

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا پہلا سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

احمد اقبال

2

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں
قارئین کے مطالعے اور دعویٰ و اصلاحی مقاصد کے
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی
، قانونی و شرعی جرم ہے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

طن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

دوسرا حصہ

احمد اقبال

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز

۲۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۱۴

اپنی فیوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکاتے والی کہانی
 چیک پیر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ ”یہ دنیا ایک ایسا جگہ ہے اور ہم سب فانی انسان ہیں۔“ اچھا اداکار وہ ہے جو اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔“ اچھا اداکار وہ ہے جو تماشاخیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا رد عمل خود اس کے کردار کی نگہ کرے۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجاتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے رول کے لئے منتخب کیا اور ان اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جھوٹا، جن کو اپنا کھیل پیش کر کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشاخی۔

مداری

دروازے کے پیچھے سے آواز آئی ”رہنے دو شاہ عالم میں یہاں توپ لے بیٹھی ہوں۔ بندہ لٹائے رہے۔“
 میں نے ڈانٹ کے کہا ”تم پھر اٹھا لائی ہوگی بھکیوں کی توپ۔ آجائیں گے صبح لاہور کا پرورش دالے والے واپس مانگتے خردوار جو گولہ چلائے۔ تمہارا نشانہ ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے بھی ایک گلدان توڑ دیا تھا۔ جاؤ پیٹنگ کرو۔“
 ”پیٹنگ ہوگئی ہے“ چندرانے کہا ”چایاں لاؤ۔“
 ”اٹنی کی ہوگی۔ میری بھی کرو۔ خان اعظم کی کرو۔“ میں نے چایاں پیٹنگ دیں۔

”وہ بھی ہوگئی۔ سب تیار ہے“ چندرانے چایاں اٹھا لیں۔
 میں نے کہا ”آفریں۔ پھر کیا چلیں“ میں نے کہا۔
 ”بس میں ذرا ٹمپ اپ کروں۔ تم پہل کے گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں ایک در“ گھٹے میں ”چندرانے کہا۔
 میں نے مسکراتے ہوئے تیمور کو دیکھا ”دیکھا۔ کتنی ہوشیار ہے میری بیکری۔ مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا“ نہ کچھ بتانا پڑا۔
 ”اس نے دروازے کے پیچھے سے سب سن لیا۔“

”معاف کرنا۔ یہ ایک زمانہ عادت ہے“ میں نے کہا ”جیسے لگائی بھالی کی عادت یا عادت لڑنے کی عادت۔ محترمہ کی شادی بھی محض اس وجہ سے نہیں ہو رہی ہے کہ لڑکی کے سرسرا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ نند نہ ساس۔ لڑکی کہتی ہے کہ ابھی تو خیر عبت کرنے میں وقت اچھا گزر رہا ہے۔ ہنسی سون کے بعد میں کس سے لڑکے وقت گزاروں گی۔“

میں نے کہا ”تم فرض کر لو کہ شہنشاہ کی بے باک پر ایک گھوڑا یا باغی بدل گیا ہے۔ کالے اور سفید ٹمرے تو ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہیں۔ مگر اپنے مہموں میں دو کالے باغی ہوتے ہیں اور گھوڑے اور دو سفید۔ اگر آج کھیل میں ایک سفید باغی ہے یا ایک کالا گھوڑا۔ اور کوئی باہر بڑے ہوئے مہموں میں سے دوسرا سفید باغی یا کالا گھوڑا اٹھا کے بے باک پر رکھ دے اور جو بے باک موجود ہے اسے باہر کر دے تو کیا اس سے کھیل میں فرق پڑتا ہے؟ یا کھلاڑیوں کو؟ یہ کام خاموشی سے ہو جائے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔“

”تم پچھن جاؤ گے کیس نہ کیس۔“
 ”وہی تو تم چھپنے ہوئے ہو“ میں نے کہا ”تم کو چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے تیاری میں دس منٹ لگیں گے۔ یہ بتاؤ کیا ہو گئے چائے یا کافی۔“
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے زہر آلود لبے میں کہا۔

”مگر میرے پاس وہ زہر ہوتا جو تم نے مردار کو مروانے کے لئے استعمال کیا تھا۔ تب میں بھی چائے کافی میں نہ ملا تھا۔ مجھے تمہاری ضرورت رہے گی تیمور۔ جیسے پہلے تھی۔ تمہیں نہ مرنے کی اجازت ہے نہ مارنے کی۔ خاموشی سے ٹھنڈے دل و درباغ کے ساتھ سوچ کر تمہارا فائدہ اسی میں ہے۔ تم زندہ رہو اور بدلی ہوئی صورت حال کو ایسے قبول کر لو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تمہارے پاس ریلوے ٹھیکہ ہو گا۔ لاؤ اچھے بچوں کی طرح مجھے دے دو۔“ میں نے میز پر سے گاڑی کی چایاں اٹھا لیں۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

چند اے پھر داخلہ کی "میاں پوری تہیں میں بھی لڑکتے ہیں۔"

مگر وہ لڑکا انتہائی امن پسند ہے۔ "میں نے کہا "تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو۔"

"میں ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں مگر جہیں باتوں سے فرصت نہیں۔ فضول باتوں سے۔" وہ بولی "خانہ کی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔"

میں نے تیمور کو اشارہ کیا "تو چلیں۔"

تیمور نے کہا "یہ سب پہلے سے تھا۔ تم سارا ہندوستان کر کے گئے تھے۔ سب انتظام عمل تھا۔"

میں نے کسی حلقہ کی طرح کہا "میں سمجھ لو کہ وہ دنیا بھی ہو۔ موقع بھی ہو دستور بھی ہو۔ ہر عید ہو۔ صاف ہو۔ پھری بھی ہو مگر بکرا نہ ہو تو مکمل انتظامات کے باوجود قربانی تو نہیں ہو سکتی تھی۔"

مجھے تیمور کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ جب میں تیمور کے ساتھ آیا تھا تو خان اعظم اور چند مستعد ہو گئے تھے۔ ان سے کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا اور جب انہوں نے میری حفاظت کرتے ہوئے تیمور سے ہونے والی گفتگو سنی تو پھر انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ خانہ کی گاڑی نے چند اے کو اشارہ کر دیا ہو گا کہ سڑکی چاروی کر۔ وہ اشارہ نہ کرتے تب بھی چند اے کی کئی۔

خانہ کی گاڑی پر تیمور کی گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ معمول کے مطابق انہوں نے سفید چٹون اور سفید شرت پٹی خلی مرڈر انیور ٹھکانے کے لیے سر پہنے کپ بھی رکھ لی تھی۔ انہوں نے پیچھے اتر کے میرے لیے پیچھے والا دروازہ بڑے مزاحمت انداز میں کھولا۔ وہ DECORUM کے بہت قائل تھے۔ میں شرمندہ ہونے کی کوشش کرتا اور ان سے کتنا کہ خانہ کی یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ تو وہ براہ راست جواب میں ہوتا کہ میں وہی کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔ باہر میں تو کل خان یا خان اعظم دیکھو نہیں تمہارا ڈرائیور ہوں۔

پہلے تیمور اور پھر میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے پیچھے ایک بڑا سوٹ کپس اور ایک چھوٹا برف کپس نظر آئے۔ پھر چند اے عام لڑکیوں کی طرح شلوار قمیض پہنے دو پٹے کنگے کا ہارٹائے نمودار ہوئی اور آگے بیٹھ گئی۔

تیمور نے کہا "مجھے اپنے گھر کو اطلاع کرنے دو۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا "تمہاری گاڑی میں فون ہے۔ نمبر بتاؤ میری سیکرٹری کو۔"

وہ میرے لیے سمجھ گیا کہ اسے براہ راست ان سے فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ اس نے نمبر بتایا۔

چند اے نے نمبر ملانے کے بعد کہا "ہیلو۔" جی آپ کون۔ سز تیمور دیکھیں جی میں پانی کے مرکزی دفتر سے بول رہی ہوں۔ ہاں جی تیمور صاحب یہاں ہیں۔ بہت اہم بینک میں مصروف ہیں۔

شاید آج رات وہ گھر نہ آئیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا نخواستہ کوئی ان کو پھنچے تو آپ بھی کہیں کہ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ جی میں پانی کی پینٹیشن سیکرٹری بول رہی ہوں۔ نہیں جی بینک آفس میں نہیں ہو رہی ہے۔ نہیں جی شاہ عالم صاحب کے گھر پر بھی نہیں۔ اس نے فون کے ریسیور کو ہک میں لٹکا دیا۔

میں نے کہا "بھئی تیمور صاحب۔ ہم نے تمہاری پریشانی دور کر دی۔ امید ہے اب تم اپنے لئے نئی پریشانی کے اسباب پیدا نہیں کرو گے۔"

"اس طرح تمہاری کوہانی جیک نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "اسی لیے میں پانی پھیریں کوہانی جیک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سبز بلب مدد کوہانی جیک کر چکا ہوں۔ پانی کے تو بڑا دلوں نمبر ہوں گے اور لاکھوں یا کروڑوں حاکم۔"

"میں آپ کی دو نمبر پوری کو بھی مطلع کروں یا وہ آپ کے اچانک بگائے ہو جانے سے پریشان نہیں ہوتیں۔" چند اے بولی شرافت سے پوچھا۔

دو سڑی سو شل اور ماڈرن وانک کو دو نمبر پوری کتا تیمور کو اتار دی گراں گزارا ہو گا چند اے کا سوال۔ غرض عام میں دو نمبر اب نقل کے سنی رکھتا ہے۔

"تمہاری یہ سیکرٹری۔" وہ طعنے لے رہی تھی "ضرورت سے زیادہ اسٹارٹ ہے۔ تاہم اس لیے۔"

میں نے اسے ٹوک دیا "وہ بتانا ضروری نہیں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ابھی آپ نے صرف دیکھا ہے سز تیمور۔ کسی دن آپ کو ملے گی۔ مجھے ہو گا تو آپ اس سے کہیں زیادہ حیران ہوں گے۔" جیسے اس وقت ہیں۔

"اس وقت بھی یہ پریشان ہیں۔ بعد میں زیادہ پریشان ہوں گے۔"

"یہ بھی غمک کا تم نے۔ میں تم کو پہلے سے خبردار کروں تیمور۔ ایک تو ان کا نام ہے مس خان۔ مجھ سمیت سب کے لیے غلام نام لینا ایک غلام حرکت ہے جس پر مس خان فوراً حرکت میں آجاتی ہیں۔ حرکت میں برکت ہے۔ تم جیسے چار پانچ سامنے ہوں تو انہیں دن میں آدھے نظر آجاتے ہیں۔ اگر وہ ہوش میں رہیں ورنہ انہیں اسپتال میں ہوش آتا ہے۔ ہاتھ میں دیو اور تو چوہا بھی شیر کی طرح دھاؤں آتا ہے اور شیر بھاگ جاتا ہے ڈر کے مارے دم دبا کے۔"

"کس کی دم دبا کے؟" چند اے سوال کیا۔

"ظاہر ہے چوہے کی۔ اشارہ ہوتا ہے کہ بڑا رکلی مت چلاؤ۔ ہم اپنی موٹھ بچے کر لیتے ہیں۔ بس کسی کو پتا نہ چلے۔"

میں فون کا بڑبڑانے کا چند اے نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ جی کی نمبر ہے۔ میں مس کون ہوں؟ آواز سے کیا لگتا ہے آپ

کو۔ اور آپ خود کیا ہیں؟ جی نہیں۔ یہ راگ نمبر نہیں ہے۔ راگ نام ہے۔ آپ ان سے بات نہیں کر سکتیں۔ وہ انتہائی اہم اور غیب بینک میں ہیں۔ ہوں۔ کون سی بیوی۔ نمبر نہیں یا چار۔"

"مس خان۔ پلیز اس سے کام خراب ہو جائے گا۔ تیمور نے آگے ہاتھ بڑھایا "مجھے بات کرنے دیں۔"

"چھ شرم مت کریں۔ میرے کان میں ویسے ہی دو ہے۔ میں دیکھتی ہوں اگر لائن ٹی گئی تو وہ خود فون کر لیں گے آپ کو۔" اس نے ریسیور لٹکا دیا۔

میں نے کہا "تم صرف اتنا بتاؤ گے کہ شاید ایک دو دن تم مصروف رہو گے اور اس سے نہیں ملو گے۔"

"اور کیا کہہ سکتا ہوں میں۔" تیمور بولا۔

جب تیمور نے بات کی تو غالباً دوسری طرف سے اس کی بیوی نے ہنگامہ کیا۔ یہ پوچھا کہ وہ بد فیز لڑکی کون تھی۔ اسے خوب خانمیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی بات کہنے میں کامیاب ہوا۔

"بے وقوفی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" اس نے ایک کمری سانس لی اور ریسیور چند اے کے حوالے کر دیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس بے وقوف عورت نے یقین کر لیا۔"

میں نے کہا "بیک وقت بے وقوف اور عورت کتنا ضروری نہیں۔ بس عورت کافی ہے۔ کیا یقین کر لیا؟"

"جی کہ میری واقعی چار بیویاں ہیں۔ اس کے بعد میں نے دو شادیوں اور کئی ہیں پچھ کے۔"

"یعنی بیوی بھی تم پر اعتبار نہیں کرتی۔"

"کیسے کرے۔ زانہ ہی ایسا ہے۔" چند اے نے کہا "قابل اعتبار شوہر اب ہوتے ہی کہاں ہیں۔"

"ہوتے ہیں خال خال۔ لاکھوں میں ایک آدمہ ہیں نکل آتا ہے اگر کوئی چراغ مرغ زبانیے کر تلاش کرے۔"

"زبانے تو تمہاری کو بھی تلاش نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ لگن جی ہو اور کوئی دل کی آنکھ سے دیکھے تو اس پاس یل جاتا ہے کوئی ماڈل شوہر۔"

"کیا سز تیمور کو یہ بتانا مناسب ہو گا کہ تم مارشل آرٹ میں میرے شاگرد ہو اور میں استاد ہوں۔"

"بالکل غلط۔ تم انتہائی ہو سکتی ہو مگر امر کی دوس۔"

"پلوہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کتنی بار شرط لگا کے ہار چکے ہو اور میرے کتنے مقروض ہو۔"

"مقروض تو ہم بہت ہیں ساری دنیا کے۔ مگر الحمد للہ ہماری خودی بلند ہے۔ اسے ہم انتہاء بلند رکھیں گے خواہ خود تاجی کے گھرے عارضی کر جائیں۔" اپنے علامہ صاحب اور قاندا اعظم۔ انہی کے فرمودات مطہل راہ ہیں۔"

"وہ راگ کہہ رہے اور کسی مطہل روشن ہے۔" وہ بولی۔

"آفریں ہے تم پر مس خان۔" میں نے کہا "تم نے ایک انتہائی عظیم نعمت کے قوی سٹے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرا دی۔"

اقتدار سنبھالنے ہی ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ایک اعلیٰ اعتباری کمیٹی کے قیام کا اعلان کریں گے۔ کیسٹن اپنی رپورٹ قومی اسمبلی میں پیش کرے گا جو اسے سیٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے سپرد کر دے گی۔ اس کی سفارشات صدر مملکت کے سامنے رکھی جائیں گی اور وہ ہمارے یعنی وزیر اعظم کے مشورے سے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کریں گے اور سپریم کورٹ شاید اس مسئلے پر ریفرنڈم کرانے کا حکم دے۔"

"مگر ریفرنڈم سے پہلے ہم ایک سیٹیار کریں گے جس میں او آئی سی۔"

"I SEE۔ OH۔ مس خان۔"

"میرا مطلب تھا آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹرز کے سربراہان کو بھی مدعو کیا جائے گا اور اس مقدمہ کے لیے ہم ایک عظیم الشان سیٹیار ہال تعمیر کرائیں گے۔ ایک ارب روپے سے۔"

"مس خان۔ براہ راست اسلامی ممالک کے سربراہان کا اس مسئلے سے کیا تعلق؟"

"تعلق تو ان کا اسلامی دنیا کے کسی مسئلے سے نہیں ہے۔ مگر آپ کا مسئلہ ہو گا لی کی تعمیر کا ٹھکانہ۔ وہ مس قمر کی طرف سے ڈاکٹر قادی کو دیا جاسکتا ہے۔ انا کہہ دیتا ہوں نہیں ہیں۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا "پھر کیا مطلب ہے اس بات کا۔ ہم نااہل لوگوں کو اسے اہم کام سونپ دیں۔" قریب پوری کر دیتے۔"

"قریب پوری سب کرتے ہیں۔ سر۔ کنگ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اول خلیفہ بعدہ، دیکھیں۔" چند اے نے کہا۔

"گھوٹا اخلاقی جواز ہے۔ قانون میں گنجائش ہم خود نکال لیں گے۔" میں نے کہا "سز تیمور۔ اچانک مجھے خیال آیا ہے کہ میں نے تم سے دیو اور کا تھا۔"

"دیو اور میرے پاس نہیں۔ گھوٹا کپارٹمنٹ میں ہے۔" وہ بڑا سامنے بٹکے بولا۔

چند اے نے دیو اور نکال لیا "واب بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔"

میں نے کہا "پھر لاکٹ کی طرح گلے میں لٹکاؤ۔"

"اس کا تو نشانہ بھی خطا نہیں ہو سکتا۔" اس نے سینٹی کچ بٹاکے اٹھ لیٹریچر پر رکھتے ہوئے دیو اور کا رخ تیمور کی طرف کر دیا "کیا خیال ہے؟"

میں نے مسکراتے تیمور کو دیکھا "مس خان کا نشانہ زبردست ہے۔ اگر آپ کھڑے ہوں جتنا پاکستان پر۔ ایک الو آپ کے سر پر بیٹھے کے لیے پر قفل رہا ہو۔ اور آلو کے سر پر کوئی پھرنی کی کوہڑی کے فرمودات مطہل راہ ہیں۔"

طرح اترنے والا ہو یہ چھر کو اڑانے کے لیے نشانہ لے کر فائر کریں گی تو کوئی گے کی میں آپ کے دل یا جگر میں۔ پھر آپ غالب کی طرح سوچیں گے کہ۔ جہاں ہوں دل کو وہاں کہیں جوں جگر کو میں۔

”اڑ کر نیچے آتے ہوئے سوچیں گے“ چندانے رپو اور کو صاف کر کے بھر دیں رکھ دیا۔ ”لیکن آپ کا طائر روح نفس غصہ سے اوپر کی جانب پرواز کر جائے گا۔“

”جیسے چھر اور الو الگ الگ سمتوں میں اڑ جائیں گے۔ سائنسی اصول ہے کہ کدھم بھن بھن جس پرواز۔ الو اور چھر ایک ساتھ نہیں اڑ سکتے۔ جسم نیچے زمین میں جاتا ہے، روح اوپر آسمان پر۔ یہاں تم سوال کر سکتے ہو کہ مس خان کتنے قاصد سے فائر کریں گی۔“

”میرا داغ خراب نہیں ہے“ تیمور بڑبڑایا۔

”تم تو جواب اس کا یہ ہے کہ صرف دو گز کے قاصد سے۔ اب تمہیں بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ خان اعظم درحقیقت کرل خان ہیں۔ ہر قسم کے مارشل آرٹ اور ہتھول سے توپ گن کے نشانے میں یہ چندانے کے بھی باپ ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ میرے علاوہ انہی کے فضل آن میں وہ ہولندہ جو ہوں۔ خدا کے بعد اگر میں کسی سے ذرا ہوں تو خان اعظم سے۔“

”اور خان اعظم کے بعد مجھ سے“ چندانے کہا۔

”جہ تو یہ بڑے شرم کی بات مگر مسز تیمور آپ سے کیا پردہ یہ بچ ہے“ میں نے ایک لمبھی سانس لے کر کہا ”دنیا میں سب سے زیادہ عزت میں خان اعظم کی کرتا ہوں مگر سب کے سامنے مجبوراً ہم ان کو اعظم کہہ کے بلائیں گے۔ معافی میں پہلے مانگ لیتا ہوں۔“

تیمور بولا ”یہ بھی یاد مجھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت تم کس سے کرتے ہو؟“

”فہم۔ دراصل یہ بھی ویسای نازک اور پے پیچہ سوال ہے جیسا کہ مس خان نے کیا تھا۔“

”جواب میں دے سکتی ہوں کہ کسی سے بھی نہیں“ چندانے کہا ”یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی نہیں“ زندگی سے بھی نہیں۔“

”تمہارا جواب سرکاری پریس ریلیز سے زیادہ گمراہ کن ہے۔“

”جو زندگی سے محبت کرتا ہے وہ اس کو اپنے لیے مشکل نہیں بناتا۔ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے تباہ نہیں کرتا“ چندانے کہا۔

”فاسوش ہو جاؤ دونوں“ خان بی بی نے کہا۔

”میں نے کہا“ ہم لا نہیں رہے تھے خان بی بی۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں ٹوکا تھا کہ تم کچھ ایزی ہو جاؤ لیکن اب ہم گیت کے قریب ہیں۔“

میں فوراً پیچھے ہو گیا۔ خود کو سمیٹ کر میں نے ریف کیس اپنے سر کی طرف کھڑا کر لیا اور سوٹ کیس کو اپنے اوپر رکھ لیا۔ اب کوئی سرسری انداز میں اندر بھاگنے کے دیکھا تب بھی میں نظر نہیں آسکتا تھا۔

گیت سے کچھ قاصد پر پولیس نے گاڑی کو روک لیا۔ تیمور نے شیشا آٹارنے والا بن دیا اور کہا ”کیا بات ہے؟“

”آپ اندر نہیں جاسکتے“ کسی نے کہا۔

”کیوں نہیں جاسکتا؟“ تیمور نے براہی سے کہا ”تم جانتے نہیں میں کون ہوں؟“

بات کرنے والا غصا ہو گیا ”سواری سر۔ میں پہچانتا نہیں سب کو۔“

”میں امیر تیمور ہوں۔ پارٹی کا سینئر وائس پریذیڈنٹ۔ کوئی افسر ہے تو اسے بلاؤ۔“

درمیان میں کسی نے کہا ”تیمور صاحب۔“

”ڈی ایچ ایس ای صاحب۔ کیسے لوگ کفرے کر رہے ہیں آپ نے بھی۔“

”وہی سواری تیمور صاحب۔ دراصل سیکورٹی کا مسئلہ ہے۔ یہ آپ کے ساتھ۔“

”میری بیکر بنی“ مس خان اور شرف۔

”بائیو سرا“

”آپ اس کے بعد گیت پر تفتیش ہوگی؟“

”نہیں سر۔ میں وائرلیس پر کھدتا ہوں“ آپ کو گیت کھلا ہوا ملے گا۔“

گاڑی پھر آگے بڑھی اور جب رکی تو تیمور نے کہا ”ہم اندر پہنچ چکے ہیں۔ تم باہر آ سکتے ہو۔“

میں نے اوپر دیکھا ہوا سوٹ کیس ہٹایا اور تیمور کے ساتھ ہی اتر کے سیدھا اندر چلا گیا۔ خان بی بی نے گاڑی کو پورے میں میں دروازے کے سامنے روکا تھا۔ میرے پیچھے تیمور آیا اور اس کے بعد چندانے۔ اب یہ گھر میرے لیے ابھی نہیں رہا تھا۔ میں اس کے اندر کے سب راسخوں سے واقف تھا۔ میرا سامنا سب سے پہلے چنبیلی سے ہوا۔ وہ مجھے اور چندانے کو دیکھ کر کھٹکی میں اسے نظر انداز کرتا ہوا سماں کے کمرے میں چلا گیا۔

دیوار پر لگے ہوئے اثر کام کارٹونیوڈ افشا کے اور ایک بن دبا کے میں نے کہا ”کمانے میں کتنی دیر ہے گلاب دین؟“

شاید اسے چنبیلی نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ وہ بوکھلایا نہیں ”ایک گھنٹہ لگ جائے گا سر۔ ایک دو چتریں بنانی پڑیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ فی الحال تم چائے پیچ دو۔ چار پانچ افراد کے لیے۔“

”نہیں سر۔ بس پانچ منٹ۔“ وہ بولا۔

میں نے دیکھ کر کہ میں لٹکایا اور اندر ای بیڈ روم میں چلا گیا جہاں میں نے ایک رات کے گزرتے ہوئے ہر لمحے کی گھم دیکھی تھی کیونکہ وہ رات میرے لیے ہوش سے بے کاغذی میں گزر گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ میں نے کیا تھا اس کا مجھے علم تھا مگر اسے بھی بیکسر کی آنکھ نے دیکھا تھا اور میرے خلاف شہادت کے طور پر محفوظ کر لیا تھا۔

رشتی ڈرنک نیل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی۔ آئینے میں مجھے دیکھ کے وہ بڑی طرح چوگی اور ایک دم چلی۔

میں نے مسکرا کے کہا ”ہیلو۔“

اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ جس پوز میں تھی اسی میں ٹھہر گئی تھی۔

میں نے ہنسی بھائی ”اے رشتی۔ کیا ہو گیا بھائی“ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟“

وہ بھر پور گئی ”دیکھ رہی ہوں کس قسم تمہی ہو۔“

میں ہنس پڑا ”میں نہیں تو کیا میرا بھوت نظر آ رہا ہے جیس؟“

وہ آہستہ سے اٹھی اور میرے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی۔ بلاشبہ وہ دولت حسن و شاد سے مالا مال ایسی عورت تھی کہ شاہ عالم کو انکا پڑا خزانہ پالینے کے بعد ٹاٹھکے اور غریبے پن کے ساتھ کسی کے سامنے خیرات کے لیے دست طلب پھیلائے، کہیں چوری کرنے یا لقب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر ہوس کو بے نشانہ کار کیا گیا۔

اس کے لبوس میں کم چابی کا انداز شاید کسی کے لیے بے حیالی ہو۔ خود اس کے لیے صرف فیشن تھا۔ کیا فیشن بھی ایک حیوانی جبلت ہے۔ ہر شخص میں مادہ اپنے زکوٰۃ کو دینے کے لیے سب کچھ کرتی ہے۔ عورت فیشن کرتی ہے۔ اس کے وجود سے پھونکنے والی خوشبو یقیناً بیجان فیر بھی اور یہ مجھے ختم سے ہی پتا چلا تھا کہ میں اسے بھی اپنی پند سے خوشبو لاکے دتا ہوں۔ اس کے کھلے شری مائل مجھ سے ہال کر تک لڑا رہے تھے۔

میں نے اس سے دور ہونے کے لیے صوفے پر گر کر کہا ”تم کچھ پوچھو نہیں“ بس ایسے ہی گھوٹی رہو گی۔ تمہاری نگاہوں میں آنے لگے جلا کے جسم کرنے والی آتش غضب کے شعلے بھی نظر نہیں آ رہے ہیں اور تمہارے لبوں سے انگاروں کے پھول بھی نہیں رہتے ابھی تک۔“

اس نے لبوں کو مٹھو اور صبح مسکراہٹ سے بھی روک دیا ”اس سے پہلے فرق پڑا ہے۔ میں تو دیکھ رہی ہوں کہ کہیں کوئی داغ تو نہیں ہے۔“

”داغ؟ کیا داغ؟“

”لو کا داغ من پڑا آئین پر۔“

میں نے کہا ”گھبراہٹ نے تسلیم کر لیا ہے پہلے سے کہ مرد و زکو میں نے ہی قتل کیا ہے؟“

”ایک شوہر کی حیثیت سے تم مجھے حکم دے سکتے ہو کہ میں تمہاری بے گناہی تسلیم کروں۔ زبان غلط اور غلط خدا کی آواز نہ سنوں۔“

میں نے کہا ”تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں قتل کر سکتا ہوں؟“

اس نے سپاٹ لیجے میں کہا ”گھوٹی خاندانی قصاب یہ سوال کرے مجھ سے۔ کیا آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ میں بکرے کی گردن پر چھری چلا سکتا ہوں۔“

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”تمہارا مطلب ہے کہ قتل تو میں کرتا ہی رہتا ہوں کون سی نئی بات ہے۔ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ عادت ہے شوق ہے۔“

”خدا کے لیے عالی۔ آہستہ بولو۔ تم نہیں جانتے اس گھر میں لوگ کتنی دہشت کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ زندہ نہیں ہیں۔ بس سانس لے رہے ہیں۔“ اس کی آواز کانپنے لگی۔

”کتن لوگوں کی بات کر رہی ہو تم؟“

”تم مجھ سے پوچھ رہے ہو“ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی ”مجھے نہیں معلوم کہ اس کھیل میں موت کے اور سیاست کے اس کھیل میں مجھے کیوں کھینچا گیا ہے۔ میں یہاں صرف اپنے شوہر کے ساتھ“ تمہارے ساتھ رہتی تھی۔ صرف تمہاری بیوی تھی۔ جس پر تک بھی تھی۔ جتنی بھی تھی۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں تھی۔“

”تم سلفیہ اور میری اگلی بیوی ہو“ عزیز از جان۔“

وہ بالکل حائر نہیں ہوئی ”جو کچھ تم باہر کرتے تھے کرتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض کرنے کا حق مانگنے کی جرات بھی نہیں ہے اب مجھ میں۔ مگر گھر کے اندر۔“ وہ رونے لگی۔

”رشتی۔ پلیز دیکھو میری بات سنو“ میں نے کہا ”آئی ایم سوری۔ میں سب بتا دوں گا جیسے۔ جو کچھ میں نے کیا۔ ایک مجبوری تھی۔ میں کسی کو بھی مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ ضروری ہو گیا تھا۔ جب دشمن گھر کے اندر آجائے تو اپنی اور اپنے گھر کی حفاظت کے لیے۔“

”گھر کی حفاظت۔ وہ چوکیدار کرتا تھا۔ کیا وہ بھی دشمن تھا تمہارا“ اپنی دوکان تھی مجھے نہیں معلوم۔“

”مجھے انتخابی صدمہ ہوا تھا“ یہ جان کر کہ چوکیدار بھی مر گیا ہے۔ اسے میں نے نہیں مارا تھا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں رشتی۔ اس خبیث ترس دوزی کو میں نے مارا تھا۔ میں اسے نہ مارا تو وہ مجھے مار دیتی۔ اس کے ساتھی کو میں نے اپنے قلعہ میں قتل کیا تھا۔ چوکیدار کو کسی نے بعد میں مارا۔ اس کے خون ناحق کو میرے ہاتھ اعمال میں شامل کرنے کے لیے۔ کیا میں نہیں جانتا

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

زندان میں پھول

لحہ بہ لحہ
سطر بہ سطر
تجربہ تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان

قیمت
300
روپے

چار پیارے خوبصورت بچے جو گلاب کی
چھتریوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

روشنی کی تابانی سے شہر کی ایک
خوشحال اور خوشحال گلی میں

بہترین کتابت
خوبصورت گرد و پیش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ
موصول ڈاک 30 روپے

بلا واسطہ منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک
خرچ ادارہ کے نام میں آرڈر یا ڈرافٹ بتا کر ارسال کریں

ناشر
طیلسان پبلشرز

۲۰ عزیزان کٹ اردو بازار لاہور 7247414

میں نے کہا ”تم دیکھو کہ یہ ایکٹنگ نہیں تھی۔ میں نے بدل
لیا ہے خود کہ جس شکایت نہیں ہوگی مجھ سے۔“
خوشی اس کے چہرے پر شوق کی روشنی بن گئی۔ اُجالے کی وہ
کرن بن گئی جو دل میں نور بھرتی ہے۔ ہونٹوں پر چاندنی جیسی
مسکراہٹ بکھیر رہی ہے۔ اس نے کپ کو چھوڑ دیا اور مجھ سے لپٹ
گئی۔ چائے بستر پھیل گئی اور اس کے ہونٹوں کی لال میسرے لیوں
پر۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے جذباتی اداکاری میں ضرورت
سے زیادہ حقیقت کا رنگ بھرا تھا۔ مجھے جھوٹ کا ماضی سارا لیتا
تھا مگر میں نے اسے وہ بچہ بنا دیا تھا جس پر روشنی نے امیدوں کی بنیاد
استوار کر لی تھی۔ وہ میری بیوی نہیں تھی مگر مجھے اس کے ساتھ رہنا
تھا۔ ایک غیر معینہ عرصے کے لیے۔ اس کے ساتھ وہ کہیں اسے
کچھ دور رکھوں گا، خود کو اس سے کچھ دور رکھوں گا۔ یہ شاہ عالم
بننے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا جس میں نے مزید مشکل بنالیا تھا۔
میں نے اسے جھک کے الگ کیا ”یہ کیا کر رہی ہو۔ سارے
دروازے کھلے ہیں“ ابھی کوئی آجائے گا۔“

”تو دروازے بند کر دو“ وہ بولی۔
میں نے کہا ”رشتی۔ ان حالات میں جب میری زندگی اور میرا
مستقبل داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ اس ویڈیو فلم کی موجودگی میں جس
کی ایک کاپی مجھے بھی خاص طور پر بھیجی گئی تھی۔“
”جس بھی؟“ وہ حیران ہو کے بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ گھبراہٹ میں لگ گیا تھا؟ خدا کا شکر
ہے کہ اس میں کوئی ایسا ویسا سین نہیں آیا ورنہ وہ فلم تو ویڈیو
شاپیں پر چلتی۔ اور غریب چلتی۔“

”رشتی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔“ تم ہوش میں کہاں تھے۔“
”ہاں۔ لیکن ایک مقصد تو دشمنوں نے حاصل کر لیا۔ وہ
میرے خلاف عین عمل کرنے کی ناقابل تردید شہادت ہے۔“

”مجھے سب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ مگر وہ بچتے
ہیں کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہی بے خبری ہے ان کی جس سے میں
فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں اچانک ان کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس طرح
کہ وہ اعتراف جرم کے سوا کچھ بھی نہ کر سکیں۔ مجھے فلم کا
اور پیکل پرنٹ لیتا ہے۔ ان سے معلوم کرنا ہے کہ اس کی کتنی
کاپیاں بنوائی گئی ہیں اور وہ کاپیاں کہاں ہیں۔ لیکن سب سے بڑی
بات یہ کہ پرسوں مجھے کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب
کرنا ہے۔ ہانگ کانگ سے پہنچنے میں ان پورٹ پر اس الزام کی
تردید کوں گا جو مجھ پر عائد کیا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنا ہے کہ میں تو
یہاں قادی نہیں اور اس کے لیے ہم ابھی کراچی روانہ ہو رہے
ہیں“ میں نے اپنی کھائی کی گڑی دیکھی۔ ”تقریباً ایک گھنٹے میں۔“
”ہم۔ یعنی میں بھی؟“

”ہاں۔ ہمارے ساتھ تیمور بھی جا رہا ہے۔ سب موجود ہوں

بستر لٹاؤ۔“ دیکھو رشتی۔ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔
میں ایک سازش کا فکار ہوا ہوں۔ میرے دشمن صرف میرا سیاسی
مستقبل نہیں دیکھ رہے بلکہ میرے خاندان کو بھی شتم نہ کرتے۔ وہ مجھے بھی شتم
کر دیتے لیکن خدا نے مجھے بال بال بچالیا۔ میں نے دشمنوں کی
سازش کو ناکام بنادیا۔“

اس نے پلکیں جھپکا کے کہا ”تمہارے تو سب ہی دشمن
ہیں۔“
میں نے کہا ”یہ سب آئین کے سانپ تھے۔ نہ جانے کب
سے سورج کی آگ میں تھے اور میرے خلاف جال پھیلانے میں
معموف تھے۔ مگر شاہ عالم نے کئی گویاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں نے
بھی ان کی ایسی جیسی نہ کر دی تو کتنا۔“

”تمہاری مراد۔۔۔ عموماً زبانی ہے؟“

”نہیں۔ عموماً زبانی مجھ سے بدگمان کیا گیا۔ پھر اسے میرے
ہاتھوں میں لایا گیا۔ دھوکے سے۔۔۔ کسی نے ایک گناہ کال کر کے
مجھے خبردار ضرور کیا تھا۔ کہ ابھی تمہارا واپس جانا خطرناک بھی
ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ اس وقت میں ہانگ کانگ میں تھا۔“

”تم تو آج بھی ہانگ کانگ میں ہو۔“

میں نے سہلایا ”ہاں۔ میں وہیں ہوں۔“

”خدا کے لیے پسلیوں میں بائیں مت کرو عالی۔“

میں نے کہا ”جان۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ ایسا
بندوبست کر دیا تھا کہ خدا نخواستہ میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے
تو میری موجودگی یہاں نہیں ہانگ کانگ میں ثابت کی جائے اور خدا
کا شر ہے کہ میری اسی احتیاط نے اچالائی مجھے بچالیا۔“
”پھر وہاں کون ہے جو شاہ عالم کا بیٹا ہے۔ اسی طرح بات
کرنا ہے مجھ سے بھی۔ جیسے تم بات کرتے ہو“ وہ نکلی سے بولی۔

میں نے ہنس کے کہا ”ہے ایک اپنا ہی آدمی۔“

”کتنی مٹی ہے اس کی آواز تم سے۔۔۔ اچھا ایکٹر ہے تمہاری
طرح وہ بھی“ رشتی نے کہا۔

”میں ایکٹر ہوں؟“

”ایسے دیسے۔ مگر مجھے تم میں ایک بہت عجیب سی تبدیلی
محسوس ہو رہی ہے۔ کہیں یہ بھی ایکٹنگ نہ ہو تمہاری۔ جیسے تم نے
باداشت تم ہو جانے کی اداکاری کی تھی۔“ اس کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا تبدیلی نوٹ کی ہے تم نے۔ چائے پو۔“

اس نے بیٹھ کے کپ لے لیا ”تمہارے کچھ بدلے ہوئے ہو۔
پہلے جیسی اکڑی اکڑی باتیں نہیں کر رہے ہو۔ بہت پہلے تم ایسے
تھے۔۔۔ نہ کبھی تم نے اپنی دیر بات کی مجھ سے۔ نہ کبھی کسی بات کی
وضاحت ضروری سمجھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بیٹھ کی طرح مجھے
بے عزت کر دے اور کھوکھے کے خیریت چاہتی ہو تو اپنی زبان بند
رکھو۔ ذرا اوگے دھکا دے اور پہلے جاؤ گے۔“

تھا کہ امیر خان اور اکبر خان کتنے وفادار اور پرانے جانثار
ہیں۔ ان پر پورا اعتماد تھا مجھے۔ میں جانی کی قسم کھا سکتا ہوں
رشتی۔“

اس نے اپنے آنسو پونچھے ”ٹھیک ہے۔ میں مان لیتی ہوں کہ
تم مجبور ہو گئے تھے۔ تم نے دشمنوں کو مار دیا۔ اچھا کیا۔ بچو کیو اد بے
چاہہ بد قسمتی کے سبب مارا گیا۔ مگر مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا۔ اور میں
کچھ جانتا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ سب مجھے بتانے کا کیا مقصد تھا؟“
میں نے کہا ”یہی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے جس کچھ نہیں
بتایا۔ میری تو تم سے اس دن کے بعد آج بات ہوئی ہے۔“

”عال۔ پھر یہ کیا ہے؟“ وہ تجزی سے اٹھی اور اس نے اپنی
المانی کے اس خفیہ خانے سے جس میں وہ اپنا زیور رکھتی تھی ایک
فلم نکالی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا ”یہ ویڈیو فلم۔۔۔ والی گاڈا اتم نے بھی دیکھ
لی؟“

”میں کیوں نہ دیکھتی آخر۔۔۔“ اس نے فلم مجھے پکڑادی۔

اس پر لکھا ہوا تھا۔ ”سر شاہ عالم کی خصوصی توجہ کے لیے۔“

میں نے کہا ”یہ کس کا پیڈر اسٹنک ہے؟“

”سب کے پیڈر اسٹنک ایکسپلرٹ تم ہو۔ میرے پاس تو کسی کا
خط بھی نہیں آتا۔“

میں نے کہا ”کیسے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہاں ملی یہ فلم تمہیں
آخر۔۔۔ اور کب؟“

”یہ میرے سر ہانے کتنے کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ کل صبح
کی بات ہے۔ عالی مجھے ابھی بتا دیا کہ یہ پکڑ کیا ہے۔ مجھے وحشت
ہو رہی ہے۔ میں بالکل ہوجاؤں گی“ اس نے میرا شانہ زور زور سے
ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”رشتی۔ ہوش میں رہو۔“

”کیسے ہوش میں رہوں میں؟“ وہ چلائی ”ڈر لگتا ہے مجھے تم
سے۔۔۔ تم قاتل ہو۔ پیڈر اسٹنک۔۔۔ مجھے بھی قتل کر دو گے تم۔“

میں نے اس کے گال پر اٹلے ہاتھ سے جھانکا مارا۔ اس کی
آواز ایک دم بند ہو گئی اور وہ نیچے گر گئی۔ ایک ہاتھ اپنے گال پر
رکھ کر کہہ رہی تھی ”آٹھوں سے دیکھتی رہی اور پھر فرش پر سر
رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئے گئی۔“

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے محبت سے اٹھاؤں اور پیار
دلار سے اسے تسکین دوں۔ اس کا یہ دڑھل بالکل غلطی تھا۔ تمام
میش و آرام، عزت اور شہرت میرے ہونے کے باوجود وہ ایک دکھی
مظلوم اور قابل رحم عورت تھی۔

میں اسے اٹھا کے بیڈ پر لے گیا اور انٹر کام پر چنبیلی سے پانی
منگوا۔ وہ پانی لاتی تو میں نے کہا کہ میرے لیے چائے بھی یہاں
لا دو۔

جب پلاٹر رشتی پر سکون ہو گئی تو میں نے اسے الگ کر کے

گے پریس کانفرنس کے وقت۔ ہمیں بس جانا ہے اور واپس آنا ہے۔ پھر مجھ پر تم تیری کرلو جو کچھ ساتھ لیتا ہے ایک سوٹ کیس میں ڈال لو۔“

”یہ کیوں کہا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ حسین نہیں ہے“ وہ بول۔
میں نے اس کے کہا ”یہ جوٹ ہے تو پھر لفت میں سے بچ کا
لفظ ہی نکال دینا چاہیے۔“

تھے۔ ان کی ماں تمام معمولات میں وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتی تھی۔ بڑھ چکے تھے۔ اسکول سے لوٹنے کے بعد ان کے لیے غسل لازمی تھا۔ سردی ہو یا گرمی، پہلے دوپٹے تک کھانا میز پر لگ جاتا تھا اور دوپٹے تک ان کا بندھن دم میں پہنچ کے لائٹس آف کرنا اور اسے سی چلا کے سو جانا بھی اتنی ضروری تھا۔ اس معمول میں فرق صرف چھٹی والے دن پڑتا تھا یا پھر کسی تقریب یا مہمانوں کے آجانے کی صورت میں۔ وہ نہاتے نہیں تھے اور کھانا دم سے کھایا جاتا تھا تو سولے کا وقت بھی لگ جاتا تھا۔ عام دنوں میں وہ ٹھیک چار بجے منہ دھو کے پڑنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ کبھی مجھے ان بچوں پر افسوس ہوتا تھا کہ ماں انہیں اپنے استادوں پر چلائی ہے جیسے وہ کہہ پتلیاں ہیں اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی کسی مشین کی طرح ہے جسے ان کی ماں چلا رہی ہے مگر میری سوچتا تھا کہ آخر ماں یہ سب کچھ ان کو ایک اچھا انسان بنانے، ایک کامیاب مستقبل کی ضامن عبادت دینے اور ان کی زندگی میں نظم و ضبط، تزیین اور بلتیر پیدا کرنے کے لیے ہی تو کرتی ہے۔ یہ اس کے اپنے بچے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ خود اس پر ان کی پرورش کے معاملے میں کوئی نامی کا کوئی الزام آئے۔ ان کی زندگی کی کامیابی عزیز نہ ہوتی تو وہ مج سے شام تک اتنا نزدیکوں کرتی۔ وہ بچوں کی پرورش تو کونوں پر چھوڑ دیتی اور خود ہمیش کرتی، بے گھری سے گھر جاتی اور اس پر الزام بھی کوئی نہ آتا۔ بچوں کو بڑا سمجھا جاتا یا زمانے کو۔ ماں باپ نے تو سب کچھ کیا۔ فخر چاکر، پُڑا بہترین اسکول اور اچھا احوال۔ پھر مجھے ان پر رشک آتا تھا۔ اتنا دولت مند گھر نہ کسی، ایسی توجہ رکھنی والی، فکر مند رہنے والی اور۔۔۔ اور جیسے بہتر نہ ہاتھ مٹی کے ڈھیلے کو خوب صورت گلدان میں ڈھالتے ہیں ایسے ہی ہاتھ کی بہتر مٹی سے میری زندگی کو اور میری شخصیت کو قابل تعریف اور قابل فخر سانچے میں ڈھالنے والی کوئی ماں میری بھی ہوتی۔

[illegible]

کچھ ہو گیا ہو یا بارکیں نہیں کر سکتے۔ بھئی نڈر تم ہو۔
گیا رہیں بار بھی تم ہی کراؤ گے۔ آخر پیسے کس بات کے دیتے ہیں
بہ۔ اس کے علاوہ کیا باتوں میں بچوں سے ہی نہیں وہ تو ہم سے بھی
EXPECT کرنا تھا کہ ہم اس کی عزت کریں۔ جب وہ آئے تو ہم
بھی کھڑے ہو جائیں۔ ہم! مثالی صاحب ایڈیشنل سیکریٹری
ہوئے والے ہیں اور ہزار روپے مانا ہم سے نیشن فیس لینے والا
کتا ہے کہ ہم اس کو کھڑے ہو کر رہیں کریں۔ مائی گڈنس! آخر وہ
لازم ہی تو ہے ہمارا۔ ہم اس سے زیادہ تنخواہ اپنے شیٹ کو اور
خوش کر دیتے ہیں۔ ان کی مثال ہے کہ ایسا کیس۔“

”ہاں۔ مگر مجھے گزشتہ سال مثالی صاحب نے دعویٰ فیئر میں
کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں نے تو لی ایم ڈی ورنہ اسی
لینڈ کروڑ سے گزارا کریں گے سال چھ مہینے۔“
اس کے بعد میں اپنے سوئٹ کوارٹر میں گیا۔ بلاشبہ استاد
بھی ذاتی ملازم ہوتا ہے۔ واقعی ڈگری کو آج کل کون پوچھتا ہے۔
لی ایچ ڈی اور ایم بی اے نوکریوں کے لیے سفارشیں تلاش کرنے
بھرتے ہیں اور پروفیسر جوتاں چنگاٹے بھرتے ہیں۔ یہ لوگ پوچھتے
ہیں کہ آپ نے میری بیٹی کی اسپرٹریڈ کبھی؟ وہی ریڈ اسپرٹس نو
ڈوب۔ بھئی بہت خدہ ہے؟ باپ کے پیچھے بچہ کی کہ جب تک یہ
گاڑی نہیں لے گی تو بخیر نہ ہی نہیں جاؤ گی۔ اور واحد حکم کے
ساتھ واحد حاضر ہوتا ہے یا ہستی ہے۔ بھی کیا کریں۔ ہر چیز اتنی
مہنگی ہو گئی ہے کہ گزارا نہیں ہوتا۔ اب میرا بیٹا اسٹیشن میں
ہے۔ ایم ایس کر رہا ہے۔ اس کے اخراجات تو بہ۔“

میں بہت حیران تھا کہ یہ میں کس دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ جنم
خانہ کس دنیا میں تھا اور اس دنیا کے بچوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا
وہ کون سی دنیا تھی۔ یہ لوگ ایسے ڈنڈے دیے ہیں۔ ایسی گاڑیاں
کیوں خریدتے ہیں۔ ایسے کپڑے کیوں پہنتے ہیں اور پھر ایسی کواں
کیوں کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری دنیا کے بارے میں سوچتے تک
نہیں جہاں پیسے بھوک سے اور بوڑھے علاج میسر نہ آنے سے
مر جاتے ہیں۔ غم روزگار کے بارے ڈگری یا نہ بین عالم شباب میں
خود کشی کر لیتے ہیں یا لڑکیاں جو غریب اور بد صورت ہونے کے
باوجود اہل ان رکتی ہیں۔ وہ کسی ناچاز بچے کو کیسے بھینکتے یا کسی
غریب کے ساتھ فراد ہونے سے بچ جائیں تو بڑھی ہو کے کنواری
مر جاتی ہیں۔

ظاہر ہے ایسے خون میں فساد پیدا کرنے والے خیالات کی
پینا ہو تو سب قبول لگتا ہے۔ میٹرک یا پچھلے آف آرٹس اور
اسٹریٹ سائنس غالب کی غزل اور مسئلہ فضا غورث اور ڈارون کا

نظرہ ارتقا اور تاج غلف۔ کیا مقصد ہے اور کیا مصروف ہے میری
دنیا میں اس کا جہاں صرف سکر راج الوقت سب سے بڑی سند ہو۔
ایک ملین بستر ہے ایک سرٹیکٹ ہے۔ ایک ملین بستر ہے ایک
ڈگری ہے۔ آری کو دور جد کتنی چاہیے صرف صفر کے لیے جو وہ
ایک کے ہر کے بعد لگ سکے۔ لگا آ جائے۔ لگا آ جائے یہاں تک کہ
خود صفر ہو جائے۔ یہی ہے اصل کاسیائی مکتب میں جھوٹ ہوتی ہیں
اور سچ ہوتی ہیں تو کیا قیامت ہے اس سچ کی۔

اجا مک لائٹ چلی گئی۔ میں نے باہر سے آنے والی مٹی کی
سودھی سودھی خوشبو سے اندازہ کیا کہ بارش شروع ہو گئی ہے۔
پہلی اور گرج چمک کے ساتھ تیز ہوا میں بارش کا شور بھی شامل
ہو گیا تھا۔ جب پہلی چلتی تھی تو میرا اپنا سایہ مقابل کی دیوار پر ایک
پل کے لیے نمودار ہوتا تھا اور پھر اندھیرے میں تحلیل ہو جاتا تھا۔
پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ موسم کی خرابی کے آثار نمودار ہوتے
ہی مسماں رخصت ہونے لگے تھے۔ میرے پاس نہ موسم تھی حتیٰ اور
نہ لائٹیں۔ ابھی میں سبز لینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر
دھتک ہوئی۔

میرے شاکر دے بڑے جوشی اور مسرت سے مجھے اطلاع دی
”سر۔ ہم ذرا آؤں کریم کھانے جا رہے ہیں“ آپ گیٹ بند
کر لیں۔“

”اس موسم میں؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔
”اسی میں تو موزا آتا ہے سب۔“ لڑکی نے قہقہہ مار کے کہا۔ وہ
سر سے جینک پانی میں بھیگی ہوئی تھی۔
”پاپائے کہا ہے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو پارن دیں
گے۔ کتنی نہیں بنائیں گے۔ گیٹ کھول دے“ چوکیدار نہیں ہے
نا۔“

”چوکیدار کون نہیں ہے؟“
”اس کی بیوی مر گئی ہے۔ سارے وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔“
لڑکی نے کہا ”گاؤں نہیں ایڈیٹ پنڈ۔“
”تم ایڈیٹ۔ گاؤں اور پنڈ ایک ہی چیز ہے۔ تو نے لڑکے کے گڈے کے
کہا۔“

”نہیں ہوتے۔ ہمیں کیا معلوم؟“ لڑکی اڑھکی۔
”ڈیڑی سے پوچھ لو۔“ وہ لڑتے ہوئے چلے گئے۔

پہلے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی شاندار دعوت میں سب کچھ
کھانے کے بعد بھی کیا ان کے پیٹ میں اتنی جگہ ہے کہ آؤں کریم
کھانے کے لیے اس موسم میں اتنی دور جانا ضروری ہو۔ بہت عرصے
بعد میری سمجھ میں آیا کہ جب پیسہ خرچ کرنا ضروری ہو تو ہمارے
طاش کسے جڑتے ہیں۔ سوچنا پڑا ہے کہ اتنا پیسہ جمع ہوتا جا رہا ہے
اسے کیسے خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں۔

اب میں چوکیدار کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا۔ میں گیٹ بند
کر کے آیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر محبت کو گھورنے لگا۔ چوکیدار نے

مجھے بھی بتایا تھا کہ اس کی بیوی تیار ہے۔ ابھی اس کی مرضی نہ
تھی۔ چوکیدار کی شادی کو پانچ سال ہوئے تھے اور اس کے تین
بچے تھے۔ اس کی بیوی کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ ابھی چند
روز پہلے بھی میری اس سے گفتگو ہوئی تھی تو میں سخت حیران ہوا
تھا۔

میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”گردے۔۔۔ وہ کیسے
خراب ہو گئے۔“

اس نے مجھے سمجھایا ”غویار۔ اور اپنا ملک میں پانی نہیں
اے۔“

میں نے کہا ”تمہ کس ملک کے رہنے والے ہو؟“
”اپنا سوہیہ سرحد۔ پتھور کے آگے لڑکی کوئل اے۔ اور سے
چالیس میل اے۔ امارا پنڈ۔“

”وہاں پانی کیوں نہیں ہوتا اور پانی نہیں ہوتا تو لوگ نہاتے
کیسے ہیں۔ چائے کیسے پیتے ہیں؟ کیا کھانے میں نہیں ہے یا پانی
نہیں آتا۔“

وہ مسکراتے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہاں نہ گھروں میں حل
ہیں اور نہ کوئیں۔ وہ پانی ڈال دیتا تھا۔ وہاں کوئی دیوار اور نہ بھی
نہیں ہے۔ سال بھر میں جو بارش ہوتی ہے اس کا پانی کہیں جمع
ہو جاتا ہے یا لوگ تالاب بنانے کے جمع کر لیتے ہیں۔ عورتیں کھیتی
ملاؤں سے پانی لانے کے لیے میلوں دور بھی جاتی ہیں اور سڑوں پر
کھڑے رکھ کے واپس پانیوں پر چڑھتی ہیں۔ بعض جگہ کوئیں بھی
ہیں اور ٹوبہ واپس بھی کران کے گاؤں کی آبادی کا گزارا تین میل
دور کے ایک تالاب پر ہے۔ اس تالاب کے پانی سے اللہ کی سب
خلق کیسا مستفید ہوتی ہے۔ گھوڑے گدے بکریاں اور گائے
بھینسیں۔ چڑیاں کتے اور انسان۔ وہ پانی پیتے ہیں۔ اسی میں نہاتے
ہیں اور اللہ کو مشکور ہو تو زوب کے بھی مر جاتے ہیں۔

ساری بات سن کے میں نے کہا ”اس بات کا تمہاری بیوی کے
گردوں کی خرابی سے کیا تعلق؟“

اس نے کہا ”اسی تم کو نہیں معلوم مگر ام کو ڈاکٹر بتایا۔ امارا
بیوی اور سے پانی پیا وہ گندا تھا۔ اس میں مٹی تھا۔ اس سے گردہ
خراب ہوا۔ ام اپنا بیوی کو پتھور (پتھور) لیڈی ری ڈنگ اسپتال
لے گیا۔ اور ڈاکٹر اس کا خون مشین سے صاف کیا۔ وہ ام کو بولا کہ
تمہارا بی بی کا گردہ میں پتھر ہے۔ گردہ کاٹ کے پتھر لے لگا۔ ام بولا
یا ر امارا مغز میں نہیں آتا۔ یہ گردہ میں پتھر کدے رہ گیا۔ وہ ام کو
بتایا کہ پانی جو ام پیتا ہے وہ گردہ صاف کرتا ہے۔ خون بھی گردہ
صاف کرتا ہے۔ خون کی خرابی پیتھاب میں نکل جاتا۔ گردہ کو وہ
فلٹر بول۔ فلٹر میں مٹی بھر گیا۔ مٹی جمع ہو کے پتھر بن گیا۔ اپنی خون
کیسے صاف کرے گا۔ خون گندا ہو گا تو تمہارا بی بی مر جائے گا۔ وہ
مشین سے خون صاف کیا۔ ہزار روپے لیا۔ اپریشن کا واسطے میں
ہزار روپے تھا۔ ام کدے سے لائے گا۔“

”پھر کیا کرے گا؟“
”کچھ نہیں۔“ وہ لفظی سانس لے کر بولا ”میں میرے مشین
سے خون صاف کراؤں گا۔ ایک سال بعد ڈاکٹر بولا کہ اب مشین سے
کام نہیں چلے گا۔ تم اپریشن نہیں کرائے گا تو تمہارا بی بی مر جائے
گا۔ ام بولا کہ یا ر! میں ہزار میں یہ گردہ کا پریشن چھوڑ دے۔ مرنے دو
اس کو۔“

میں بھونچکا رہ گیا ”تم نے کہہ دیا کہ بیوی مرنے ہے تو
مر جائے؟“

”کا کدہ کا بات ہے تا ناؤں۔ میں ہزار میں اس کو مرمت کرائے
گا۔ خدا مالوم چلا اے کہ نہیں۔ پانچ ہزار میں دو سڑا شادی کر لے
گا۔“

”مگر چوکیدار! یہ تمہارے بچوں کی ماں ہے۔“
اس نے سہلایا ”دوسرا والا بی ہو گا۔ ایک دم خیالی بی ہو گا
کوئی خرچہ مرنے نہیں بتا رہا۔“

مجھے اس کی بے حسی پر اور مقدس رشتوں کے بارے میں
کا دہ باری اندازہ لگ کر پر دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی تھا مگر اس نے یہ
سب شمر کے ان مذہب اور تعلیم یافتہ کھلانے والے لوگوں سے
سیکا تھا۔ گاڑی کے انجن کے رنگ پوسٹن بیٹھ گئے ہیں۔ نہیں
زرا نیو اور وہاں مت کراؤ۔ عادت کماں سے اور پھر یہ بد معاش
اور بے ایمان کلینک لوستے ہیں۔ ہم گاڑی بدل لیں گے۔ نئی
گاڑی ہو گی تو یہ روز کا خرچ تو نہیں ہو گا۔ کچھ بھال اور مرمت کا۔
پریشانی الگ ختم۔ تاقص گردے والی بیوی کو مر جائے دو! میں ہزار
میں ایک گردہ مرمت کرائے گا کیا کا کدہ جب پانچ ہزار میں سالم تھی
عورت مل جاتی ہو۔ جب خراب پانی پیتے سے اس کے بھی گردے
خراب ہوں گے تو پانچ ہزار میں پھر ہی لے آئیں گے۔ ہو سکتا ہے
اس سے بھی کم میں مل جائے۔ جیسے اپنی کار ویسے اپنی بیوی پرانی
خراب ہو تو تلی لے آؤ۔

چوکیدار کی بات سن کے پہلے میرا خیال اس کو مشورہ دینے کا
تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے میں ہزار مانگے یا اپنی بیوی کو یہاں لے
آئے تو اس کے علاج اور آپریشن پر خرچہ نہیں ہو گا۔ آخر ڈاکٹر
صاحب جو ہیں یہاں۔ میں تو اس حد تک چڑھائی ہو گیا تھا کہ اسے
اپنے پاس سے میں ہزار دینے کا سوچ رہا تھا مگر جو میں سوچ رہا تھا وہ
دو ہزار مانگے پانے والا ایک عورت کا شوہر! اس کا سراج! اس کا
گلاز! خدا نہیں سوچ رہا تھا جس کے لیے عورت یہاں کی جاتی کے
برابر تھی۔ پرانی ہو گئی، پھٹ گئی، کھو گئی، دوسری لے آؤ ہزار سے۔
بے شک سب ایسے نہیں سوچتے ”لوگ رشتوں کو ٹوٹنے سے بچانے
کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ماں باپ بھائی بہن بیوی
بچے سب کی زندگی! انہیں اپنی زندگی سے زیادہ اہم محسوس ہوتی
ہے۔ کوئی رشتہ ختم ہوتا ہے تو لگتا ہے سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ خود
بھی مر جانا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ مر جائیں گے۔ کچھ مر بھی

جاتے ہیں۔ باقی ذمہ رہتے ہیں۔ خون جگر ان کی آنکھوں سے آنسو بن کے ٹپک رہتا ہے اور یاد کا سورج بیٹھ رہتا ہے مگر یہ چوکیدار دوسری قسم کا آدمی تھا۔ جیسے وہ نمبر آکس سے کار کا انجن پیز کر جاتا ہے ایسے ہی ہاتھ پائی سے اس کی بیوی پیز کر گئی تھی۔ کڈم ہو گئی تھی اور ہاتھ غرضاً۔ سب اللہ کی مرضی۔ اب وہ اس کو پپر خاک کرے گا۔ اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا کے دعا بھی مانگے گا۔ سو گم رہنے چاہوں گا تھ اور دی ایڈ۔ مرے والی کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ذمہ وہ جانے والوں کو اپنے لیے بہت کچھ کرتا ہے۔

چوکیدار نے اپنی بیوی کو ایسے نہیں مارا تھا جیسے ناصر کو اس کے چچا نے قتل کیا تھا مگر جیسے یہ بھی قتل لگتا تھا۔ اگر وہ چاہتا اور کوشش کرتا تو اسے بھی مچا سکتا تھا مگر اس نے خود کو پریشانی سے اور غریب سے بچایا۔ اس کے پردہ ہزار صاف بیچ جائیں گے اور براہِ نیت بیوی مل جائے گی۔ ناصر کے چچا کو اس کا گھر اور مال سب مل گیا تھا۔ وہ رشتوں کی محنت کے چکر میں پڑا تو ساری عمر بھائی کی خدمت کرتا اسے ذمہ رکھنے کے لیے پڑی محنت کرتا اور بہت خرچ کرتا۔ اس کے بچے اور اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت بہت لمبی ذمے داری تھی۔ اس نے بھی اپنی پریشانی اور اپنا خرچ بچایا تھا۔ اس نے دونوں کو بار بار تھا اور بہت فائدہ سے مل رہا تھا۔

کیا ایک آدمی کی زندگی اور موت دوسرے کے لیے نفع نقصان کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ رشتوں کی قیمت کیا حساب کے کسی فارمولے کے مطابق ضروری جاسکتی ہے۔ بوڑھے بظلم یا ناکام باپ سے تعلق میں بہت گھٹا ہے بھائی۔ مفت کی کھانا دوا علاج پر خرچ کرو۔ وقت بڑا کرو اور ہر وقت کی بک بک سنو۔ کیا فائدہ اٹھائیں؟ ہر روزی اور خدمت گزار کی؟ ہاں اس بیٹے کی پرورش میں فائدہ مند سرمایہ کاری ہے جو اسمگلر بننے والا ہے۔ ابھی عمری کیا ہے جی اس کی۔ دس میں بڑا کامال پر کھپ میں لے آتا ہے بھی ایک کایک سے بھی سنگاپور سے۔ آج کبھی ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد لالچ ہوگی اس کی اپنی اور ہر بھٹے لاکھوں کا مال آئے گا۔ ماشاء اللہ بڑا ہوشیار ہے۔ سب سے تعلقات ہیں۔ اپنی لائن کو پیر رکھتا ہے۔ دیکھ لیتا پیش کرانے گا نہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس قسم کے خیالات میری عمر کے کسی اور بچے کے ذہن میں کھلی جاتے ہیں یا نہیں مگر یہ میری زندگی کے سچ تجربات ہے رحم حادثات اور پُر آزار تجربات کا ردِ عمل تھا کہ میں پہلے چوکیدار کی بیوی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا ناکام مال کی طرح موت کے کیا ڈی کو دے دیا گیا تھا۔ اور ناصر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی قبر کے بارے میں۔ اب تک مجھے کیا بچا ہوگا؟ کیا پتا لگتا ہے کہ کتنے چور لے گئے ہوں۔ شاید تو کسی سالم اور آدمی شکستہ بڑوں کا کھوڑا ڈھانچا پڑا ہو گیا ہوگا یا اسے بھی گورکن نے نکال پھینکا ہوگا۔ وہاں دوسرا مرد قابض ہوگا۔ زمین انسانوں پر جھگ

کے ساتھ رشتے کا ماں کی مجبوری یا لاعلمی سے کیا تعلق؟
"میں نے کئی بار خواب میں دیکھا ہے اسے اپنی ماں کو۔"
"پھر تو تم اسے صورت دیکھ کے پہچان لوگے" وہ بولی۔
"میں شش و پنج میں پڑ گیا" پتا نہیں۔

"ناصر میرے قریب آگے میری صورت کو غور سے دیکھو میں ناصر عظیم کی ماں ہوں۔ تم کو مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آگے آؤ ناصر عظیم۔"

میں آگے بڑھا۔ ایک قدم۔ پھر دو قدم۔ اور مجھے ہوں لگا جیسے میرے ہر قدم کے ساتھ تاریکی میں اس کا ہیرو بھی اتاری پیچھے چلا گیا ہے۔ میں نے اس وقت ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی بہت کوشش کی کہ میں جو خواب بار بار دیکھتا تھا۔ جس میں میرا باپ مجھے اور میری ماں کو ساتھ لے کر ایک گاڑی کی بندھی سے خیب کی جانب چلا گیا تھا۔ اس خواب میں نظر آنے والی عورت کی صورت کیسی تھی۔ اس کے چہرے کے خدو خال کیا تھے۔ نفوس کیسے تھے۔ کیا اس کے بال اور اس کے کپڑے اور اس کی آواز۔ سب اسی عورت جیسے تھے مگر مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خفا تھا۔

کسی بے وزن وجود کی طرح فضا میں معلق اور تیرتی ہوئی وہ عورت پیچھے ہٹتی گئی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ اس کے بازو ہوا میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ مجھے ہار رہی تھی۔ آؤ تاکہ۔ میرے پاس آؤ گے تو تم مجھے پہچان لو گے۔ میں اور آگے بڑھتا تھا۔ وہ اتاری دوڑ رہی بنائی گئی۔ بارش اب سولہا چار برس دی تھی مگر بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج ختم ہو گئی تھی۔ ہوا کا طوفانی زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میں نیند میں پھلنے والے کی طرح اس عورت کا قاقب کر رہا تھا۔ اگر وہ میری ماں تھی تو مجھے اس کو صرف دیکھنا ہی نہیں تھا۔ اس سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا۔ میں نے کئی بار اس کو آواز دی "رک جاؤ۔ تم نصیحتی کیوں نہیں ہو آخر۔" اور اس نے کہا۔

"میں تمہارے سامنے تو ہوں" آؤ۔ آگے آؤ۔"
میں اس کے قاقب میں چلا رہا۔ اچانک میں نے اپنے آپ کو ناصر عظیم کے تارک گھر کے آگن میں دیکھا۔ اپنی مکان کے مقابلے میں بیٹھ کا پتہ فرش بالکل نیا تھا۔ "یہ ناصر عظیم کے باپ کا گھر ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کس ناصر عظیم کی ماں تھی "اس کے چچا نے یہ گھر بیچ دیا تھا۔ مگر اس نے تو ہمیں قتل کر دیا تھا۔"
"ہاں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بڑی غلطی کی میں نے قتل ہو گئے۔"

"تم کیا اپنی مرضی سے قتل ہوئی تھیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔
"میں سمجھ لو۔ مجھے قتل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا لا آخر مجھے

قتل ہو گئے؟ میں اپنے بیٹے ناصر عظیم کو بھی نہ بچا سکی۔ وہ صحن کی پھولی دوار کے ساتھ ٹیک لگے کھڑی دوری تھی۔
"لیکن۔۔۔ یہ تمہارے اختیار کی بات کہاں تھی؟"

"جی" اس نے اصرار کیا "چار سینے دس دن میں نے عدت کے یہاں گزارے تھے اور اس عرصے میں دسم کی نیت مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے بھائی کی موت پر سوگ کا پورا ڈراما کیا۔ اس نے سوگ تک کھانا پینا چھوڑ دیا۔ رکھا۔ سوگ پر ملاؤ زور دے کر دیک بکوالی اور خیم خانہ جنت الاطفال سے لڑکے بلائے ختم قرآن کے لیے وہ سب کے سامنے بار بار اعلان بھی کرتا رہا کہ اس نے تمیں فتح کرائے ہیں اپنے مرحوم بھائی کے ایصالِ ثواب کے لیے۔ میرا جیسی۔ وہ تو خود اپنے لیے اور اپنی بیوی کے لیے بھی کتا تھا کہ ہم نے دو دن میں پانچ پانچ بار قرآن ختم کیا ہے۔ اس نصیحت پر اللہ کی بار۔ نہ اس کی بیوی نے پارے کو ہاتھ لگایا نہ خود اس نے۔"

"تم نے یہ بات اس کے منہ پر کئی تھی؟"
"نہیں۔ اتنی بہت نہیں تھی مجھ میں۔ وہ مجھے من طعن کرتا اور خول چھپا جاتا۔ جملے سے پہلے ایک دن میں نے مل کے کہہ دیا تھا کہ خود کیوں تکلیف کرتے ہو؟ نیپ دیکھا زور پر کیسٹ لگا دو۔ ایک گھر میں" ایک اپنے بھائی کی قبر پر۔ تلاوت ہوتی رہے کی ہر وقت "تم تیار کرتے رہنا۔ وہ دوڑتی اگلے دن بیچ جاتلاوت کے کیسٹ لے آیا۔ اس نے تین کیسٹ پلیئر بھی بیچ کر لیے۔ پلا کیسٹ ختم ہوتے ہی دوسرے میں لگا دیتا تھا۔ پھر تیسرے میں۔ شام کو حساب کر کے پتا تھا کہ فلاں قاری کی آواز میں اتنے ختم ہوئے فلاں قاری صاحب کے اتنے۔ جملہ پڑاؤ زور دے کر ایک ایک دیکھ کھانے والوں کو اس نے خبر دے پایا کہ الحمد۔ بھائی صاحب کی روح کی مغفرت کے لیے دو سو کلام پاک ختم ہوئے۔ میرے اعتراض پر وہ جھٹک رہا تھا۔ بھائی "فلاں عالم کا یہ تو تھی ہے" فلاں یہ کتا ہے۔ اذان بھی تو لاؤ! آجیکر سے نشر ہوئی ہے۔ پہلے یہ مولوی کہاں مانتے تھے۔ اب قرات کے دیکھا ڈاؤ آخر کس لیے لٹے ہیں" خلیفہ جی جی دی رہ کھاتے ہیں۔ نکاح نیلی فون پر ہو جاتا ہے۔ میں خاموش ہو جاتی تھی۔ عدت کا زمانہ ختم ہونے سے قبل ہی اس نے ہاتھ باتوں میں واضح کر دیا کہ وہ مجھ پر چادر ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"چادر کیسے ڈالنے ہیں۔ کہاں ڈالنے ہیں؟ سر پر؟"
"بھائی کی بیوہ سے دوسرا بھائی شادی کر لیتا ہے۔ تاکہ گھر کی عزت گھر میں رہے لیکن اصل مقصد ہوتا ہے بیوہ کو جائداد کا مالک بننے سے روکنا۔ مکان، دکان، وہ پہلے ہی اپنے نام کرا چکا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ عدت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد میں اسے گھر سے نہ نکال دوں۔ اس کے خلاف کیس نہ کروں۔ جب اس کی بیوی کو پتا چلا کہ وہ مجھ سے نکاح کرنے کا سوچ رہا ہے تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ دسم نے اسے بہت سمجھایا کہ اس میں کیا فائدہ ہے مگر وہ نہ

مائی۔ اس نے صاف کہا کہ مکان تو اب ہمارا ہے۔ وہ جانے اپنے بیٹے کو لے کر جہاں چاہے اور کیس کو دے ہم پر اگر کر سکتی ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے شادی کرلو تو میں اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہوں۔ دراصل وہ بہت بد صورت اور بد زبان تھی۔ وہ مجھ سے کہتا تھا کہ تم تو ہی ہو اس چڑیل کے مقابلے میں۔ جب میری طرف سے بھی اس کو صاف جواب مل گیا کہ اس نے زبردستی کی تو میں اسے گل کدوں کی دوند خور اپنی جان لے لوں گی تو اب اس ہو کے اس نے اپنی بیوی کے مشورے پر مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر وہ آدمی کیسے اور لالچی تھا۔ نہ اس کے لالچ کی کوئی انتہا تھی اور نہ کینکری کی۔ میں بھی اسے سمجھتی تھی۔ مدت کا زمانہ گزار کے میں نے اس کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کیا۔ میرے پاس اچھا خاصا زور تھا۔ اسے میں اپنے ہی گھر میں محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی دن وہ سیم وڈر مجھ سے چھین لے گا۔ میں نے سوچا کہ سب زور رکھی جانے والے کے پاس رکھوا دوں مگر جاننے والوں کی نیت کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ لالچ سب کو اندھا کر دیتا ہے۔ آنکھوں کی دنیا مر جاتی ہے اور دل میں موت نہیں رہتی۔ کوئی کہہ دیتا کہ رات کو ڈاکا چڑھ گیا۔ ڈاکو سب لے گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تیسارے زور کی وجہ سے ہماری جان نہیں گئی۔ تو میں کسی کا کیا بگاڑ لیتی۔ زور کو تیار رکھنے والے کا زور بے طاقت ہے۔ زور ایسی چیز بھی نہیں جس کے جانے سے میں مر جاتی یا میری عزت آبد چلی جاتی۔ پھر بھی زور میں اور نقد رقم میں زیادہ فرق نہیں۔ زور اٹاڑی ہوتا ہے عورت کے لیے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی وہ سیم نے ایک رات خود ہی کیا۔ وہ بالاک آدمی تھا۔ اس نے کسی سے پولیس کی وردی مانگ کے پستی۔ منہ پر زامنا باندھا اور مجھے سوتے سے جگا کے میرا سارا زور لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں ہسٹل بھی تھا۔ معلوم نہیں اصلی تھا یا نقلی۔ میرے قلعے سے آواز نہیں نکلی۔ میرے بعد اس نے اپنی بیوی کا زور بھی چھینا مگر اس سے مجھے شک ہو گیا۔ میرا تو خوف سے یہ حال تھا کہ میں قہر قہر کانپ رہی تھی۔ اس نے دھمکی دی کہ جو کچھ تیرے پاس ہے سب خود نکال کر سامنے رکھ دے۔ بعد میں مجھے حلاش کرنے سے ملا تو تیرے بچے کو گولی بار دوں گا۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اس کو سونے دو ورنہ یہ دہشت سے مر جائے گا۔ اس کے معصوم دل میں خوف بیٹھ جائے گا۔ میں خود ہی قسمیں سب دیتی ہوں "اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے ایک چھٹانک نہیں بچایا۔ جب وہ اپنی بیوی سے زور مانگ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اپنے سامنے ڈاکو اور اس کے ہاتھ میں دیو اور دیکھ کے بڑے بڑے مردوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ مگر وہ بے وقوف عورت خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری تک نہیں کر سکتی۔ اس نے بڑے چاٹ لیے میں کہا کہ اچھا ہی سب لے لو بس میری جان مت

دہولا کہ کچی بات یہ ہے جناب عالی کہ میں نے کپڑوں پر غوری نہیں کیا تھا۔ میرے تو اپنے کپڑے ناپاک ہو گئے تھے ڈر سے۔ تھانے دار نے اس سے کہا کہ "بھئی اس بھالی کو لے جا اور اسے سمجھا کہ بلا وجہ پولیس کو کچھ میں نہ ڈالے ورنہ ہم جانتے ہیں ایسی عورتوں کے سارے چکر۔ اب گھر والا تو ہے نہیں۔ کوئی یار آیا ہوگا رات گزارنے کے لیے۔ یہ اس کے ساتھ کھل جائے گی کسی دن۔ زور پہلے ہی اس کے حوالے کر دیا ہے۔" تھانے دار کی بات پر میں پیش میں آگئی اور میں نے انعام کی پروا کے بغیر اسے گالیاں دیں کہ ایسے یار اسے لگاتی ہوں گی تیری بھینس۔ وہ سیم مجھے زبردستی وہاں سے لے گیا۔ تھانے دار... سے بھی اس نے بہت معافی مانگی کہ یہ وہ ہے۔ پاگل ہے۔ بے وقوف ہے۔ اسے صاف کہیں۔ اور تھانے دار نے کہا کہ یہ کچھ ہے کی ترس کھا رہا ہوں ورنہ آج رات رہتی میرے پاس تو جتن تک اس یار کا نام پاسبان تارہتی۔

میں نے کہا "اس کی بیوی کچھ نہیں بولی۔"

"نہیں۔ وہ بی بی خاموش اور مطمئن بیٹھی رہی۔ جب واپس آنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ تو وہاں کیوں کو گئی بن گئی تھی تو اس نے کہا "جب میرا میاں بول رہا تھا تو میں کیوں زبان چلائی۔ اور تو نے تو زبان چلائی اس سے کیا ہوا؟" اسے ساتھ میری عزت بھی خسرے میں ڈالی تو نے۔ رات تھانے میں گزرتی تا تو صبح اپنے ہیروں سے چل کے آنا مشکل ہو نہ۔ اتنی کالک ہوئی منہ پر کہ ساری عمر نہ چھٹی۔ مگر میں اس کی بات میں سے خاموش نہیں ہوئی۔ میں نے صاف کہا کہ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے۔ سب کچھ گئی ہوں میں کہ پولیس کی وردی میں ڈاکو کون تھا۔ میں اوپر بڑے افسروں کے پاس جاؤں گی۔ میری باتوں نے میاں بیوی کو پریشان کر دیا۔ بس یہی غلطی کی تھی میں نے مجھے جو بھی کرنا تھا خاموشی سے کرتی۔ بہت ہوشیار بنائی میری بے وقوفی تھی۔ ہوشیار میرا دیو و سیم تھا۔ اس نے بہت پہلے سے میرے خلاف ہاتھیں شروع کر دی تھیں۔ اس کی بیوی نے پاس پر دس میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ میرے تو شوہر کی زندگی میں بھی کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ ورنہ وہ مجھے چھوڑ کے برائی عورت کے چکر میں کیوں پڑا۔ اور جتنا عرصہ وہ جیل میں رہا مجھے آزادی حاصل رہی۔ میں اس سے جیل میں ملنے کے بہانے گھر سے نکلتی تھی مگر کہاں جاتی تھی یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ سیم نے تو کئی بار بھائی سے پوچھا کہ بھائی آئی تھی تو اس نے کہا کہ ہاں مینہ پھیلے آئی تھی۔ پانچ منٹ کے لیے گھر سے میں مینے میں دوبار جاتی تھی۔ میرا شوہر تو تھا نہیں کہ ان کی بات کو بھولتا۔ انہیں بتا کہ میں کتنی باقاعدگی سے جیل جاتی تھی اور اس سے ملاقات کی آسانی کے لیے کتنا پیسہ رشوت میں خرچ کرتی تھی۔ پانچ دس منٹ زیادہ وقت لینے کے لیے میرے سو پیاس روپے اٹھ جاتے تھے۔ اور مجھے سنتری کی منت ساجت بھی کرنی پڑتی تھی۔ ہاتھ بھی جوڑنے پڑتے تھے ان کے سامنے۔ ایک

انوار طلنگی کے قلم سے ایک دہشت انگ ناول

ہزار داستان

کنزول حضرات اکیلے میں اس ناول کو برگزینہ پڑھیں

- سائپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُرباکی داستان حیرت۔
- سائپوں کا شہزادہ رشتہ ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
- عمر کا چند ہوا اس سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سید بابا کا خادم ایک بار ہفت لہبا سانپ تھا جس نے رشتہ کا طلسم توڑ دیا۔
- سید بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔

قیمت 250 روپے محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت خوبصورت گروپیشن اور عمدہ طباعت کے ساتھ

آپ کو یہ کتاب ڈاک سے بھیجیں یا براہ راست مندرجہ ذیل پتے پر بھیجیں

ڈاکٹر ہالکس میاں پبلکیشنز

۳۰ عزیز جاگت اردو بازار لاہور 7247414

ہالکس پبلکیشنز انٹرنیٹ سب سے زیادہ

بد معاش سنتری نے تو مجھے آنکھ مار کے کہا بھی تھا کہ تو چاہے تو رات کو آجا۔ وارڈن صاحب کے کمرے میں شوہر سے بھی مل لیتا اور صبح جلی جاتا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں اور کوئی تو نہیں ہو گا تو وہ ہنسنے لگا کہ وارڈن صاحب کا کمرہ ہے وارڈن صاحب تو ہوں گے۔ ہم بھی ہوں تو کیا فرق پڑے گا؟ اگر میں اسے کچھ کہتی تو وہ میرے شوہر پر ظلم کرتے۔ میں خون کا گھونٹ پی کے چلی آئی تھی۔ میرا شوہر مر رہا تھا اور اب جو کچھ اس کا چہرہ بھائی کتا پھر رہا تھا یا اس کی بیوی مشہور کر رہی تھی اس کی تردید کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے خوب بدنام کیا۔ بعد میں میرے شوہر کو چھائی ہو جانے کے بعد انہوں نے یہ بات پھیلانی کہ اب تو دمک ٹوک نہیں رہی۔ بی بی بھائی ہے، ہم سانسے بول بھی نہیں سکتے۔ بس دیکھتے رہتے ہیں آئے جانے والوں کو۔ سب دی پرانے یار ہوں گے وہ خود رات کو غائب ہو جاتی ہے۔ تو یہ تو یہ "عدت کا زمانہ" پر انہیں ہوا عورت کا گھر سے قدم باہر نکالنا گناہ اور یہ عورت ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے راتیں باہر گزارتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے دار کو بھی مجھ سے ایسی بات کرنے کی ہمت ہوئی۔ میرے منہ پر کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا مگر میں طوائف کی طرح بدنام تھی۔

"بگنی کی واردات کے بعد دو سیم نے محسوس کیا کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر میں جی جی اور والے انصروں کے پاس پہنچ جاتی تو شاید وہ بھی پکڑیں آجائے۔ شاید میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے پاس شرافت اور نیک چلنی کی سند نہیں تھی۔ میرے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہ ہوا اور دو سیم خود کو بچانے کے لیے دس گواہ لے آئے جو اس کے بیان کی تائید کرتے۔ پھر بھی اسے ڈر ضرور تھا۔ اس نے بی بی چالا کی سے کام لیا اور مجھے سمجھایا کہ پولیس سے دشمنی مول لینے میں کیا نقصان ہے۔ اس نے کہا کہ بھانوج مجھ پر شک کرتا بڑی زیادتی ہے۔ سارا غصہ گواہ ہے کہ ڈاکو خود مجھے بھی بند کر گئے تھے۔ مگر تو غرمت کر۔ دکان اچھی چل رہی ہے۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے تجھے سارا زیور بنوا دوں گا۔ میں خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے اور اس کی بیوی نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ اب مجھے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پہلے میں ہمت غصہ ہوئی مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ دو سیم نے کہا کہ شرع میں اس کی اجازت ہے اور ابھی تو ساری عمر بڑی ہے۔ جوانی کس کے آسرے پر تھا گزرے گی۔ ایک شریف آدمی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی حادثے میں مر گئی تھی۔ ناصر کو بھی باپ کی ضرورت ہے۔ باپ نہ ہو تو بیٹے بگڑ جاتے ہیں۔ شادی کے بعد میں یہ گھر تمہارے نام کر دوں گا۔ تم آرام سے اپنے شوہر کے ساتھ رہنا۔ اکیلی عورت کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔ ناصر جو ان ہوتا تو اور بات تھی۔ میرے انکار اور برا بھلا کہنے کا وہ برا نہیں مانتے تھے۔ بالآخر اس کی بیوی نے کہا کہ تم کچھ تولو۔ ایک بار اس سے مل لو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شریف آدمی تمہارا

شوہر بننے کے لائق ہے یا نہیں۔ یہ میری دوسری بے وقوفی تھی کہ میں رضامند ہو گئی۔ انہوں نے ایک دن کسی کو گھر بلایا۔ وہ بڑی شاندار گاڑی میں آیا۔ اس نے ہتلون، قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ اور مذہب تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وجہ تھا اور خود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ پروفیسر ہے اور اپنی بیوی کی باتیں کرتا رہا جو حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں کار نہیں تھی میرے پاس۔ یہ کار میں نے ابھی سال بھر پہلے کی ہے۔ ہم موٹر سائیکل پر پھرتے تھے۔ ایک رنگ نے موٹر سائیکل کو گھر مادی اور فرار ہو گیا۔ میری بیوی مر گئی اور میں بد نصیب بن گیا۔ وہ ایسے غم ناک لمحے میں بول رہا تھا کہ میرے دل پر اچھا اثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی شریف آدمی ہے۔ پروفیسر بد معاش کب ہوتے ہیں۔ وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھے پسند آ گیا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ایک بات بھی ایسی نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے کیوں ملنے آیا ہے۔ اس نے دوسری ملاقات میں بتایا کہ وہ مجھ پر مرنا ہے۔ جی بتاؤں تمہیں میں واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اسی لیے میری آواز کی کچھ زیادہ مشہور ہوئے اور مجھ سے جملے والی بد صورت عورتوں نے شک مریج لگے کہ دوسری بد صورت عورتوں کو سنا ہے۔ اب اور کیا بتاؤں تمہیں میری عقل پر تو ہتھ دگے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہونے والا ہے۔ میں شادی پر راضی ہو گئی۔ نکاح سادگی سے اس کے ایک دوست کے گھر میں ہوا جہاں سے وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس رات مجھے پچھلا کا دنیا میں کیسا کیسا کھیل دکھانے والے مداری ہیں۔ وہ پروفیسر نہیں ایک بڑے فروش تھا۔

میں نے کہا "بڑے فروش کیا ہوتا ہے؟"

"جو عورتوں کو بیچتے ہیں" وہ بولی "عورت کے جسم کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اس کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں ایک ملازمہ تھی جس کو اس نے اپنی ماں بتایا۔ ایک جوان عورت بھی تھی۔ خوب میک اپ کئے ہوئے۔ اس نے کہا کہ یہ میری بہن ہے۔ رات کو اس نے مجھے چائے میں کچھ ملا کے دے دیا۔ اس سے مجھ پر نقش سا طاری ہو گیا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکوں۔ پھر میرا شوہر چلا گیا اور میرا زیور آ گیا۔ اس نے کہا کہ بھانوج میں نے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کر لے۔ بڑا خرا تھا تو اب۔ اب بول کس کا نقصان کیا تو نے۔ پہلا شوہر تو مر گیا۔ آج رات میں تمہارا شوہر ہوں اور جب تک میرا جی چاہے گا میں ہی شوہر ہوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کچھ دن بعد وہ غائب ہو گیا اور وہ جلی پروفیسر آ گیا۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ اس کا یہی کام ہے۔ خدا نے اسے ایسی شخصیت عطا کی ہے اور اس کی زبان میں وہ جلد بھی تاثیر رکھی ہے کہ عورتیں خود بخود کھینچی چلی آتی ہیں۔ آدمی اسی چپے میں کامیاب ہوتا ہے جس کی خداداد

صلاحیت رکھتا ہو چپے میںاں داد صرف بیسٹین بن کے کامیاب ہوا۔ وہ ڈاکٹرا افسر نہیں بن سکتا تھا۔ مددی حسن فزول گاکے بارشاز فزول ہوا۔ وہ صورت میں بن سکتا تھا۔ اس نے مجھے دو سیم سے بچاؤ بزار میں خرید لیا تھا۔ اسے ایک کے چارہ ضرور ملیں گے۔ وہ مجھے مل ایسٹ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ مجھے بے ہوش کر کے لے جا سکتا ہے۔ پتارے کے ایسا انجکشن دے سکتا ہے جس سے میں سوئی رہوں۔ اور مل ایسٹ پیچ جانے کے بعد میں جو چاہوں کروں۔ جسم کی دیو اداں سے صرف میری مدد باہر جاسکتی ہے۔ جسم میں جاسکتا۔ وہاں ایسی بڑا دھول ٹوکیاں ہیں اور ابھی تک تو ان میں سے کسی کی تو عرش تک پہنچی نہیں۔ کسی کی بد دعا سے کوئی محل زمین ہوس نہیں ہوا اور کسی کی فریاد پر کوئی محمد بن قاسم مدد کے لیے نہیں پہنچا۔ وہ غیبت ایسی ہی خرافات بکرا رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس کی باتیں سن کے ڈر گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مردوں کی اس دنیا میں ایک تمام عورت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ ایک کام ضرور کر سکتی ہے وہ مرکتی ہے اور موقع ہے تو مرنے سے پہلے ایک شیطان کو مار بھی سکتی ہے۔ میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے ملک سے باہر جانے سے پہلے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ میں نے اپنے نام نداد شوہر کی مکمل خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کیا اور اس کا احاطہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے کئی بار مجھے آڑا دیا۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ کے باہر نکل گیا اور پھر ہمارا کچھ فرار ہونے کی کوشش کروں تو وہ مجھے وہیں پکڑ لے۔ اس نے متعلق شدہ خون کی لائن بھی جوڑ دی اور دیکھا تھا۔ کبھی جھوٹ موٹ سوکے اور کبھی چھپ کے۔ مگر میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ مجھ میں کچھ دلچسپی لینے لگا ہے تو میں نے اسے پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا اور ایک دن اس سے دو سیم کی شکایت کر دی کہ کس طرح اس نے ڈاکو بن کے مجھ سے میرا تمام زیور چھین لیا تھا اور پھر پولیس والوں نے بھی اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ میری رپورٹ تک نہیں لکھی تھی۔ تمہارے تعلقات ہیں تو مجھے میرا زیور واپس دلوادو۔ وہ ضرور اس کی بیوی کے پاس محفوظ ہو گا یا اس نے سنے ذرا سن میں بولا ہو گا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اور بولا "کتنی ماییت کا تھا تمہارا زیور؟" میں نے کہا کہ ستر ہزار سے کم نہیں تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ "ستر ہزار کا زیور تھا تمہارے پاس؟" میں نے اسے سب بتا دیا کہ وہ گھر بھی میرا تھا جس پر دو سیم نے قبضہ کر لیا ہے اور مجھے نہ مکان چاہیے نہ زیور۔ بس مجھے اپنے بیٹے سے ملوادو۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔ ستر ہزار کے زیور کا سن کے اس کے آنکھوں میں ہوس کی تلخی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس چمک کو پچھاتی تھی۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ دو سیم کو بلا کے سودا کرے گا کہ زیور میرا مکان تمہارا۔ ورنہ تیار ہو جاؤ تمہارے میں خاطر

واردات کے لیے۔ وہ سب اگھو لیں گے۔ اس نے خون کر کے دو سیم کو بلوایا۔ فون دکان پر تھا۔ اس نے کہا کہ وہ رات کو دکان بند کرنے کے بعد آئے گا۔ وہ پھر کو کھانے کے بعد دو سیم کو تھیں نے کھنے کے لیے رخصتی ہوئی چھری نکالی۔ یہ انہیں نہیں اسٹیل کی نئی چھری تھی اور مجھے کچن میں ملی تھی۔ اس کی دھار پہلے ہی بہت تیز تھی۔ میں نے اسے کچن کے سلیب پر گھس کے زیادہ خون اٹھام بنالیا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے وہ چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ بالکل صحیح جگہ دیکھ کر اس کا زرخہ تک کٹ گیا۔ خون فوراً کے کی طرح میرے چہرے اور کپڑوں پر ابل کے گرا۔ وہ بری طرح تر ہوا اور زخ ہونے والے بکرے کی طرح میاں لگا۔ اس کے دھگے سے میں بچنے چاہتی اور پھر آرام سے اس کے خون کو ہستہیں جذب ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر میں تپ کے ٹھنڈا ہو گیا اور اس کی مکمل آنکھیں بہت پر سرخ ہو گئیں۔ اس سے پہلے ایک بار میں نے تجوری میں مرنے کی فون کی تھی تو فون کی بو سے مجھے جلی اور ابکیاں آتی رہی تھیں مگر اس وقت خون میرے چہرے اور گردن اور ہاتھوں پر اور کپڑوں پر جما ہوا تھا مگر اس کی بو مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے کہا "اس گھر میں دو عورتیں اور تھیں۔ ایک خادمہ تھی اس نے ماں بتایا تھا۔"

"ہاں۔ مگر وہ تو بے جھوٹ تھا۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ گھر میں وہ اکیلا نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ماں بھی ہے اور بہن بھی۔ ماں تو تو کرانی تھی جو صبح آتی تھی اور دوپہر تک سارا کام ختم کر کے چلی جاتی تھی۔ بہن کوئی ایسی ہی عورت تھی جو چاہتی تھی کہ اسے دوئی بیچ دیا جائے۔ یہاں کے دھندے میں اسے آدمی کم محسوس ہوتی تھی۔ وہ دوسرے دن ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ جب میں نے اسے قتل کیا۔"

"اس کا کوئی نام بھی تو ہو گا؟" میں نے کہا۔

"مقام تو تھا۔ وہ خود کو ظاہر کرتا تھا میرا خیال ہے کہ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ اس نام سے وہ مکان کرائے پر لے کر رہتا تھا۔ ظاہر کو قتل کرنے کے بعد میں نے سکون سے غسل کیا اور اپنے کپڑے بدلے۔ رات کو جب دو سیم کے آنے کا وقت ہوا تو میں نے ظاہر کا سراں کے تن سے الگ کیا اور اسے کھانے کے کمرے میں رکھ دیا۔ ایک خوب صورت ڈش میں سجایا کہ اس پر بھی کوہ زوال دیا اور ڈش کھانے کی میز پر رکھ دی۔ جب دو سیم آیا تو ظاہر کو پناہ کے حیران ہوا۔ میں نے کہا کہ اسے اچانک جانا پڑا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ظاہر کو اچانک کہاں جانا پڑا۔ میں نے اسے باتوں میں لگایا اور کہا کہ پہلے کھانا کھاؤ۔ رات ساری پڑی ہے۔ وہ بولا کہ وہ گھرنے گیا تو یہی پریشان ہو گئی۔ میں نے کہا "یہ یوں کا مقدور ہے شوہر کے لیے اور شوہر کی وجہ سے پریشان ہونا۔" وہ کھانے کی میز پر بیٹھا گیا تو میں نے کہا کہ پہلے یہ اسٹیل ڈش دیکھ لو جو

میں نے بتائی ہے۔ راجہ اور میرے ہاتھ میں تو نہیں تھا مگر اس کمری پر ضرور رکھا ہوا تھا جس پر میں دوسم کے بالکل سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ طاہر کا رواج تھا جو اس کی موت کے بعد میں نے دراز میں سے نکال لیا تھا۔ میں نے پہلے بھی کوئی نہیں چلائی تھی مگر راجہ اور ضرور دیکھا تھا۔ میرے پہلے شوہر کے پاس راجہ اور تھا۔ اسی راجہ اور سے اس نے اپنی محبوبہ کے شوہر کا خون کیا تھا۔ تین فٹ کے فاصلے سے مجھے نشانہ چمک جانے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں نے ملے کر لیا تھا کہ چھ گولیاں اس پر چلا دوں گی۔ بس مجھے راجہ اور کی نال کا سرخ اس کے سینے کی طرف رکھا ہے۔ دوسم نے جیسے ہی ڈش پر سے کور ہٹایا اس کے سامنے طاہر کا چہرہ آگیا۔ اس کی کھلی آنکھیں دوسم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے بال کھڑے ہوئے تھے اور گردن کے کٹے ہوئے حصے میں خون اکھڑا نہیں اور گوشت کے ریٹے بھیاک طریقے پر پھیلے ہوئے تھے۔ خون اس کے چہرے پر بھی تھا اور اتنی دیر میں دم کے سرخ سے سیاہ پڑنے لگا تھا۔

دوسم نے ایک بھیاک تہوار نکالی اور اس بڑی طرح چلایا کہ میں بدحواس ہو گئی۔ میں نے ایک دم کمری پر سے راجہ اور اٹھانے کی کوشش کی تو راجہ اور پیچ کر گیا۔ میں اور نروس ہو گئی۔ میں نے جبک کے راجہ اور اٹھانا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ سمجھ چکا تھا کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ وہ ہیز کے اوپر سے جست لگے گھر پر آیا۔ میں کمری سیت الٹ کے پیچھے گری۔ راجہ اور اب مجھ سے بہت دور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی گردن پر اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ اور بس۔ اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ آخر کیا ضرورت تھی مجھے قتل ہونے کی۔ مجھے اتنی رسوائی برداشت کرنے اور دکھ اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیا حاصل ہوا مجھے قتل ہونے کے؟ میں نامر کا بچا ہوا تھا۔ اپنے بیٹے کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ مگر نہ میں زندہ رہی نہ نامر کو بچا سکی۔ اگر میں نے دوسم کی بات مان لی ہوتی تو میں اس کی بیوی بن کے اسی گھر میں رہ سکتی تھی۔ وہ گھر پھر بھی میرا ہی گھانا تھا۔ نامر کا گھر ہوتا اور ہم سب ایک ساتھ رہتے۔ اسی طرح جیسے میں چاہتی تھی۔ دوسم کی بیوی کب تک ہنگامہ کرتی۔ اس کے مقابلے میں میری اہمیت زیادہ ہوتی۔ دوسم میری باتا۔ اس گھر میں میری چلتی۔ میرا جادو اس کے سر پر چڑھ کے ہوتا تو وہ میرے اشاروں کا غلام ہوتا اور شادی کرتا بھی ضروری نہیں تھا۔ میں مشتعل نہ ہوتی۔ اس کی بات کو نہیں کے نال دیتی۔ یہ کتنی کہ اچھا میں سچ کی۔ وہ تو اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار تھا میری خاطر مجھے اتنا وقت اور اتنی مصلحت مل جاتی کہ میں نامر کے ساتھ اس گھر سے نکل جاتی۔ نہ میں اس سے جدا ہوتی نہ وہ ختم خانے جاتا اور پھر ہمارا جانا۔ نہ میں بے آہود ہوتی نہ قتل کرتی اور نہ قتل ہوتی۔ بڑی غلطی کی میں نے قتل ہو کے۔ نامر کی خاطر مجھے خود کو بچانا چاہیے تھا۔ یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میرے سوا نامر کا ہے کون اور کیا ایسا بچا نامر کو چھوڑے گا۔ جس نے

اس کی ماں کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ مگر جو نصیب میں تھا وہ ہو کے رہا۔ میں دوسم کو مارنا چاہتی تھی اور خود ماری گئی۔ میں دم بخود کھڑا اس کا اقبالی جرم سن رہا تھا۔ "دوسم نے تمہارا گھانا کھونٹ دیا تھا۔ تم مریچکی ہو؟" "ہاں میں مریچکی ہوں۔ مجھے مارنے کے بعد وہ اتنا پریشان ہوا کہ میری لاش کو رات کے وقت پوری میں ڈال کے اپنے ساتھ ہی گھر لے گیا۔ اس نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اپنی کوئی نشانی وہاں نہیں چھوڑی تھی۔ مگر بچے کے اس نے بیوی کو سب بتا دیا اور ان دونوں نے مل کے راتوں رات مجھے صحن میں گاڑ دیا۔ یہ صحن اس وقت کا تھا اور بارش سے زمین گیلی ہو رہی تھی۔ دونوں بعد ہی اس نے صحن پکا کر لیا اور اس خیال سے کہ کسی کو شک نہ ہو گھر کے اندر چھوٹی سوئی سرست کا پتھر اور کام بھی کر لیا۔ یہ جگہ جو تم دیکھ رہے ہو بالکل تمہارے قدموں کے نیچے ہاں اسی جگہ وہ پوری ہے۔ تقریباً دو فٹ نیچے۔ جس میں میری لاش تھی۔ جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے۔ وہ ویسے ہی ہوں گے ابھی۔ زرد رنگ کی پھولوں والی قمیض تھی اور جامنی شلوار۔"

میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور فرش کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کا رنگ بتایا تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا مگر جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک اس کی آواز بارش کے شور میں بازگشت کی طرح گونجنے لگی۔ "تم نے نامر عظیم کو چھوڑا بھائی کیا تھا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ پھر کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو؟ میں انتقام لینا چاہتی ہوں۔ اپنا بھی اور اپنے بیٹے کا بھی۔ کون لے گا یہ انتقام؟ تمہارے علاوہ اور کون ہے بولنا۔ جواب دو۔ تمہارے بھائی کے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ قلم کرنے والے کو تم ایسے ہی چھوڑ دو گے؟"

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ یہ سرکاری اسپتال کا جنرل وارڈ تھا۔ میرے بستر کے نزدیک ہی ایک پولیس والا کمری پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میرے جسم پر مریضوں والا لباس تھا اور مجھے قہامت محسوس ہو رہی تھی۔ آس پاس کے دوسرے بستر پر سب مریض ہی تھے ان میں سے کچھ سو رہے تھے ساتھ والے بستر پر ایک بوڑھا جو دسے کا مریض تھا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے مسکرا کے پوچھا "کیا حال ہے بیٹا اب تیرا؟"

میں نے کہا "اچھا ہوں باباجی۔ یہاں مجھے کون لایا؟" اس نے پولیس والے کی طرف اشارہ کیا "یہ بیٹھے ہیں نا۔" پولیس والا میری توازن پر چڑھتا ہوا گیا "کیا بات ہے۔ بڑھے سے کیا پوچھ رہا ہے؟" میں نے کہا "تم یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟" اس نے کہا "اور کیا اپنے گھر لے جاتا۔ تیری سرال لے جاتا۔"

میں نے کہا "مجھے زرا تیز سے بات کرو۔ تمہیں معلوم ہے

میں کون ہوں؟" وہ غصا ہوا گیا "تیرے ہاتھ پر تو لکھا نہیں کہ تو ظلم خاں کا سالا ہے۔" میں نے کہا "تو پھر سن لو انا سمجھ لو کہ میں واقعی ظلم خاں کا سالا ہوں۔ اب میرے سوال کا جواب دو کہ مجھے یہاں کون لایا تھا اور کب؟" "میں نہیں لایا تھا مگر پولیس والی تھی۔ ایک بڑھا رہتا ہے قبرستان میں۔ مرنے کا ڈر تھا۔" وہ بولا "اس نے تمہارے میں بتایا کہ کوئی لڑکا احرار قبر کے اوپر ہے ہوش پڑا ہے۔" "قبرستان میں۔۔۔ یہ کب کی بات ہے؟" "آج صبح کی۔"

میں نے کہا "کل رات بہت بارش ہوئی تھی۔ گرج چمک کے اس نے مجھے غور سے دیکھا "دماغ تو ٹھیک ہی لگتا ہے مجھے تیرا۔"

اسے جواب دینے کے بجائے میں نے ایک نرس کو جنگی بجائے کو جگایا "سسرار"

اس نے مجھے ناگوار سے دیکھا "کیا ہے؟" میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا فون نمبر دیا "میرے گھر فون کرو۔ انہیں بتاؤ کہ نامر عظیم کو لانے کے لیے گاڑی بھیج دیں یا خود آجائیں۔" ڈاکٹر کے نام سے وہ کچھ حائر ہوئی۔ وہ بہت مشہور ڈاکٹر تھا۔ "یہ کیا گتے ہیں تمہارے؟"

میں نے کہا "سسرار میں ان کا۔ اور بات سنو اس وقت جو بھی ڈاکٹر موجود ہے اسے میرے پاس بھیج دو۔" میرے اعتماد اور تحسنانے انداز غلطی کو اس نے سخت پائند کیا تھا مگر وہ کچھ بولی نہیں اور پولیس مین کو گھور کے چلی گئی جو میری بات پر ہنس پڑا تھا۔

"کیا ہوا تھا تمہیں آخر؟" وہ بولا۔ میں نے کہا "ابھی ڈاکٹر آئے گا تو معلوم ہو گا۔" "میرا مطلب ہے۔۔۔ احرار قبرستان میں تم کیا کر رہے تھے۔ وہ قبر کس کی ہے؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ سوال تو پولیس کو کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس قبر پر نام کا کتبہ نہیں تھا۔ ورنہ مرنے سے پوچھتے۔" "یاد تو بڑا اٹھایا ہے" پولیس والا بیچنپ کر بولا "اھر کون ہے تیرا۔ یہ تو معلوم ہو گا کچھ۔"

میں نے سوچ کے کہا "ہاں۔ چار تو سسرار ہیں کیونکہ چار بیویاں ہیں ابھی میری۔ ہر بیوی کے ساتھ ایک ساس بھی ملی تھی چیزیں۔ کتنی چیز تھی۔ میں نے اُورھری گاڑی۔ پھر ان سب کے ساس۔ سر پر۔۔۔ حلوہ عدد۔ ان کی بھی چار بیویاں تھیں۔ بہت سے گریڈ

ساس اور گریڈ سسر۔ جیسے گریڈ راجہ اور گریڈ قادر ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر کے آنے سے میری بکواس اُورھری رہ گئی۔ وہ ایک نوجوان اور خوش اخلاق آدمی تھا۔ "ہیلو بوائے کیا حال ہے؟" میں نے کہا "قانون سرب مگر میں جانا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی" "تم بے ہوش تھے۔ تمہیں بہت تیز بخار بھی تھا" اس نے بڑے سائڈ پر سے چارٹ اٹھاتے ہوئے کہا "تم کو کچھ سات بجے داخل کیا گیا تھا تو بخار تھا ایک سو پانچ۔ ہم نے کنٹرول کر لیا۔ شام چھ بجے ٹیبلٹیں ڈال دیں اور لی پی بھی۔ اگر ذرا دیر ہو جاتی تو تم یہاں نہیں وہاں لیٹے ہوتے۔"

"وہاں کہاں؟" میں نے قبرستان لگانے کے لیے منہ کھول دیا۔ "جہاں سے لائے گئے تھے۔ قبرستان میں۔" ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا "غالباً رات بھر بارش میں بیٹھے تھے۔" میں نے منہ بند رکھتے ہوئے کھوپڑی ہلائی۔

ڈاکٹر نے قبرستان نکال کے دھنکی کے رخ کیا۔ "بالکل ٹھیک۔ ویسے تم رات کو اس قبر کے اوپر کیوں لیٹے ہوئے تھے۔" "آپ کا مطلب ہے سر مجھے اندر ہونا چاہیے تھا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ میں اندر ہی تھا۔ کیا آپ روح و نیرو کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس نے انکار میں سہلایا "روح کا مرنے کے بعد اس دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔"

میں نے ایک لمبی سانس لی "پھر اب میری بات نہیں سمجھیں گے۔ میرا نام نامر عظیم ہے اور وہ نامر عظیم کی قبر تھی۔ یہ بات البتہ خود میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مجھے وہاں کون لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ یہ حرکت کسی روح نے کی۔"

میری بھینچ کر گودکھ کے اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "یہ سب فعلوں باتیں ہیں۔ ابھی میں نے خود ڈاکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ وہ خود آ رہے ہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب خود آ رہے ہیں؟" "ہاں۔ یہ بتاؤ کیا پہلے بھی ایسا ہوا تھا؟" "میں سمجھا نہیں سکتا۔"

"پہلے بھی تم گھر سے باہر نہیں سوتے ہوئے یا بے ہوش پڑے پائے گئے تھے؟ تمہیں نیند میں پھنسنے کی عادت ہے؟"

میں نے کہا "نیند میں تو سسرار بہت کچھ کرتا ہوں۔ میں پہاڑ کی چوٹی سے کود جاتا ہوں اور اڑتا ہوا بیچے اڑتا ہوں۔ پرنے کی طرح۔ سسرار میں ڈکی لگاتا ہوں گھر کی ڈم پکڑ کے تو۔"

"نالی بوائے" ڈاکٹر نے ہنسنے ہوئے کہا اور رخصت ہو گیا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ آتے تو تمہارے والے مجھے قہقیش کے لیے ضرور لے

راہ پر چل پڑے۔ انہوں نے کہا۔

میں ان سے پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ غلط اور صحیح کا فیصلہ کون کرے گا؟ میں یا دنیا؟ دنیا نے تو سجدوں سے لے کر بیٹیوں تک سب کو غلط کہا حالانکہ وہ صحیح راستے پر تھے اور آج بھی سب دوسروں کو غلط کہتے ہیں خود کو صحیح سمجھتے ہیں۔

اس رات میں سوئے سے اچانک اٹھ کے بندھ گیا۔ میں نے ایک آواز سنی تھی جو کہیں بہت دور سے آ رہی تھی مگر بہت واضح تھی۔ کون لے گا یہ انتقام؟ بولوس۔ جواب دو تمہارے سوا اور کون ہے؟ کیا اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ظلم کرنے والے کو تم ایسے ہی چھوڑ دو گے؟

میں نے کان لگے سنا۔ ہر طرف سنا تھا۔ باہر ہوا کی سرسراہٹ بھی نہیں تھی کھلی کھڑکی سے رات کا سنا نظر آتا تھا اور درانی میں کم ہو جانے والی صدائے بازگشت کا احساس ایک دامن لگتا تھا مگر کانوں کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ یہ آواز سن کے ہی میں جاگا تھا۔

میں نے اٹھ کے پانی پا اور باہر ٹھنڈی ہوا میں نکل کے اس بیچ پر لٹ گیا جو قطعی صبح کے مختصرے لمحے میں ملتی ہوئی تھی۔ میں اوپر آسمان کی وسعت میں غمائے آندوں کو دیکھا اور کمرے کی دیواروں کے باہر کی فضا میں مجھے زیادہ سکون محسوس ہوا۔ میں وہیں بیٹھ کر سو گیا۔

رات کے آخری برس میں میری آنکھ بھر کھل گئی۔ مجھے دھگائے والی دی آواز تھی۔ بولوس جواب دو کون لے گا یہ انتقام؟ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے سرانے کھڑی بول رہی تھی اور ابھی ابھی دروازے کی طرف گئی ہے۔ صبح کا ظب کا اجالا من گھڑا تھا اور صبح صادق کے آثار ہو رہے تھے۔ میں دروازے کی طرف لپکا اور پھر درک گیا۔ میرے پاؤں من من کے ہو گئے تھے اور میں پھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔

میری نظروں کے سامنے وہ من گھٹ کی طرف تھی اور غائب ہو گئی۔ یوں جیسے وہ بند دروازے سے گزر گئی ہو۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ ابھی چوکیدار لوٹ کے نہیں آیا تھا ورنہ مجھ سے ضرور پوچھتا "کیا بات ہے ناصر صیب؟" خود غیظ نہیں آتی؟

میں داہیں کمرے میں آیا۔ میں نے طے کیا کہ اس بات کا کسی سے بھی تذکرہ نہیں کروں گا ورنہ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب اس بار مجھے پاگل خانے بھیج دیں۔ وہ فرض کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر کی رائے غلط تھی۔ میں نے غلط جوابات دے کے غلطی کر دی تھی۔ اس لیے کہ میرا آئی کیو خطرناک حد تک زیادہ تھا۔ میں چالاکی سے ماہر نفسیات کو بھی گمراہ کر سکتا تھا۔ وہ پاگل خانے نہ بھیجتے تب بھی اپنے کمرے سے میرا بولیا بہتر ضرور گول کر دیتے۔ یہ وارننگ وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ فی الحال میں اس محفوظ ٹھکانے کو چھوڑنا نہیں

چاہتا تھا۔

اس دن میں نے ریشمی خبیث سے ملاقات کی۔ میں اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ "آج تو میرا صمان ہے۔ جہاں تیرا می چاہے چل۔"

وہ بولا "کوئی لمبا ہاتھ مارا ہے؟ کیا کام ہے کوئی مجھ سے؟" میں نے کہا "نہیں۔ بس تو دوست ہے میرا۔" مگر اس وقت کہ کوئی سالہ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ سب اپنی اپنی غرض پوری کرتے ہیں۔ میں نے کہا "چل می کسی۔ یہ تاکہ تو کیا کر سکتا ہے میرے لیے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تو کیا کرنا چاہتا ہے مجھ سے؟" میں نے ہنس کے کہا "فرض کر کے تو کل رات ہو۔" "بے چل بھاگ۔ کے تو خود کیوں نہیں کرتا یہ کام تیرے لیے میں چاہتی چڑھ جاؤں کیا پاگل سمجھ رہا ہے مجھ سے؟" میں نے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔ کل تو مجھے کراتا ہے مگر تجھ سے نہیں تو نے کہا تھا کہ ایسے لوگ ہیں۔ جو یہ کام کر سکتے ہیں پیر لے کر۔"

وہ مجھ پر ہنسا "کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟" میں نے کہا "نہیں۔ میرے سوال کا جواب دے۔" وہ بولا "تو کس کو کل کراتے کی سوچ رہا ہے؟" "ہی کس؟" "یہ بھی بتا دوں گا تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا" میں نے کہا "تو جانتا ہے ایسے کسی شخص کو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے سنا ہے ایک شخص کے بارے میں مگر کب بات نہیں ہے۔ اگر وہ بھی یہ کام کرتا ہو گا تو ایسے نہیں جیسے کوئی قصاب سے کے کہ کرا کاٹنا ہے تو وہ چھری لے کر ساتھ چل پڑے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں" میں نے کہا "تو مجھے نام پتا دے۔" اس سے میں خود بات کر لوں گا۔"

ریشم نے کہا "تیرے وہ ایسا بھانپنا مارے گا بنا کہ منہ شوج جائے گا ایک طرف ہے۔"

"تو زہرا ہے تاکہ تیرا نام لیا میں نے تو وہ دوسرا بھانپنا تجھے مارے گا۔ ایک طرف سے تیرا بھی منہ شوج جائے گا۔ وہ پوچھنے کا کہ ریشم خبیث تو نے پھر اپنی بات منہ سے نکالی تو میں تیری زبان سمجھنے کے باہر نکال لوں گا۔ نہیں تو مجھ کو سارے کچھ پر۔ میں تیرا کوئی حوالہ نہیں دوں گا۔ وہ مارا کے سارا بدن تجھ سے میرا بھر بھی نہیں ہٹاؤں گا کس۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "دیکھ ناصر۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے بتا تو ابھی بچ ہے۔"

"تیری میری عمریں تین سال کا فرق ہے صرف۔" وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ

ایک لاکھ سے کم میں شاید یہ کام نہ ہو۔ ایک لاکھ ہیں تیرے پاس؟"

میں نے ہلکانے کی آواز کا ری کی "ایک لاکھ!" وہ ہنس پڑا "اور کیا تیرا خیال تھا کہ جتنے قتالی لیتا ہے بکرایا بیل گرانے کے اس سے سو پچاس زیادہ ہیں کوئی آدمی گرا دے گا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا تجھے کہ مت بے فضل پکڑوں میں۔ اب کیا نئی بات ہو گئی یہ دورہ پھر کیوں پڑا ہے تجھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس کا یقینا دعوں پر اعتقاد ہو گا۔ وہ حیرت خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میری بات سنتا رہا۔

"ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ میرا داغ خراب ہے۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹر اختر کو دکھایا۔ وہ داغ کا سب سے بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس نے کہا کہ لڑکا بالکل ٹھیک ہے اور میری طرف بھی کی۔ اب تو یہ مت سمجھنا کہ وہ دم خوار مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہے یا دورے پڑتے ہیں مجھ پر پاگل ہیں کس۔"

اس نے سر ہلایا "مگر رات یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تو یہ کتا ہے کہ وہ عورت۔ میرا مطلب ہے اس کی روح۔ تجھے وہاں لے گئی تھی جہاں وہ دفن ہے۔ پھر تو نامہری قبر کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ خود مجھے معلوم نہیں۔ پولیس نے مجھ سے وہاں سے اٹھایا تھا۔ اسی رات خت بارش ہوئی تھی۔ میں صبح تک بارش میں پڑا بیٹھتا رہا تھا۔ اس سے بخار بھی ہو گیا تھا مجھے تو جہاں سے چاہے پوچھ لے پولیس سے 'ہسپتال والوں سے' وہ تجھے بتا دیں گے کہ یہ سچ ہے۔"

"سچ تو ہے" وہ گھاس کا ٹکڑا چبانے لگا "میں نے کب کہا کہ جھوٹ ہے۔ وہ کاٹا جال تو کتا تھا کہ جو روح کو نہ مانے وہ کافر۔"

"اس کی بات رہتے دے۔ وہ خود ایک بد روح تھا۔ مجھے بتا کہ میں کیا کروں۔ میرا تو بیٹا شکل ہو جائے گا اگر میں نے کچھ نہ کیا۔ وہ آواز مجھے دن رات سنائی دیتی ہے۔ میں رات کو سو نہیں سکتا۔" "پھر تو کچھ کرنا ہی پڑے گا تیرے لیے" ریشم کمری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا "تو مجھے وہ مکان دکھا سکتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ ابھی چل" میں نے کہا۔ کھانے کے بعد ہم ایک پارک میں سب سے الگ جا بیٹھے تھے جہاں باہر والا سب کو کھانے لاکر دیتا تھا۔ لوگ فارغ بیٹھے کپ لگا رہے تھے سو رہے تھے سر میں بیل پلٹ کر اترتے تھے اور بدن دوڑا رہے تھے ہم کھانے بھی لی گئے تھے اور ابھی صرف نو بیجے تھے۔ ریشم نے اور میں نے پیرل چلنے کا فیصلہ کیا۔

"کچھ کھانا ہم جو جائے گا۔ سالم چرچا میں ہو تو کھتا ہے حل ہے مجھے" ریشم نے بیٹن پر ہاتھ بھر کے آنکھ ماری "مگر تو کیا سمجھے گا۔"

میں نے کہا "میک چٹم صوفی جو مجھے مرتنا تھا، کیا شمر مرتنا تھا۔ حمل سے زندگی بنتی ہے۔"

ریشم نے ایک قدم مارا اور پھر ایک دم خاموش ہو گیا "یار ناصر۔ کیوں نہ پہلے ہم تھوڑے لے لیں۔"

"کیا تھوڑے؟" "میں۔ آفات سے اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے والا۔ آگے بڑھنا پویش کی درگاہ ہے۔ اس کا مجارہ ہے نڈولا بابا۔"

میں ہنس پڑا "کیا وہ مجھ ہے؟" "وہ جب سے پیدا ہوا ہے اس کے سر پر ایک بال نہیں آگا۔ یہی ہے اس کی کرامت۔ جو لوگ منت مانتے ہیں وہ نڈولا کے چکر کاتے ہیں۔"

میں نے کہا "درگا تو میں نے دیکھی ہے۔ اچھا ریشم ہوتا ہے جمرات کی رات۔ تو اب بھی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ پوری دنیا جاتی ہے مراویں مانگتے نڈولا بابا کے مرشد تھے جیسا پویش۔ وہ جس کے جو آواز دیتے تھے اس کی مراد آتی تھی۔ اب ان کی پاوش مبارک مزار کے پاس رکھی رہتی ہے۔ حاجت مند نڈولا نہ پیش کرنے کے بعد پاوش پھیلنے پر رکھ کے نڈولا بابا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جس کی نیت میں کھوٹ نہ ہو اس کو غیب سے اشارہ ملتا ہے۔ پاوش مبارک کو حرکت ہوتی ہے اور بابا نڈولا جوتی اٹھا کے سر پر مارا ہے۔"

"کس کے۔ اپنے" میں نے کہا۔ "یہ مذاق کی بات نہیں۔ اکثر لوگ پھیلنے پر جوتی رکھے سر جو کائے کھڑے رہتے ہیں اور نڈولا بابا نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ نامراد لوٹ آتے ہیں۔ جس کے سر پر جوتی پڑ جائے اس کی مراد پوری ہوتی ہے۔"

"اپنے سب دوا رہی ہیں۔ ایسے ہی کھیل دکھاتے ہیں لوگوں کو۔ تقدیر کے کھٹے کوئی اور تئیر نہیں بدل سکتے تو جیسا پویش کیا ان سے بھی بڑھ کے ہے۔ تو بے توبہ۔ اور یہ نڈولا بابا نڈولے بھی لیتا ہے اور جو تھی مارا ہے لوگوں کے سر پر۔"

میرے خیالات سے اس کے جذبات مجروح ہو رہے تھے۔ اس کی عقیدت مندی میں فرق آ رہا تھا تو بے توبہ ہی سے مل جائے گا۔ سوا دپے میں" وہ دھکی لے کر میرا ہولا "مزار کے خلاف کا دھاگا ہوتا ہے اس میں۔"

میں نے کہا "بات سوا دپے کی نہیں۔ تجھے ذر لگ رہا ہے تو اپنے لیے لے آ۔ میں آیت انگری پڑھ لوں گا۔ دے عاتے قوت یاد ہے مجھے۔"

"میرے پاس تو ہے" وہ بولا "مجھے کاہے کا ڈر۔" معلوم نہیں کیوں ناصر کے باپ کا گھر ویران اور تاریک پڑا تھا۔ اسے غریبے والے ایک وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ جیسے ہی رنگ اور مرمت کا چھوٹا موٹا کام ہو گا اس کی جیلی شفقت

ہو جائے گی۔
 ”شہر کوئی بات ہے بیٹا“ رئیس سرگوشی میں بولا ”سایہ معلوم ہوتا ہے اس پر۔“
 ”کس کا سایہ؟“ رئیس نے بھی ہوتا ہے کیا؟“
 ”اے ساری چوڑی اور مخنی بھول جائے گا جس دن کسی سے پالا پڑا۔ کیا وہابی ہو گیا ہے؟“ رئیس نے غصے سے کہا۔
 ”میں نے کہا“ ایسے بات کر رہا ہے تو جیسے میں شرابی کبابی ہو گیا ہوں مکان تو نے دیکھ لیا؟“
 ”اُس دیکھ لیا۔“ وہ بولا ”اب کیا کرتا ہے؟“
 ”یہ تو مجھے ہے پوچھ رہا ہے؟“ میں نے کہا ”اندھ بنا ہے اور فرش کھود کے دیکھتا ہے کہ نیچے لاش ہے یا نہیں؟“
 اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں نے اس سے ستاروں پر کندہ ڈالنے کا کہہ دیا ہے۔ پھر اس نے اوڑھنا دیکھا اور بولا ”ہوں۔“
 ”تیرے پاس تنویر ہے۔ تجھے تو نہیں ڈرنا چاہیے بالکل بھی۔ میری فکر مت کر، مجھے اللہ پر زیادہ بھروسہ ہے“ میں نے کہا۔
 ”دیکھ بارے“ فرش توڑنا اور لاش نکالنا یہ تو ناممکن ہے مگر ہم اندر جا کے دیکھ سکتے ہیں کیا فرش واقعی ٹپا ہوا ہے؟“ وہ بولا۔
 ہم اس طرف سے دیوار چھانے کے صحن میں کود گئے جدھر گلی کچھ دیر ان بھی اور اندھرا بھی زیادہ تھا۔ میرا دل پکڑے جانے کے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ دروازے کے باہر ٹال ٹک رہا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ اندر کوئی چوکیداری کے خیال سے موجود ہو۔ رئیس کا حال زیادہ خراب تھا۔ اسے آسپ چٹ جانے کا خیال بھی ڈر رہا تھا۔
 میں نے اس گھر میں پہلے قدم نہیں رکھا تھا مگر اندر اترتے ہی مجھے یوں لگا کہ یہاں میں پہلے آچکا ہوں۔ میں اس جگہ کو پہچانتا تھا جو قصبات مجھے پہلے یاد نہیں آتی تھی وہ صحن کو دیکھ کے یاد آگئیں۔
 ”دیکھ رئیس۔ یہ ذہن سے یہاں وہ کھڑی تھی بالکل اسی جگہ۔ اور یہ گھڑوئی یہ بھی اسی جگہ تھی۔ ذہن کے نیچے یہ ٹپٹی ہوئی کرسی بھی یہی تھی اور یہ پانی کی موند۔“
 مگر کبھی فرش کا معائنہ کر رہا تھا جو بالکل ٹپا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں مختصر سے برآمدے کا فرش بہت پرانا تھا۔ اس کا بہت کچھ کالا پڑ گیا تھا۔ ذہن کا پلستر کیس کیس سے مرمت ہوا تھا اور پرانے پلستر میں سے دھبے بہت نمایاں تھے۔ ان دھبوں کا اور نئے فرش کا رنگ اچھا سفیدی بالکل تھا۔
 میں نے کہا ”میں یہاں کھڑا ہوا تھا اس جگہ۔“
 رئیس نے ہنسنے لگا ”اس کے نیچے اس کے نیچے اس نے بتایا تھا کہ وہ دفن ہے۔ بار کچھ خیال کر۔ جیسے ہٹ جا۔“
 میں نے کہا ”میں تو نے مان لیا ہے کہ اس جگہ لاش ہوگی اور یہ نامرکی ماں کی قبر ہے؟“

”ایسے ماننے والی بات تو نہیں ہے۔ مگر کیا پتا۔“ وہ بولا
 ”جل اب نکل جائیں تو چاہے کہیں کوئی آگیا؟“
 ”کون آئے گا یہاں۔ جس نے مکان لیا تھا وہ خود نہیں آیا۔ کرے سب غالی پڑے ہیں“ میں نے ایک بند کھڑکی کے نوٹے شیشوں سے اندر بھاگ کے کہا۔ باہر سے آنے والی اسٹریٹ لائٹ کا لکھا سا اجالا اندر بھی پہنچ رہا تھا اور ہماری نظر بھی تاریکی میں دیکھنے لگی تھی۔
 ”مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“
 میں نے کہا ”اگلی مرتبہ گھبراہٹ کے لیے بھی تنویر لے لیں۔ میرا تو خیال ہے کہ آج رات میں گزراؤں۔ شاید وہ پھر ملاقات کرے مجھ سے۔ فرش پر آرام سے لیٹی تان کے سو سکتا ہوں میں“
 میں نے غیر متوجہ ہو کر کہا۔
 رئیس مجھے سمجھنے کے لیے گیا۔ ٹپا ہوا فرش دیکھ کے ہتھوڑ پریشان ہوا تھا اتنی ہی حیران تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا اس رات واقعی میں پران آتا تھا؟ میں اندر کیسے پہنچا تھا؟ مدین کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ دیواریں اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ میرا اپنا ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا اور میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ادراج کا اس مادی دنیا کے معاملات میں کوئی دخل نہیں اس کے باوجود میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی کوئی منطقی یا سائنسی توضیح پیش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں نے خواب دیکھا تھا تو خواب میں نامرکی ماں کے قتل کے محرکات اور واقعات مجھے اتنی تفصیل سے کیسے معلوم ہو گئے جن کا خود نامر کو بھی علم نہیں تھا۔ ان واقعات کی صداقت کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا مگر میں نے نامر کے مکان کو اندر سے دیکھا تو مجھے وہ جگہ دیکھی ہوئی لگی اور بہت سی چیزوں کو میں نے شناخت بھی کیا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ میں وہاں آیا تھا۔ کب کیسے اور کس کے ساتھ یہ میرے لیے بھی ایک معما تھا مجھے کانہ سمجھانے کا۔
 کیا واقعی ظاہر نام کا کوئی شخص ہو گا جسے نامرکی ماں نے قتل کر دیا تھا۔ جو بڑھ فروش تھا لیکن اپنی شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے معزز اور مذہب نظر آتا تھا۔ ظاہر اس کے نام کا ایک حصہ تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا اور یہ اصل نام کیا تھا؟ میں ”اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ مجھے علم تھا کہ یہ واردات۔۔۔۔۔ کہاں ہوئی تھی؟ میں کو کوشش کر کے بھی یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔
 رئیس مجھے یہ سب بھول جانے اور اس باگل پن سے باز رہنے کا مشورہ دے کر رخصت ہو گیا مگر اب یہ واقعی میرا OBSESSION بن گیا تھا۔ ایک ایسا خیال جو صبح و شام ہر لمحہ دماغ میں گھس کے بیٹھا جاتا۔ ٹالے نہ نظر اور بھٹانے نہ بھولے جو اچھا سا بڑا ہوا ہو جائے اور سوتے جاگتے پہچانے جھوڑے۔ مشکل یہ تھی کہ لوگ مجھے پچھتے تھے حالانکہ میں

نوجوانی کی عمر کو پہنچ گیا تھا اور اپنی جسمانی صحت سے نوجوان ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں اس واردات کا پولیس کے ریکارڈ سے سراغ لگانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے ہی پکڑ لیتے کہ تو کیا لگا ہے ظاہر کا پتہ کیوں پوچھ رہا ہے؟ پھر تو مجھے فوراً مشتبہ اور مشکوک قرار دے دیا جاتا اور زیرِ مجتہد مجھ سے اس واردات کے بارے میں ”سچ“ انکار کے لیے کوشش کی جاتی یا کوئی شریف خانے دار ہوتا تو ایک ہاتھ مار کے یا لٹ رہید کر کے مجھے خانے کی حدود سے نکال دیتا کہ ”جیل پچھت اور مر۔“ شکل کم کر لیں۔ پھر نظر آیا مجھے تو ذک و دل کا۔ جاسوس کے گھوڑے۔“
 پھر ایک رات مجھے خیال آیا کہ یہ خبر اخباروں میں بھی تو شائع ہوئی ہوگی۔ ایسی سنی خبر واردات کی خبر تو شام کے اخباروں میں جلی حروف کی سرشتی اور تصویر کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی پہلے میں ہنسنا اور پھر رونا۔ ہنسنا اس لیے کہ میری مشکل آسان ہو گئی تھی اور اب میں کوئی پریشانی مول لے بغیر واقعات کی ایک سچ سچ سنا کر اور یہ جان سکتا تھا کہ وہ خواب تھا یا حقیقت تھی۔ دھڑا اپنی اصل پر کہ آخر یہ خیال اتنی دیر سے کیوں آیا۔
 دوسرے دن میں مصروف صورت بنا کے ایک اخبار کے دفتر میں گیا اور اپنا مسئلہ بیان کیا ”سرب“ مجھے دو سالوں کے اخبار دیکھتے ہیں۔“
 ایک خاتون نے عینک تار کے مجھے دلچسپی سے دیکھا ”کیا دیکھنا ہے؟“
 میں اس سوال کے لیے تیار تھا ”ہم نے ایک اشتہار دیا تھا۔ اطلاع عام کے کالم میں۔“
 اس نے کہا ”کس سلسلے میں؟“
 میں نے کہا ”ایک پلاٹ خریدنا تھا ہم نے۔۔۔۔۔ اپنے نام ٹرانسفر کرانے کے لیے اشتہار دیا تھا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“
 میری مدد کریں۔“
 اس نے کہا ”اچھا۔۔۔۔۔ اوپر چلے جاؤ لاہوری میں۔ میں فون کر دیتی ہوں۔ لاہوری میں تمہیں قائل نکال دے گا۔ کیا نام ہے تمہارا؟“
 ”نامر عظیم۔“ میں نے کہا ”مجھے یہاں اتنے لوگوں میں آپ سی سے امید تھی مجھے پتا تھا کہ آپ میری مدد کریں گی۔“
 وہ مسکرائی ”اچھا۔۔۔۔۔ کیسے بھی؟“
 میں نے کہا ”اچھی صورت میں تو کوئی شبہ نہیں مگر اب میری حالت کا حسن الگ نظر آتا ہے ہی آپ کے چہرے پر۔“
 وہ جتنی خوش ہوئی اس سے زیادہ حیران ہوئی ”اتنی سی عمر میں تم ایسی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔“
 میں نے کہا ”پتا نہیں۔ لوگ یہ کیوں کہتے رہتے ہیں مجھ سے۔ اچھا ہوتا بھی نہیں ہوں میں۔ دوسروں کا امتحان دوں گا اس سال۔“
 شام کے ایک اخبار کی ایک فاکس کے صفحے پلٹے پلٹے میری

انگلیاں درد کھٹکے لگیں۔ میں نے ان محنت قتل کی وارداتوں کی سنی خبر سرخیاں پڑھیں اور تصویریں دیکھیں ”کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس قسم کی خبر مجھے پہلے مل سکتی ہے یا پھر آخری ملے۔ اس کے باوجود میں نے درمیان کے صفحات کو نظر انداز نہیں کیا۔
 مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں اور مجھے کبھی اخبار میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ پلا والیوم ختم ہو جانے کے بعد میں خاصی مایوسی کا شکار تھا۔ مگر دوسرے والیوم سے چند صفحے پلٹے ہی وہ خبروں میرے سامنے آئی کہ میری نظریں سرشتی پر جم گئیں۔ میرا دل جیسے دھڑکا بھول گیا تھا۔ ”ریکرونگ ایجنٹ کا قتل۔“ شام کا قتل نے سرکوتن سے جدا کر کے ڈش میں بھالوا۔“
 خبر میں سب وہی تھا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ مقتول کا پورا نام ظاہر علی تھا اور اسے نامعلوم قاتل نے بڑی کانٹے والی چمڑی سے ذبح کر دیا تھا۔ مقتول کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ لوگوں کو جھوٹا ملک بھوانے کے پکڑ میں وہ لاکھوں روپے ہتھم کر چکا تھا اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ عورتوں کو ملازمت دلانے کے بہانے مل ایٹ لے جا کر فروخت کرتا ہے مگر اس کی پشت بنائی کرنے والے بااثر لوگ تھے چنانچہ پاس پڑوس کے لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ قتل کو دشمنی کا شائبہ نہ تھا۔ قرار دیا گیا تھا مگر قاتل کے بارے میں یہ اشتہار تک نہیں تھا کہ وہ کوئی مزدور کا بیٹا نہ تھا۔ آخری جلد وہی تھا کہ پولیس سرگرمی سے تحقیق کر رہی ہے اور سنی خبر انکشافات کی توقع ہے۔
 خبر کے ساتھ تصویر بھی تھی مگر اس حالت میں کہ سرکودھڑ سے ملا کے رکھ دیا گیا تھا۔ شاید پولیس نے کھانے کی میز ڈش میں بچے ہوئے سرکی تصویر اتارنے کی اجازت نہیں دی تھی۔
 میں بچے کے پھر اس خاتون کے سامنے بیٹھ گیا ”مل کیا گیا اخبار۔“
 اس نے کہا ”پھر۔۔۔۔۔ اب کیا مسئلہ ہے؟“
 میں نے کہا ”کیا اس اخبار کی کاپی مل سکتی ہے؟“
 ”مل جائے گی“ بقصد کر ”وہ بولی“ میں مشکواتی ہوں۔“
 میں اخبار لے کر نکلا تو میری ذہنی کیفیت اس شخص سے مختلف نہ تھی جس نے کسی گمشدہ خزانے کا سراغ لگایا ہو۔ اب میں ڈاکٹر صاحب پر اس باہر نفسیات پر نہیں غیبت پر اور ہماری دنیا پر ثابت کر سکتا تھا کہ جو کچھ میں نے بتایا تھا وہ میرے ذہن کی اختراع، میرا وہم یا خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔ میں فوقی الفطرت یا چاراسرار واقعات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایسے واقعات ساری دنیا میں پیش آتے تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ لوگ بھوت بولتے ہیں۔ کپ مارے ہیں یا مہر و دم کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اب ایک واقعہ تو خود

میرے ساتھ پیش آیا تھا جس کو محل قبول نہیں کرتی تھی۔
مگر پہلے کے بعد میرے خیالات پھر بدل گئے میں نے سوچا کہ
یہ اخبار میں سے ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھا تو قائل وہ خاک بھی
نہیں ہوں گے البتہ یہم ہوں گے کہ ان کے سبھانے پر بھی میں نے
خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کیا اور شراک ہو کر جاسوسی
کرنا رہا۔ یقین انہوں نے مجھ پر پہلے بھی نہیں کیا تھا اور اگر ان کا
اپنا قائل احمد باہر تعلیمات میرے بارے میں اچھی روایت نہ دیتا تو
ان کی بات سچ ہو جاتی کہ مجھے دہم کا عارضہ لاحق تھا یا خواب میں
چلنے کی عادت تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کو ڈاکٹر اختر نے
میرے کس کے بارے میں کیا بتایا تھا مگر یہ بات اب یقینی تھی کہ
اخبار پڑھ کے ان کا فک سو فیصد یقین میں بدل جائے گا کہ اس
رات بھی جاسوسی اہم بن کے میں دہرے کل کی اس واردات کا
سراغ لگانے ہی گیا تھا۔ وہاں کسی نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ (جیسا
کہ جاسوسی فلموں کی ڈرامائی صورت حال میں اکثر ہوتا ہے) اور
ناک آؤٹ کرنے والا قاتل یا اس کا ساتھی ہی ہوگا۔ میں قبرستان
میں دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔ پڑے عزائم رکھنے کے باوجود میں
ابھی اتنا بڑا نہیں تھا کہ رات کو تنہا گزرنے سے مرے اکھاڑا
پھول۔ یا پھر مجھے غار ہو گیا جو بارش میں بیگنے سے بڑھ گیا تو میں
واپس گھر نہ پہنچ سکا اور میں نے اسپتال کے بیڈ پر لیٹنے کیلئے ایک
اشوری بنائی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ میں خطرناک حد تک ذہن ہوں
کیونکہ میرا آئی کیو ایک سو تیس تھا۔ میرے جیسا لڑکا سارے
زمانے کو بے وقوف بنا سکتا تھا۔

مگر پہلے سے پہلے میں نے فزیکل فٹوائسٹ کیا یا نہیں؟ خبر
کے ساتھ اخبار کا نام اور تاریخ اشاعت بھی واضح تھی۔ اصل
اخبار کو میں نے بیخفاغت اپنی پڑھنے کی سیرک دراز میں رکھ دیا۔ پھر
میں ہسپتال کے سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ معاملہ
میری سمجھ سے باہر تھا۔ بارش والی رات جو کہ میں نے دیکھا اور
سنا وہ خواب بر حال نہیں تھا۔ خواب اکثر بے سرو پا ہوتے ہیں یا جو
کچھ آدمی دیکھتا ہے وہ کوئی عام سادہ ہوتا ہے۔ بے شک خواب
ڈراؤنے بھی ہوتے ہیں اور میری معلومات کی حد تک کچھ خواب سچ
ہوتے ہیں ان کی تعبیر بھی سچ ہوتی ہے۔ کچھ خوابوں کی تعبیر انہی
ہوتی ہے۔ اب یہ تعبیر بتانے والے ہی جانتے ہیں کہ کس خواب کی
تعبیر کیا ہوگی۔ خواب میں بشارت بھی ہوتی ہے اور بزرگانِ دین
سے انہی اولیا تک سب کے ہمت سے خواب مشہور تھے۔

لیکن میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اور
پوری طرح ہوش میں تھا۔ چند منٹ پہلے ہی تو ڈاکٹر مشہور کا بیٹا مجھے
بتا کے گیا تھا کہ وہ سب آگس کریم کھانے جا رہے ہیں اور میں نے
خود باہر جا کے گیٹ بند کیا تھا۔ اگر میں سو گیا ہوتا تو اسے خواب سمجھ
سکتا تھا مگر اس گرج چمک میں خیر آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

پھر وہ عورت کون تھی جو مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زوجہ

والی بات کو میری عقل بھی تسلیم نہیں کرتی تھی مگر میں نے خود اسے
بند دواؤں سے گزرتے اور غائب ہونے دیکھا تھا۔ کہیں ایسا تو
نہیں کہ میری نظروں کو دھوکا ہوا ہو۔ دواؤں کو مل کے باہر گئی ہو
مگر اندر سے میں مجھے ایسا لگا ہو جیسے وہ سیدھی گزر گئی تھی۔ آخر
میں خود بھی تو باہر گیا تھا۔ میں تو بند دواؤں سے نہیں گزر سکتا
تھا۔

پھر وہ اچانک غائب کیسے ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بدی تفصیل
سے ہر بات بتائی تھی۔ نام کو تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے اس
کی ماں کے قاتل کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ یہ معلوم تھا کہ اس شخص کا
کردار کیا تھا اور پشہ کیا تھا جس کے ساتھ نامر کا بچا اپنی بھائی کی
"شادی" کرنا چاہتا تھا۔ نامر کے بچانے کی سعی مایت کے سونے کا
زور بھٹم کیا تھا اور کیسے۔ قتل کی یہ واردات جس میں پہلے ظاہر
مارا گیا تھا اور پھر نامر کی ماں۔ کب اور کیسے ہوئی تھی؟ یہ سب تو
مجھے اس عورت نے ہی بتایا تھا۔ اخبار میں نے بعد میں دیکھا اور
اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہو گیا۔

اگر وہ عورت مدح نہیں تھی تو کون تھی؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ
نامر کی ماں زندہ ہو اور انہیں چھپ کے زندگی گزار رہی ہو؟ اپنی
جان بچانے کے لیے کیونکہ اس نے ایک قتل کیا تھا اور وہ بچوے
جانے سے ڈرتی ہو۔ قتل پر اس کے شہر کو بھانسی کی سزا ہو گئی
تھی۔ لیکن ہے وہ نامر کو باپ کے بعد اس کی محبت سے محروم نہ کرنا
چاہتی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ نامر تو اب یتیم خانے میں ہے۔ بڑا
ہونے تک وہاں وہ محفوظ رہے گا اور وہ مدح بھی کی زندگی گزارتی
رہے گی۔ پھر جب نامر بڑا ہو جائے گا تو وہ اس کو سب بتا دے گی
اور نامر اپنی ماں کے کہنے پر وسم کو لٹکانے لگے گا اس سے اپنا حق
واپس حاصل کر لے گا یا ماں کے ساتھ کہیں دور چلا جائے گا جہاں
وہ سکون کے ساتھ وہ کس مکان گیا ہاؤس۔ جان ہے تو جہان
ہے۔ صرف چھ سات سال کی بات تھی۔ اٹھارہ سال کا لڑکا پانچ
ہو گیا ہے۔ یہ انتظار کا وقت وہ مجھ کی میر کے ساتھ کاٹ سکتی
تھی۔ پچاسی پڑھ جانے سے یہ بہتر تھا کہ وہ چھ سات سال بیٹے کی
جدائی برداشت کرے اور خود مدح بھی کی زندگی گزارے۔ شاید
چوری چھپے وہ نامر کو دیکھتی رہتی ہوگی اور اس کی خبر رکھتی ہوگی۔ مگر
نامر مر گیا تو اس کی ساری امیدیں بھی مر گئیں۔ پہلے وہ انتقام نہیں
لیتا چاہتی ہوگی۔ اسے اپنی اور بیٹے کی زندگی زیادہ عزیز ہوگی۔ جو ان
بیٹا ساتھ ہو تو ماں کو اور کیا چاہیے۔ وہ کما کے کھائے گا۔ ماں کو
آرام سے رکھے گا اور اس کی زندگی کے سارے دکھوں کا مداوا
کرے گا۔ وہ ایک اور مکان بنائے گا۔ اس کی شادی ہوگی۔ بچے
ہوں گے۔ یہ خواب ہی اس کی آس تھی اور مستقبل پر یقین کی
اساس تھی۔ یہ خواب مر گئے تو بچنے کے لیے صرف ایک آرزو کا
بمانہ رہ گیا۔ انتقام کی آرزو اب وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو عبرت
ناک انجام تک پہنچانے بغیر مر بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف اس کو

قتل کرنے سے یہ انتقام کی آگ سرد نہیں ہو سکتی تھی۔ وسم نے
اس کے شہر کو اسے اور اس کے بیٹے کو مار دیا تھا۔ وہ اس کے گھر
کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس سے سب کچھ جھین لے
گی۔

میں کئی بار آغا پھر بھنا اور لٹ گیا۔ اس کے زندہ ہونے کی
بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر وہ زندہ بھی تو کہاں تھی۔ وہ
اپنے طوفانی موسم میں مجھ سے لئے کیوں آئی اور کیسے آئی۔ اگر اس
نے مجھ سے توقعات وابستہ کر لی تھیں اور یہ سمجھتی تھی کہ اس کے
انتقام کی آرزو کو پورا کرنے میں وہ سارا نامر تعلیم اس کا ساتھ دے
سکتا ہے تو وہ مجھ سے باہر بھی مل سکتی تھی۔ ایسی بارش اور گرج
چمک والی رات میں اتنا ضروری نہیں تھا۔ وہ کبھی رات مجھ سے
ملاقات کر سکتی تھی۔ میں ہر رات اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تھا۔

اگر وہ مدح نہیں تھی تو پھر مجھے کیسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس
نے مجھے کیسے مجبور کر دیا کہ میں اس طوفانی موسم میں اس کے ساتھ
نکل جاؤں اور اس کے پیچھے چلا رہوں۔ مجھے تو پہلے کا بھی علم نہیں
تھا۔ یہ یاد نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ کس راستے سے گزرا تھا۔
سڑک پر چلتا رہا تھا یا فٹ پاتھ پر۔ ایسی خوفناک رات کی تاریکی اور
دیرانی میں کسی نے ایک عورت اور ایک لڑکے کو پیدل ساتھ جانے
ضرور دیکھا ہوگا۔ بے شک فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور ڈاکٹر مشہور کے
بچلے سے وہ گھر ایک کلومیٹر ہو گا کچھ زیادہ۔ مگر مجھے راستے کے
بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔

کیا اس نے مجھے پتا ہوا کہ کیا تھا؟ اگر وہ نامر کی ماں تھی تو کیا
اسے جادو سے ملانا آتا تھا۔ میں نے سڑک پر مداری کا قاتل بار بار
دیکھا تھا جو کسی لڑکے کو سلا دیتے تھے۔ پھر نیند میں اس سے جو
سوال کیا جائے وہ جواب دیتا تھا۔ مجھے بیش شک رہا کہ مداری
لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ بچہ بھورا سوتا نہیں تھا۔ وہ محض
سونے کی اداکاری کرتا تھا۔ لیکن یہ مجھے علم تھا کہ جادو سے مداری
چاہے نہ سلائے ہو مگر کچھ لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ باتوں باتوں میں
جاتے آدمی کو سونے پر مجبور کر دیتے ہیں اور پھر اس سے نیند میں جو
کہا جائے وہ کرتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہتے ہیں۔

نامر کی ماں عام عورت تھی۔ وہ مداری نہیں تھی کہ مجھے جادو
سے سلا دیتی اور پھر اڑا کے کہیں لے جاتی۔ اس نے تو شاید پتا ہوا
کا لفظ تک نہیں سنا ہوگا۔ وہ مجھے نیند میں چلنے پر کیسے مجبور کر سکتی
تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سوچنے سوچنے میں پاگل ہو جاؤں گا۔
اس سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملے گا کہ سچ کیا ہے۔ حقیقت
جاننے کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ پاگل ہونے سے بچنے کے لیے یہ
ضروری تھا۔ حالات میری راہنمائی کر رہے تھے۔ جتنا مجھے معلوم
ہو چکا تھا اس کی مدد سے میں صحیح سمت میں پیش قدمی کر سکتا تھا۔ وہ
مدح کی پاکر تھی۔ ندائے غیب یا میرے اندر کی تواذ مگر میں اسے

نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ذہنی انتشار اور ریٹان خیالی سے بچنے کی
مجھے ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ میں قتل کا قاتل اور مقتول کا
سراغ لگاؤں۔

یہ کام بہت مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔
شام سے پہلے ہی میں ریش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ
مجھے ایک سنیما کے باہر جوئے کھانا نظر آیا۔ دو پولیس مین اس کی
گوشتی کر رہے تھے۔ سنیما کے باہر ٹکٹ لینے کے لیے شائقین کی
لمبی قطاریں اور جھوم دھم کے گوشتی کی وجہ بھی میری سمجھ میں
آئی۔ وہ ضرور ٹکٹ بلک کر پکڑا ہو گا۔ میں دور کھڑا دیکھتا
رہا۔ پھر کچھ لوگ جمع ہوئے اور پولیس والے ریش کو ایک طرف
لے گئے۔ وہ کچھ دیر بعد منہ لٹکائے نمودار ہوا اور ایک طرف چل
پڑا۔

میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ "ریش۔ کہاں بھاگ رہا
ہے غیبت۔"
دھمک گیا اس پر جو ناخوری کا زرا بھی اثر نہیں تھا۔ اس نے
بڑی گرم جوشی سے مجھے مسکرائے کہ "اے اچھا ہوا تو اچھا" میرا
موزہ خراب تھا۔

میں نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا موزہ
خراب ہونے کی وجہ جانتا ہوں۔ "کیوں کیا ہوا؟" میں اس کے
ساتھ چل پڑا۔

"کچھ نہیں یاد۔ ایک تو سالی تھیں ہی ختم ہو گئی ہیں۔ لوگ
کہتے ہیں" اندھڑی کا بھٹا بیٹھ گیا ہے۔ بھٹا تو بیٹھنے کا جب یہ فانی
ماں جی عورتیں کالج کی لڑکیوں کا بدل کریں گی۔ ٹھک آگئے ہیں
لوگ بھی۔ اپنا استاد کہتا ہے کہ کیا زمانہ تھا جب نئی فلم گنتی تھی تو
ایک کے دس بھی بن جاتے تھے۔"

"ایک کے دس کیا؟"
"یاد دس گنا قیمت پر ٹکٹ خرید لیتے تھے لوگ۔ جب دلپ
کار کی فلم "آن" ریلیز ہوئی تو ایک کے پچاس کا بھاؤ چل رہا تھا۔
استاد کہتا ہے کہ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے والا ٹکٹ تھا فرسٹ
کلاس کا۔ وہ پچاس پچاس میں بیٹھ گیا ہوا۔ سب سے آگے والا پانچ
آنے کا ٹکٹ دس دس روپے میں خرید لیا لوگوں نے۔"

"پانچ آنے کا ٹکٹ؟" میں ہنس پڑا۔
"ہاں یاد۔ چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ مگر اب تو بھٹا بیٹھ
گیا ہے۔ ٹکٹ اتنے زیادہ ہیں کہ بیٹھ میں کوئی کیسے لے۔ اور پھر
فلم ایسی کوئی نہیں جتنی جس پر لوگ ٹوٹ کر گریں۔"

میں نے کہا "یہاں تو بہت رش تھا۔"
"یہ ایک فلم بڑے عرصے بعد گئی تھی۔ دس ٹکٹ بچ کے
پچاس روپے بنائے تھے۔ دس۔ گھر نہ جانے کہاں سے آگئے۔"
اس نے جملے میں گالی کو گھیننے کی طرح جڑوا "سب جھین کر لے گئے
حرام خور۔"

میں نے کہا "مروار خور۔"

"ساروں نے مار خواہ خواہ لگائی۔ اے میرے ہائیں تو شرافت سے ملے لو۔ بد معاشی کیوں دکھائے ہو؟ پولیس سے مار کھانے کا واقعہ بتاتے ہوئے بھی اس کی خودی بندھ رہی تھی۔ وہ شاہین پچھا جو گدھ بننے کی عملی تربیت حاصل کر رہا تھا کیونکہ اس کا بھرا ہواڑوں کی چٹانوں پر نہیں کوڑے خانوں میں تھا۔

اس کی انٹ شلٹی کے لیے میں نے پچاس کانٹ نکالا۔" لے یار رکھ لے۔ تیرا نقصان تو برا ہو جائے۔"

اس نے شرمندگی سے کہا "اے چھوڑ۔ نقصان تیری وجہ سے تو نہیں ہوا تھا۔ سب چننا ہے۔ ابھی نفع تو بھی نقصان۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ تو دوست ہے میرا۔ تیرا نقصان میرا نقصان۔"

اس نے پھر انکار کیا اور مجھ سے نوٹ لے کر میری جیب میں رکھ دیا "موتولی کا رہیں ہے دوست۔ ہم تو بس نام کے رہیں ہیں۔"

میں نے پچاس کانٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیا "نہیں اب ہونا نہیں۔ دوستی میں سب سما جاتا ہے۔ دکھ بھی اور سکھ بھی۔ نفع ہو جب تو ابلیس کو دیتا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی تھی۔ وہ پولیس سے مار کھانے نہیں دیتا تھا۔ مجھ سے محبت کے دو بول تھے اس کا دل بھرتا تھا۔ ہم زمانے سے اتنی مار کھانے تھے کہ اب مار سے بے نیاز ہو گئے تھے ہم بار سے ڈرتے تھے۔

"میل بھر میں تجھے چائے پلاتا ہوں" وہ بولا "تو کھان پھر رہا تھا؟"

میں نے کہا "میں تیری تلاش میں تھا یار!"

چائے پیتے ہوئے میں نے اخبار کی فوٹو کاپی اس کے سامنے رکھ دی "یہ کیا ہے؟" وہ بولا اور پھر خیر پڑھنے لگا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں سطحوں سے اٹھی پڑ رہی تھیں۔ اس نے کافی دیر بعد کانٹ کو میز پر رکھا اور مجھے گھورنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" میں نے کہا "یہ خبر جعلی نہیں ہے۔ اور میں نے نہیں جھانکی۔"

"میری سمجھ میں ہے پھر نہیں آیا" وہ بولا۔

"میری سمجھ میں بھی نہیں آیا" میں نے کہا "اور اسی لیے میں تیرے پاس آیا ہوں میرا تو داغ خراب ہو رہا ہے" میں نے اسے تفصیل سے اپنی پریشانی کے بارے میں بتا دیا۔

"اب کیا کیا یہ وہی کہیں ہے یا کوئی اور پکڑ ہے۔" رہیں ہوا۔

"وسم بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اچھل پڑا "بالکل ٹھیک۔ اسے سب معلوم ہو گا۔ باقی سب تو مر گئے۔"

میں نے کہا "قتل ہو گئے۔ ایک قتل نامرکی ماں نے کیا۔ دو دسم نے مگر وہ ہمیں کب بتائے گا اس سے صرف پولیس معلوم کر سکتی ہے مگر پولیس کے پاس کون جائے؟ روپوت کون کھواسے؟ ڈاکٹر صاحب یہ کام کر سکتے تھے۔"

"صرف روپوت کھواسے سے کچھ نہیں ہوتا یار۔ وہ روپوت بھی ختم کر دے گا" اس نے ایک اگلی اور انگوٹھے سے قند مال کا اشارہ کیا "لیکن پتا چل جائے گا اگر اس کا قتل ہو گا۔ اس کا تو باپ بھی بتائے گا جمل اٹھ۔"

ہم ریٹورنٹ سے باہر آ گئے "کیا سوچا ہے تو نے آخر؟"

"میں اب تو دیکھتا جا اپنے یار کا کمال" اس نے ایک سگریٹ جلا کے کہا اور ڈیڑھا میٹری طرف بڑھائی "اے لپا! یہ حرام نہیں ہے۔"

میں نے انکار کر دیا "حرام" طحال کو یہاں کون پھینچتا ہے۔ بس جو کام مجھے اچھا نہیں لگتا وہ میں نہیں کر دیا گا۔ سگریٹ ہو شراب یا بیرون۔ میرے لیے سب برابر ہیں۔"

ہم خاموشی سے پیڈل چلے گئے۔ فاصلہ کافی تھا مگر ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ نامر کے چچا کا پانی آبادی کا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مگر بچے کے کہیں اور نہ چلا گیا ہو۔ وہ لاہور شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ نامر کی موت کے بعد میری دھمکی نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

میں نے خبر کی فوٹو انٹیٹ کاپی کو ایک سادہ لفافے میں بند کیا اور رہیں کے حوالے کر دیا۔ پھر میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں دسم کے گھر پر نظر رکھ سکتا تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ پتلی سی سڑک تھی جس پر اس کا مکان شاید ساتواں آنسوں تھا۔ جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی وہاں چند دکانیں تھیں۔ ایک چمچر لگانے والے کی دکان کے سامنے پرانے کا گاہہ ہارن میری صورت میں پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گئے گاؤں کے نکلنے والی مشین گلی ہوئی تھی اور موٹر سے مشین کا پیپر گھوم رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے کھڑا ہو کر دیکھتا ہوا دوڑنے کا پس پیتا رہا۔

رہیں نے دو داڑے کے قریب پہنچ کے آگے پیچھے دیکھا اور پھر لفافہ پیچے سے اندر کھسکا دیا۔ اس نے دو داڑے پر ہاتھ مارا اور فوراً سیدھا چل پڑا۔ دسم کے باہر آنے تک رہیں کالی آگے چلا گیا تھا۔ میں نے دسم کو لفافے میں سے کانٹ نکالتے دیکھا۔ اسے فاصلے سے میں اس کی صورت پر خوف یا حیرانی کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کی پریشانی واضح تھی۔

وہ کمر ہاتھ رکھ کے مجی وائیں طرف جانے والوں کو دیکھتا تھا تو مجی وائیں طرف۔ اس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ دو داڑہ بجا کے لفافہ اندر سر کھانے والا کون تھا۔ اس نے گلی میں آگے ایک

دو لوگوں سے کچھ پوچھا۔ لفافہ اور کانٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ شاید وہ دیکھ چکا تھا کہ کسی نے ابھی ابھی گلی میں کسی مشکوک قسم کے آدمی کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔ دو افراد نے نفی میں سر ہلایا اور چلے گئے۔

دسم دو داڑے پر کھڑا اپنی معافی نگہوں سے گلی کے آخری حصے تک دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ میں نے گئے کے دس والے کو ایک دھپک دیا اور اطمینان سے واپس ہو گیا۔ رہیں دوسری گلی سے گھوم کے آیا تو میں اس گلی کے موڑ پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیوں نہیں رہی؟" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"زبردست۔ اس کی قسم۔" میں نے جواب دیا کہ اس کا مطلب کچھ یہ تھا کہ اسے دن میں مارے نظر آ گئے۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چھٹی کا دوڑ دھاوا دیا "غیر وہ غیر وہ۔"

"کیسے پتا چلا تجھے؟" رہیں خوش ہو کے بولا۔

"میں دیکھ رہا تھا۔ حالت خراب تھی سارے کی۔ اندر جا کے کپڑے بدلے ہوں گے۔" میں نے ہنس کے کہا "مگر تو نے واقعی کمال کر دیا۔ بڑی معافی سے کھل گیا۔"

"اس کے گھر میں فون تو لگا ہوا ہے۔" رہیں نے کہا "میں نے ٹیلی فون کے مجھے سے مگر تک جانے والا نار بھی دیکھ لیا اور مکان کا نمبر بھی۔"

"مگر فون نمبر کیسے معلوم ہو گا؟" میں نے کہا۔

"یہ ذرا مشکل کام ہے۔" وہ بولا اس کے کسی پڑوسی سے پوچھا تو وہ ٹھک کر رہ گیا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ پڑوسی کو معلوم ہو۔ ہم اس کے کسی جاننے والے کو بھی نہیں جانتے۔ کیا خیال ہے آپاچی سے کہوں۔"

میں نے کہا "آخر یہ آپاچی کیا چیز ہے؟"

"بڑی چیز ہے پیارے۔ اور مزے والی چیز ہے۔" وہ بولا "آپاچی سب کچھ ہیں۔ مجبوراً سب مرے بھی ہیں اس پر اور ڈرتے بھی ہیں کہ بڑی نظر سے بھی دیکھا اور اسے پتا چل گیا تو بچ بچ مرنا پڑے گا۔"

میں نے خامے اشتیاق سے کہا "اس سے طواؤ یار۔"

"ہر ایک سے نہیں ملتی۔ اور ہر وقت نہیں ملتی۔" رہیں نے کہا "مگر تو مگر مت کہ میں کسی دن تجھے ضرور طواؤں گا اس سے۔ چوڑی بھول جائے گا بیٹا۔"

"اسی کیا بات ہے اس میں۔"

رہیں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تیرے لیے نہیں ہوگی۔ اپنے لیے ہے" اب تو جا میرا نام ہو گیا ہے آپاچی کے گھر جانے کا۔"

"اس کا کیا نام بھی تو ہو گا یار۔" میں نے کہا۔

"اں۔ نام تو شادان ہے۔ استاد کی بیٹی ہے۔ استاد سے شادو کتا ہے۔" وہ بولا "ہم نام اس لیے نہیں لیتے کہ آپاچی کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ کسی دن لٹکلی سے نام لگیا زبان پر تو بہت مارے

گی۔"

"مکون؟ شادو مارے گی؟ تجھے مارے گی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا "تجھے دیکھتا ہے تو دور سے دیکھ۔ مجھے لٹکلی سے تیرے ساتھ دیکھ لیا تو پوچھے گی یہ کون تھا۔"

"تو کہہ رہا دوست تھا۔"

"ایسے کیسے کہہ دوں جس سے بھی جان بچان ہو جائے اس کے باپ بھائی پہلے سب بتا دیتا ہے۔ ورنہ اپنے دوست تو وہی ہیں جو استاد کے پیچھے ہیں۔ ہم سات لڑکے ہیں اور ایک اس کی بیٹی ہے۔ اس کو بھی وہ بیٹھی کتا ہے۔ جیسے ہم سب کو بیٹھا کتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ استاد آخر کس چیز کا استاد ہے۔ کیا کرتا ہے۔"

"اے بے مت بول۔ یہ تو پولیس بھی نہیں بول سکتی ہے اس کے آگے اور میں اس کی استادی ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یوڑھا شیر ہے اپنا استاد۔ اب بھی سب کا پتہ ہے اس کے سامنے جب وہ مجھے میں دھاڑتا ہے۔ بس تو میں رک جا۔"

رہیں چند قدم آگے گیا اور مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ آگے نیکھ لٹکلی کے پاس فٹ ہاتھ پر ایک بلیک ٹائپ بوڑھی فقیہی لائٹھی کے سارے ٹھنڈی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر رنگ رنگ کے کپڑوں سے بنا ہوا پرانا میلا اور ڈھلا ڈھلا لباس تھا۔

اس کے گلے میں موٹے موٹے رنگین مشکوں والی مالا تھیں اور اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔

وہ کمر دہری گئے لائٹھی فٹ ہاتھ پر مارتی چند قدم رہیں کے ساتھ گئی۔ پھر پیچھے سے ایک لمبی سی کار آئی اور ان کے پاس رک گئی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس کا نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کی مگر اسے فاصلے سے کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں بے وقوفوں کی طرح وہاں ہٹا ہٹا کھڑا رہ گیا۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے جو مجھ سے باتیں کر رہی ہے اور اچانک وہ دو داڑے سے گزر جاتی ہے یا وہاں غائب ہو جاتی ہے۔ ابھی رہیں نے آپاچی کو استاد کی بیٹی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اس پر سب مرے ہیں مگر تھے وہ ساتھ لے کر گیا تھا وہ ایک بوڑھی فقیہی تھی اور اس فقیہی کو میں نے ایک شاندار دار کا میں بیٹھ کے روانہ ہوتے دیکھا تھا۔

رات کو میری... آگے بار بار کھلتی رہی۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی جس کی وجہ سے پہلے تو مجھے سوتا مشکل ہو گیا تھا اور جب کو نہیں بدلتے بدلتے ٹھک جانے کے بعد میں سو یا تو میری نیند خراب ہوتی رہی۔ میرا ذہن پریشان تھا۔ میں جانتا تھا کہ نامر یا اس کی ماں اور طاہر کے بارے میں نہ سنا نہ دیکھا۔ میرے اعتبار میں نہ تھا۔ میں نہ کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ دیر بعد مجھے

احساس ہوا کہ میری نظریں کتاب پر ہیں لیکن میرے خیالات کا محور دی جزو ہے۔ ظاہر کے قتل کے بارے میں سب سے پہلے مجھے اس عورت نے بتایا تھا جو خدا جاننے والی روح تھی یا زندہ حقیقت۔ مظلوم نہیں وہ ماسکری ماں تھی یا کوئی اور۔۔۔ خبریں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں تھا اور میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا مگر اس خبر کی کاپی وصول کر کے و سیم پریشان ہو گیا تھا۔ کیا خبریں اسی ظاہر کا حوالہ تھیں ماسکری ماں نے قتل کر دیا تھا۔

مجھے مجھے حرارت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا معائنہ کیا اور کہا "بخار ہے ایک سو ایک۔ آج تم کہیں باہر نہیں جاؤ گے۔ بس آرام کو گے مجھے مظلوم ہوا ہے کہ تم گھر سے باہر زیادہ وقت گزارتے ہو اور رات کو بھی دیر سے آتے ہو۔"

میں نے کہا "سر۔ پہلے میں دو جگہ ٹیوشن پڑھتا تھا۔ اب دو ٹیوشن مل گئی ہیں۔"

"آخر ایسا کون سا ذائقہ داریں گا پڑھنے کے لئے؟" وہ بولے "کیا ہیں ایسی ضروریات جن کی خاطر تم دن رات ایک کرنا ضروری سمجھتے ہو۔ چھ سویم دیتے ہیں۔ کھانا پینا سب فری ہے۔ جو ٹیوشن ملتا ہے تم پر ان سے بھی زیادہ دو ہزار ملتے ہوں گے۔ بینک میں جو رقم محفوظ ہے اس پر بھی ہر سہ ماہی ہزار روپے بڑھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ میں ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ترقی ضرور کرو۔ بہت گھری ہے اس کے لیے۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو پہلے۔ تم تو ایسا لگتا ہے کہ پیسے کے پیچھے ہھاگ رہے ہو۔"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ میں ہی نہیں سادی دنیا پیسے کے پیچھے ہھاگ رہی ہے۔ کیا وہ خود اتنا پیسہ ہونے کے باوجود اپنی دولت کو کوٹنا چاہ رہا کرتے ہے کہ اسے دن رات ایک نہیں کر رہے ہیں؟ وہ اپنی نہیں بڑھاتے چاہ رہے ہیں اور پیسے والے مریضوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ بیماروں کے وہم میں جھکا کر کے اور معمولی بیماری کو سنگین بنانے کے علاج کو طول دے کر اور بے سبب غیر ضروری دوا نہیں دے کر۔

مگر میں خاموش رہا کیونکہ پہلے ہی سب کو شکایت تھی کہ میں چھوٹے منہ سے بڑی کرتا ہوں۔ یہ جیسے ہی تھامس کے پیکر میں ناصر کی ماں کی آبرو بظاہر ہوئی اور پھر جان گئی۔ اس ہوس زرنے ظاہر کو بردہ فروش بنالیا اور بالآخر ایک مظلوم عورت کے ہاتھوں عبرت ناک موت سے رو چار کیا۔ اسی پیسے کے لالچ میں و سیم نے اپنی بھائی اور بھتیجے کو قتل کیا۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا۔

اب تک میں نے صرف ظلم دیکھا ہے اور بھلا ہے۔ مہر شکر کے ساتھ اور اسے نوشتہ تقدیر سمجھتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ شاید خدا نے انسانوں کے وہی گردہ بنائے ہیں۔ حاکم اور محکوم، ظالم اور مظلوم، قاتل اور مقتول، دولت مند اور غریب۔ محل مند اور بے وقوف۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے آسمان اور زمین نیچے ایسا ازل سے تھا اور اب تک رہے گا۔ اور لاکھوں

ہزاروں سال سے زمین پر آباد انسان نے جیش یوں ہی دیکھا ہے اور ایسا بھی سوچا بھی نہیں کہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے کیا اس نظام کو دیا جاسکتا ہے۔

لیکن۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی ہمتیوں سے ہیں۔ چونکہ مظلوم ظلم سہتا ہے اور صرف اپنی تقدیر پر اتسومنا ہے اس لیے دوسرا ظالم ہوتا ہے اور محکوم بلا چوں و چرا قبول کرتا ہے تو دوسرا حاکم کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مظلوم دونا چھوڑ دے اور ظالم کا ہاتھ قیام لے۔ اس کے سامنے جینہ پر ہو جائے اور پھر وہی کرے جو اس کے ساتھ ہوتا رہا اور جھک کر قبول کرنے والا سر اٹھا کے ظلم سامنے سے انکار کر دے اور حاکم کی جگہ بیٹھ کر کہے کہ اب تم میرے محکوم ہو۔ کیونکہ تقدیریں بدل گئی ہیں۔ تو ایسا ہو سکتا ہے۔ اور ہوا ہے۔ ظلام نے حکومت کی ہے۔ غلامان ظلام کا دور حکومت آئندہ کا حصہ ہے۔ اور مظلوم جب اٹھ کھڑے ہوتے تو ہر دور میں اور ہر ملک میں انقلاب لائے اور انہوں نے زمین کو غلاموں کے خون سے رنگ دیا۔ ان کے محلات کو کھنڈر کر دیا اور ان پر زمین تنگ کر دی۔ شاہ ایران کا دود گز زمین کے لیے دیدہ رہا تھی آئندہ کا قصہ ہے۔ دوس اور چین کے انقلاب کا قصہ برائے نام ہے۔

پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اخباروں کے علاوہ مجھے جہاں سے بھی رسالے مل جاتے تھے میں ان کا ہر صفحہ پھاٹ لگا تھا۔ خواہ وہ علمی رسالے ہوں یا سیاسی، ادبی ہوں یا مذہبی، پڑانے جاسوی بادل اور ڈائجسٹ مجھے کب انہوں سے بہت سستے مل جاتے تھے۔ خیم خانے میں اخبار یا مذہبی رسالوں کے سوا کچھ بھی پڑھنا جرم کے حوالہ تھا چنانچہ میں چھپ چھپ کے پڑھتا تھا یا باہر جا کے اپنا شوق پورا کرتا تھا۔ میں کئی بار پکڑا گیا اور مجھے یہ خرافات پڑھنے پر سزا میں لٹی مگر اس سے میرے شوق کو کمزیر نہیں کیا۔ یہ اندر کی طلب تھی اور ایک فطری پیدا کی تھی یا ہوس تھی کہ میں دنیا میں صرف زندہ نہ رہوں۔ جو دیکھوں سنوں اور محسوس کروں اسے سمجھوں۔ یہ جانوں کہ دنیا پہلے کیا تھی۔ جو حیرت نہ رہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ مجھ لوں کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں تو کیسے ہیں اور ستاروں پر کنہ کینے والی جاسکتی ہے۔

جاننے کی اور سمجھنے کی اس منہ زور اور بے مدار خواہش نے مجھے ایسا بنا دیا کہ لوگ کہنے لگے کہ تم اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی باتیں کرتے ہو۔ اس وقت مجھے بالکل ظلم نہیں تھا کہ میرا آنی کی ایک سوئیں ہے اور میں خطرناک حد تک ذہین ہوں۔ ذہانت خدا داد ہوتی ہے۔ خطرناک نہیں۔ اپنی حفاظت کے لیے دی جانے والی بندوبست سے کوئی ذرا کوہن جانے تو اس میں بندوبست کا کیا قصور۔

شام تک میں بستر پر سو رہا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ رات تک میرا بخار اتا بڑھ گیا کہ بیگم صاحبہ نے مجھے سرونٹ کوارٹر سے اندر گیسٹ بیڈ میں شفٹ کیا اور ڈاکٹر صاحب بھی خامے پریشان رہے۔

مجھے بتایا گیا کہ مجھ پر بنیائی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میرے سر اور ماتھے پر برف کی پٹیاں رکھی گئیں اور سارے جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے حکم پر مجھے ٹھنڈے پانی سے بھگو کے از کزنڈیشن کے سامنے رکھا گیا تو میرا نمبر بڑھ کر کم ہوا۔ خود بیگم صاحبہ نے رات کو کئی بار جاگ کر میری حالت دیکھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا "تمہاری حالت بہت بہتر ہے۔"

میں نے کہا "یہ اچانک اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا ہے؟"

کہنے لگے "بخار اچانک ہی ہوتا ہے۔ ٹوش دے کر نہیں آتا۔ اور کم زیادہ بھی ہوتا ہے۔ یہ غالباً لپٹا ہے۔ تمہارے کوارٹر میں بچھڑ ہوں گے۔ میں نے آج اس پرے کرانے کو کہا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو سہ۔ آپ نے مجھے بتایا۔"

وہ پھر کہنے لگے "ڈاکٹر کے گھر میں لیٹا ہے مر سکتا ہے کوئی؟ تم میرے ساتھ اسپتال چلو گے۔ تمہارے کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ ٹھیک ہونے تک تم وہیں رہو گے۔ کیا پتا یہ ٹائفاؤڈ ہو۔ ایک ہفتے سے پہلے اس کا پتا کیلڈ ٹیسٹ سے نہیں ملتا۔"

میرے انکار کے باوجود مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے کئی بار بخار چڑھا اور آٹا۔ زہریں مسلسل میرا نمبر بڑھ جات رہی تھیں اور ڈاکٹر مجھے دیکھتے آتے رہے۔ تین دن بعد میں ٹھیک ہو گیا مگر مجھے پھر بھی گھر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ مجھے مزید چار سو گئے آبرو دین میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ چاروں میرے لیے قید خانہ سے کم نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی اپنی کے اوقات میں آتے اور جاتے وقت مجھے ضرور دیکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ دن میں ایک بار بچوں کے ساتھ آتی تھیں تو میرے لیے ڈیوڑھی چھل لائی تھیں۔ بچے میرے سرانے پھولوں کا گھڑت رکھ جاتے تھے اور کارڈ جس پر لکھا ہوا تھا۔ GET WELL SOON۔ وہ شریف اور انسانیت کا احساس رکھنے والے لوگ تھے ان کے ہمدردانہ سلوک نے مجھے متاثر کیا۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اگر ایک پارٹی میں اپنے پیسے کا کاس کپکس میں جھار پڑتوں کو ان کے سامنے انہوں نے مجھے ملازم کہا تھا تو یہ ان کی معاشرتی بھجور تھی۔ خیم خانے کے پردہ کی لاوارث اور بے نام دشمن سب نسب رکھنے والے کسی لڑکے کو وہ اپنے خاندان کا رکن ظاہر نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ اس گھر میں مجھے پورا تحفظ حاصل تھا اور اپنائیت کا یہ احساس بھی میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا جو مجھے اس گھر میں رہنے والوں نے دیا تھا۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود۔

میں ان تجربات سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ دنیا میرے لیے عجیب مجموعہ تضادات تھی۔ خون کا حقیقی رشتہ و سیم کا اپنے بھائی سے تھا اور اس کے بیٹے سے تھا جس کی روگوں میں دوڑنے والا خون وہی تھا۔ اس کا اپنا خون مگر یہ رشتے نامناسب، بچہ فریب اور پُر منافقت تھے۔ ایک مکان اور قہوڑے سے زیور کی خاطر و سیم نے اپنے گئے بھائی کی بیوہ کو نہیں بخشا تھا اور پھر اس کے اکھڑے بیٹے کو

انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔

اسپتال کے گھر چننے کے بعد بھی مجھے ایک ہفتے تک گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ میرا قیام ابھی تک گیسٹ بیڈ میں تھا۔ ٹائفاؤڈ کے خطرے کے پیش نظر میرے کھانے پینے پر سخت پابندی عائد تھی۔ مجھے بھلی اور زود ہضم غذا دی جا رہی تھی اور انٹنی باؤنک دوا باقاعدگی سے دی جا رہی تھی۔ میرا بیشتر وقت اپنے سالانہ امتحان کی تیاری کرنے گزرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ ان کی بیگم کا اصرار تھا کہ نویں جماعت میں میرے نمبر اسے دن کرڈ کے تھے تو بیڑک میں میری پوزیشن مزید بہتر ہونی چاہیے۔ اگر میں نے اسی فیصد نمبر حاصل کر لیے تو ڈاکٹر صاحب مجھے سب سے اچھے کالج میں پری میڈیکل گروپ میں داخلہ دلوا دیں گے اور پھر دو سال بعد میں نے انٹرن میں بھی پوزیشن پر ترقی کر رکھی تو میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ایک بار میڈیکل کالج میں پہنچ جانے کے بعد میرے جیسے طالب علم کی کامیابی ممکن ہے۔

کورس کی کتابوں کو پڑھ کے میں بور ہو جاتا تھا تو باقی وقت کتابیں اور رسالے دیکھتا رہتا تھا جن کی ڈاکٹر صاحب کے گھر میں کمی نہ تھی۔ دو بچوں کو پڑھانے میں میرے صرف دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ مجھ سے بہت کم بات کرتی تھیں اور ڈاکٹر صاحب تو سب صبح شام کمرے کمرے سے مل پوچھتے تھے۔ ہاں بھی کیا حال ہے بیمار صاحبہ۔ اور پھر جواب سے بغیر لوٹ جاتے تھے۔ میری بیماری کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔ بچوں کو دوا دیتی تھی کہ وہ میری عزت کریں مگر مجھ سے بے تکلف نہ ہوں۔ مجھے گھر کے ملازموں سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ میں ہر حال ان کے بچوں کا استاد تھا۔ یہ عزت کا کیا نہ بھی عجیب تھا۔ معزز مسلمانوں کے سامنے میری اوقات ملازم کے برابر نہ جاتی تھی۔ نچلے درجے کے کام کرنے والے ملازمین کے مقابلے میں مجھے معزز کہلانے کا شرف حاصل تھا۔ یہ بتانے پر جگہ ایسے ہی الگ تھے اور خود ساختہ تھے۔ اور جعلی تھے۔

ایک ہفتے بعد جب۔۔۔ میری رپورٹ آئی اور یہ پتا چل گیا کہ مجھے ٹائفاؤڈ نہیں ہے تو مجھ پر سے کھانے پینے کی پابندیاں ہٹائی گئیں مگر مجھے واپس سرونٹ کوارٹر میں نہیں بھیجا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام کرنا چاہیے اور کچھ کھانے کے جان بٹائی چاہیے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ عندیہ بھی ملا کہ کئی الحال میرا گیسٹ بیڈ میں قیام رہے گا۔ جب تک کوئی ایسا مسلمان قیام کے لیے نہیں آتا جس کو یہاں ٹھہرا ضروری ہو۔

پھر اچانک ایک دن اتفاق سے میں نے ڈاکٹر صاحب کو روم اور اپنے کنبے کے نیچے سے نکالتے دیکھ لیا۔ وہ اسپتال جانے کے لیے تیار تھے۔ بیگم صاحبہ نے انہیں برف کس لاکے دیا پھر انہوں نے بڑی محبت سے پرلوم اس پرے کیا اور ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق انہیں چھوڑا۔ انہوں نے ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا اور پھر پلٹ کے سکرانے ہوئے کنبے کے نیچے سے روم اور نکال

لایا۔ میں نے انہیں کھڑی کے شیشے سے دیکھا۔ ریلواریوں نے شو فر کو دے دیا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ شو فر ان گاڑی میں خود گاڑی اور دن بھر ریلواریوں کے پاس رکھتا تھا۔ رات کو وہ اسے حفاظت کے خیال سے کچے کے نیچے رکھ کے سو جاتے تھے۔

اگر یہ ریلواریوں کے مل جانے میں نے سوچا اور ایک بار یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو پھر نکالنے نہ نکالنے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں اور پھر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا۔ بس مجھے اس کو غائب کر دینے کے بعد ایک دو ہفتے تک بالکل نارمل رہتا ہو گا۔ سب سے اچھی بات ہوگی اگر میں گھر سے کیا کرے گا۔ ہر دن باؤں نہ۔ وہ جب چاہیں میری یاد اس کر کے کی تلاش کریں۔

میرے دن قدرت نے مجھے عجیب طرح سے یہ موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے وقت لچ کے لیے آئے شو فر پر آئے میں کرسی پر بیٹھ کے کھانا کھاتا تھا۔ میں نے کھڑی کا پردہ ہٹا کے دیکھا تو وہ کھانا کھاتے کھاتے اٹھا اور بیٹھ دیا ہوا اندر چلا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے پیٹ میں گڑبڑ ہے اور وہ ہاتھ دھو کر گیا تھا۔

گھر کے باقی افراد ڈاکٹر صاحب کے خیل پر تھے۔ میں ان کے ہنسنے بولنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میرے پاس کم سے کم کچا پیٹ منٹ تھے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے کھڑی کو بھی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ آواز نہ ہو۔ پھر میں باہر اتر گیا۔ خوف سے مجھے ہینڈ آئے لگا تھا مگر میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر گاڑی تک دوڑ نہ لگا۔ اس کا دوا نہ کھولا جو گھوڑ کپار منٹ کی سائیل پر تھا۔ گھوڑ کپار منٹ لاک نہیں تھا۔ اس میں کاغذات کے نیچے ریلواری موجود تھا۔ میں نے ریلواری نکالا تو میرے ہاتھ ہی میں میری انگلیں بھی کاپ رہی تھیں۔

ریلواری کو میں نے ایک سائیل میں رکھے ہوئے کھیلے کے پیچھے رکھ دیا اور واپس کھڑی کی طرف ایک بندر کی طرح جست لگا کے میں چار فٹ اونچی دیڑھی کو عبور کر گیا اور اگرچہ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ تھے مگر میں نے خاموشی سے کھڑی بند کی۔ چٹنی لگا بکے پردہ برابر کیا اور بستر چادر اوڑھ کے لیٹ گیا۔ میرا مطلق خشک ہو رہا تھا اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

میں نے پانی پیا اور اپنی حالت کو پہلے سے بہتر محسوس کیا۔ چند منٹ بعد ہی میں نارمل ہو چکا تھا۔ اب جو ہوتا ہے۔ فوری طور پر اس چوری کا شاید پتا نہ چلے۔ ریلواری کے غائب ہوجانے کا علم رات کو واپس پر ہو گا جب ڈرائیور واپس کرنے کے لیے ریلواری نکالنا چاہے گا تو اسے گھوڑ کپار منٹ خالی ملے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ کیا ڈاکٹر صاحب ڈرائیور کو پولیس کے حوالے کریں گے؟ پولیس اسے بہت بارے کی محرومہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب ڈرائیور کو بچالیں۔ وہ قابل اعتبار ملازم شمار نہ ہوتا تو ہر روز ریلواری اس کے حوالے کیوں کیا جاتا۔ یہ اس کی غفلت ہی تھا۔ کبھی جابے کی مگر کیا وہ دن بھر گاڑی میں بیٹھا رہتا ہو گا یا گاڑی کے پاس۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اچٹال میں ڈاکٹر صاحب کی گاڑی

کمال کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی چوکی دار ہوتا ہے یا نہیں۔ دن میں شو فر کیا کرتا ہے۔ کہاں کہاں جاتا ہے اور گاڑی میں خود ڈاکٹر صاحب کتنی جگہ جاتے ہیں۔ یہ خیال کے آسکا ہے کہ ریلواری گھر میں چوری ہوا ہے۔ چوری کا امکان باہر زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے ریلواری کا لائنس نہ ہو اور ڈاکٹر صاحب اس کی رپورٹ نہ کر آئیں۔ وہ شو فر پر غصہ ہوں اسے گایاں دیں۔ ایک آدھ تھپڑ بھی ماریں۔ لیکن اس کے بعد شو فر ہاتھ جوڑے یا پاؤں پڑے تو اسے صاف کر دیں۔ دوسرا ریلواری خرید لیں۔ اور اگر غلطی کے دوران ریلواری پر آدھ ہوتا ہے تو مجھے کیا۔

اچانک ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی تھی۔ سبز صاحب قیلولہ فرما رہے ہیں۔

بیم صاحب نے جراتی سے کہا "کھانا تو کھایا نہیں ابھی تک اس نے اور سو گیا۔" پھر انہوں نے مجھے آواز دی "مہاجر۔ کیا بات ہے؟"

میں نے چادر ہٹا کے انہیں کھولیں "آپ۔ السلام علیکم سر۔"

"کیا مسئلہ ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ڈاکٹر صاحب نے میری کھانسی تمام کی۔

"کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی سر۔" میں نے کہا۔

انہوں نے فوراً بیڈ سائیل سے اٹھا کے قہر میٹر میرے منہ میں ٹھونس دیا اور پھر اعلان کر دیا "کچھ نہیں۔ کمزوری کا اثر ہے شاید۔ کھانا پیو کچھ پیو۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا اور قہر ڈاسا کھانا بھی کھایا۔ پھر بیم صاحب اور بیجے سو گئے۔ میں نے سوچا کہ ریلواری کو بہتر اور زیادہ گھونٹا جگہ پر رکھ کر کھانے کا بہترین موقع ہے۔ کھیلے کے پیچھے اسے مالی بھی دیکھ سکتا تھا جو برج دو گھنٹے کام کرنے آتا تھا۔ وہاں اس پر پانی پڑ جاتا تو وہ خراب اور ناقابل استعمال ہو جاتا۔

میں خیلوں میں اسٹے کی فراوانی کے بارے میں پڑھتا رہتا تھا اور نام کی حد تک میں ہر قسم کے اسٹے سے واقف تھا۔ اسٹو میں نے دیکھا بھی تھا مگر اسے کبھی چھوا نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے پر میں اس کا استعمال کر سکتا ہوں گا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب خود میرے پاس نہیں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری عمر کے نہ جانے کتنے لڑکے ایسے ہی اسٹے کے بل بوتے پر ڈھکی کی وارداتوں میں ملوث تھے۔ زیادہ تر پھولی موٹی واردات کرتے تھے چنانچہ پکڑے بھی نہیں جاتے تھے۔ دو چار سو یا دو چار ہزار سے محروم ہوجانے کے بعد کوئی بھی پولیس کو رپورٹ نہیں کرتا تھا۔ اول تو پولیس ایسی رپورٹ پر کان نہیں دھرتی۔ یہ جیب کتنے جیسے غیر اہم بات ہو گئی تھی۔ دو چار لاکھ چائیں تو پھر آدھی شہر چائے۔ لوگ کتنے تھے کہ چلو سہاں سی سننے چموت گئے۔ مال کا کیا ہے۔ ہاتھ کا سیل ہے۔ مودہ ہے جان کا۔

اللہ اور دے گا۔ اور کتنے والے خود بھی ڈرتے تھے سب سے پہلے مجھوں سے کہ وہ دشمن ہو جائیں گے۔ پھر پولیس سے کہ وہ کھیل خوار کر دیں گے۔

ریلواری مل جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں لوٹ مار کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے ساتھ جتنی نا انصافی ہو رہی تھی۔ جتنا ظلم ہوا تھا اور جتنی تمام عروسی کا سبب میری کمزوری تھا۔ جو زیادہ طاقت ور تھے وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ آدھی کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ کتنی پہلوانی یا کنگ سے جسمانی طاقت اور صارت کا مظاہرہ صرف کھیل کی حد تک ممکن ہے۔ انسان کی اصل طاقت بن گیا ہے اسٹو۔ زیادہ دو لچ لچائی کوئی کے سامنے بڑے بڑے سوسائٹیل اور اپنے خاں جوت ہوجاتے ہیں۔

نامر کے پاس یہ ریلواری ہوتا تو کیا اس کا بچا کچھ کر سکتا تھا؟ اس کی ماں نے بھی بالآخر اسٹو استعمال کر کے ہی ظلم سے نجات پائی۔ وہ اسٹو ایک چھری تھا جس کی ہلاکت تیزی سے ہو رہی تھی۔ اس کے پاس بھی ریلواری ہوتا تو ظاہر کے ساتھ دیکھ کر لاش بھی برآمد ہوتی۔ پھر خواہاں کی طرح میں بھی قتل کے جرم میں پھانسی چڑھ جاتی مگر نامر کو اس کا حق ضرور مل جاتا۔ زندہ رہنے کا حق بھی اور باپ کی چھوڑی ہوئی ہر چیز پر ملکیت کا موصوعی حق بھی۔ جو قانون اسے نہ دلا کا تھا۔

میں طاقت ور بننا چاہتا تھا۔ میں نے پڑھا تھا کہ طاقت ور کے لیے ہے اور قہرور کے لیے۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ ظلم اور ظلم کی طاقت کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ چکر کے زمانے کی طرح۔ یہ اسٹے کی طاقت کا عہد تھا۔ ایک ڈاکٹر کالج کے پرنسپل سے ایک بڑی تیز پر معاشی زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ لڑکا زیادہ طاقت ور تھا جس نے بلورف کی محرومی کو پہنچنے سے پہلے ہتھیار ہاتھ میں لیا تھا۔ دنیا میں بھی طاقت ور قوم دی تھی جس کے پاس انعام اور مہر اس کے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار تھے۔

مجھے یہ نامکن سا لگتا تھا کہ میں ریلواری لے کر نامر کے بچا کے سامنے جاؤں۔ اس سے اعزاز پر جرم کراؤں اور پھر اسے سزا دینے کے لیے کوئی مادل۔ میں قتل نہیں شکار کرنا چاہتا تھا بالکل اس طرح جیسے اس نے نامر کو شکار کیا تھا۔ چالاک اور سفاکی سے محصور کر کے اس کی ماں اور اس پر جینے کے سبب دواؤں سے بند کر کے ان کو ہر خوشی سے محروم کر کے ان کا سب کچھ چین کے میری خواہش تھی کہ اپنا کیا اس کے آگے آئے اس کی بیوی پر بھی دی بیٹے جو نامر کی ماں پر جیتی تھی۔ اس کا بچہ بھی اپنے باپ کا بیٹا ہونے کی سزا کائے۔

میں نے عہد کیا کہ اپنی طاقت کو پیش اپنے دفاع کے لیے اور مظلوم کے حق کی حفاظت کے لیے استعمال کروں گا۔ ریلواری حاصل کر کے اچانک میں بہت بڑا اور طاقتور بن گیا تھا۔ میں ایک لاوارث تیز چم نہیں رہتا تھا۔ چشم تصور سے میں نے بہت سے ساعز کیے۔ چشم خانے ایک چشم صوفی میرے سامنے قہر قہر کاپ رہا ہے۔

ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ مجھے اللہ رسول کے واسطے دے رہا ہے۔ احادیث اور آیت سے مجھ پر حمور مگر کی غفلت ثابت کر رہا ہے۔ کھانے دہل۔ جب محسوس ہے غلطی کرتے تھے تو مجھے یہ احادیث یاد میں آتی تھیں؟ مجھے یاد آتی تھی مولا بخش کی گمراہی جس سے تو ان بچوں کے نازک کرؤںے گئے تو نہ تھا۔ انہیں کیسے کیسے شرناک خطابات دے رہا تھا۔ جو تہم کے حق اور اس کے ساتھ نیکی کے بارے میں خدا رسول کے احکامات کو نظر انداز کرتا رہا۔ تہم کی تو سے نہیں ڈرا۔ چل مرقا بن چلا۔ آواز نکال مرنے کی۔ کہہ کہ میں کنا ہوں 'کے کا بچہ ہوں۔ بچے بھی آواز میں بھونکے۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک چشم صوفی دی کر رہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ طاقت اب میرے ہاتھ میں ہے۔ پہلے اس کے ہاتھ میں مولا بخش کی گمراہی ہوئی تھی 'اب میرے پاس مولا بخش کی گمراہی کا باپ تھا۔ پھر میں نے بنگالی کو دیکھا۔ 'نامر صاحب۔ ہوم پوت بوڈا کو بتی کیا۔ گونا کیا۔ ہاں ہم خود والا لڑکا لوگ کا آکھوں میں۔ کھاس انجکشن دیا۔ ہم شلا بوت حرا۔' وہ کاپ رہا تھا اور دوا دہا تھا۔ اس کی لنگی ملی ہوئی تھی اور ڈاکٹر میں ہو گئی تھی۔ اس نے میرے سامنے زمین پر ناک سے گیسز نکالیں۔ میں نے قہر کا اور اس نے چاہا۔ میں نے اس کو پوت سے ٹھوکر مار دی۔ اسی کی بلیوں میں 'اور وہ ابلانے تڑپنے لگا۔ اس کی لنگی کھل گئی۔

میں اس پڑا اور اس ہنسی نے مجھے تصورات کی دنیا سے پھر حقیقت کی دنیا میں کھینچ لیا۔

مجھے مزید حقیقت ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ مجھے اس ریلواری کو بلا تک میں لیٹ کر کیوں دبا دیا چاہیے۔ پولی تھیں کا شاپنگ بیک مجھے نہیں مل جائے گا یا بارہا نہیں جی پڑا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو ابھی تک چوری کا ظلم نہیں ہوا۔ ڈرائیور نے گھوڑ کپار منٹ کھول کے ریلواری کے موجود ہونے کا یقین کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی ہوگی۔ ریلواری جہاں ہوتا ہے وہاں ہو گا۔ چودہ طبق تو اس پر رات کے وقت روشن ہوں گے جب واپس آنے کے بعد دھخت ہونے سے پہلے وہ ریلواری ڈاکٹر صاحب کے حوالے کرنے کے لیے نکالنا چاہے گا اور اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

اگر اس واردات کا ظلم ہو جاتا تو ڈاکٹر صاحب اب تک خود آجاتے یا ان کا فون ضرور آتا۔ کیا تھو اپنے گھر سے میں بیٹھ کے سی ساری کارروائی کر رہے ہوں۔ پوچھ پچھ اور رپورٹ۔

میں اطمینان سے دواؤں کھول کے باہر آیا۔ میں نے فلائی پروف دواؤں سے کی آہٹ تک نہیں ہونے دی۔ میں کچھ دیر پر آمد سے میں کھڑا رہا۔ پھر شلا ہوا پروج تک گیا اور دائیں جانب گھوم گیا۔ وہاں کھلے ایک قہار میں رکھے ہوئے تھے۔

دیکھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے کھلے کے پیچھے ہاتھ والا۔ میرا ہاتھ خالی جگہ میں بھٹکا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ریلواری وہاں نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے آگے اندھرا آگیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہے۔
اس ایک لمحے میں ہزار اندیشہ ہائے دور دورہ راز کے آئینہ گت عنقریب چٹختے چلائے سوال بن کے ہر سمت سے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ کیا کسی نے مجھے روبرو کرتے یا چھپاتے دیکھ لیا تھا؟ کیا اب کوئی چھپ کے مجھ سے لڑے گا تو نہیں پکڑنے کے لیے تیار نہیں تھا؟ جیسے ڈاکوؤں کی کس کس جگہ اور مال قیمت کا سرواغل مل جائے تو نظریہ آنے والا مگر ناقابل شکست حصار قائم رکھے۔ پولیس کے مستعد جوان تک لگائے خاموشی سے ڈاکوؤں کے لوٹ کر آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ کبیں ایسا تو نہیں کر ڈاؤن ہونے مجھے روبرو چھپا کے جاتے ہوئے دیکھا ہو اور خودی خاموشی سے روبرو نکال لیا ہو؟ یہ سوچتے ہوئے کہ جس واقعے کا یقینی شائد اور گواہ وہ خود ہے اس میں مدھی بننے سے اسے سخت اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر میری عمر کا لڑکا روبرو انور پڑنے کی ہمت رکھتا ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بولنا اس کے لیے کیا مشکل ہوگا۔
نہ چوری کا جرم مجھ پر ثابت ہو گا نہ روبرو کی حفاظت میں غفلت اور کوتاہی کا الزام اس پر لیکن میں اسے دودھ گو اور کینہ پرور ثابت کر دوں گا۔ میں کہوں گا "بیگم صاحبہ" یہ شروع سے ہی مجھ سے جتنا ہے۔ آپ مجھے عزت دیتے ہیں تو اسے بڑا لگتا ہے۔ طعنے تو یہ پہلے بھی دیتا تھا کہ نہ جانے کہاں سے لاوارث حرامی لونڈے کو لائے گھر میں رکھ لیا ہے جس کے نہ باپ کا پتا نہ ماں کا۔ آپ نے جب سے مجھے گھر کے اندر گیسٹ بنے دم میں جگہ دی ہے اس کے تو سینے پر ساپ لوٹ رہے ہیں۔ آتے جاتے مجھے کچھ ضرور سناتا ہے۔ بھلا میں کیا کروں گا روبرو کا۔ اس کی اپنی نیت میں فتور نظر آتا ہے۔ آج الزام لگایا ہے، کل خود روبرو اور غائب کر دے گا اور ثابت ہو جائے گا کہ جس نے یہ حرکت پہلی بار کی تھی اور ناکام رہا تھا وہ دوسری کوشش میں کامیاب ہو گیا۔"
یہ سب ایک لمحے کے خیالات کی مدھمکی میں نے تصور کر کے دوسرے منٹ میں دیکھا کہ مجھے اس گھر سے یہ یک جہتی دودھ گوش نکال باہر کیا گیا ہے۔ ڈرائیو ر پڑا اور قابل اعتماد تھا۔ اس کی ایک لڑکے سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے کہ جھوٹ بول کے اس پر اتنا سنگین الزام لگائے بیگم صاحبہ چاہے میری مصیبت کی اداکاری پر یقین کر لیں مگر ڈاکٹر مشہور کو بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوگا۔
دوسرے لمحے میں نے اچھوڑ دیا دیکھا اور اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں روبرو کو غلط جگہ پر تلاش کر رہا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کی نہیں بائیں ہاتھ کی قطار کا تیسرا لنگھا تھا۔
روبرو ہاتھ میں آتے ہی میرے دودھ میں احساس تحفظ سے نلنے والے سکون کی لہر دو گئی۔ ٹھنڈا پینت اب بھی میرے جسم پر سہ رہا تھا مگر میں نے اپنے ہاتھوں کی لڑش پر قابو پاتے ہوئے روبرو کو پلاٹک بیک میں اچھی طرح لیٹا۔ وہ خاما بڑا شاپنگ بیک تھا پھر

میں نے اس پر رر کے پھلے چڑھائے جو میں کب سے ہی ساتھ لایا تھا۔
یہ والٹر روف پینٹنگ میں نے زینے کے پھلے حصے میں چھپ کے کی جہاں پانی کی سوزنگی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ اندر سے اچانک نکل آنے والا اور نہ باہر سے آجانے والا۔ پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد کہ اب روبرو تک پانی کی نمی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی میں نے سر نکال کے باہر جھانکا اور زینے سے اوپر چلا گیا۔ مجھے یہ خیال بھی رہا کہ پھت پھیرے قدموں کی دھک اتنی بھی نہ ہو جتنی لمبی کے پھلنے سے ہوتی ہے ورنہ نیچے کسی بندہ میں اس کی آہٹ سنائی دے گی۔
ایک منزلہ نیچے پر پانی کا ٹینک پھت کے آخری حصے میں بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مکان بنانا خرید لیا تھا۔ میں نے انہیں کہتے سنا تھا کہ ایسے پھت پر کھل بنانے والا احمق تھا۔ اب دوسری منزل بنانی پڑے تو اسے تو زنا پڑے گا اور جب تک کھلی اس سے اوپر والی پھت پر بن کے تیار نہیں ہوتی پانی کی پمپائی کے لیے کوئی عارضی بندوبست کرنا پڑے گا۔ نین کی کھلی لاکھ رکھنی پڑے گی۔ کھلی کس سے کم ایک منزل کی بلندی تک پلڑا لٹکا کے بنائی جاوے۔ تعمیر کی یہ خامی اس وقت میرے لیے آسان بن گئی۔ کھلی دس بارہ فٹ اوپر بنائی جاتی تو شاید مجھے کسی پائس کی سیزم کی مدد سے اوپر چڑھنا پڑتا اور میرے دیکھ لیے جانے کا فخر بھی لاحق ہوتا۔ میں اطمینان سے ٹھٹھا ہوا گیا اور چار فٹ اونچی کھلی کا اٹھنا اٹھایا اور اس میں روبرو چھوڑ کے کوئی آواز پیدائے بغیر لوہے کا ڈھلکا پھر بند کر دیا۔
اب کوئی... دیکھ بھی لیتا تو مجھے فرق نہ پڑتا۔ آج کل پھت پر بلیاں بڑا اودھم چاری تھیں اور ان کی محسوس آوازیں سے بیگم صاحبہ کو ہمت و شہت ہوتی تھی۔ وہ چلائی تھیں "انہیں سمجھا ڈاؤر جا کے سونا حرام کر دیا ہے انہوں نے تو" ایک بار میں نے بیلیوں بھگانے کے بعد انہیں ملنے کیا تھا کہ دونوں بلیاں نہیں تھیں۔ ایک ہاتھ تھا تو نہ جانے کیوں ڈاکٹر صاحب مسکرانے لگے تھے اور پھر بولے تھے کہ ابھی میاں بیوی میں بھی لڑائی تو ہوتی ہے نا پیار میں بھی پھر وہ آپس میں لڑنے لگتے تھے۔
جب میں واپس اپنے کمرے میں آئے لینا تو پرسکون ہونے کے لیے مجھے ایک گلاس پانی پینا پڑا۔ اس کے باوجود میری گہرا ہمت ختم نہیں ہوئی۔ شاید ہر عزم پہلی بار ایسا ہی محسوس کرنا ہوگا۔ چور ڈاکو یا قاتل۔ خوف اس کے اعصاب کو بھی شل کرنا ہوگا۔ اسے ضمیر کی تلش یا احساس جرم کی پیشانی بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ پہلی کامیابی کے بعد تو زرا سا اعتماد آتا ہے۔ اس کے بعد خوف مزید کم ہو جاتا ہے۔ دوسرا قدم اٹھانا آسان ہو جاتا ہے پھر آگے بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ حوصلہ بڑھتا جاتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جرم کی عادت ہو جاتی ہے تو احساس باقی نہیں رہتا۔

مجھے شدت سے احساس تھا کہ میں نے چوری کی ہے اور ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، جواز کیسا بھی ہو، گناہ کو ثواب اور جرم کو نیکی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اندر سے میں بہت پریشان تھا مگر میں کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے خاصی محنت سے جھوٹ بولنا پڑا اور اچھی خاصی مشکل اداکاری بھی کر لی پڑی۔
سہ پہر کے چار بجے سے چھ بجے تک میں بچوں کو پڑھاتا تھا اور عام طور پر ان کے آنے سے پہلے ہی نسا دھو کے تیار ہو جاتا تھا۔ اس روز میں حادہ آئے لیٹا رہا۔ غالباً بچوں کے بھانک کر دیکھا ہو گا اور ماں کو اطلاع دی ہوگی کہ ماسٹر صاحبہ تو سوئے پڑے ہیں۔
کچھ بعد بدو بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی "ماسٹر کیا بات ہے؟ اٹھو۔"
تیسری آواز پر میں بڑبڑا کے اٹھا "جی... آپ...! پھر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا "ساڑھے چار بج گئے۔"
"تمساری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" بیگم صاحبہ کچھ تشویش سے بولیں۔
"دوسرے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے بخار ہو... اب ٹھیک ہے لیکن کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے" میں نے کہا "تم نیچو گڈو" میں ذرا منہ دھو لوں۔"
"رہنے دو۔ آج سچے چھٹی کریں گے۔ تم ذرا تمہا میز سے نمبر پیکر دیکھ لو اپنا۔" انہوں نے مجھے بند سا ڈسے تمہا میز اٹھا کے دیا۔
میں نے پارے کو نیچے لانے کے لیے جھٹکا مگر بیگم صاحبہ کی نظریہ نہ دیکھ پانی کہ میں نے تمہا میز کو اٹا پکڑ کے جھٹکا تھا جس سے پارہ نیچے آنے کے بجائے کچھ اوپر چلا گیا۔ منہ میں لگانے سے پہلے میں نے دیکھا تو وہ ایک سو سے کچھ اوپر تھا۔ ایک منٹ بعد میں نے تمہا میز بیگم صاحبہ کو دے دیا۔
انہوں نے اس کو روشنی کے مڑ کیا "ٹھیک کہاں ہے؟ ایک سو سے... بلکہ ایک نشان اوپر۔ تم اسپرین کھاؤ۔ میں چائے بھیجتی ہوں۔ کمزوری ایسے ہی تو محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ لیٹے رہو آرام سے" انہوں نے تمہا میز کو واپس میرے سرہانے میز پر رکھ دیا۔
مجھے ان کی محبت اور توجہ دیکھ کے سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ میرے اندر کی توانائی نے کہا۔ "۳۳ حسان فراموش" کہنے شخص تو ان کا سلوک دیکھ اور اپنی حرکت پر خود کر۔ گتا بھی جس مالک کا کھاتا ہے اس سے وقار اور رتتا ہے۔ تو نے جس قتالی میں کھایا اس میں پھید کیا۔"
حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں خود اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا مگر کچھ بعد جذبات پر عمل نے بڑی عبادی سے قندہ کر لیا۔ اول تو اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ میں نے سوچا پھر ایک روبرو کم ہو جانے سے ڈاکٹر صاحب کو کیا فرق پڑے گا۔ اللہ نے

انہیں بہت کچھ دیا ہے۔ وہ دوسرا خرید لیں گے۔ نہ ان کی عزت آہو کم ہوئی ہے اور نہ مال و دولت مگر مجھے اس دنیا میں جیسے کا حق اپنے پاس رکھنے کی قوت حاصل ہوئی ہے۔ یہ طاقت نہ ہو تو نامہ عظیم کے لابی چاچے جیسے ضمیر قاتل ہر قدم پر راستہ دے دیتے ہیں اور جان لیے بغیر نہیں ملتے۔ آخر مجھے اپنی زندگی کی حفاظت خود ہی کرنی ہے۔ جن بچوں کے ماں باپ ہوتے ہیں وہ سارے غولی رشتوں کی دیوار کے پیچھے ہوائے بغض و عداوت سے محفوظ رہتے ہیں پھر چاہے ماں بھی اپنے بن کے رہے ہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے جو بے گھر ہو وہ بالآخر اپنا گھر بنا لیتا ہے، اولاد نہ ہو تو علاج معالجے، تعویذ گنڈے سے عقیدہ خانی تک کوئی سبیل پیدا کر لیتا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے ہزار وسیلے ہیں۔ محنت کر کے مشکل سے ملتی ہے اور کم ملتی ہے۔ عزت داؤ پر لگا کے اور جان بھٹکی پر رکھ کے ڈاکے ڈالنے سے بہت زیادہ ملتی ہے مگر ماں باپ کوئی کیسے حاصل کرے۔ رشتوں کی پیمان اور حوالے کہاں سے لائے؟ اس معاشرے میں جو اکیلا ہی ہے اور غریب بھی اس کو اچھے اور نیک دل لوگ خیرات میں ہر روز سے نوازتے ہوئے کہہ سکتے ہیں۔ ہائے بے چارے کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اور بد طبیعت اس پر لاوارث یا حرامی ہونے کا لیل بھی پچاس دس دان کا کوئی کیا کاڑ سکتا ہے۔
اس کے علاوہ میں نے اپنے آپ کو دیکھ لیا۔ یہ چیز بہ آسانی بازار سے مل جاتی تو میں ضرور خرید لیتا۔ خریدنے کو میں اس سے اچھی کار خرید سکتا ہوں جو ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے مگر مجھے اس کی فی الحال ضرورت نہیں۔ مجھے طاقت چاہیے جس سے مجھے زندگی کے راستوں پر کامیابی کی طرف قدم بڑھانے سے کوئی نہ روک سکے۔ محفل مجھے خدا نے دوسروں سے زیادہ ہی دی ہے۔ اب یہ مجھ پر ہے کہ میں اس محفل کا استعمال کیسے کرتا ہوں۔
میرے پاس صرف محفل ہی نہیں تھی "احساس بھی تھا۔ میں علم اور انصاف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نیکی بدی کا فرق محسوس ہوتا تھا۔ میں اچھا آدمی اور برا آدمی بنا چاہتا تھا۔ برا آدمی تو برا آدمی ہی ہو سکتا ہے مگر میں تو وزیر اعظم بننے کی سوچتا تھا۔ اس وقت بھی جب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وزیر اعظم بننا چاند کو زمین پر لاکے ذرا رنگ دوم میں لٹکانا یا پھر پادشہ کی رست پر گھبرانے جیسا مشکل کام ہے مگر مشکل کام کی خواہش کرنا بھی آسان تو نہیں ہوتا۔
شام کو میں نے بیگم صاحبہ کو خط لکھا۔ وہ لان میں ٹہل رہی تھیں۔ پرسکون ہوں تو وہ اطمینان سے بیٹھ کے چائے پیتی تھیں اور نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں۔ پریشانی میں وہ لان پر پکڑ لگاتی رہتی تھیں۔
میں نے قریب جا کے کہا "خیریت تو ہے بیگم صاحبہ" آپ کچھ ادا ہیں۔"
انہوں نے کہا "ارے بھئی ادا ہی کیا ہماری اور خوشی کیا۔

پیشے بھائے ایک پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔
”وہ کیا بیگم صاحبہ!“

”کسی نے ڈاکٹر صاحب کا رپو اور چوری کر لیا ہے اسپتال میں۔“

ان کے آخری الفاظ نے جیسے میرے دل میں پھینچے ہوئے گائے کی خلیش بھی دور کر دی اور میں نے زیادہ احمق کے ساتھ افسوس اور حیرت کا اظہار کیا۔ ”اسپتال میں؟“

”ہاں۔ فون آیا تھا ان کا۔ گاڑی صبح سے شام تک اسپتال میں ایک ہی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ دیکھ لیا ہو گا کسی کم بخت نے۔“

”کیا دیکھ لیا ہو گا؟“

”یہی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی حفاظت کے لیے گاڑی میں رپو اور ساتھ رکھتے ہیں۔ اب آوی کیا کرے آخر۔ حکومت تو بس دعوے کرتی ہے۔ نہ گھر میں کسی کی جان و مال محفوظ ہے نہ سڑک پر۔ ہر روز کئی گاڑیاں چھین لی جاتی ہیں۔ کتنے ڈاکے پڑتے ہیں لوگ مجبور ہو گئے ہیں کہ خود اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھیں۔“

میں نے کہا ”ہمت افسوس ہو رہی۔“

”افسوس کیا تا صبر۔ اب یہ پریشانی پیدا ہو گئی ہے کہ چور نہ جانے کیا کرے گا۔ ظاہر ہے ڈاکو بے گناہ رپوٹ بھی نہیں لکھوا سکتے چوری کی۔“

میں نے کہا ”رپوٹ تو لکھوا دینی چاہیے بیگم صاحبہ۔“

”تم نہیں سمجھتے ناصر۔“ انہوں نے کچھ جھنجھلا کے کہا ”رپوٹ لکھوانا اتنا آسان ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کا فون کھینچا کافی تھا کہ رپوٹ لکھوا دو تو لائن سنسنی لاد۔“

”اور کل کو خدا خواست کوئی اس رپو اور سے ڈاکا ڈالتے وقت پکڑا گیا اور اس نے بک دیا تفتیش میں کر میں نے رپو اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں سے چوری کیا تھا تو مزید پریشانی ہو گا کچھ بھی نہیں۔ پولیس والے اسے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ مجرم آپ کا نام لیتا ہے۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب انکار کریں۔“

”انکار ہی کریں گے مگر اس مجرم کا بیان بدلوانے کی قیامت تو پولیس کو دینی ہی پڑے گی۔ ورنہ پولیس کی دھونس کہ ڈاکٹر صاحب اس نے یہی بیان عدالت میں دے دیا تو ہم آپ کو بھی تفتیش میں شامل کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور آپ ہیں عزت واد آوی۔ اگر اللہ نہ کرے اس رپو اور سے کوئی قتل ہو گیا اور قاتل پکڑا گیا تب بھی یہی ہو گا۔ بس پولیس قیامت زیادہ لے گی بیان بدلوانے کی۔“

”پولیس بیان کیسے بدلوائی ہے؟“

”پولیس کیا نہیں کر سکتی ناصر۔ وہ جس سے جیسا بیان چاہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی مارے اللہ کی پناہ۔ کسی بے گناہ کو پکڑے کہ اس پر کوئی بھی جرم تصدیق ہو سکے ہیں اور اس کا اقرار بھی

کر سکتے ہیں۔“

”لیکن۔۔۔ مجرم کو یہ جھوٹ بول کے کیا قاعدہ ہو گا بیگم صاحبہ۔“

”وہ مارے قیاح جائے گا۔ ہو سکتا ہے پولیس رپو اور کو جانب کر لے۔ یہ بعد میں کسی بے گناہ کے قبضے سے برآمد ہونے میں کام آئے پھر پولیس ذہنی کی واردات کو چوری بتا سکتی ہے۔“

میرا خیال تھا کہ رات کو ڈاکٹر صاحب انہیں گے تو آتش فشاں بنے ہوئے ہوں گے اور بہت بگاڑ کریں گے لیکن انہیں نارمل دیکھ کے مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ڈرائیور کا چوکھ آڑا ہوا تھا۔ ممکن ہے اسے ڈاکٹر صاحب نے جھڑکائی ہو لیکن نہ اس کو بر طرف کیا گیا اور نہ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ ہوئی۔

جب وہ کھانے کی میز پر تھے تو میں نے پچھپ کے ان کی باتیں سنیں۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ ”اے ہو گا کیا۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم اپنی جان کیوں جھلائی ہو میری جان۔“

”ظہر کی بات تو ہے۔“

”مگر فکر کرنے اور پریشان ہونے سے رپو اور مل سکا ہے تو کھانے کے بعد ہم سب آٹھ گھنٹے قہر مند اور پریشان ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“

”آخر رپو اور کیا کیسے؟“

”چھ ماہ سے۔ بڑی ذہانت کا سوال ہے لیکن تمہارے سر کی جسم بیگم میں سے دیکھا نہیں ورنہ ضرور بتا دیتا۔“

”میرا مطلب تھا۔۔۔ کسی کو معلوم کیسے ہو گیا کہ گاڑی میں رپو اور ہے؟“

”بالکل اسی طرح۔ جیسے سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک خوب صورت بیوی ہے گھر میں۔ صرف ایک۔ اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہے کہ اس کی حسین ذلفوں کے نیچے جو سر ہے اس میں عقل اور سمجھ کا کتاب کیا ہے؟“

”آپ تو بہت مذاق میں چل رہے ہیں۔“

”میں بالکل سیریس تھا بیگم صاحب۔ جب شرف نے مجھے بتایا تو میں واقعی پریشان بھی ہو گیا تھا اور میں نے فیصلے میں اسے بہت کچھ کہہ ڈالا کہ وہ میں مجھے خیال آیا کہ اس کا کیا قصور ہے؟ نہ ہر وقت گاڑی میں بیٹھا رہتا ہے اور نہ رپو اور ساتھ لے پھرتا ہے۔ اسے بھی پتا نہ چلا اگر اسے گاڑی کھلی کھرنے آئی۔ کوئی بے وقوف چور تھا گاڑی کھولنا مشکل ہوتا ہے۔ لاک تو وہ خود بخود ہوجاتی ہے۔“

”کیس خود اس نے تو ہے؟“

”تمہارا مطلب ہے شوفر نے۔ لا حول ولاقوت۔ کتنے سال سے ہمارے ساتھ ہے وہ سوچو ذرا۔“

”آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ ریموٹ کنٹرول والے لاک

لگا لیں۔“

”اگر ریموٹ کنٹرول اور دھڑک کے بھول جاؤں تو گاڑی کھڑی رہے اسپتال میں اور مجھے گھر پیدل آنا پڑے یا پھر تصویف بنا کے گلے میں بن لوں گا کہ میں بھولنے کا امکان ہی نہ رہے۔ ہاں دوسرے طریقے ہیں۔ الیکٹرونک الارم وغیرہ۔ ویسے تو چور بیشہ زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور ایک قدم آگے ہی رہتے ہیں حفاظتی انتظامات ایجاد کرنے والے والوں سے پھر میری دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے کہ ہم نے تو جدید ترین سینیٹر لگا رکھا ہے۔ ہم اور ہماری گاڑی بالکل محفوظ ہیں۔“

”پھر اب کیا کریں گے آپ؟“

”کچھ نہیں۔“ میں کھانا کھا کے خدا کا شکر ادا کریں گے کہ چور ہمیں ساتھ نہیں لے گیا۔ ورنہ رپو اور لے کر انتظار کرتا یہی رہتا کہ وہ رپو اور پھر مجھے میری گاڑی میں اغوا کر کے لے جاتا تو گاڑی جاتی یا تمہارا انگوٹھا شہر ہوتا۔“

”اللہ نہ کرے۔“

وہ نہیں پڑے۔ ”میں بھی یہ اللہ نہیں کرتا۔ اس کے بندے کرتے ہیں۔ کسی کی قسمت اچھی ہو تو گاڑی مل جاتی ہے۔ اے سی شپ وغیرہ کے بغیر۔ اپنی خاتون میں بھی تھوڑی بہت سرجری ہوتی ہے۔ سنے گاڑیوں تو پڑانے ڈال دیتے ہیں۔ کسی کو سنبھل پھند آجائیں تو وہ بھی خال لیتے ہیں۔ اور پھر اطلاع کر دیتے ہیں کہ سہی سارک ہو گا۔ گاڑی مل گئی آپ کی۔ قسمت اچھی تھی تمہاری بیگم۔“

وہ نکل چکرانے کے ادا کرنا۔

”خیر اب ایسی خوشی کی بات بھی نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب بولے ”میں یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ گاڑی بھی گھر آگئی اور ہم بھی آگے۔ ورنہ ایک فون آتا یا کوئی پیغام کہ پچاس لاکھ دو اور ڈاکٹر صاحب کو لے جاؤ۔ اب بھلا اتنی قیمت کہاں ہے ہماری۔“

”چھائی۔ اور میری کیا قیمت ہے آپ کی نظر میں؟“

”وہ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ۔۔۔ بالکل صحیح کہیں گے یہ نکاح ہائے میں۔ اب ڈاکو لاطمی میں لے جائیں نہیں اور ٹانگ لیں پچاس لاکھ۔۔۔ تمہاری قسمت ہی کہاں تھاری۔“ انہوں نے ایک لٹھری سانس لی۔

ظاہر ہے اس کے بعد بیگم صاحبہ دو گھنٹیں اور بات کہیں اور نکل گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ دو سر رپو اور انہوں نے کب خریدے۔ شاید گھر میں بیٹے سے سوچ رہا تھا۔ میں نے حیرت سے چوتھے دن ڈاکٹر صاحب کو معمول کے مطابق رپو اور گاڑی میں بیٹھے سے پہلے شوفر کے حوالے کر دے دیکھا۔

صورتحال کے اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی معمول پر آجانے کی مجھے امید نہیں تھی۔ میری طرف تو کسی نے شک آئیز لگا دیا تھا۔ اب بھی نہیں دیکھا تھا۔ سوال کرنا تو درجہ کی بات ہے۔

پہلے بیماری اور اس کے بعد صحت یابی کے عذر پر میں نے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گھر میں گزارا تھا۔ یہ میرے لیے جبری نظر بندی سے کم نہ تھا۔ میں ختم خانے کی زندگی کے معمولات کا عادی تھا جس میں صبح سے شام تک ہم باہر کے کچھ کام کرتے تھے اور کچھ تو اوارہ گردی۔ کام ہمارا نہیں تھا مگر اسی کام نے مجھے بہت کم عمری میں وہ تجربہ عطا کیا تھا کہ میں آج اپنے بیروں پر کھڑا ہوا تھا اور میرا اعتماد بڑے لوگوں کو بڑا کر دیتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ ختم خانے والے میری جان کے دشمن بنے مجھے تلاش کر رہے ہوں گے اور کر رہے ہوں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے گھر تک ان کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میں نے فرض کر لیا تھا کہ میں محفوظ ہوں اور وہ جاہل بھی تو میں اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آئے والا نہیں۔

میری آمدنی کے ذرائع بھی مسدود ہو گئے تھے اور میں پانچ سو روپے ماہانہ کی ٹیوشن پر حاکم زندگی گزارنے کا مقصد لے کر ختم خانے کی اس جنت الاطفال سے نہیں نکلا تھا جہاں جینا ورنہ خ کے عذاب سے کم نہ تھا۔ میں نے ختم خانے کے چندے میں نہیں کیا تھا۔ لوگوں کے جذبات سے کھیل کے خوب قاعدہ اٹھایا تھا اور اپنی مظلومیت کا ڈراما ادا رکھا کہ ہمدردی کے ساتھ مال بھی سمیٹا تھا اور مجھے اپنے کئے پر کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی۔ ایک طرح سے میں ڈاکوؤں کے مال میں سرقہ کر رہا تھا۔ مال حرام۔ جائے حرام رفت والی بات تھی۔

جب بہت آہستہ آہستہ لکھا ہوا تو مجھے اس کی طاقت محسوس ہونے لگی۔ میری سمجھ میں آئے گا کہ صبح سے شام تک ہر شخص کی جدوجہد کا کیا مقصد ہے اور دنیا میں غریب ہونا کیوں جرم بن گیا ہے اور دولت مندی کے احساس میں کتنا فرق ہوتا ہے جب ہر چیز آپ کی قوت خرید میں آئے لگتی ہے۔ پہلے چھوٹی اور بے وقعت چیزیں۔ اچھے کپڑے۔ جوئے۔ اچھا کھانا اور تھوڑی بہت تفریح پھر اس سے بھی بڑی چیزیں کار کو بھی اور نوکر چاکر۔ اور بالآخر سب کچھ۔ کارخانے۔ یونیورسٹی۔ شیشیں آپ کے اشارے پر چلتی ہیں اور سیکڑوں یا ہزاروں محتاج ہاتھ سلام کے لیے اٹھتے پر مجبور ہوتے ہیں۔ قانون کی حدیں۔ ہنرمندی کی سرحدیں اور ایوان اقتدار کی تفصیل آپ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ وی آئی پی ہیں اور فقیر شہرے شاہ کے مصاحب تک سب کا ایمان اور اختیار بھی خرید سکتے ہیں۔

پھر ناصر حکیم کے قتل نے مجھے ایک اور طاقت کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ تھی بدعاشی کی طاقت جس کی لامعنی اس کی ہمیشہ والا علامہ بدل کے یوں ہو گیا تھا کہ جس کی کھاتخوف اس کی بادشاہت۔ عدالت کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز بنج اصول انصاف کے خلاف۔ نبوت اور شہادت کی عدم موجودگی

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت



قیمت فی جلد
250
روپے

دو جلدوں میں مکمل

غور و محول چکیروان کے خون آشام عہد کی ایک جنگ
کوہ الہائی کے برف پوش پہاڑوں سے اگلے والے ایک وحشی نوجوان کا قصہ جس
کا نام سن کر مشکوٰۃ بھی کانپ اٹھتے تھے
شیر عارم جمال الدین کے کیا ختم کمانی تھی؟
پہاڑوں سے نکلنے والے چٹانوں سے لڑنے والے اور طوفانوں سے لڑنے
والے وحشی دیوانے کی داستان حیرت
تاریخ کے دھندلے چھپے گوشوں سے کشید کیا یہاں قابل فرائض ناول

مہترین کمپوزنگ، خوبصورت طبع اور مردہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگولے کا پتہ:-
علی بیگ مشینری
7247414
علی بیگ مشینری
نسبت روڈ، چوک میوہ پتال، لاہور

جا ہے گا۔ میں بتا رہا تھا۔
وہ ہنسا۔ بتا رہا تھا؟ سالے یا رہی کتا ہے اور گولی بھی دتا ہے۔
صحت دیکھ کے لگتا ہے تو میری کاٹان گیا ہوا تھا۔
”دو دن تنہا رہا آیا تھا مجھے مگر ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں
نے لہجہ لٹائے رکھا اور لینے لینے جان بنانے والی خوراک کھانے
سے ایسا ہی ہوتا ہے“ خیر تو بتا۔
”میں کیا بتاؤں۔ ایک ہفتے سے تلاش کر رہا ہوں تجھے تو نے
ڈاکٹر صاحب کا نام تک نہیں بتایا کبھی۔ نہ فون نمبر یاد دہن میں پہنچ
جاتا۔“
میں نے کہا ”نہیں یاد۔ وہ کون سا میرا گھر ہے؟ تیرا وہاں
تکا۔“
”کیوں؟ بے عزتی خراب ہوئی تھی؟“ وہ دل زدہ لہجے میں بولا۔
”اے نہیں۔ میری وہاں کون سی عزت ہے مگر ان بڑے
لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہوا ہوا پورا بستر بھی گولی کھیں۔
ایک ٹھکانا ہے وہ بھی نہ رہے۔“
اس نے اپنے سر پر ایک شرمندگی کی نظر ڈالی ”چھا جاؤ۔
میں آؤں گا اس جیلے میں۔ جس دن سوٹ بوٹ ہو گا اپنے تن پر۔
اور گاڑی ہوگی اپنے پیچھے تب آؤں گا۔“
میں نے کہا ”کوئی خاص بات تھی؟“
”خاص بات۔ ہاں۔ وہ تجھ سے ملنا چاہتی تھی۔“
”وہ کون؟“ میں نے کہا ”تیری آپائی!“
اس نے مجھے آنکھ ماری ”بڑی جلدی سمجھ گیا مطلب کی
بات۔“
”کیا تو نے ذکر کیا تھا میرا؟“

”ہاں کچھ زیادہ ہی ذکر کر دیا تھا۔ کتنے گلی کہ اپنے دوست کو
ساتھ لاؤ کسی دن۔ میں نے کہہ دیا کہ کل ہی لے آؤں گا۔ اس کے
بعد تو مصیبت ہو گئی میری۔ تو ملا نہیں اور وہ ہر روز پوچھتی رہی پھر
غصہ ہونے لگی مجھ پر کہ کیا بات ہے۔ بھوت بولا تھا مجھ سے۔ تیرا
کوئی ایسا دوست نہیں ہو گا۔ میں نے قسم کھائی تو کتنے گلی کہ پھر تو
اسے لا آؤں نہیں۔ یا وہ آتا نہیں تیرے ساتھ۔ مجھ سے ملنا نہیں
چاہتا۔ میرے بارے میں کیا بتایا ہے تو نے اسے۔ میں کوئی چہل
ہوں یا بلا ہوں۔ آج تو شیل میرے ساتھ تاکہ میری جان بچوئے۔
مجھے بہت ڈر لگتا ہے اس سے۔“
”کیوں ڈر لگتا ہے؟ ایک عورت سے۔۔۔“
”اے یاد آؤں لگتا ہے اس کے باپ سے۔ وہ بڑا جلاہ ہے۔
ویسے تو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتا۔ تو خود اپنے جلی پین سب کرتے
ہیں لیکن اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے سامنے
اوپر آواز میں بات کرے اور اسے دھمکی دے۔ یہ سمجھنے لگے کہ وہ
بھی استاد سے کم نہیں اور جب چاہے ایسے ہی اپنا دھندا شروع
کر سکتا ہے۔ اس کا کتا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اس شرمیں

میں ایک مستند بسری شہید معاش اور حلیم شدہ ڈاکو“ قاتی کو ایک
دن کے لیے جیل بھی نہیں بھیج سکتا تھا لیکن وہ جس کے ہاتھ میں
کلا شکوف تھی۔ کوئی بے شعور جاہل یا سن شعور تک نہ جینے والا
نوعمر لڑکا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ وہ قانون کی دھجیاں کھیر سکتا تھا۔
عالم کی دستاویزیات کو بیروں کے روئے دکھاتا تھا۔ عزت و ناموس
سے کھیل سکتا تھا اور پھر سرعام نکالنا چ سکتا تھا۔

یہ سب غلط تھا مگر ہو رہا تھا اور اسے روکنے کے لیے دردی
پوش قانون کے رکھوالے۔ کالے کوٹوں والے وکیل اور گاڈن اور
وگ پین کے جینے والے منصف کچھ بھی نہیں کر پارہے تھے۔
قانون کی کتابوں کے حوالے نہ تھے جیسی محفلوں کے احکام معاشرتی
اخلاق کے ضابطے، عقل کی دلیل اور نالہ و فریاد سب بے اثر اور
لا حاصل ہو گئے تھے۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا زمانہ تھا۔
شہروں میں جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسان نہیں درندے
تھے چنانچہ ان سے گولی کی زبان میں ہی بات کی جاسکتی تھی۔
بہت کم عری میں ہی میں نے دولت اور طاقت کے حصول کی
عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ میں نے تلخ تجربات سے یہ سیکھ لیا تھا
کہ دنیا میں عدم تشدد کا فلسفہ کیس بھی نہیں چلتا اور نہ ایک گال پر
تھپڑ مارنے والے کو دوسرا گال پیش کرنے سے ظالم کا ہاتھ رکتا
ہے۔ اس کے لیے جنگ ضروری ہے۔ بد معاشی کا جواب بد معاشی
سے دینے کی طاقت نہ ہو تو شرافت کا دعویٰ مذاق بن جاتا ہے اور
کمزوری کی علامت۔ برائی کا راستہ روکنے والے کے ہاتھ میں بھی
کلا شکوف نہ ہو تو تکی کا تصور باقی نہ جاتا ہے۔ نیکی نہیں رہتی۔

میں نے ایک عہد اپنے آپ سے کیا کہ کبھی میرے پاس
طاقت ہوگی اور دولت ہوگی یا اقتدار اور اختیار ہو گا تو میں لکیر کے
اس طرف رہوں گا جدھر انسانوں کی اکثریت ہے۔ شریف اور نیک
اور خدا ترس۔ امن پسند اور محبت کرنے والے اور باخیر لوگ جو
وامض اکثریت رکھنے کے باوجود کمزور اور محکوم و مظلوم ہیں جب میں
اپنا اور ان سب کا دفاع کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا تو طاقت یا دولت
کے استعمال سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں کبھی تکیر کے دوسری
طرف کے درندوں کی صف میں شامل ہو کے انسانیت کی تذلیل
نہیں کروں گا۔ آخر خدا نے مجھے کیوں اشراف المخلوقات بنایا ہے۔
جب بالآخر میں نے رئیس کو تلاش کیا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونپکا
”ہاں!“ اسے تو نے زندہ ہے۔ میں تو سمجھا تھا مر گیا۔“
”کیوں؟ یہ خیال کیسے آیا تیرے دل میں؟ نہیں نے کہا۔“
”اے بھائی! کچھ مرنے نہیں ہیں۔ آجاتے ہیں کسی بس نرک
کے نیچے ایسے ہی بیٹھے ہوتے ہیں گیس اور نہ جانے کسی کی کوئی
آگتی ہے تیرے پیچھے تو دشمن بھی بہت لگے ہوئے تھے تو نے خود
پنگالے کر لگائے تھے۔“

میں نے کہا ”ایسی کی تھی دشمنوں کی۔ تیرے جیسے دوست
ساتھ ہوں تو پھر ڈر کیا۔ موت تو اسی وقت آئے گی یا جب اللہ

کوئی اور استاد نہیں ہو گا۔ ایک ملک میں دو بادشاہ اور اس شہر میں دو استاد نہیں ہو سکتے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک دولڑکوں نے کوشش کی تھی تھی اپنے کھیل جانے کی مگر استاد بت پرانہ امی ہے اس نے ایسا جملہ پھیرا کہ ان کا مشر فتر ہو گیا اور وہ کو وقت گون ہو گئے۔

”کیا مطلب؟“

”گوشت گون کا مطلب ہے وہ گئے اور ایسے گئے کہ کسی کو بچا نہیں کہاں گئے۔ غائب ہو گئے پیش کے لیے۔ ظاہر ہے مارویے گئے۔ دراصل استاد اس دھندے میں کسی کا دخل نہیں چاہتا۔“

وہ راز داروں سے ہوا "بھیک مانگنے کے چندے میں۔ اس شہر کے سارے فقیروں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی فقیر بن کے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکا۔ پہلے اسے استاد سے معاملہ فہم کرنا پڑے گا۔ استاد اجازت دے گا، جبکہ بتائے گا اور جبکہ کے حساب سے خزانہ مقرر کرے گا۔ اب یہ مرضی ہے وھذا کرنے والے کی کہ وہ روز کا حساب رکھے یا مجھے کے مجھے حساب صاف کر جائے۔ جہازت کو خیرات زیادہ ملتی ہے اور مجھے کو بھی نماز کے بعد۔ سارے فقیر استاد کے کنٹرول میں ہیں۔ کوئی گریڈ کرے جیسے دوسرے ہفتے میں گول ہو جائے تو پھر اس کی ہفتے کی رات ہی سخت گزرتی ہے، حوالہ میں۔"

۳۱ سے پولیس پکڑ لیتی ہے ۳۲

”ہاں۔ رات بھر میں غالی یاد آ جاتی ہے۔ صبح استاد خود جا کے ان کی سفارش کرتا ہے اور ان پر جرمانہ لگاتا ہے۔“

”خزانہ یہ کہ اب اس کے دو حصے یا چار حصے خزانہ ذیل کوئی
انتار کرے تو پھر اتوار کی رات ٹائی کو بھی مانی یاد آجاتی ہے۔
دراصل استاد بھی مجبور ہے۔ اسے ہر بٹے قحانے میں گلی بندھی رقم
چھانی پٹی ہے۔ قحانے والے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے
اور کوئی بھانہ نہیں مٹنے۔ استاد کو جتنا خزانہ ملتا ہے اس میں سے
آدھا جو کہیں لیتی ہے۔ نصف نفی فنی پر کام چل رہا ہے۔ نیسے یہ منکھور
نہیں وہ دھندلا چھوڑ دے یا شہر چھوڑ دے۔ کوئی اور کام کرے شفا
جو کہ میں یا کسی دکان پر اور کسی کے گھر میں۔“

میں نے کہا تو نے دوسری بات نہیں بتائی جس پر استاد کو بہت فخر آتا ہے۔

”اے میں نے پہلے بھی بتایا تھا تجھے آپاچی اس کی بیٹی ہے کوئی اسے بڑی عمر سے بھی رکھے یا اس کے بارے میں زبان سے بڑی بات نکالے تو استاد باکل ہو جا تا ہے۔“ اس نے جھرمجھری لے کر کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ ”خود میں نے دو بار دیکھا ہے انہیں کھانکے اٹا لٹکا دیا تھا استاد نے۔ استاد کے پاس ایک جاکب ہے جیسی آٹھ والوں کے پاس ہوتی ہے۔ ایک بیہوش ہے۔ لمبی لمبی لکیریں

پڑی جاتی ہیں کھال پر اور ان سے خون رسنے لگتا ہے۔ جن پر استاد کو تک ہو کر سالے زیادہ حرامی ہیں۔ ان کو کھلا کے دکھاتا ہے اور ان کے سامنے زخموں پر تنک لٹائی دلاتا ہے۔ اور کیا باتیں کہی کہی جگہ۔ جلی کے تار مار کے منگے رہتا ہے وہ ایسے پیٹے ہیں اور ایسے نہ پتے ہیں کہ توہ۔۔۔ مننے والا کوئی نہیں ہوتا وہاں اس لیے ان کے من میں کپڑا نہیں ٹھوسنا جاتا۔ جو ہنستا ہے اور دکھتا ہے اس کو اندر سے کچھ ہونے لگتا ہے مجھے تو لگتا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ پکڑ آئے گے تھے اور دھلی ہو رہی تھی۔“

میں نے کہا ”مجھے زیادہ مت ڈرا ورنہ میں تمیں جاؤں گا
تیرے ساتھ۔“

وہ ہنس پڑا "مردے پاگل خانے" تو نہیں جائے گا تو شامت
میری آئے گی۔ اور تو بھٹکتا کیا ہے خود کو۔ اس نے شکایت کر دی تا
باپ سے تو تجھے جانا پڑے گا۔ تیرا تو باپ بھی جائے گا۔ اپنے ساتھ
رخصتی مت کر۔"

میں نے کہا ”دیکھ کر نہیں۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ زندگی مجھے بھی اس وحشت پر مجبور کر سکتی ہے۔“

”بے فیس اور بد نظریہ ہو کر رہا جاتی ہے۔ ملنا چاہتی ہے قحط سے تو اس کا مطلب ہے کہ تیری کوئی بات انجمنی گئی ہے اس کو۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ تمہاری یہ بات سچی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ میرے ساتھ۔ ایک فضیلتی بھی، کمزوری۔ وہ تیرے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئی تھی۔“

وہ مجھے دیکھا ہوا اور بھر سہلایا ”ہاں۔ تو بھی آج اسی کار میں جاؤ گے ہمارے ساتھ۔“

○☆○

تیمور کو اپنے ساتھ کراچی لے جاتے ہوئے مجھے یہ بہت بُرائی بات یاد آئی تھی۔ شاید اس وقت تیمور کو دیباہی محسوس ہو رہا ہو جیسا میں نے غصے کی تھوڑی خف زوہ قمار کے اپنے خوف کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے زہل گیم کھیلا تھا۔ ایک ساتھ دو بازاں شروع کر دی تھیں۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے شہوں کا انتخاب کیا تھا اور ہر چال تمام امکانات کو پیش نظر رکھ کے چلی تھی۔ ابھی تک اسے جین تھا کہ ہریاڑی اس کے ہاتھ میں ہے اور جیت اسی کی ہوگی۔ اگر وہ دونوں بازاں جیت لیتا تو اس کے ڈوہرے فوائد حاصل ہوتے۔ وہ شاہ عالم پر اپنی ذہانت معاملہ فہمی اور مشکل کشائی سے ثابت کر دیتا کہ لحاظ قدرت اس کی اہمیت اور ضرورت دیگر سب سے زیادہ ہے اور شاہ عالم کے لیے اس کی دست راست والی حیثیت برقرار رکھنا کتنا اہم ہے۔ وہ میرا اعتماد بھی حاصل کر لیتا اور شاہ عالم کا بھی۔ اگر وہ ایک بازاری بھی جیت لیتا تو تھان میں بھر بھی نہ رہتا کہ اسے یہ قسمی کہتے یا اندازے کی غلطی کہ وہ دونوں بازاں ہار گیا۔

اس کا بڑا وقت اور تھم چکا ہے کہ اس نے خور کو سب سے سنا ہے

لایا تھا جب کہ نہ وہ شاد عالم سے زیادہ مہیا تھا اور نہ مجھ سے زیادہ
 ہشیار۔
 اس نے شاد عالم سے کہا کہ اگر اس مرد روز کی عمر تو میں مختصر
 کرانا ہوں۔ آپ گھر بیٹہ نہ کریں۔ اس نے شاد عالم کو بھجایا ہو گا
 کہ یہ کام مجھے ہو گا اور اسے یقین دلانے میں کامیاب رہا ہو گا کہ
 میں یعنی ناصر عظیم آسانی سے اس کے ذیلی کینٹ کا بدلہ قبول کرنے
 پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ وہ ایک گانگ میں پیش کئے، مرد روز کو آپ
 کا ذیلی بدلہ کرنے والا قتل کئے گا لیکن آپ الزام سے محفوظ
 رہیں گے۔ اگلا اس جھوٹ سے آپ کے حریف ذلیل و رُخسوا ہوں
 گے ناصر عظیم یہ کام کوئے پراس کا کام تھا۔

مجھ سے اس نے دوسرا سوچا ہوا۔ اس نے کہا کہ شاہ عالم کو ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کی ضرورت ہے اور اگر میں جاہلوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکوں ہوں۔ میں شاہ عالم کے ذیل کا دھوکا کرنا شروع کر رہا تھا اور جب اس کے برسرِ اقتدار آنے کا وقت آئے تو میں وزیرِ اعظم بن جاؤں۔ شاہ عالم اس قابلِ فہم نہیں اور وہ بہت غلط آدمی ہے۔ وہ میرا دشمن ہے۔

میتا میں شاد عالم کو جانتا تھا تا ہی شاد عالم مجھ سے واقف تھا۔ ایک بار اس نے سوئٹل ور کر کر حیثیت سے میرے ساتھ فراڈ کیا تھا اور میں نے اس کا فراڈ پکڑ لیا تھا۔ وہ کبھی مجھے اپنے ذیلی کرٹ کے طور پر قبول نہیں کر سکتا تھا مگر مرد راز کو میرے ہاتھوں قتل کرانے کی اسکیم اسے پسند آئی تھی اور تیور کی زمین دانی پر اس نے کہا تھا کہ اچھا۔ اگر تم یہ دتے دار کی قتل کرتے ہو تو تمہیں میری آشریہ حاصل ہے۔

یہ جھوٹ کی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑکی کی جالے والی عمارت تھی۔ تیور کی بدجنی، پھر اس وقت کل مئی مئی جب شاہ عالم کے گھر میں اس نے مجھے ٹھہرنا رکھنے کے لیے براجم پٹہ افزاوی خدمات حاصل کی تھیں۔ وزیر کیراگ کے مجھے بلک میل کیا تھا اور مردراز کے معاملے میں غلط خیالی سے کام لیتے ہوئے مجھے ایک جعلی قرارداد تھما دی تھی۔ وہ جعلی افراد میرے ہمراہ کوسہ تھے اور مجھے مضامین کے مشن پر بھیجے کے مردراز کو میرے ہاتھوں سے قتل کر دیا تھا۔

اگر میں پکڑا جاتا تو وہیں مار دیا جاتا اور تیمور شاہ عالم صاف انکار کر دیتے کہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے۔ یہ کہی کہیں ہو گیا تھا جسے شاہ عالم کی ذات پر کچھ اچھا لگنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ تیمور کا کھیل اس وقت خراب ہوا جب میں نے چنار اور خان اعظم کے بیٹروں کو جانے سے انکار کر دیا۔ یہ حقائق بخود دست میرے کام آگیا۔ میں بچ کر نکل آیا۔ چنار اور خان اعظم جیسے مخالفوں کے ساتھ میری راہ میں مائل ہونا آسان بھی نہ تھا۔

عمر دراز کے بارے میں بھی تیور نے جتنا جھوٹ بولا تھا اس کا اندازہ مجھے عمر دراز سے ملنے کے بعد ہو گیا تھا۔ جعلی قراءات، جعلی

3 ☆ ماری .

ایگزیکٹو کمیٹی کے اراکین کے نام اور خطہ شیمنے پکڑ لیے۔ جیل نائب صدر کے فرار ہو جانے سے بھی سازش کھل کر میرے سامنے آئی۔

تیمور کا اپنے مگرے نائب ہو جانا مجھے خدا حافظ کہہ دینے کے مترادف تھا۔ فیروز شاہ عالم نے ہر دو "احسن درجہ" اول اور بے وقوف کلاس دن۔ تم ہے جو کام مجھے لینا تھا وہ تم نے کر دیا۔ آگے تساری قسمت۔ تم مرد راز کے محافظوں کے ہاتھوں مارے جاؤ یا مختل کارکن جسیں ہلاک کر دیں، مجھے یا شاہ عالم کو فرق نہیں پڑتا۔ ابھی تم جان بچا کے روپوش ہو گئے ہو تو ممکن ہے کہ ہم نے بے لٹھی کی کوشش کر۔ تم بہت جلد کو کے بہت شرمندہ لڑا کو کے مگر ہمارا جواب ایک ہی ہو گا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، کون ہو تم، تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے کیا تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟"۔

تیورم کی بازی اس وقت چلی جب تقدیر نے مدح کو مات دی اور ایک معمولی اشفاق کو بہانہ بنایا۔ تیورم ایک کام سے تھکے ہوئے تھا اور اس کی بدقسمتی کہ مجھے جلیل وہاں سے لگی جہاں جانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کسی اور ادارہ سے بے گھلا تھا مگر جو اتحاد ہو کے رہا۔ جب ایوکر آزادانہ مجھے گھر پہنچانے کے لیے لٹھ دی جسی گران کو تھانے میں کوئی کام یاد آ رہا تھا میں نے تیورم کو کچھ لیا۔ اس کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس سے میری ملاقات ہوگی۔ اس نے تو فرض کر لیا تھا کہ میں ڈر کے مارے کیس منہ چمپائے بیٹھا ہوں۔ وہ بے بسی بھی ایک منہ بعد وہ نکل جاتا۔ تیورم کی کمان میں قانع عالم کھلانے والی بیوٹھری فورس تھی۔

اس میں نوجوان اور بوٹیلے کارکن تھے جن کے جذبات کو ناداری کے نام پر اُبھارا جاتا تھا اور انہیں جاڑیوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ان کے ہاتھ شورو کی تربیت یوں کی گئی تھی کہ ابھرا غلام قصور کے لیے مارنے کو جہاد اور مرنے کو شہادت سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اسلحہ تھا کہ انہیں شاہد عالم اپیلی اور منصور کے لیے چٹا نر کوڑا لگایا تھا کہ وہ اپنی عقل سے کام نہ لیں اور گھبرانے والے کے عمل تابع ہوں۔

تجور چاہا کہ اور بے خبری میں پکڑا گیا تھا اور اسے ملتے سی نہ لی تھی کہ وہ کسی سے رابطہ کر سکے اگر وہ نکل جاتا تو پھر یہی اس تک رسائی ناممکن تھی۔ اس کے خلاف یہی راہ میں دواہن جاتے اور میرے عرائم کو کیا مجھے خاک میں ملا دیتے جس میں شاہ عالم کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا دیکھا جاتا۔ سیکرٹری فورس میں بھی باورنی کے جانثار ضرور شامل ہوں گے۔ پولیس ان کے اشارے پر کسی خطرناک یا مشکوک شخص کو گرفتار کرنے کی پابند تھی۔ امیر تجور کو ذرا مل جاتے بغیر میں یعنی شاہ عالم خود اپنے گھر میں پھنپ کر بھی ہواظر آئیں اور یہ سب کچھ تھا۔

ابھی یہ کتنا مشکل تھا کہ اصل شاہ عالم کے واپس آ جانے کے

☆ 43 دوسرا حصہ

بعد میرا کیا اہتمام ہوتا۔ امن، انصاف، آزادی کی نام لیا اور علیحدہ دارپائی کے چیمبریں اور اس کے دست راست امیر تیمور میرا کیا اچھڑا کر گئے۔

وہ مجھے سی آئی اے یا ایف آئی اے جیسے دہشت ناک قہقشی اداروں کے حوالے کر سکتے تھے کہ اس جعلی شاہ عالم کی نیت اور اصلیت کا چٹا چٹا جائے۔ اس نے مرزا کو قتل کیا تو کس کے اشارے پر۔ صورت سے مشابہت کی بنا پر اس کو شاہ عالم کے کسی سیاسی حریف نے آواز کار کے طور پر استعمال کیا تھا اور اس نے یہ کام لالچ میں کیا تھا یا کسی اور وجہ سے۔ جب تک میں اپنی شناخت کا ثبوت لاتا یہ مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق اعتراض جرم کی تحریر حاصل کر لیتے۔

ہمارے قہقشی ادارے اس معاملے میں بڑے نیک نام ہیں۔ یہ بات اخبارات کے ریکارڈ پر ہے کہ ایک کیس میں عدالت عالیہ کے کسی جج کو ایک فائل پیش کر دی تھی جس میں سادہ کاندہ پر طرم یا کسی گواہ کے دستخط حاصل کئے گئے تھے۔ پولیس تمام قانونی شکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بعد میں اس پر ایسا بیان لکھتی جس سے کیس کا نسخہ وہ اپنی مرضی سے چھڑھا جیسے مولیٰ تھے وہ ایک طرح سے بلیک جیک تھا۔ اس پر کچھ بھی تحریر کیا جاسکتا تھا۔ وہ بیان جس سے طرم پر جرم ثابت ہو جائے یا ایسا بیان جس سے ملازم کو شک کا فائدہ حاصل ہو یا وہ صاف بری ہو جائے۔ انھما اس رقم پر تاجروں کی بدعاطی ادا کرتے۔

عدالت عالیہ کے جج نے بھی اس دیدہ دلیری پر پولیس کے خلاف برہمی کا اظہار کیا تھا مگر صورت حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اگر آئی تھی تو مزید خرابی کی صورت میں آئی تھی۔ اب تو مکمل بولی گئی تھی۔ ابھی پرچا نہیں کا گیا۔ سوچا لو جلدی کرو۔ پرچا نہ کانے کا ریت بھی ہے تاج کل۔ اگر پرچا کا نا ضروری ہے تو عام قانون کے تحت قیمت ادا کرو زیادہ سے مگر ضمانت آسان ہے اور جان جلد چھوٹ جائے گی۔ حدود آرڈی نہیں میں ریت کم ہے مگر عام عدالت سے ضمانت نہیں۔ ہائی کورٹ کی شریعت بیچ اور شریعت ایبیلٹ کورٹ کا معاملہ لیا ہے اسلئے ایکٹ میں پرچا کاٹ دیا تو کوئی ضمانت نہیں اور آئندہ دہشت گردی کی خصوصی عدالت سے سزاؤں اور زیادہ سخت ملے گی۔

مجھ سے بھی ایک سادہ کاندہ پر دستخط حاصل کر لے جاتے اور سترے راج الوقت کے حساب سے میرا بیان خود پولیس لکھتی، انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ تھوڑی سا سنسن نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک جرم کا اعتراف دس افراد سے کرایا جاسکتا ہے اور ناکہ جرم کا اقبالی بیان پڑھنے اور یاد کر لینے کے بعد خود طرم کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ بے گناہ نہیں۔ ہر طرم کے لواحقین ضرور ہوتے ہیں۔ پوری بچے یا باپ اور بھائی ہیں۔ انہیں بچانے کے لیے وہ عدالت میں بھی اس بیان پر قائم رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اگر میں انتہائی سخت جانی کا مظاہرہ کرتا۔ پولیس کی زبان میں بڑا بڑا ثابت ہوتا اور اپنی بے گناہی کے موقف پر مڑے دم تک قائم رہتا تو اخبار میں ایک اور خبر آتی کہ زیر قہقشی طرم نے حالات میں ازارد سے گئے میں پندرہ اڑال کے خود کشی کر لی۔

پولیس کے چکر میں پناشاہ عالم ایڈ جینٹی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ پولیس انہیں بھی بلیک میل کرتی۔ ان سے بھی قہقشی کے پسندیدہ نتائج حاصل کرنے کی پوری قیست لیتی۔ پیسہ خرچ کرنے کا مقابلہ ہوتا تو میں جیت جاتا۔ میرے لواحقین بھی کمزور نہیں تھے۔ ڈاکٹر کمال قادیانی عام آدمی نہیں تھے پولیس پریشان کر سکتے کرل خان پر ہاتھ ڈالنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ ان کے ہوتے چندا یا قمر کا کوئی کیا بچاؤ ہو سکتا تھا۔ تھانے میں پولیس کی مرضی کا بیان دینے کے بعد میں عدالت میں اس بیان سے بھر سکتا تھا اور اسے تھوڑا سا نتیجہ قرار دے سکتا تھا۔ میں اصل حقائق بیان کرتا تو شاہ عالم اور امیر تیمور کی مٹی پلید ہوتی۔

چنانچہ زیادہ امکان یہی تھا کہ شاہ عالم کی واپسی کے بعد میری چھٹی کر دی جاتی۔ وہ بھی اسی اصول پر عمل کرتا جس پر میں عمل کرنے جا رہا تھا۔ ایک وقت وہ شاہ ایک ہی شریں اور ایک ہی ملک میں نہیں ہو سکتے۔ اصل کو رہنا چاہیے۔ نقل کو مٹا دینا چاہیے۔ بس فیصلے پر عمل درآمد میں پل میں نے کر دی کہ نقل کو رہنا چاہیے اور اصل کو کسی کے سامنے آنے سے پہلے ناب ہو جانا چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر خرابی یہ ہوئی کہ گھوڑے نے پہلے چھوٹ کر مار دی۔ گھوڑے کو دوا دینے والا وہی کر رہا تھا جو حکیم صاحب نے کہا تھا۔ گل میں دوا بھر کے اور گل گھوڑے کے من سے لگے کے زور سے چھوٹ کر مارا۔

اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ شاہ عالم مجھے زندہ رہنے کی اجازت دینے پر تیار ہو تا تو اس کی کچھ شرائط ہوئیں۔ اور یہ بالکل ناممکن تھا کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔ فراخ دلی سے ہاتھ لائیں اور اور کہیں کہ اچھا ہو اسو ہوا۔ آئندہ سے ہم الگ الگ اپنی اپنی دی زندگی جیئیں گے جو پہلے جیتے تھے۔

”تم سمجھ لو کہ امیر تیمور سے کیس لے لی نہیں تھے اور نہ پھر ملو گے۔“

”اوہ میں۔ تم بھی فرض کر لو کہ کسی ناصر عظیم کا تم نے نام تک نہیں سنا۔“

”!!!—NO HARD FEELINGS?“

”ABSOLUTELY NONE!“

ٹیک پشہ۔ ”ہائی“ خدا حافظ۔ ایک پرخاش شیطانی قتل کے منصوبے میں کامیاب شراکت کے بعد انتہائی شرمناک اور چمک سون انڈاز میں اپنا اپنا رات ”انت بھلا ہو بھلا۔“

کراچی تک میں کھینے کا مسلسل سڑا یک اعصاب صحت تجربہ تھا۔ ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہم سب کی آپس میں بے

تکلف گفتگو میں مانع تھا۔ میں نے امیر تیمور سے رشتی کی موجودگی کی وجہ سے کوئی بات نہیں کی۔ رشتی مجھ سے چندا کی موجودگی کے باعث بے تکلف اظہار محبت نہ کر سکی حالانکہ میرا بدلا ہوا رویہ دیکھ کے وہ بہت خوش تھی پھر میرے بائیں ہاتھ پر امیر تیمور بیٹھا ہوا تھا چنانچہ رشتی نے بھی کبھی مجھے سیکرا کے پیار سے دیکھے، میرے کندھے پر سر رکھ کے سوتے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے پر اکتفا کی۔ ایک ہی کی حیثیت سے اس کے نزدیک اتنی بے حیالی جائز تھی۔

میں خان اعظم سے یا چندا سے رشتی کی موجودگی کے باعث بات نہ کر سکا۔ رشتی میری سخت گھرائی کر رہی تھی۔ اتنی خوب صورت سیکرٹری ساتھ ہو تو کوئی ہیرو شوہر کی نظر پر نظر نہ رکھنے کا ریسک نہیں لے سکتی۔ ہمارے درمیان جتنی گفتگو ہوئی وہ رکی یا ضروری تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر کم دوسری گاڑی میں ہوتے تو کیا ہوتا؟ میں تیمور کو خان اعظم کی تحویل میں دے کے مطمئن ہو سکتا تھا کہ چاندی خراب تیرے حوالے لیکن پھر دوسری گاڑی میں چلا تا تو میرے ساتھ کون بیٹھتا۔ رشتی میری نصف بہتر کے طور پر اس سیٹ پر اپنا حق جتاتی اور امرار کرتی کہ اپنی سیکرٹری کو پیچھے والی سیٹ پر بھی کیوں بیٹھاتے ہو۔ اسے باپ کے ساتھ بیٹھا۔ چندا پیچھے والی سیٹ پر سخت جلتی بیٹھتی۔ شاید خودی بیٹھنا قبول نہ کرتی۔ میرے اور چندا کے ساتھ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پوری الگ بیٹھنے اور تم میں کو سیکرٹری کے ساتھ۔ رشتی کے ساتھ اکیلے بیٹھنا میرے لیے سخت آزمائش میں پڑنے کے حوالہ تھا۔ میں تیمور کو ساتھ رکھتا تو رشتی اور چندا کی آپس میں ہرگز نہ بنتی۔ چنانچہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ”اسی میں عافیت ہے۔“

رات کا کھانا ہم کھا کے چلے تھے اور چائے کافی کے علاوہ تھوڑا بہت کھانے کا سامان ہمارے ساتھ تھا۔ رشتی نے رات باہر بچے نیند کا سہارا دینا کھل کر کے میرے کندھے سے سر اٹھایا اور خواب ناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرا دایاں شانہ درد کرنے لگا تھا اور مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے شاہک ابراہیم بیٹھ جانے سے گاڑی ایک طرف جھک جاتی ہے ایسے ہی میں سیدھے ہاتھ کی طرف جھک گیا ہوں اور میرا دایاں شانہ نسبتاً بلدی پر ہے۔ اس جسمانی خرابی سے بڑھ کر مجھے اپنا امپریشن خراب ہونے کا غم تھا۔ چندا ایک بار طرہ ”ایک بار“ ایک بار شلہ بار اور ایک بار خون آشام نظروں سے مجھے گھور رہی تھی اور پڑنے والی قلبی تعلق کے باعث میں ان نظروں کے پیغام کو واضح الفاظ میں سن اور سمجھ سکتا تھا۔ کچھ کے بغیر اس نے کہہ دیا تھا کہ انسان کے بچنے میں جاؤ۔ یہ نہیں جانتی مگر جیسے مظلوم ہے کہ رشتی کسی اور کی بیوی ہے۔ زن مرید شوہر کی اداکاری کے سامنے مزے مت لو۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ چندا میری صفائی پیش کرنے والی ناہوں کا پیغام سننے اور سمجھنے پر

بالکل بھی آمادہ نہ تھی۔ میری حالت قابل رحم تھی۔ ایمان مجھے دے کے ہے تو کھینچے ہے مجھے کھرب کب میرے پیچھے ہے کھینچا سرے آگے۔

رشتی نے پشتوں کی بیرونی سرت شاہین جیسی انگریزی لینے کی کوشش بھی کی مگر جبکہ تم بھی چنانچہ اس کی کبھی میری ناک پر تھی ”مجھے ذرا نیند آئی تھی۔“

میں نے ناک سلا کے کہا ”ذرا نہیں“ جیسے پوری نیند آگئی تھی۔ جیسے کیا پتا دیکھنے میں کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“ رشتی نے پوچھا۔

”ہا ہر دیکھو کیا بیکار رات ہے اور کیا خطرناک جنگ ہے۔“

”جی کی چک اور دالوں کی گرج میں نے مٹی تھی“ وہ بولی۔

”وہ بادل نہیں گرے تھے“ شہر دھاڑ رہے تھے۔ اصل ہیر۔

”توم خود نسل کے۔“ میں نے کہا سڑک پر دوڑتے پھر رہے تھے۔

”بھوکوں کے ساتھ۔“

”اچھا! پھر تم نے سب کو کھانے لگا دیا ہو گا؟“ وہ ہنسی۔

”اس کے بعد ڈاکو آگئے تھے۔ سڑک پر درخت کاٹ کے ڈال دیے تھے اور باوردی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ چاروں طرف سے ہم پر گولیاں برسائیں انہوں نے مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہم نکل آئے۔“

چندائے کہا ”پیچھے سے وہ توپ کے گولے اور میزائل بھی داغ رہے تھے۔“

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا ”کیا کسی نے تم سے پوچھا ہے سیکرٹری کے اپنا خواب سناؤ۔“ سوتے ہوئے خزانے لینے کے علاوہ تم

بیشہ اوٹ پانگ خواب دیکھتی ہو۔ خراب تم چائے کافی وغیرہ پیش کر رہے ہیں۔“

تیمور نے کہا ”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”کافی لو۔“ تمہیں دور ہو جائے گی اور نیند بھی نہیں آئے گی“

میں نے کہا۔

”وہ بولا ”مجھے ویسے بھی نیند نہیں آتی۔ رات کو گولی نہ کھاؤں تو۔ اور گولیاں میں اپنے ساتھ لا لی نہیں سکا۔ بلڈ پریشر کی شکایت بھی ہے مجھے۔“

”مجھ سے کیوں شکایت کر رہے ہو“ میں نے کہا ”یہ سب تمہارے اپنے اعمال کی خرابیاں ہیں۔ میرا مطلب ہے تم احتیاط رکھو اور پرہیز کر سکتے۔“

چندائے مجھے کافی لاکم تھما یا ”آپ کی سڑکی پیند کریں گی؟“

رشتی نے اسے حکم دیا ”فل کریم“ چینی دو تھپے۔“

میں نے کہا ”اسی ہی تیمور صاحب کو بھی بناؤ۔ میں تو بلیک سی پیند کرتا ہوں۔“ مرحوم مرزا نے چائے میں ہی دورہ ڈالتے تھے۔

زیادہ کریم اور چینی ہو تو کافی کا طعم داغ دے جاتا ہے۔ اس میں

زہر بھی شامل ہو تو پتہ نہیں چلتا۔
 رنجش کا پتہ رک گیا "میں... یہ نہیں بولوں گی۔"
 میں نے کہا "چھاتیو صاحب کو دے دو۔ اگر تمہیں شک
 ہو گیا ہے کہ اس میں زہر ہو گا۔"
 "میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے ضرورت نہیں" تیو بولا۔
 میں نے رنجش سے کہا "تمہیں تو دعویٰ تھا کہ محبت کے ساتھ
 میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں زہر بھی دوں تو تم بیگنی ہو۔"
 وہ بولی "میں نے نہیں۔ تم نے مارا تھا یہ ڈائیاگنوسٹک لوپ پی
 کے دکھاؤ۔"

ہو گیا تھا کہ اپنی وفاداری بدل کے میرا ساتھ دے۔ اس کی حیثیت دوا دازے کے جیسے بھی تھی۔ دوا دازہ اندر کی طرف کھلے باہر کی طرف یا بدل دیا جائے، سارا بار ہر صورت میں قبضے پر ہی آتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت جاننے کے لیے میں نے یہ موقع قیمت جانا۔ چند ایسا خان اعظم کے سونے جانے سے مجھے فرق نہیں پڑتا تھا مگر رشتی کے خزانے یقیناً اسے کسی نیند میں ثابت کرتے تھے۔ میں نے کہا "حمبور۔ تم بہت پریشان ہو۔ کیا سوچ رہے ہو۔"

"ظاہر ہے اپنی پریشانی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

آزمائے کمال۔ جو بھی مسلم ایک کلیل لگا کے آجائے اس کو بھی بل پائی
لا۔ ایک پارٹی میں ماموں دو سرے میں بھانجا۔ ایک میں جو دو
بھائی دو سرے میں اس کی کائی۔ پہلے تو ایسے سب امیدوار مقابلے
سے خارج ہوں۔
”تم کسے سے ملو گے؟“

میری حیثیت قربانی کے کہنے جیسی تھی اور تم نے یہ بکرا تلاش کیا تھا اور اپنے پیچھے زمین صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اب وہ قصاب کی اولاد چمڑے تیار کر کے آیا تھا۔ اور مجھے یہ سب معلوم ہے اس کے بارہو میں اپنی گردن اس کے سامنے جھکا کے لمبا لیٹ جاؤں؟ کیا وہ مجھے چھوڑے گا؟ محل سے اٹھ پھیل نہیں ہوں میں نیور صاحب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہے کوئی کہ میں اس کی چمڑی سے اسی کا جھکا کر دوں۔“

ہے۔ اول تو کوئی تمہاری نیسے کا نہیں اور مانے کا نہیں۔ شاہ عالم سوچ بھی نہیں دے گا تمہیں زبان کھولنے کا تمہارے کچھ کرنے سے پہلے پانی تمہارے سر سے گزر چکا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ باؤ کے ساتھ رہنا شروع کر دو ورنہ تم ڈوب جاؤ گے۔

”اور شاہ کی بیوی رشتی تم اس کے شوہر۔“

میں نے کہا ”صرف اپنی فکر کرو تیور میرے مسائل مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے کہ ابھی تک میں مجبور تھا کہ اس کی قوت کو برداشت کروں۔ اس قوت میں جتنا فاصلہ مجھے برقرار رکھنا ضروری تھا وہ میں نے رکھا۔ رشتی غلطی کے باعث کچھ جذباتی ہو جاتی ہے لیکن اس مسئلے کا حل میں نے سوچ لیا ہے۔“

”شاہ عالم بھی اب اس نصیبت سے جان چڑانا چاہتا تھا“ وہ بولا۔

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ ”رشتی کو آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔ اس کے اپنے شوہر کی طرف سے۔ میرا خیال ہے وہ زیادہ خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزارے گی بعد میں۔ طلاق کے بعد اسے بہت طبع کے زندگی بھر سارا دینے والے وہ حسین بھی ہے اور دولت مند بھی۔ میرا خیال ہے ایک غلط تجربے کے بعد وہ دوسرے شوہر کے انتخاب میں غلطی نہیں کرے گی۔ یہ شاید اسے کبھی علم نہیں ہو گا کہ وہ بیوہ بھی ہو چکی ہے۔“

”معلوم نہیں تم یہ سب کیسے کر گئے؟“

”تم جو وہ میرے ساتھ۔ سینئر نائب صدر۔ اس کو میری بے وفائی سمجھنے کی غلطی مت کرنا تیور۔ دینے تو تم میرے بھرم ہو۔ تم نے مجھے ٹپ کیا تھا پھر بلیک میل کیا اور مجھ سے ایک مل ٹپ کرادیا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ تم میرے ساتھ ہو۔ کسی نے مجھے تمہارے ساتھ نہیں دیکھا۔ اپنے چاروں طرف دیکھو کیا سنسان جنگل ہے اگر میں تمہیں مار کے گیس پیچیک روں یا گاڑوں تو یوم حشر سے پہلے کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا اور مجھے انٹائے راز کا کوئی غلط نہیں ہوگا لیکن میں تم کو ایک چانس دے رہا ہوں۔ ایک احسان کر رہا ہوں تم پر تمہارے بیوی بچوں پر کہ انہیں بیوہ اور یتیم نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسا دسک بھی مت لینا جس پر تمہیں پچھتانے کی مصلحت بھی نہ ملے۔“

”میں اب کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری ”غلطی میری تھی، غلطی یا پھر حسرت۔“

”ہاں۔ تم نے آج کے ناصر عظیم کو دیکھا۔ وہ ایک مذہب شریف اور پڑھا لکھا ذہین آدمی ہے مگر وہ اپنی طور پر ایسا نہیں تھا۔ آج میں جو بھی ہوں وہ زندگی کے تجربات کا پتھل ہے۔ اچھا! مجھے درستے میں نہیں ملی تھی۔ میں نے پہلے برائی کو دیکھا۔ جیلا برداشت کیا پھر اعتقاد کیا اور اس سے غرت کے نتیجے میں

اچھا! کو قبول کیا۔ محبت میرے وجود میں غرت کے زہر کا خاتمہ کرنے کے لیے شامل ہوئی۔ جسے انجشن سے در خون میں شامل ہو کے بیماری کے جراثیم کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پہلے میں جسم غرت تھا۔ یہ تم نہیں جانتے کہ انسانیت کی حوصلہ تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت شیطان دیکھے پھر شیطان بن کے دکھا اور وہ سب کیا جو شیطان کر سکتا ہے اور بس اس کے بعد خدا نے توفیق دی مجھے کہ میں جرم اور گناہ کا راست ترک کر کے توبہ کروں اور انسان بن جاؤں۔ مسلمان ایک تو وہ ہوتا ہے جس نے مسلمان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اس کا باپ اور باپ کا باپ بھی مسلمان تھا۔ اس کا نام مسلمانوں جیسا رکھا گیا تھا۔ یہ وہ مسلمان نکلا۔ ایک کفری راہ پر چلنے والا اسلام کو سمجھو اور قائل ہو کہ یہ مذہب دیگر تمام مذاہب پر کیون فزیت اور فضیلت رکھتا ہے۔ اور پھر یقین اور ایمان کے ساتھ مسلمان ہو جائے تو یہی فرق ہے تم جیسے شریف آدمی میں اور مجھ میں۔ تم میرا کئی طور پر شریف اور معزز ہو گے میں ہر بد معاشی کر کے مجھ کے اپنے خواہش، محنت اور خدا کی مہربانی سے شریف اور معزز بنا۔“

تیور میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا اور مجھے پہلی بار اس کی آنکھوں میں حیرانی سے زیادہ گہرندی اور تشویش محسوس ہوئی۔ مجھے ایسا کبھی نہیں تھا۔ اس نے میری کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ گرگ باران دیدہ، خزان سیاست دان پڑانا مداری تھا اور شاید اب تک اس مکان میں جتنا تھا کہ چلو ایک نئے مداری کو اپنا کھیل دکھائیں اور پھر اس کا کھیل یوں تمام کر دیں گے جیسے حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پیچیک کے تمام جاوڑ گروں کے سانپ نکل لئے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا ہے کہ کھیل ہے۔ انڈی کا کھلاڑی سے مقابلہ ہے۔ کچھ دیر چلے وہ پھر ختم کرنا تو اپنے اختیار کی بات ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ دور سے دیکھنے میں پناہ مت کر اونچے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی پر پھیلی ہوئی سرخسی کیر سے تو پناہ کسی حقیر پناہ کی طرح نظر آتا ہے۔ اب وہ پناہ کے دامن میں کھڑا ہو کے دیکھ رہا تھا اور اس نے رات کی تاریکی میں درمیانی مسافت طے کی اور اچانک صبح نظر آئی تو پناہ کی چلی اسے آسمان کو پھرتی محسوس ہوئی۔ اس کے اردوں اور عزائم سے کہیں زیادہ بلند اور اس کی قوتِ تخیل سے ناقابلِ یقین حد تک دور۔

گھبراہٹ اب اس کی صورت پر یوں نے غلبہ ہو گئی تھی جیسے کھڑکیوں کے شیشوں پر ڈہرے پردے ڈالنے کے باوجود سورج کا اُجالا روکنے نہ رکے اور اپنے وجود کا اعلان کرے۔ اس کی حالت نے خود مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر تیور کے ذہن میں پہلے کیا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بے خبری میں اچانک زہرِ دام ڈال رہا تھا مگر اس کو اپنے میاں داغ کی شعلہ

کری پر احتاد تھا۔ وہ طے کر چکا تھا کہ میرا کھیل اپنی کس چال سے کس سرے پر ختم کرے گا۔ کیا وہ اپنا ارادہ بدل دے گا؟ میری باتوں سے غافل ہو کے وہی کرے گا جو میں چاہتا ہوں؟ نہیں وہ پھر سوچے گا۔ سب سے منصوبہ بندی کرے گا کہ مجھے اس نے پہلے سنوایا سمجھا تھا اور خیال تھا کہ اس کا سر وہ اپنے جوتے کی ایڑی سے چل دے گا وہ سانپ بن گیا تو اس نے لاٹھی کاٹی بھی تھی مگر اب وہ اڈا ثابت ہو رہا تھا تو لاٹھی رکھ دے گا اور سوچے گا کہ اسے مارنے کے لیے کیا استعمال کرے ”ریو اور“ شکاری ہندو ”قمری ناٹ قمری کی رائفل یا کلاشنکوف۔

مجھے میری چھٹی جس نے خواب کر لیا کہ میں اس پر محمودانہ کروں۔ وہ میری لٹاقلی سے حائر ہوئے والا اور دھمکی سے ڈر جانے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف ظاہر کرے گا کہ ڈر گیا ہے۔ ذہنی طور پر وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گا کہ میں کون تیور آج سے میں شاہ عالم ہوں اور وہ نیک بیتی سے سر ہٹا کرے کہ میں سر۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں کیونکہ آپ غلط فرمایا نہیں سکتے۔

رشتی کے بارے میں مجھے کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ وہ سوہی ہے۔ اسے نیند میں خزانے لینے کی عادت تھی۔ وہ دقت سے وہ کوٹ لیتی تھی تو خزانے بھی بند ہو جاتے تھے۔ سب سے پیچھے کے حصے میں چند اور خانہ کی کے بارے میں کچھ کٹاوش تھا۔ چندا کی تربیت میں خانہ کی نے اپنا سب کچھ لگا دیا تھا۔ اپنی عقل اور ذہانت، تجربہ اور مہارت، محنت اور صلاحیت۔ ان کی یہ پوری وہ دھپکا رہی تھی جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کیا تھا۔ جسمانی حسن خدا داد تھا اور اسے درستے میں ملا تھا۔ کرل خان اپنی جوانی میں انتہائی وجہ و تھکیل موٹھے ان کے سرخ و سفید رنگ کی محبت مندی میں آج بھی پھان خون جھلکا تھا۔ چندا کی ماں اس بیکر حسن کا نقشِ اول تھا۔ خاشا نقشِ ثانی بہتر کھڑا اول۔ مصروف دسری تصویر بہتر بنا ہے۔ چندا کو اپنی ماں کے حسن کا سارا اٹا بھی ملا تھا اور قدرت نے کمال مہربانی سے اس کو اضافی حسن دے کے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ ماں سے کہیں زیادہ حسین تھی یا پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ حسن تو ایک احساس ہے جو دیکھنے والے کی نظر پر اثر کرتی ہے۔ ویسے عقل اور ذہانت میں چندا مجھے خانہ کی کی وارث نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے ابا باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی پرورش اور تربیت میں خانہ کی نے ذیلِ عدل ادا کیا تھا۔ وہ چندا کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کی شخصیت میں خانہ کی کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ سوہی حسن و ذہانت کے اس باکمال استخراج نے چندا کو دو دھاری نکو اور مادی تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت اور توانائی کو کرل خان کی توجہ اور محبت نے جلا بخشی تھی۔ خانہ کی کوئی عام آدمی ہوتے تو کیا صلاحیت اور توانائی چندا کے کسی کام نہ آتی۔ اس میں نشوونما سے اضافہ نہ ہوتا اور شاید اسے بھی پتا نہ چلا کہ قدرت نے اس کی

ذات میں کیا جو ہر رکے تھے جو کسی پر ٹھیکے نہیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی کا ایک اور ثبوت تھا کہ اسے خانہ کی کے دھپ میں باپ جیسا رشتہ اور قابلِ رنگ استاد بھی ملا جس نے ڈرتے کو آفتاب بنا دیا۔ ایک گل کو گلستان کر دیا۔

خانہ کی کی طرح چندا کو بھی ذہن اور جسم پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ یہ کنٹرول اس نے سخت ٹریننگ مشق اور محنت سے حاصل کیا تھا۔ مٹی تو مٹی ہی ہوتی ہے۔ کڑوا کر دیا جسے سائے کا ہاتھ اسے اپنی فنکارانہ مہارت سے کوئی بھی بیکر جمال عطا کر سکتے ہیں جو ذہنی حسن رکھنے والوں کی نظر کو حیران کر دے۔

یہ خانہ کی کے اختیار میں تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے سو جائے۔ میں نے نظر اور پولیس یا انیگال کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ مسلسل کئی دن جاگ سکتے تھے اور پھر اچانک کسی بینک یا کانفرنس کے دوران کہتے تھے ”سو رہی خنٹیں۔ مجھے صرف دس منٹ دیکھنے سونے کے لیے۔“ وہ ٹھیک دس منٹ بعد جاگتے تھے تو اتنے ہی چاق و چوبند ہوتے تھے جیسے ہر رات سونے والے اور بینک کی کارروائی میں بھر شامل ہو جاتے تھے۔ ایسا میں نے کرل خان کو کرتے دیکھا تھا۔ وہ دس بیس منٹ کے لیے یا دو ڈھائی گھنٹے کے لیے کہیں بھی اسی اور کسی بھی وقت سو سکتے تھے۔ ان کے داغ میں ایک گہری مٹی جس کا وقت اور الارم وہ اپنی مرضی سے سیٹ کرتے پر پوری طرح قادر تھے۔ نیند ایک ذہنی عمل ہے۔ وہ کہتے تھے۔ جب داغ سوتا ہے تو جسم سو جاتا ہے۔ ذہن کو کنٹرول کر دے۔ اسے اپنے تابع رکھو۔ اسے علم ہو کہ سو جائے تو تم سو جاؤ گے۔ اسے تیار کر کے کب چکا ہے۔ وہ تمہارے کنٹرول میں ہو گا تو تمہیں ٹھیک وقت پر جاگے گا۔ کسی فریاد اور خادم کی طرح لیکن تمہارے لیے بھی ضروری ہے کہ تم داغ کے لیے ایک سخت کیرڈزیشن کے پابند اور اصول کے گئے آقا بنو۔ ایسا نہ ہو کہ داغ تمہیں وقت پر اٹھنے کو کہے اور تم اس کی نہ سنو۔ اسے ٹال دیا جھڑک دو اور پھر سوتے رہو پھر داغ بھی سمجھ جائے گا کہ تم کس باتیں کرتے ہو۔ عملی طور پر بے عمل ہو چنانچہ وہ بھی ڈھیلا پڑ جائے گا۔ حرام خوری، بے بائی باڑی اور مکاری کرنے لگے گا۔

رات بھر کے سفر میں وہ باری باری سوئے ہوں گے۔ وہ مجھے تیور کے رحم و کرم پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے اور اس کی طرف سے شرانگیزی کے امکان کو ذہن سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ چندا نے کہا ہو گا کہ پہلے آپ سو جائیں نہیں سمجھتے تو خانہ کی نے کہا ہو گا کہ اچھا۔ میں سمجھنے چندا خاموش اور پرسکون آنکھیں بند کر دیتی طور پر پوری طرح مستعد تھی رہی ہوگی۔ شاید اپنے کانوں کے دوش اٹھنا کا رخ ہماری طرف کے اس مشکو کاہر لفظ مٹی ہی ہوگی۔ اور اگر رات کے پہلے مجھے میں خانہ کی کے مٹی میں نے یہ باتیں سنیں ہوں گی تو اب تک وہ میرے لیے کوئی محسوس عملی مرتب کر چکے ہوں گے۔ خانہ کی کے مٹی کا یہ بھی ایک طریقہ تھا کہ وہ مسئلے کو پکڑ کے نہیں

بیٹھے رہتے تھے اور عام لوگوں کی طرح سوچ سوچ کے پاگل نہیں ہوتے تھے۔ اضطراب میں ادھر سے ادھر گھومتا، چائے پیتے رہتا، سگرتیں پھونکتے رہتا۔ یہ سب ان کے نزدیک دماغ کو مزید پریشان کرنے کے مترادف تھا۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ دماغ کے کپیڈر میں ڈالو اور سکون سے حل نکالے۔ وہ جب تک کوئی حل برآمد نہیں ہوتا تھا اپنا کام کر۔ اس مسئلے کے بارے میں سوچ بھی نہیں کیونکہ دماغ اپنے کام سے فارغ نہیں ہوتا۔ مناسب وقت پر وہ خود حل پیش کر دے گا لیکن اس کے لیے بھی دماغ کے کپیڈر کا استعمال آنا چاہیے۔ دماغ کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ صبح نو بجے تک نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر کے ہم نے سکھر میں قیام کیا۔ تمام رات میں نے کافی پیچے یا بسکت چرے گزاری تھی۔ تیور نے صرف ایک بار کافی پی کی اور سینڈویچ کھائے تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے ہی خان بی انھہ گئے تھے اور چندا نے انہی کے ساتھ کچھ کھا لی لیا تھا۔ خان بی پھر ڈرائیو تک سنبھالنا چاہتے تھے مگر میں نے اعلان کر دیا کہ سکھر میں اسٹاپ اور ہو گا۔ تاہم ہونے کے لیے اور ناشتے کے لیے۔ ہم ناشتے کا انتظام کر کے چلے گئے مگر میں اب تھوڑے سے بریک اور بالکل تازہ ناشتے کے موڈ میں تھا۔ رخصتی سب کے بعد اٹھی تھی اور سب سے زیادہ تیز ار تھی۔

”تم ساری رات گاڑی چلاتے رہے؟“ اس نے جھای لے کے پوچھا۔

”میں نے کہا“ نہیں۔ میں بیٹھا رہا مگر گاڑی کو انجن چلاتا رہا۔“

”خود ڈرائیو تک کرتے رہے اور ڈرائیو آرام فرماتا رہا۔“

میں نے آہ بھر کے کہا ”جب مٹی پوری کو اکھوٹے شوہر کے آرام کا خیال نہ ہو تو ڈرائیو سے کیا لگے؟ میں میرے نصیب میں تھا رات آنکھوں میں کانٹا۔“

”سینڈ تو مجھے بھی نہیں آتی۔“

”ہاں۔ خزانے لینے سے فرصت ملتی تو سینڈ آتی“ میں نے کہا ”تمہاری آواز کی طرح تمہارے خزانوں میں بھی کیا لنگھتی ہے۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے پاؤں کو اٹھیں تال میں داد مارا گا رہا ہو پھر محسوس ہوتا تھا کہ برساتی مینڈک جو جڑی بیٹھیں کو راگ لہا رہتا رہا ہے۔“

اس نے اپنی سخت بے عزتی محسوس کی کیونکہ تیور نفس پڑا تھا۔

”لگتا ہے تم رات بھر پیتے رہے ہو“ وہ ہنسنے لگا۔

”اویس مینڈک“ میں نے چار انگلیاں دکھائیں۔

”ہا میرے خدا۔ ڈرائیو تک کرتے ہوئے چار بار۔ چھوٹے چینگ کے نام پر بڑا پیتے رہے ہو گے۔ خالی کوئی ہوگی بوقت“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”مومل نہیں۔ قمر مس فلاں۔ ایک کپ تم بھی پی لی۔ کافی گرم ہے ابھی تک“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کو مزید غصہ اٹھانی پڑی ”خیر اب گاڑی روکو گے کس۔ ایسے ہی چلے جاؤ گے کراچی تک“ وہ جھٹکے بولی ”مجھے برش کرنا ہے۔“

”مکون سا برش پیش کروں“ جوتوں کا، ہاتھوں کا، کپڑوں کا یا داغوں کا؟ مجھے امید ہے دوچار فالتو بھی ہوں گے۔ تم پوری تیاری کے ساتھ سڑک کی۔ بھولتی کچھ نہیں ہو فالتو جوتوں سے فالتو شوہر تک۔“

وہ مسکرائے لگی ”یہ اچانک کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

میں نے گہرا سٹ کا مظاہرہ کیا اور جڑے پر ہاتھ مارا ”کیا ہوا۔ سر پر سینک کھل آئے رات بھر میں یا تاک کئی گئی اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔“

”تم پہلے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔“

”مٹی باتیں میں سب کے سامنے نہیں کر سکتا“ میرا مطلب ہے ایسی دیکھی۔“

”بعض اوقات تو مجھے شک ہوتا ہے کہ آخر اس تہذیب کا مطلب کیا ہے۔ کسیں یہ میری نظرس یا محفل کا دھوکہ تو نہیں۔ یہ کیا پکڑ ہے شادی۔“

میں نے باہر جھانک کے کہا ”مگر حرم کہاں ہے پکڑ۔ مجھے بھی بتاؤ۔“

”پہلے تم سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔“

”اور تمہارے منہ سے بھی ایسے بھول نہیں جھڑتے تھے“ میں نے ہنسنے لگا ”اب اصل شاہ عالم والا روڈ اور لوجہ اختیار کروں“

”جب بھی میں گھر آیا تمہاری مٹی کئی ہنسنے کو لی۔“

”مگر آئے کو دل کب چاہتا تھا تمہارا۔ دل لگتا تھا باہر کی مصروفیات میں۔ سب جانتی ہوں میں۔ وہ تو میان جی اور ماں جی کا کچھ خیال تھا نہیں۔“

”یہ تو خیر ابھی تو شروع ہو گئیں باتیں“ میں نے برہمی سے کہا ”میرا نہیں تو کچھ اپنی ہی عزت کا خیال کرو۔ صبح سویرا خراب مت کرو میرا۔“

وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اس کی صورت سے ناگواری کے جذبات مہاں تھے۔ شاید اس نے اندازہ کر لیا کہ اس طرح بات بڑھ جائے گی اور شاہ عالم اس کا لٹا نہیں کرے گا۔ باقی راستہ وہ خاموش رہی اور اندری اندر کھو گئی رہی۔

سکھر میں دیر کے کنارے ایک ہوٹل میں ہم نے عارضی قیام کے لیے دو کمرے حاصل کر لیے۔ گزارا تو ایک سے بھی ہو جاتا مگر رخصتی کو اپنے ملازموں کو شو فرمائیں کیونکہ بڑی کے ساتھ دو گھنٹے گزارنا بھی محسوس تھا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ پھٹ پڑی ”آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔ سب کے سامنے تم نے مجھے ڈھیل کر دیا۔“

میں نے کہا ”کیونکہ تم نے شوہر کی تھی۔“

”کیا غلط کہا تھا میں نے“ وہ چراغ پا ہو کے بولی ”لیکن کچھ کرنا ہوتا ہے۔ خوب سمجھتی ہوں میں کہ ناگ کیوں کر رہے تھے۔ تم صرف اس لیے کہ میں تم سے اس چمک چمکے بارے میں کچھ نہ کہوں جو آج تک میری بن کے آئی ہے۔ شریک سفر ہے۔ بن جائے گی بالآخر شریک حیات۔“

میں نے مشتعل ہو کے کہا ”رخصتی۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔“

”ہاں حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

میں نے ترخ کے جواب دیا ”تو کس نے کہا ہے برداشت کرنے کو۔“

”میں کیا اپنی خوشی سے ہوں تمہارے ساتھ اس جنم میں۔ تیر کر کہا ہے تم نے مجھے“ وہ رونے لگی۔

”میں بھی جانتا ہوں کہ تمہیں آزادی چاہیے اور تم کس کے ساتھ خوش رہتی ہو مگر یہ کچھ نہیں ہے ایسے معاملات طے کرنے کی“ میں نے گویا سنبھل کے کہا ”ہم واپس جا کے بھی بات کر سکتے ہیں۔ دنیا کے سامنے تمہارا کرنے سے کیا فائدہ۔“

”تمہارا تو کچھ ہی رہی ہے دنیا۔“

”لو کہ۔ اوکے تمہیں جو شکایات ہیں مجھ سے۔ اور مجھے تم سے“ ہم اگر ان کو دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر دیکھیں گے کہ اور کیا طریقہ ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ واپس تک ٹھہرنا۔۔۔“

لیکن خاتم کو بات۔ تم فیصلہ چاہتی ہو تو فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ جیسا تم چاہو گی۔“ میں نے کہا۔

ابھی میں اس سے زیادہ بات کو بڑھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ انجانے میں مجھ سے یہ غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے شاہ عالم کے مزاج اور عادت کے برعکس کچھ شرع اور عیت آہیز روڈ اختیار کیا۔ رخشندہ اور شاہ عالم کی ازدواجی زندگی کس حد تک ناکام تھی یہ مجھے تیور نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اس کی زیادہ تر ڈنڈے داری شاہ عالم پر عائد ہوتی تھی جس کی غیر سیاسی ”مصروفیات“ اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ بیوی کو خود اپنی نظرس اپنا وجود بے معنی اور بے مصرف محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ ایک عورت کی بھی تو بین تھی جسے زمانہ احساس دلاتا تھا کہ وہ محسوس ہے اور اس کی کشش کی قوت کو وہ کچھ اور محسوس بھی کر سکتی تھی مگر وہ جسے اس نے اپنا آپ سوچ دیا تھا اسے گھر کے ایک ڈکوریٹیشن جیسی جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک بیوی کی حیثیت سے یہ اس کے خوابوں کی موت بھی جو اس نے شادی سے پہلے دیکھے ہوں گے۔ اپنا گھر اپنی جنت کے عنوان سے۔ اس میں شوہر سو فیصد اس کا ہو گا۔ اسے بے پناہ جاہت دے گا۔ ان کے بچے ہوں گے وہ اپنی ساری عیت تو ان کی اور کائی ان کی خوشی اور کامیابی کے لیے وقف کر دیں گے۔ وہ گھر کے بیاد و سفید کی اور شوہر کے دل کی بلا شرکت غیرے مالک ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ پبلک لائف میں آنے والے ہر شخص کی کئی زندگی کے اوقات اس کی مقبولیت میں اضافے کے ساتھ کم ہوتے جاتے ہیں ”خواہ وہ سیاسی لیڈر ہو“ فلم انڈیا کرکٹر۔ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے الگ دلچسپیاں بھی انکسٹیل کی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ رستار اور صحافی لوگ۔ پڑھا بھی دیتے ہیں کچھ ذہین داستان کے لیے۔ سارو شاکر قسم کی بیباں سب برداشت کرتی ہیں کہ آج کل میں درخت ہے تو دھوپ کے ساتھ سایہ بھی ہو گا۔ تمہیں چو تھا لی یا نصف جتنا بھی شوہر اپنے تصرف میں ہے غنیمت ہے مگر ایسا حق دس لکھ نہ جائے اور تو نے فیصلہ پر عاصمانہ قبضہ ہو جائے تو عورت مکمل ختمی کو اس ناقدری اور بے توقیری پر ترجیح نہ دے تو کیا کرے۔ صرف شوہر کے نام سے حاصل ہونے والی ناموری کا دکھ بھی تو کسی کو دکھ نظر نہیں آتا۔

سب اس کی خوش حسی پر رنگ ہی کرتے ہیں۔ دو گھنٹے کے قیام میں مکمل کے بعد لباس بدلے اور ناشتا کرنے کی فرصت ہی ملی۔ رخصتی نے اس کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی مگر اپنا موز ٹھیک رکھا۔ وہ چندا کے ساتھ ہوئی گئی تھیں جس سے دیر کا نظارہ کر رہی تھی اور میں لاؤنج میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ خان المصم نمودار ہوئے۔ ان کے اشارے پر میں گاڑی کی طرف چلا گیا جس کا پونٹ انہوں نے پہلے ہی کھول دیا تھا۔

میں نے کہا ”خان بی۔ اگر آپ مجھے کسی گستاخی یا نامعقولیت پر اپنی پاپوش مبارک سے زد کوکب فرماتا چاہتے ہوں تو سر حلیم فم ہے۔ یہ نہایت مناسب جگہ ہے۔“

وہ مسکرائے لگے ”جسور۔ سنبھل کے چل۔ تیور باتوں کا بھوت نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”کلات مارنے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ابھی تک اس نے پوری طرح تعاون کیا ہے۔“

”یہ اس کی مجبوری ہے۔ وہ موقع ملنے پر وار کرے گا۔ اس کو سیکھا دے کہ اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ خود اسے نقصان پہنچائے گا۔ جیسے ریو الوور کی گولی جو اپنے ہاتھ میں ہو مگر اس کا رخ بھی اپنی طرف ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے وہ بنگامہ کھڑا کر سکتا ہے!“

”اکیسویں قید میں ہے۔ آزاد ہو جانے کے بعد وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ شاہ عالم ابھی باگ کا ٹک میں ہے۔ اس کے آنے سے پہلے تو کچھ نہیں“ صرف ایک بیوی اور جھلسا ہے۔ تیور کے ایک بیان پر پولیس نے جیسے مرد راز کے قتل کے الزام میں پکڑ سکتی ہے۔

”وہ مجھے لاہور میں پکڑا سکتا تھا۔“

”وہاں جیسے ہی اس کا تیرا سامنا ہوا تو نے اسے اغوا کر لیا۔ تیور کو وقت اور موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ مجھ ہا تھا کہ سازش کا راز افشا ہوتے ہی وہ عتاب ہو جائے گا اور تیور کو اس دھوکا دی کے جرم میں دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ وہ خود اسی ڈر سے مد پویش

ہوگا۔ اس نے احکامات جاری کر دیے ہوں گے کہ قاتل کو بلا تفریق اس کے زبان کھولنے سے پہلے قتل کر دیا جائے۔ پس اس کی بد قسمتی کہ اسے معمولی سے کام سے ختم کر دیا اور تو اسے پکڑ لایا۔ اس کے اچانک غائب ہو جانے سے اس کی فیملی پریشان ہوئی تو وہ سب سے پہلے تیمور کے دوستوں اور پارٹی کے لوگوں سے رابطہ کرتے۔ صبح تک خبر عام ہو جاتی تو خطرہ لاحق ہوتا تو قتل کو کمال کو ہم تو گھر میں ہیں نہیں۔

میں نے کہا ”کرتل صاحب! یہ تو بڑی گریز ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟“

”ان کے جوہر پھوٹتے ہیں“ قاتل عالم کلائے والے۔ وہ جو شیلے اور پاگل ہیں۔ اور حکم کے غلام بھی ہیں۔ مجھے انہی کا ذکر تھا کہ وہ قتل کو یا ڈاکٹر کمال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ”خان اعظم بات کرتے ہوئے گاڑی کے انجن میں جھانکتے رہے۔

”یہ فرسائے سر کی کہ آپ نے کیا قدم اٹھایا ان کی حفاظت کے لیے۔ کیوں مجھے دہشت زدہ کر رہے ہیں میرا دل مضطرب۔“

”گاڑی کبھی کبھی MISSING کرتی ہے۔ میرا خیال ہے گرم ہو کے اس کا کواکل۔“

”ابھی مجاز میں گیا کواکل۔ میرا دل مضطرب غم اور بارش کے سحر کن کی MISSING کرنے لگا ہے۔“

”فکر اور غم کرنے سے کیا ہوگا۔ میں نے بندوبست کر لیا تھا۔ دعا لگی سے پہلے۔ بس ابھی کچھ دیر میں فون آجائے گا تیرے دوست کا۔ مگر وہ تیمور سے بات کرے گا۔“ انہوں نے بونٹ بند کر دیا۔ ”اس فون کا دوسرا کنکشن نہیں تھا۔ میں نے کر دیا ہے۔ ایک کارڈ لیس ریسیور تیرے کمرے میں رکھ دیا ہو گا چنداٹنے۔“

میں نے کہا ”سر۔ آپ کو پورا سراسر بات کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔“

”میلی فون کی خامی سے خراش چچ جیسی ٹھنکی بجتے لگی۔ پڑانے ڈاکٹر والے فون میں واقعی ٹھنکی ہوئی تھی جو ویلو ویلو کے انداز میں دوبار بجتی تھی۔ جدید ٹیکنالوجی والے ڈیجیٹل فون کی پکار کو عاراً ٹھنکی کہا جاتا ہے۔

خان بی بی نے ریسیور کو بک سے ہٹایا تو میں فوراً واپس چل پڑا۔ مجھے اپنے کمرے میں پہنچ کر اس فون کے ڈائریس ریسیور کو دریافت کرنا تھا اور فون پر ہونے والی مشکوک کھینچ کی جلدی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ خان بی بی فون ریسیور کرنے کے بعد تیمور کو بلانے جائیں گے اور اسے لاڈ لچ سے گاڑی تک پہنچنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں گئیں گے۔ میں غلٹ میں دوڑانے کی طرف بڑھا۔

میں دوڑانے کے سامنے میرا چنداٹ سے تصادم ہوا جو اتنی ہی غلٹ میں کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے میری من پند چچ ماری اور پھر آنکھیں نکال کے کہا ”نہ مے تیل۔“

میں نے ہاتھ سلا کے کہا ”دلف۔“ اور پھر جواب میں اسے

”مرکبھی گائے“ کے خطاب سے نوازا۔

دور سے یہ ٹھانڈے دیکھنے والی روشنی نے اسے ”سوری سر“ اور ”سوری بس خان“ ہی سمجھا ہو گا۔ ان حالات میں ہم اس سے زیادہ بے تکلف اظہار خیال نہیں کر سکتے تھے۔ چنداٹ شاید کمرے میں فون رکھنے ہی آئی تھی۔ ریسیور ہوٹل کے بغیر ڈاکٹر والے فون کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

میں نے اسے آن کیا تو وہیں منظر میں ستائی دینے والی خفیف سی آوازوں سے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ کال کس کی ہے کس کے لیے ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ پھر تیمور نے اپنے مخصوص انداز میں ”ہالی لو“ کہا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا ”تیمور! کہاں ہو تم؟“

تیمور نے ضرور خان اعظم کی طرف دیکھ کر جواب دیا ہو گا ”میں نے کل رات تم کو بتا دیا تھا۔“

”کراچی میں تم کہاں ہو گئی کمرے ہو؟“

تیمور نے جھٹکے کہا ”لوگو! کیمت کی فٹ پاتھ پر کان سے میل نکھو رہا ہوں تم سے مطلب؟“

پھر کسی اور نے کہا ”مطلب ہم سمجھاتے ہیں تم کو اپنی قوی زبان اردو میں۔“

”تم! کون ہو تم! تبدیلیز چچ میں بولنے والے۔“

”تغیر تو غیر ہمارے باپ کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ ہمیں کیا سکھاتا۔ ہاں چچ میں ہم ضرور بولتے ہیں کیونکہ ہم خبیث ہیں یہی ہے ہمارا نام۔“

خوشی سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خان اعظم کے حسن انتظام پر فخر ظاہر کیا۔

”خبیث! یہ تمہارا نام نہیں ہو سکتا۔“

”چچ بولے تم۔ یہ شخص ہے ہمارا۔ حالانکہ ہم شاعر نہیں ہیں ہمیں خبیث ہیں۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔ ابھی میری بیوی بات کر رہی تھی وہ کہاں ہے؟“

”وہ لاہر کڑی ہے میرے پلو میں۔ میرے پاس۔ اور لوگ بھی تمہارے گھر کے موجود ہیں۔ ٹٹ فارٹیٹ۔“

”تم میرے گھر میں ہو؟“ تیمور چلا یا۔

”ہائل نہیں۔ ہم ایسے خبیث نہیں ہیں کہ کسی کے بھی گھر میں گھس جائیں۔“

”دیگو۔ فون میری بیوی کو دو۔“

”صوبات کرو۔ خبیث بولا۔

پھر تیمور کی بیوی نے کہا ”تیمور! یہ کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے نہیں۔ کون ہے آخر یہ شخص جو ہمیں پتا نہیں کہاں لے آیا ہے۔“

مجھے آرام سے ساری بات بتاؤ۔ تیمور نے اسے تسلی دینے

کے انداز میں کہا۔

”آرام سے! یہاں ہم سب کی جان پریشی ہوئی ہے تم گھر سے مجھے صرف دس منٹ کے لیے بتائے تم ہو نہیں کہ کہاں جا رہے ہو۔“

”بتانے سے قانع نہ ہو میری سیاسی مصروفیات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ باہر میں دس بجے جاتا ہوں۔ پچاس لوگوں سے ملتا ہوں۔ گھر کو میں نے پیش اپنی سیاست سے محفوظ رکھا ہے۔“

”پھر یہ کیا پکڑ ہے تم نے ہلا ہی پلا کر اپنی جانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر یہ خبیث! تمہارا بیٹا نام لے کر۔“

”میرا بیٹا نام لے کر کیا کر رہی ہو؟“

”مجھ سے بھی کیا تھا اس نے۔“

”اور تم نے یقین کر لیا ایک اجنبی پر؟“

”مگر کرتے ہو تم بھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کوئی دھوکے باز ہے۔ اس نے کہا کہ تیمور صاحب نے بھیجا ہے مجھے اور کہا ہے کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔ یہاں آج رات دشمنوں کی طرف سے حملے کا خدشہ ہے۔ وہ قاتل بھی کر سکتے ہیں۔ دینی ہم بھی پیچک سکتے ہیں ان شکست مار سکتے ہیں۔“

”پھر یہی پیچک سکتے ہیں۔ تیمور نے بھڑکے کہا ”ایسا ہو سکتا ہے کسی۔“

”کبھی کی کیا بات کرتے ہو۔ اپنے پاکستان میں سب ہوتا ہے اور اس وقت تو میں اتنی ڈر گئی تھی کہ میں نے تمہارا بہت سامان لیا۔“

”اس میں نقدی اور زور ضرور شامل ہو گا۔ وہ خطرے بولا۔

تیمور کی بیوی نے دے دے لیے میں کہا ”اب قریب تو ساتھ نہیں لے سکتی تھی میں کہ جہاں جائیں گے وہاں کیا فرش پر سوئیں گے؟“

”ہمت محض مند ہو تو ہوا تھی۔ تیمور نے غصہ کی سانس لی ”خیر یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”نہیں معلوم کا کیا مطلب؟“

”ہم جس گاڑی میں گئے تھے۔ اس کے شیشوں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ باہر اور اندر بیٹھنے کے بعد ہمیں پتا چلا کہ ہم اندر سے نہ دروازہ کھول سکتے ہیں اور نہ شیشے کچھ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہڈی بھی باندھ دی تھی۔“

”انہوں نے؟ اس خبیث کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟“

”گاڑی میں دو تھے۔ ان کے پاس ریل اور تھے۔ لڑکیاں اتنی ڈر گئی تھیں۔ چھوٹی پر تو وہ پڑ گیا تھا۔“

”وہ آپ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے ویسے تو۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ہڈی کھول دی تھی مگر اس وقت گاڑی شہر سے باہر تھی۔ اندھیرے میں کچھ اندازہ کرنا

بھی مشکل تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ گاڑی دو تین گھنٹے چلتی رہی۔ پتا نہیں کہ جراثیم کی طرف یا اوکاڑہ کی طرف۔ رات کے دو بجے ہم یہاں پہنچے تھے۔ اس گھر میں۔“

”میں نے اس کے ساتھ کوئی نذرانی تو نہیں کی انہوں نے۔“

”نہیں۔ ویسے تو بڑی شرافت سے باہر مٹائی مانگ رہے تھے کہ آپ کو یہ تکلیف اس لشکرے آہم کی وجہ سے اٹھانی پڑی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ ایک ہجر کے معمولی نقص کی وجہ سے امیر تیمور کو تیمور لنگ بھی کہا جاتا تھا اور لشکرے آہم بھی اس کو کہا گیا تھا۔

”لشکرے آہم کو تو ہم کات کے بھی کھائی جائیں گے یا چوس کے اس کی مٹھلی ریاں گے تمہارے گھر میں۔ اگر اس نے کوئی اور حرای پن کیا۔ لیکن ابھی تک ہم سے کسی نے بد تمیزی نہیں کی۔ تم ویسے تو آرام سے ہیں۔ یہاں ہر چیز ہے۔ یہ بھی باہر پوچھتے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دیں۔ مجھے بھالی کتا ہے خبیث اور لڑکیوں کو۔ صحت سے اور پیٹے سے شریف آدمی نہیں لگتا۔ سن کے سکر رہا ہے۔“

”بھول جائے گا مسکرا رہی۔ میں راپیں آکے نہ لوں گا ان سب سے۔ جنہیں اغوا کرانے والے بھی اسی حرام زادے کے آدمی ہوں گے۔“

تیمور کی بیوی نے ایک چچ ماری۔ پس منظر میں دو چیزوں کی آواز بعد میں سنائی دی۔ یہ غالباً لڑکیوں کی چچ مگی۔

”کیوں کیا ہو؟“ تیمور گھبرا کے بولا۔

اب خبیث نے جواب دیا ”تم نے باس کو گالی دیا۔ اپن اس کا سزا دیا۔ بھالی کو ایک جھانٹ مارا۔ پھر گالی دیں گا تو اپنا پاس ایک بیڈ ہے۔ وہ ماریں گا۔ خبیث نے کسی مولی کے لمبے کی سٹل کی اور پھر قہقہہ مارا۔

تیمور نے اسے ایک درجن تھانہ مار کر گالیاں دیں۔

”اپن کو جو مرضی ہو۔ ایک دم چٹا کر دے۔ بہت سونا کمال ہے لیکن باس کو اور اس کا کسی توئی کو کچھ ہو گیا گا تو زور اپن حساب کتاب برابر کرے گا سالا لشکرے آہم کی اولاد۔ ٹٹ فارٹیٹ۔“

”چھا اچھا۔ خبیث صاحب! میرا مطلب ہے۔ تم اچھے آدمی ہو۔ میری بیوی نے تعریف کی تھی تمہاری۔ میری چھوٹی بیٹی مفدوہ ہے اس کا کچھ خیال کرو۔“

”خیال تو کر رہے ہیں جی اتنا۔ اور کیا کریں۔ پاؤں دبا نہیں بھالی جی کہہ دیجئے سے اور تک دبا نہیں۔ وہ خبیث سے جفا تم بھی ہمارے بار کا خیال رکھو کہ کچھ نہیں ہو گا کسی کہ۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ تیمور نے سانس روک کر پوچھا۔

”کوہر بڑے میدان میں ملتا۔ جو ہر سب جمع ہوں گے قیامت کے دن۔ اس دنیا میں سب مل جائے گا۔ ان تین چیزوں

سب سے بہتر ہوگا۔ چوک سے اٹھ گازی سوزنیں اور
 سیدھے چلیں۔
 خان اعظم کی بات میں وزن تھا لیکن ان پورٹ ہوئی زیادہ بڑا
 نہیں تھا اور وہاں عموماً مسافروں کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ ایک دو دن
 کے لیے روتے والے یا آگے ٹکٹ کے لیے اسٹاپ اور کرنے
 والے سب نزدیک ترین ہوٹل کے لیے اسے ترجیح دیتے
 تھے۔ میں نے کوشش کر لی تھی کہ کوئی حرج نہ سمجھا۔
 یہ اتفاق تھا کہ جب ہم ان پورٹ ہوٹل کے لاؤنج میں پہنچے تو
 ایک صاحب چیک آؤٹ کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ کراؤن آلے
 لیا۔
 رشتی نے ناک بھول چڑھائی "ہمیں کم سے کم بھی دو ڈبل روم
 چاہئیں اور ایک سنگل۔ ایک سے کیا ہوگا۔"
 چنانچہ نے کہا "دو سرائے کراؤن گھنٹے میں خالی ہو گا تو مل جائے گا۔
 میں نے اس کی ادائیگی بھی کر دی ہے۔"
 "تم کیا تھو صاحب کے ساتھ کراؤن شیز کرو گی؟" رشتی نے
 کہا "یا تھو صاحب لاؤنج میں بیٹھ کے تیرے کمرے کے خالی
 ہونے کا انتظار کریں گے اور ڈرائیور صاحب اپنی دختر نیک
 اختر۔"
 "رشتی! اسٹاپ! اسٹاپ۔" میں نے کہا "تم اور چندا جاؤ اس
 کمرے میں اور سامان رکھ کے لڑی ہو جاؤ۔"
 "اور تم۔" رشتی نے صحن کے باعث چندا کا ساتھ بھی
 قبول کر لیا۔
 "میں اور تھو دو گھنٹے یہاں بیٹھ کے کچھ باتیں کریں گے" میں
 نے کہا۔
 "بھئی کوئی بات نہیں۔ میں ایک رات گازی میں ہی سو کے
 گزرا سکتا ہوں سر۔" خان جی نے کہا۔ پھر وہ سلام کر کے باہر چلے
 گئے۔
 جب ہوٹل کا پورٹر سامان اوپر لے گیا تو تھو نے کہا "ہم ہال
 میں بیٹھ کے بات کریں گے۔"
 میں نے کہا "فی الحال میں پبلک میں آنا نہیں چاہتا۔"
 "یہ کراؤن خان نے تمہارے نام پر ہی لیا ہے۔ مسز اور مسز
 شاہ عالم کے لیے۔" تھو بولا۔
 "رشتہ اپنے شوہر کو رہیو کرنے آئی ہے۔ جب وہ آئے گا تو
 میں قیام کرے گا" میں نے کہا "دوسرے کمرے کی بجگہ تمہارے
 نام پر ہے۔"
 "تم خود کدیں رہو گے؟"
 "میں۔ مگر ہوٹل کے اندر نہیں باہر۔ یہ بات میں رشتی کے
 سامنے کہتا تو وہ فضول بک بک کرتی۔ پہلے تم فون کو شاہ عالم کو۔ یہ
 معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کب اور کس وقت آ رہا ہے۔"
 میں نے اسے باہر آ کے اپنے ریف کیس میں سے فون نکال کر

دیا تو وہ کچھ حیران ہوا "یہ سوا کس فون نہیں ہے۔"
 میں نے کہا "یہ کارڈ لیس فون ہے۔"
 "اس کا کنکشن۔ کس فون ٹاکس پر ہے؟" وہ بولا۔
 "گازی کے فون سے" میں نے کہا "حیران ہونے کی ضرورت
 نہیں۔ سائنس بڑی ترقی کر گئی ہے۔ تمہاری سب ٹکنگ میں نے سنی
 تھی۔"
 "پھر تو سب ریکارڈ بھی کی ہو گی؟"
 "نہیں۔ ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی" میں نے
 کہا اور نمبر ملا کے فون اسے تھمھایا "حوالت کرو" ذرا سوچ کچھ
 کے۔"
 تھو نے کہا "ہیلو۔ کون شاہ عالم؟"
 میں نے گازی کا رہیو راپنے کان سے لگا لیا "تھو۔ آخر
 کھلے ہو تم۔ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ میں نے قریبی سے پوچھا اور
 صاحب دا۔" تھو نے کہا "تمہارے ہر ٹکٹ پر دیکھ لیا۔ سارے فون ایک
 ساتھ نیسے اسٹج ہو گئے؟"
 "میں کیا بتاؤں شاہ عالم۔ بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں ہم۔ جان
 بچانے کے لیے میں نے فیملی کو بھی شفٹ کر دیا ہے ایک نامعلوم
 جگہ۔ میرے سب فون کٹ دیے گئے ہیں۔ صرف یہ گازی والا
 فون رہ گیا ہے۔"
 "کیوں؟ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ تمہاری پوزیشن تو بہت محفوظ
 تھی۔"
 "حق۔ مگر اب نہیں ہے۔ غالباً اس نے ایف آئی اے یا
 فٹری ایشی جنس سے رابطہ کر لیا ہے۔ اور سب بتا دیا ہے۔ وہ خود
 بھی غائب ہے اس گھر کے سب لوگوں کے ساتھ۔"
 "یہ تمہیں کس نے بتایا کہ وہ ایف آئی اے یا فٹری ایشی
 جنس والوں کی تحویل میں ہے؟"
 "یہ میرا اندازہ ہے جو فلا نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھ لیا ہوگا
 کہ وہ سازش کا شکار ہوا ہے اور اب کیس بھی محفوظ نہیں ہے۔
 اسے چھین ہو گا کہ وہ ایسا جائے گا اور اس کے ساتھ دوسرے
 بھی۔ چھاپے پڑے ہیں تمہارے اور میرے لیے ہر جگہ۔ آخر
 کیوں؟ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ ساہیو کپڑوں میں برائ پورٹ کی مگرانی
 ہو رہی ہے۔ پانی کے تمام عرصے والوں کے فون نیپ ہو رہے
 ہیں۔ یہ سوا کس فون ہے اس لیے محفوظ ہے۔"
 "یہ تو بیٹی تھو کی بات ہے۔ تم کہاں سے بات کر رہے
 ہو؟"
 "میں اس وقت کراچی میں ہوں۔ رشتہ کو میں اپنے ساتھ
 لے آیا تھا۔"
 "رشتہ کسے کہیں؟"
 "وہ۔ میرا خیال تھا کہ وہاں اس سے نصیحت کے لیے کوئی بیچ
 گیا تو پتا نہیں وہ کیا کر دے۔"

"اور میرے گھر کے ملازم۔"
 "میں میں نے اور رشتہ نے سمجھا دیا تھا اچھی طرح۔ ہم
 ان پورٹ ہوٹل میں ہوں گے تم کب آ رہے ہو۔"
 "ان حالات میں۔ کیا میرا آنا مناسب ہو گا؟"
 "کیسی باتیں کر رہے ہو شاہ عالم۔ تمہارے آنے سے ہی ہم
 سب کی مشکلات ختم ہوں گی۔ جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ تم
 واقعی باہر تھے۔ کل جس وقت محمود آکا قتل ہوا۔ تب تک تمہاری
 اور میری پوزیشن سخت مشکوک رہے گی۔ تم آؤ اور اچانک ایک
 پریس کانفرنس کرو لیکن ایسے کہ تمہارے آنے کی کسی کو بھی خبر نہ
 ہو۔"
 "پھر پریس کانفرنس میں کون آئے گا؟"
 "بہ بندہ۔ تم مجھ پر چھوڑو۔ اگر پہلے سے چل گیا تو
 جنس ایشی جنس والے ان پورٹ سے اٹھائیں گے۔ جنس سوج
 بھی نہیں دیں گے اخبار والوں سے کوئی بات کرنے کا۔"
 "پھر میں باہر کیسے آؤں گا؟"
 "میں نے آؤں گا جنس۔ میں نے اس کا انتظام بھی کر لیا
 ہے۔"
 "چھاپا تو ان پورٹ ہوئی پر بھی پڑ سکتا ہے۔ وہ معلوم کر لیں
 گے کہ میرے نام سے ایڈوائس بلگ ہے اور وہاں رشتی موجود
 ہے۔"
 "ہم آخری وقت میں وہاں جائیں گے تمہارے آنے سے
 ایک دو گھنٹے پہلے میرا کراؤن خالی رہے گا تمہارے آنے تک۔ رشتہ
 بھی میرے ساتھ ہی جنس رہیو کرے گی۔ مگر تمہارا جلد از جلد
 پہنچنا ضروری ہے۔ مجھے وقت کا پتا چلے تو میں اخبار والوں کو بھی
 مطلع کروں۔ وہ خاموشی سے آجائیں گے۔"
 "وہی تو میرے پاس سیٹ کنفرم ہے صبح نو بجے کراچی پہنچنے
 والی ٹکٹ پر" شاہ عالم نے کہا۔
 "میں دس بجے پریس کانفرنس رکھ رہا ہوں۔ بس ایک بات کا
 خیال رکھنا۔ جنس کسی کے ہاتھ نہیں آتا ہے۔ میں رشتہ کے
 ساتھ ملوں گا۔"
 "میری فکر مت کرو۔ میں تمہارا بہت غلیظ بھی بدل سکتا
 ہوں۔"
 "ٹھیک ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے مجھے پھر کھل کر لیتا۔ میرے
 سوا کس فون کا نمبر ہے؟ تمہارے پاس۔ میں ہے تو کھلو۔"
 "تم نے اچھا کام کیا تھو۔ بس یہ کام غلط ہو گیا۔ ناصر عظیم
 ہمارا تو کچھ نہیں گاڑ سکتا۔ خود پھنس جائے گا لیکن خواہ مخواہ شک
 کی فضا پیدا کرے گا۔ اچھا ہوا اسے بھی لکھانے لگا رہے" اسی
 وقت۔
 "میرا گرام ہی تھا مگر وہ نکل گیا۔ خبر ٹھیک اس پر محمود آکا
 قتل کی خبر جرم عام ہوئی۔ وہ خود بتائے گا کہ اس نے اچھا کیا تھا۔"

تھا اور کس کے کہنے پر کیا تھا۔ ہم بالکل لا تعلق رہیں گے۔"
 "تھو۔ وہ دوران نصیحت بھی خود کشی کر لے گا" شاہ عالم
 بڑھا۔
 تھو نے ایک لمبی گہری سانس لی اور فون بند کر کے مجھے
 تھمھایا۔
 "اسے کہتے ہیں۔ تھو کد بندہ" تھو پر کد بندہ۔"
 "تمہاری قاری سے بہت عاجز ہوں میں" تھو بولا۔
 "میں بھی بہت عاجز تھا جب کراؤن خان مجھے پڑھاتے تھے۔
 اب اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بغیر میری اردو بھی اچھوری رہتی۔"
 "میں نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں" تھو بولا "اب میں
 تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔"
 "رحم و کرم پر کیوں؟ تم میرے ساتھ ہو۔ میرے دوست راست
 اور بائیں کے سینئر نائب صدر ہو۔" میں نے کہا "آؤ اب چلیں۔"
 "کہاں چلیں؟"
 میں نے کہا "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی۔ اخبارات کے
 آفس جا کے انہیں اطلاع دو کہ شاہ عالم صاحب سنگاپور سے صبح
 پہنچ رہے ہیں۔ انہیں ٹکٹ نمبر اور تمام بھی بتا دو۔ یہ صبح کے
 اخبارات میں شائع ہو جائے گا کہ وہ کراچی پہنچنے کے بعد محمود آکا
 کے قتل کے بارے میں ایک اہم پریس کانفرنس سے خطاب کریں
 گے اور اس میں مستحق خبر انکشافات کئے جائیں گے۔ اہم جنس
 کراچی کے راستوں کا علم ہے؟ اخبارات کے دفتر کہاں ہیں؟"
 "میں سر" خان اعظم نے کہا۔
 روانہ ہونے سے پہلے میں نے لاؤنج کے فون پر رشتی سے
 بات کی "میں تھو کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اخبارات کے دفتر۔ پتا
 نہیں کتنی دیر لگ جائے گی تم اور میں خان اپنا اندر وہیں ٹھکرو
 ہال میں کرو۔"
 "تم کو اتنی کیا جلدی ہے کہ کھانا تک نہیں کھا سکتے میرے
 ساتھ۔"
 میں نے کہا "میرے پاس کھانے سے زیادہ اہم مسائل ہیں۔
 جنس بتائے بغیر بھی جاسکتا تھا۔ میںی واپسی کا انتظار مت
 کرنا۔ تم اور میں خان اسی کمرے میں سو جائیں۔"
 "میں ہرگز اس کے ساتھ بیڈ شیئر نہیں کر سکتی۔"
 "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں اور تھو رات کو نہ جانے
 کس وقت لوٹیں گے۔ ہم دوسرے کمرے میں سو جائیں گے۔ میں
 خان کوئی اچھوت نہیں ہے۔ اس سے اتنا الزبک ہونے کی
 ضرورت نہیں۔"
 "تم الری کہتے ہو اسے۔ میں تمہاری ایک ملازم کے ساتھ
 سو جاؤں۔ یہ میری بے عزتی نہیں ہے؟"
 "اؤکے عزت بچھ۔ تم اس سے کہنا کہ صوفے پر سو جائے گی
 لیکن وہ سب کی اسی کمرے میں تمہارے ساتھ" میں نے کہا اور

فون بند کر دیا۔

میں باہر گیا تو خان جی نے چاہا میں مجھے تمہاری "سوری سر" میں ڈراؤ نہیں کر سکتا۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔
ان کی طبیعت ہر طرف سے ٹھیک لگ رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے ان کی طبیعت کبھی خراب دیکھی ہی نہیں تھی۔ ان کی جسمانی قوت و طاقت عمر کے اعتبار سے قابل رشک تھی مگر موسمی بیماریاں اور دائر و دایرہ سے گوشت پوست کا انسان اتنا محفوظ نہیں رہ سکتا جتنا دلوانہ۔ وہ بھی بیمار ہوتے تھے تو کسی سے تندرست نہیں کرتے تھے۔ اسے میں ان کی خرابی شمار کرتا تھا کہ وہ کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتے تھے سوائے ڈاکٹر کے اپنا علاج وہ عام دواؤں سے خودی کر لیتے تھے اور ٹھیک بھی ہو جاتے تھے۔ ان کے اقوال و زبانی کے اس قول سے مجھے ذرا بھی اتفاق نہیں تھا کہ "بنا" صحت مند رہتا چاہے ہو تو جہاں تک ممکن ہے ڈاکٹر سے دور رہو۔

ان سے طبیعت کی خرابی کے اسباب پوچھنا یا انہیں مشورہ دینا حاصل تھا۔ میں نے ان سے چاہی لے لی کوئی بات نہیں میں معلوم کر لوں گا کہ انہیوں کے دوا کرکے کیا ہیں۔
میں خود کسی اخبار والے کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ عام لوگوں کی بات مختلف تھی۔ سر راہ ہوش رہتو نہٹ بس یا زین اور بازار کے اجتماع میں کوئی بھی کسی کو گھور کے غور سے نہیں دیکھتا تھا۔ پولیس کی طرف سے اور بعض اوقات دودھ کی طرف سے منہور مجرموں اور گندہ افراد کی تصاویر اخباروں پر شائع ہوتی تھیں اور انعام کی رقم دس لاکھ تک بھی پیش کی جاتی تھی مگر میں نے آج تک کسی کو دس لاکھ کے لیے مطلوبہ شخص کی تلاش میں سرگرداں نہیں دیکھا تھا۔ خود مجھے کبھی خیال تک نہیں آتا تھا کہ تصویر دیکھنے کے بعد آس پاس کے لوگوں کی صورت پر ایک سرسری نظر بھی ڈال لوں۔ دس لاکھ خاصی رقم ہوتی ہے مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کے دسویں حصے کے لیے دیکھنے سے کل تک سب کچھ ہوتا تھا۔ مگر چلتے پھرتے کسی مطلوبہ شخص کی تلاش کا بے ضرر دلچسپ اور فائدہ مند کام کرنے کی کوئی سوچا تک نہیں تھا۔

اخبار والوں کی بات ذرا مختلف تھی۔ ان کے دماغ کے کپیٹر میں ان گنت چرچہ، افادت اور مقامات کے حوالے سے محفوظ رہتے ہیں اور چھپے ہوئے کسی کی نگاہ کے لینے سے کوئی ٹکس سامنے آتا ہے۔ ان کا خود کار کپیٹر ذہنی دماغ فوراً کام شروع کر دیتا ہے۔ ویسے تو جاسوسی اور تحقیق کا کام پولیس کی ذمہ داری کا حصہ ہے مگر وہ عام طور پر ذمہ داری کے معانی پہلو پر غور فرمانے کے بعد ہی دماغ کے کپیٹر کو ان کے ہونے پر اس وقت جب اہل و عیال کا دباؤ قابل برداشت ہو جائے۔ سہلی یہ کام پیچھے کھینچ کے ذاتی دیکھیں اور ناموسی کے لیے کرتے ہیں۔

اگر میں تجور کے ساتھ کسی اخبار کے دفتر پہنچ جاتا تو سبیل ج

جاتی اور جہاں جاتا وہاں پولیس کا نفرنس کا سہل پیدا ہو جاتا۔ صبح میری تصویر تقریباً ایک جیسے سوالات کے ایک جیسے جوابات مگر اپنے اپنے انداز کی شرفی کے ساتھ شائع ہوتی تو میرا سارا چلان چہنٹ ہو جاتا۔

میں تجور کو کہیں اکیلا بھیجے کارسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ تجور کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ اپنی کشتیاں چلا سکتا ہے اور اب اس کے لیے وہاں کے سب راستے ختم ہو گئے ہیں۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا رہتا اور وہ اندر جا کے کسی ایڈیٹر کے سامنے سستی خیر انکشاف کا دھماکا کر دیتا تو میری صبح کسی خصوص اور تفتیشی ادارے کی حالات میں ہوتی۔ نہ میرے لیے حالات ہی جگہ تھی اور نہ جیل۔ بقول قلمی شاعر یہ تو ہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔ مگر وہ وقت اور تھا اور اس وقت کے تھانے اور تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا۔ گاڑی میں وہ کپڑے بھی تھے جو پیش پر گرد صاف کرنے کے کام آتے تھے۔ پچھلی سیٹ پر ایک ویکہ بھی تھا۔ تو لیے کو سر پر باندھنا مشکل ثابت ہوا۔ میں نے تقریباً ایک گز چڑھے اور اتنے ہی پچھلے کو عرب شیڈ کے اسٹائل میں سر پر باندھا اور آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی۔ اتفاق سے وہ کپڑا چار خانے والا تھا۔ اس سے مجھ میں یا سرعرات جی شان پیدا ہوئی اور اس کی تصدیق تجور نے بھی کی۔ میرا دل رکھنے کے لیے یا مجبوراً مجھے گھوڑا کپڑا ٹسٹ میں سے تجور کا خاصا رنگ دھوپ کا چشم بھی ملا۔ میں نے اسے بھی لگا لیا اور اس تبدیلی کے بعد بہت مطمئن ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ سمجھے گا کہ میں کانٹا یا بیگ ہوں کہ رات کے وقت سن گلاس لگا رکھے ہیں مگر لوگ انھوں کی بیماری میں بھی تو ایسا کرتے ہیں۔ پہلے تو لیے کو میں نے مولوانہ انداز میں کندھے پر ڈالا اور گاڑی ایک اخبار کے دفتر کے گیٹ پر دھوک دی۔

چوکیدار فوراً آگے آیا "دو سیال بھائی، دو دانہ نظر نہیں آ رہا ہے کیا؟"

میں نے سر ہلایا "رائیں طرف۔ اچھا ہاں، اب نظر آ رہا ہے۔"

وہ ہنسا "ایک بلب نیو ہے۔ خیر اب گاڑی سامنے سے ہلاوے۔"

میں نے کہا "کوئی ایڈیٹر وغیرہ لے گا؟"

اس نے میرے انداز خطاب کا سخت بُرا مانا۔ یہ سوال ایسے ہی کیا کیا تھا جسے کوئی کہنے لای پولس میں جا کے پوچھے کہ بھی کھانا لے گا؟

"دیکھو سیال ایک چشم ٹک" ایڈیٹر کی سے نہیں ملتا۔ لوگ لٹے ہیں ایڈیٹر سے ٹم لے کہ کیا مجھے اب گاڑی آگے بڑھائی۔"

میں نے کہا "اپنی ایل ٹی ایف پائی کے سینئر نائب صدر تشریف لائے ہیں۔ جناب امیر تجور صاحب۔"

"یہ بہت تشریف لائے ہیں یہاں آگے کو گاڑی۔"

"ایڈیٹر کو چاہا تو وہ ہمیں دماغ طبع بنانے کا" میں نے گاڑی آگے کی۔

اس نے کچھ ڈر کے کہا "اچھا۔ میں بتاتا ہوں۔ کیا نام بتانا تم نے؟ میں تجور "اور میرا جواب سے بغیر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ہڈیوں کا دروازہ دھماچا پر آدہ ہوا جس کی ناک ٹیک کا پارکراں سنبھالنے سے ڈھری ہوئی تھی "جی کون؟" اس نے قہقہے کے ٹیک کو اٹھایا اور فوس کیا۔ پھر ایک پرورد آواز نکالی "آپ تجور صاحب۔ میں شی جی کا انچارج ہوں۔ آئیے اندر لیا پر کیوں؟"

تجور نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ لرزے لگا "مجھے بس ایک اطلاع دینی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے میں خود آ گیا۔ ہمارے چیئرمین شیج تشریف لا رہے ہیں منگ پور سے۔ فوجی فلائٹ پہنچے گی۔"

"اچھا اچھا۔ یہ تو بڑی اہم خبر ہے۔ حالات کے ناظر میں۔" تجور نے کہا "جی ہاں آدہ کے فوراً بعد وہ ان پورٹ ہوئی میں ایک پولیس کا نفرنس سے خطاب کریں گے تقریباً دس بجے۔" اس نے سر ہلایا "یہ تو ضرور ہو گا۔ واقعات کے ناظر میں۔" تجور نے کہا "آپ کسی ذمہ دار قسم کے رپورٹر کو بھیج دیجئے گا۔"

"میں کرائم رپورٹر کے ساتھ پولیس کی رپورٹر کو بھی بھیج دوں گا۔ وہ فون دن ہے" دھماکا کنٹرول کر کے ہنسا "ایک سی شخص دونوں کام کر رہا ہے اور ویسے بھی کرائم اور سیاست گویا لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ نظریات کے ناظر میں۔"

تجور نے کہا "چیئرمین شاہ عالم کے لیے اپنی پوزیشن کیلبر کرنا انتہائی ضروری ہے، ان کی غیر موجودگی میں سیاسی حریفوں نے جو الزام تراشی اور کردار کشی کی کم چلا رکھی ہے۔ اور انہیں مرد راز کے قتل میں ملوث کرنے سے جو شرارتیں گیزی ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ پولیس کا نفرنس بہت اہم ہے۔"

"جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں نکات کے ناظر میں" اس نے سر ہلایا۔

تجور نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا "خبر لیاں ہو تو آپ کی توجہ۔"

"آپ ایسے کہاں چل دیے۔ ایڈیٹر صاحب سے نہیں ملیں گے اور چاہے تو ملیں ایک کب ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "تھر صاحب" ہمیں اور بھی کئی جگہ جانا ہے اور آپ کے بدترین چکر دار نے تو ہمیں ایریا فیئر قرار دے کے بھاگ جانے کو کہا تھا۔" "میرا نام ناظر نہیں، ناظر ہے" سمجھا۔ اس نے تھکی سے کہا۔

"سمجھ گیا" میں نے گاڑی آگے بڑھادی "مگر ایک بڑے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں اخبارات میں خبر کی نمایاں کوریج کا بعد دست ہو گیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تقریباً اسی وقت اخبار والے پولیس میں آخری کالی پیچھے ہیں۔ میں نے تجور سے کہا کہ اتنی پہلوی کالی ہے۔ اندک کے دو اور انگریزی کے ایک بڑے اخبار میں پولیس کا نفرنس کی خبر شائع ہوئی تو دوسرے سہائی خودی پڑھ لیں گے اور پہنچ جائیں گے۔" اسی وقت مجھے خان اعظم کا فون موصول ہوا۔ "کہاں ہو تم لوگ؟"

میں نے عرض کی "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ آپ فرمائیں یہاں کیا؟"

"ابھی شاہ عالم کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں، مگر آئے گا، آئے گا، آئے والا۔" میں نے گاہے گاہے کہا۔

"اس کو سمجھنا کہ وہ آخر وقت تک ٹکے۔ اس کے لیے ایک خصوصی ایئر لینس کو اندر تک لے جانے کا بعد دست ہو گیا ہے۔ ایئر لینس میں صرف اس کی بیوی کو ساتھ رہنے کی اجازت ملی ہے۔ ایک نرس ہوگی اور ایک ڈاکٹر ہوگا پیچھے۔"

میں نے کہا "اور باقی سب لوگ؟"

"باقی تو گاہے باہر بھیج کریں گے۔ ایئر لینس کا راستہ الگ ہے۔ تم اور تجور۔ اور چنڈا۔"

"اور آپ؟"

"نہیں۔ یہ اجازت نامہ کرل خان کی ذاتی ذمہ داری پر جاری کیا گیا ہے کہ وہ چیئرمین شاہ عالم کے چیف سیکریٹری مل ہیں۔ اور وہاں اسے ایس ایف کا ایک اعلیٰ عہدہ دار نہیں جانتا تھا۔ میں اسے ایس ایف کی جیب میں وہاں پہلے سے موجود رہوں گا اور جب اس ایئر لینس کے پیچھے پیچھے باہر آئے گی۔" میں نے "تو آواز بلند کیا "صوت غلطی" اور پھر تہ پر ہاتھ رکھتے بناتے ہوئے قلع سے کئی ساتوں بھی آواز نکالی۔ تجور بھونکا کہ کیا۔

میں نے کہا "مصافحہ کرنا۔ جیسے گویا کبھی کبھار زمین پر لوٹ لگتا ہے ایسے ہی میں بھی کبھی ایسی آواز نکالتا ہوں۔ یہ اندر ہے تو خرابی پیدا کر لیتا ہے۔"

"بہت خوش نظر آ رہے ہو؟"

"صرف دیکھتے ہیں۔ اندر سے میں ایک فائدہ اور بھوک سے قہقہہ الگ ٹھنک میں جگر چلتی ہے۔ دل گھبرا رہا ہے کوئی جتنا مجھے پکڑا رہا ہے۔ چلو میں تم کو اندر لیاؤں گا۔ آج بھی ذمگی کی آخری رات ہے۔ نامرہم حق منکرت کرے جب آزاد ہو۔ قلعہ کل سے میں شاہ عالم ہو جائوں گا۔ شاہ عالم حالی نہیں ایک

۳۳ انقلاب کی وجہ بھی تم جانتے ہو؟

61 ☆☆☆

میں نے اٹھا کر بچے پھینک دیا تا تو جاہل جائے گا کہ کتنی اونچائی ہے وہ بول۔

"بھری کی جاکش نیچے سے بھی کی جاسکتی ہے" آسان طریقہ ہے۔
 "کوئی کا کردار کتنا بلند ہے اور اس کی خودی کتنی بلند ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟" وہ بولی۔
 میں نے کہا "یہ سوال نصاب عشق میں شامل نہیں۔ اگلا سوال؟"
 "آخر آپ اپنی بیوی سے اتنی بے اعتدالی کیوں کرتے رہے ہیں؟ وہ سخت دھکی ہیں اور مجھے انہوں نے کوئی ایک درجن پُرالم بھی کماناں سنائیں کہ اپنا ایک دل آپ کس کس کو دے چکے ہیں۔"
 "اس خانہ دویروں میں کون کون آباد رہا ہے؟ مجھے معلوم ہی نہیں۔ تم ان کے حساب سے تیر ہوئیں ہو۔ تیرہ کا عدد منکوس ہوتا ہے۔"
 "میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری ایسی پیشانی لگا لی جائے کہ تمہارا دماغ درست ہو جائے۔"
 میں نے کہا "مفلح ناک جسم کے پاگوں کو ایسے دورے پڑتے ہیں جب وہ حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ جو بھی سامنے آئے تمہاری یہ کیفیت کب سے ہے؟"
 "مجھے ایک بات بتاؤ گے ایماندار! سے!"
 "تم ہمیں سوال کرنا۔ پہلے میں ایک بات کہوں ایماندار! سے۔"
 "کوئی دوسرے مجھے اندازہ تو ہے کہ تم کیا کوئے؟" وہ بولی۔
 "بے شک تمہیں۔ اور تمہیں کیا دنیا کی ہر لڑکی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو جس پونڈورس یا کہ قاف کی پری و فیو سمجھتی رہے اور اس خوش قسمتی میں جھلا رہے کہ شاہ عالم کیا سارا عالم مرنا ہے اس پر۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ناصر عظیم سے شاہ عالم بیٹے ہی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کر رہا ہوں اپنے خیالات میں۔ تمہارے لیے میرے جذبات بالکل بدل چکے ہیں۔ تم مجھ کو کہ خواب تھا جو کچھ ہم نے دیکھا تو بھی سنا انسان تھا۔ میں تمہیں بے وقوف بنانے میں وقت ضائع کرتا رہا۔ تم جتنی بے وقوف تھیں اس سے زیادہ میں بھی بن سکتی تھیں۔ میں نے جھوٹ بولا تم سے۔ نہ تم مجھے اچھی لگتی تھیں کیونکہ میری نظراں بالکل ٹھیک تھیں اور نہ مجھے تم سے محبت تھی کیونکہ میرا دماغ خراب نہیں تھا۔"
 "بالکل ٹھیک تھا میرا اندازہ" وہ بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم میری کوئے کیا اب میں کچھ عرض کروں؟"
 "ہاں ہاں۔ ضرور عرض کرو۔"
 "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم سب میں اور تم۔ جس راستے سے آئے ہیں اس پر لوٹ جائیں۔ ایک قدم آگے بڑھائے بغیر۔ ابھی وقت ہے۔" وہ بولی "تمہاری اپنی زندگی ایسی تو نہیں تھی کہ ہم اسے چھوڑ کے نئی زندگی جینے کی خواہش کریں۔ چھوڑنا ضروری ہے پھر بازی واپس چلنا اپنے گھر۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جذباتی لہجے میں کہا "چند۔ پھر بازی کیا میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اس وقت تمہارے ساتھ واپس جاسکتا ہوں اگر صبح نو بجے سے پہلے تم قاضی کے سامنے کہہ دو کہ میں نے قبول کیا۔"
 اس نے اپنا ہاتھ جھڑپا "جدا سو جاؤ۔ بیگم صاحبہ بڑے انتظار کے بعد سوئی ہیں۔ مجھے تو بیدار ہونے نہیں ملا۔"
 "بس خان۔ مت بھولو کہ تم ایک معمولی ملازم ہو" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "یہ الگ بات ہے کہ ہم ہر یکہ پڑی کی طرح تم پر بھی فریفتہ ہو جائیں۔"
 چندا چیخے ہٹ کے دروازے میں ڈکی اور ایک دم چٹائی "میں؟"
 "رکھی آٹھ بیٹی" کیا ہوا اس خان۔"
 "میں یہ آپ کے شوہر۔ یہ بہت نفٹے میں ہیں شاید۔"
 اس نے شکر اٹھے مجھے دیکھا اور آٹھ مار کے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
 "لوکی چچی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا ہے کہ گالی دی۔ اب رشتی اس سے کہہ کر پوچھ لیں کہ میرے شوہر نے نفٹے میں کیا کیا تھا اور ایسی کیا لفظ حرکت کی تھی؟" پتا نہیں چندا اسے کیا بتائے گی۔ بس ڈال دی جس میں چنگاری۔ صبح رختہ کے پاس جنگ شروع کرنے کے لیے بہترین ہمانہ موجود ہو گا۔ وہ جتنا چاہے گی کہے گی اور میں چاندنی کا دل بار بار باغ ہو گا۔ مگر رشتی کی پروا کرتا ہے اب میرا جو آؤ خواتین کتنی ہیں میری جوتی۔
 امیر تیمور ایک بیڈ پر دراز تھا اور بے خواب آنکھوں سے پھٹ کر گور رہا تھا۔ دوسرا بیڈ خالی تھا۔
 میں نے کہا "یہ خان۔ میرا مطلب ہے ڈرائیو رکھا کیا؟"
 "یہ رتھر رکھا تھا یہاں کہ مجھے کوئی ضروری کام ہے۔ آپ لوگ دروازہ بند کر کے سو جائیں" میری فکر مت کریں "اس نے ایک پڑھ میری طرف بڑھاوا۔
 خان جی کے ضروری کام واقعی ضروری ہوتے تھے۔ وہ طبیعت کی خرابی کا ہمانہ کہے بلا وجہ نہیں دے تھے۔ یہ وقت آنے پر ہی معلوم ہو گا کہ وہ کام کتنا ضروری تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے عزت و احترام اور عقیدت کے ساتھ محبت کے وہی جذبات تھے جو کسی بھی سعادت مند اور باخیر بیٹے کے باپ کے لیے ہو سکتے ہیں مگر خان جی کو جذباتیت کا مظاہرہ سخت چاہیہ تھا۔ اگر میں ان کے انتظار میں جاگتا رہتا اور جب وہ واپس آتے تو ان سے درخواست کرتا کہ آپ بیڈ پر سوئیں میں بھی سو جاؤں تو وہ بخا جاتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے سب معلوم ہے تم میری کتنی عزت کرتے ہو اور کتنی اپنیت ہے تمہارے دل میں مگر یہ جتانے کے لیے زندگی کی خدمت گزار اور غیر گیری یا غیر مندی کی کیا ضرورت ہے میں اپنا خیال خود کر سکتا ہوں اور ضرورت پڑنے کی تو تم ہی سے کہوں

کہا کہ جسورے چل یہ کام کر دے۔ میرا بیڈ پر سونا ہو گا تو میں تجھے اٹھا کے بھی کہہ سکتا ہوں کہ چل نیچے ستر بچھا۔ مجھے اور سونا ہے کیا میں کھٹ سے کام لوں گا اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے تیمور سے کہا "تم صبح نو بجے سے پہلے مجھے کل کرنے کے امکانات پر غور کر رہے ہو تو ستر ہے سو جاؤ۔ میں سوئے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھتا ہوں۔"
 اس نے کسی رتھر عمل کا اظہار نہیں کیا "مجھے ایسے نیند نہیں آتی۔ میں LAXATONIL کی ایک گولی کھانا ہوں۔"
 "جو تم نے گزشتہ رات بھی نہیں کھائی تھی۔ کبھی تجربہ کیا ہے تم نے کہ نیند آخر تک نہیں آئے کی دو دن تین دن۔"
 "یہاں نہیں ہے۔ میں رات بھر سو جاتا رہا ہوں گا۔ ہر کل کا دن بھی اسی طرح اوجھٹے گزرے گا۔ میں کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دماغ بوجھل رہتا ہے۔ اس سے ستر ہے میں گولی کھا کے رات بھر سکون کی گہری نیند سوؤں اور صبح چاق چوبند اٹھوں۔"
 "پھر تمہیں گولی خرید لی جا چاہیے کتنی دن میں۔ اگر تم کو تو میں لا دوں کہیں سے۔ آس پاس کوئی فارمی ضرور کھلی رہتی ہوگی رات کو بھی۔"
 "رہنے دو۔ شاید آج کوئی بھی مدد نہ کرے۔"
 "تم میری بچوں کی طرف سے فکر مند ہو؟" میں نے پوچھا۔
 "یہ خیبت کون ہے آخر؟"
 "جیسے شاہ عالم کی فوس ہے قاف عالم۔ ایسے ہی ناصر عظیم کی فوس کا نام ہے ناصر عالم دنیا کے بدگار۔ تم انہیں خدا کی فوج دار بھی سمجھ سکتے ہو۔ ایسی فوس ہر شر ہر ملک میں اٹھ کر اڑ کر کام کرتی ہے۔ اپنا لفظ جو پہلے دہشت گرد عظیم کے لیے استعمال ہوتا تھا یا منشیات فروشوں کے کسی بہت بڑے گروہ کے لیے۔ وہ آج کل بہت عام استعمال ہوتا ہے۔ زمین پر ناجائز بیغہ کرنے والوں کی مانیا ہے۔ جنگلات کاٹنے والوں کی مانیا ہے۔ بتا لینے والوں کی مانیا ہے۔ یہاں تک کہ ٹرانسپورٹرز کی مانیا ہے۔ بلڈرز کی پرائیویٹ اسکولوں کی اور وائر ٹیکرز کی مانیا ہے۔ ایک ایسی طاقت جس کا قانون یا رائے عامہ کچھ نہیں کاڑھ سکتے۔ ایسے ہی غیظے بد معاش پولیس کے خیر اور جرائم پیشہ افراد کی مانیا ہے۔ خیبت اسی مانیا کا رکھن ہے بلکہ ابھی خاص پوزیشن ہے اس کی اور وہ اپنا بار ہے۔"
 "تمہارا بار ہے؟"
 "ہاں۔ حالانکہ نہ میں غیظا بد معاش ہوں اور نہ کسی مانیا سے میرا تعلق ہے مگر وہی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی بے ضرر ہے دیکھ۔ تم خود اپنے بوی بچوں کی حفاظت ایسے نہیں کر سکتے تھے جیسے خیبت کرے گا۔ جب تک میں محفوظ ہوں تم ان کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔"
 اس نے صرف سر ہلایا اور پھٹ کر دیکھا رہا۔ میں ایک منٹ

کے بعد سو گیا۔ پھر میری آنکھ پر گرام کے مطابق سات بجے ٹپکی۔ اب وقت کم رہ گیا تھا۔ غسل کرتے وقت میں یہ آواز بلند کاٹا رہا۔ اے سو جاؤ جاگ ڈرا اب وقت شرارت ہے آٹا اٹھ اکبر۔ تیمور غسل خانے میں قابض چندا نے قدم رنجہ فرمایا "خیر لے فون کیا تھا۔"
 "کوئی خاص بات؟" میں نے تیار ہوتے ہوئے کہا۔
 "ہاں۔ شکایت کر رہا تھا کہ یہ شرکا کا ہو گئی ہے۔ آپ لوگوں کو خیال رکھنا چاہیے۔"
 میں نے کہا "یہ کون سی ملاحزمت کی ہے تم نے؟"
 وہ ایک رسالے کے سلسلے چینی رہی "کہہ رہا تھا کہ کہوں میں پالتو جانور رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ چڑیاں، طوطے، بلیاں، کتے

محمد احمد مودی



۱۵۰۰

ایک آدم زاد کہ
عبدالغنی استانہ
جسے اولادِ آدم نے دوسرا لیا تھا۔

اپنے باکرہ باقری کے ساتھ سے طلبہ فرماہیں

یہاں تک کہ شوہر بھی نہیں۔

”لاحول ولا قوت۔ یہ کہا تھا اس نے؟“

”دعہ دراصل اسے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید تیمور صاحب اپنے گئے کو مٹا رہے ہیں۔ گئے صاحب کی مرضی کے خلاف چنانچہ وہ ان کو یہ آواز بلند گالیاں دے رہا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ اندازہ یہ رہی حیوانات والے آجائیں گے۔ ویسے بھی ہاتھ دہم انسانوں کے نمائے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ دوسرے سہان کیا کہیں گے ہوئی کی تو یہی ٹیشن خطرے میں ہے۔“

میں نے برہمی سے کہا ”صاف کو تا کہ میں گا نہیں رہا تھا“ ہوبوک رہا تھا۔ میں ہر حال جملہ عداوت سے اجھا گا تا ہوں۔“ وہ مصوبیت سے بولی ”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ خیبر کہ رہا تھا۔“

میں نے غرا کے کہا ”یہی چاہتا ہے لپک کے جسیں کٹ لوں“ گال پر۔ جب بائیں ٹیکے لگیں گے۔“

وہ فوراً دوڑا زے کی طرف ہو گئی۔ ”میرے قریب آ کے دیکھو ذرا۔“ جسیں پتا ہے یا ناگل ہو جائے گا تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔ گولی پر یاد آ گیا کہ کم سے کم تین افراد جسیں گولی مارنے کے خواہش مند ہیں۔ فہر ایک تہا سہی مینہ ناخف مکتود، فہر دو تیمور اور تم پائے تین منٹ میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے تو کرل خان۔“

”رات کو آپ نے کیا کیا اس فریادی تھی رخشدہ۔ میں نے نٹے میں ایسی کیا حرکت کی تھی۔“ میں نے کہا اور ایک جست لگے کہ اس کی راہیں حاکی ہو گیا۔

دوسرے لمبے پھٹ میری داغوں میں سے گزر گئی اور میں اڑتا ہوا اوپر جا کے پھر نیچے آ گیا تو تیر پر لپٹا ہوا تھا۔ چندا قناب تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ”گر تیرے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔“ اچھی بات یہ ہے کہ دیکھا کہ نے بھی نہیں۔ چندا کو اس گستاخی کی سزا مناسب وقت پر دی جائے گی۔“

میں رخشدہ سے بچ کے کل جا تا مگر اسے بھی غالباً چندا نے ہی باہر بھیجا ہو گا کہ وہ ایک دم میرے سامنے آ گئی۔ ”تم سے کچھ پوچھنا ہے مجھے۔“

میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے کہ تم کیا پوچھو گی۔ میں خود بتا رہا ہوں کہ رات کو میں نے اتنی شراب پی کہ تمہارا باپ نہیں پی سکتا۔ اس کے بعد لٹے کی حالت میں کم سے کم ایک درجن لڑکیوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے بگا لے جائیں۔ ان کی عرس سات سے ستر کے درمیان تھیں۔ صرف تمہاری وجہ سے سب نے انکار کر دیا۔ سارا قصور تمہارا ہے۔“

”شرم نہیں آئی اٹا نا مجھے قصور وار ٹھہراتے ہو۔“ ”ہاں۔ تم قصور وار ہو۔ نہ تم میری بیوی ہو تیں نہ مجھے کوئی انکار کرتی۔ وہ صرف کوتاہیوں کو ساتھ لے کر فرار ہونے والی

خواتین تھیں۔ سوری۔ لڑکیاں۔“

”جو موت۔ تم نے جس خان سے کیا کیا تھا؟“

”میں نے اس سے جو بھی کہا۔ وہ آتشیں ہے۔ تم کو نہیں بتایا جا سکتا۔“ میں نے کہا اور راستہ کاٹ کے کل گیا۔ خان اعظم خاصے سنجیدہ تھے ”جسیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وقت کم ہے۔“

”بہا اور شاہ۔ ایک فرصت گنناہ مل رہی تھی چار دن۔“ ”میری بات پر دھیان دو۔“ خان جی نے کہا ”تلاش تقریباً پڑنے دس بجے پہنچ رہی ہے۔ پڑنے دس بجے ٹھیک رخشدہ اور تیمور یہاں سے ایک ساتھ روانہ ہوں گے۔ تیمور کی گاڑی پر پانی کا بھنڈا ہو گا اور یہ وی آئی ٹی لاؤنج کے سامنے کھڑی کی جائے گی۔ ہم وہاں اخبار والوں کے درمیان سے گزر کے اندر لاؤنج میں جائیں گے۔ اس کے لیے میں نے ایک پیشہ انداز پاس بنوائے ہیں۔ کشم کلیرنس کے بعد شاہ عالم کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“

”میں اندر کیسے جاؤں گا؟“ آپ نے ابھی تک نہیں بتایا۔ ”ہمارے ہو گئے سے روانہ ہو جائے کے بعد ایک ایسپرنس آئے گی۔ تم اور چندا اس میں جاؤ گے۔ ذرا تیمور جسیں دوسری طرف سے اندر لے جائے گا۔ اسے راستہ معلوم ہے۔ یہ ہیں تم دونوں کے پاس“ انہوں نے دو کافے کے پڑے میری طرف پھرائے۔

میں نے ایک پر ”ڈاکٹر پروجہ صالح کا ملڈ لوجسٹ“ اور دوسرے پر ”سٹاف نرس مس سیمادیشان“ لکھا ہوا دیکھا۔

”تم شاہ عالم کو ایسپرنس کے پچھلے حصے میں سوار کر کے لوٹ آؤ گے۔ میں جسیں وہیں پھنک دوں گا۔ اس وقت تک رخشدہ اور تیمور وی آئی ٹی لاؤنج میں پہنچ جائیں گے اور اخبار نویسوں کو بتا دیں گے کہ مسٹر شاہ عالم گئے ہیں اور چندا منٹ بعد ہو گئے کے لاؤنج میں پریس کانفرنس سے خطاب فرمائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا مگر جب تم اخبار والوں کی بیخبر سے گزر کے رخشدہ اور تیمور کے ساتھ اپنی سرکاری گاڑی میں چلنے پھرنے کے تو بھی جسیں فہر میں آؤں گا۔“

”دیر کی گز۔ آپ اتنی دیر میں سلیمانی ٹولی میں لیں گے۔“

”میں ایسپرنس میں چندا کے ساتھ کل جاؤں گا۔“

”ایسپرنس پر یاد آ گیا شاہ عالم کو ایسپرنس میں چندا کے ساتھ اکیلے جانے پر اعتراض نہیں ہو گا؟“

”نہیں ہو گا۔“

”مگر مجھے ہے“ میں نے کہا ”اکیلی چندا۔“

”وہ شاہ عالم جیسے دس سے منٹا جاتی ہے۔ تم اس کی حرکت کرو۔ تیمور کو یہ پروگرام سمجھا دو۔ اگر رخشدہ پوچھے کہ شاہ عالم کہاں ہے تو تیمور اسے مطمئن کر دے کہ وہ اندر سے آئے گا۔ لاؤنج میں اسے رہیو کر کے والوں میں تیمور بھی ہو گا اور اس کے

ساتھ رخشدہ ہو گی۔“

”رخشدہ کو میں بھی سمجھا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم آؤ گے گئے میں ناشتے سے فارغ ہو کے اپنے کمرے میں جا سکتے ہو۔ ناشتا ڈاننگ ہال میں کرنا۔ وہیں سے رخشدہ کو تیمور اپنی گاڑی میں لے جائے گا۔ چندا جسیں اوپر تیار لے گی۔ دس منٹ میں تم بھی تیار ہو سکتے ہو۔ ایسپرنس جسیں نیچے کھڑی لے گی۔“ اب جاؤ۔“

میں واپس گیا تو تیمور کپڑے بدل کے تیار ہو گیا تھا۔ میں نے رخشدہ سے اکیلے میں ملاقات کی۔ اس کا منہ ابھی تک خراب تھا۔

”اب ہم ناشتا ڈاننگ ہال میں کریں گے۔ وہاں سے تم تیمور کے ساتھ چل جاؤ گی اس کی گاڑی میں۔“ ”اور تمہ۔ تم ساتھ نہیں چلو گے؟“

”بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں باہر سے آ رہا ہوں۔ میں اندر سے آنے والے مسافروں میں شامل ہو سکے وی آئی ٹی لاؤنج میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں تم اور تیمور ایسے ہیرا استقبال کر کے جیسے میں واقعی سکا پور سے پہنچا ہوں۔“

”غالی۔ میری کچھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ یہاں جسیں ہو گئے والے کل سے دیکھ رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”ہو گئے والوں کو گولی مارو۔ ان سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔ اور تم بھی داغ پر زیادہ زور مت ڈالو۔ کیس اور نوڈنگ سے بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ تم جانتی ہو یہ سارا ڈراما کس لیے رچایا جا رہا ہے۔ مجھے کل کے الزام سے بچانے کے لیے۔“

”جو تم نے نہیں کیا“ وہ فخر سے بولی۔

”ہاں۔ ضرور راز کو میں نے نقل نہیں کیا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔“

ہم نے ڈاننگ ہال کی دو میزوں پر ناشتا کیا جو ساتھ ساتھ تھیں۔ ایک پر میں رخشدہ اور تیمور تھے دوسری پر خان اعظم اور چندا۔

رخشدہ نے تیمور کو مخاطب کیا ”کل رات تم انہیں کہاں لے گئے تھے؟“

تیمور نے اس کے لیے کو پند نہیں کیا ”آپ صحیح کر لیں۔ یہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے جیسے یہاں لائے تھے۔“

”اور باہر جا کے اتنی ہی کہ ہوش دخواست سے بے گند ہو گئے۔“

تیمور کا منہ حیرت سے کھل گیا ”جہاں ہم نے ضرور لی تھی اور کانی بھی مگر کوئی شراب کی بات کرتا ہے تو وہ بکا ہے۔“

”مجھے بس خان نے بتایا۔ نٹے میں انہوں نے اس کو پریشان کیا۔“

”آپ کو بس خان کی بات پر زیادہ اعتبار ہے تو میں کیا کر سکتا

ہوں۔“ تیمور نے دو کپے لیے میں کہا ”اور پھرنے کا کیا مطلب ہے؟“

”میں بتاتا ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔ تو شاہیں ہے ہیرا کر ہانڈوں کی چٹانوں پر شٹا مری میں مری مجھے بھی پسند ہے۔ میں نے کہا کہ شاہین۔“ پہلے میں بیوی سے تو اجازت لے لوں۔“

وہڑ کے ناشتالانے سے بات وہیں ختم ہو گئی۔ تیمور مسکرا کے رہ گیا۔ رخشدہ بھی مجھ پر غامض رہی۔ ات کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ رات والی بات میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اور تھی تو شاہ عالم جیسے شوہر سے کھ عہت ہے۔

سازمے نو بجے تیمور نے کھڑی دیکھی ”میرا خیال ہے کہ اب ہم تو چلیں۔“

میں نے سر ہلایا ”مجھے باہر آنے میں آدھا گھنٹا تو لگ جائے گا۔“

تم اتنی دیر میں صحافیوں کا دل بھلا تا۔“ تیمور نے خان جی سے کہا ”معلم۔ گاڑی لے آؤ۔ اور دیکھو اس پر ہماری پانی کا پرچم پوتا ہوا ہے کہور میں اسے کھول دیتا۔“ ”جسیں سر۔“ خان جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے ساتھ ہی چندا بھی اٹھی اور اوپر چلی گئی۔

رخشدہ اور تیمور کی دو گئی کے بعد میں اوپر پہنچا تو دروازہ کھول کے اندر قدم رکھتے ہی پھر پوچھا رہ گیا۔ چندا نرس کی بے داغ سفید یونیفارم پہنے بالکل تیار کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیشن کوپ تھا۔

”اس لباس میں تم مجھے برف سے بنی ایک گولیا لگ رہی ہو۔“ ”ایک قدر آدم قفل کھ رہی ہو شے دیکھ کہ منہ میں پانی بھر آئے۔“

”اس پانی کو حقو کہ کہا جاتا ہے“ دونوں مثالیں بازار ی ہیں۔“

”اوکے تم کسی فرشتے کی طرح نظر آ رہی ہو۔“ ”گوں سا۔ موت کا؟“ وہ بولی ”لاؤ تمہاری حرکت قلب دیکھو۔“

”دیکھو۔“ مندر کے ہاتھ میں قلب اس آٹے سے دل کی دھڑکن ٹپتی جاتی ہے۔ دیکھنا ہے تو میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو۔ چندا ”میں نے جذباتی لیے میں کہا۔“

”اوہ!“ اس نے اسٹیشن کوپ کاٹوں میں لگے کہ ”یہ کیا تمہارا قول ہی نہیں ہے یا مگر چہرے گولی آواز نہیں۔“

میں نے اسٹیشن کوپ کا دو سراسر احتیاط بائیں جانب رکھا ”جاہل۔ دل اور نہیں ہوتا اب کچھ سنا لی؟ بالکل صاف تمہاری نام ہو گا۔ جن سدا۔ جن سدا۔ ہر دھڑکن کے کی۔“

اس نے ٹپٹی میں سر ہلایا۔ ”تمام بالکل کچھ میں آ رہا ہے۔“ ”مٹ۔ مٹ۔ مٹ۔“ تم ایک محبت کہنے والے وفادار شوہر ہو۔“

"ہوں نہیں، ہوں گا۔۔۔ تمہارا۔"

اس نے اشتیاق کوپ کاٹوں سے جٹایا "پلے انسان کے بچے بن جاؤ۔ یہ سب تیرا بھیری، پکریازی، چھوڑو۔ میں کسی مداری سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"سب سے بڑا مداری تو میرا سر ہے۔" میں نے بھی ہمتا کے کہا۔

"ہوگا، مجھے کیا؟" چنرا نے اشتیاق کوپ مجھے ہمتا دیا۔

"بد قسمتی سے وہ تمہارا دادا ابھی ہے" میں نے ہاتھ دم کارخ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات میں ان سے تمہاری موجودگی میں پوچھ لوں گی۔" میرا خون خشک ہو گیا۔ چنرا سے کچھ بعید نہ تھا کہ خان اعظم کے سامنے کچھ بھی بک دے۔ "اے چنرا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم جانتی ہو، میں ان کی کتنی عزت کرتا ہوں۔ میرے لیے بھی وہ باپ سے کم نہیں۔"

چنرا ابھی "ہیں" ہوا نکل گئی غبار سے۔۔۔

ہم تیار ہو کے نیچے آئے تو کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے اور چنرا کو خاصی دلچسپی سے دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگی۔ شاید یہ کہ ایک ڈاکٹر اور نرس کو کس نے طلب کیا تھا؟ ویسے صورت آشنا لگتے ہیں۔

ایمرلیس باہر ایک رنگ ایریا میں موجود تھی۔ ڈرائیور تہہ سی چڑھ کر بیٹھا سرکریٹ لی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے سرکریٹ بچھا دی اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے چنرا کو آگے بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا۔

یہ سوڑکی ہائی روڈ گاڑی تھی جس کے سامنے والے حصے میں دو اسکرین کے عین نیچے انگریزی میں ایمرلیس کے خوف اٹنے لکھے گئے تھے۔ ایسا غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ ٹریفک میں آگے جانے والی گاڑی کا ڈرائیور عقب نما آئینے میں دیکھتا تو اسے خوف سیدھے نظر آتے اور وہ ایمرلیس کا لفظ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

تقریباً دس منٹ کے بعد ایک گیٹ پر ایمرلیس کو اسے ایس ایف کے مستعد جوان نے روک دیا۔ چنرا نے اسے پاس دکھائے تو وہ مطمئن ہو گیا اور ایمرلیس آگے بڑھ گئی۔

ایمرلیس پر کرل خان پہلے سے موجود تھے لیکن اس وقت وہ شو فر نہیں، شاہ عالم کے چیف سیکورٹی آفیسر تھے۔ انہوں نے مجھے آگے بڑھ کے رہیو کیا اور خوش اخلاقی سے ہاتھ ملا کے کہا "ہیلو ڈاکٹر پوریو سال۔ آپ کبھی وقت پر پہنچ گئے۔"

میں نے مصافحہ کر کے کہا "کرل صاحب۔ صرف فونی ہی وقت کے بائند نہیں ہوئے، ڈاکٹر وقت پر نہ پہنچ پائیں تو ڈاکٹری نہیں چلتی۔"

"آئیے اندر لاؤں میں چلیں۔ فلائٹ تو لینڈ کر چکی ہے۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ نرس بھی ہے۔"

"اسے رہنے دو ہمیں" انہوں نے کہا ہماری سب گفتگو ایک شخص سن رہا جو خان صاحب کے ساتھ تھا۔ وہ غالباً سول ایوی ایشن کا کوئی افسر تھا مگر ہمارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ہوا۔ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

لاؤنج میں سرکاری دفینر سرکاری حکام مسافروں کا سامان چیک کر رہے تھے۔ یہ سب کانڈی کا رولڈ والی تھی۔ جس میں زیادہ تر وہ کانڈ کام آتے تھے جو اسٹیٹ بینک کی ضمانت سے جاری ہوتے تھے اور جن پر ایک ہینڈ سہ کسی کو نہ میں دویا تین مفر کے ساتھ نظر آتا تھا۔ پولیس، کنسٹم، ایگریکیشن، اسے ایس ایف، سی آئی اے اور ایف آئی۔ اے۔ قانون کے نصف درجن لیے ہاتھ کسی کو نہیں بخشے تھے۔ تاؤ تھیکہ وہ اپنا خاص بندہ نہ ہوا کسی دیری دیری خاص بندے کا خاص بندہ نہ ہو۔ باقی سب اللہ کے بندے کا فلو بات نہ کریں۔ مال سیٹ کر لاتے ہیں باہر سے تو اکیلے ہتھم کرنے کی نہ سوچیں۔ دوسروں کا حصہ دیں اور راضی خوشی جائیں۔ مل بانٹ کر کھانے سے برکت برتی ہے۔

میری نظر شاہ عالم کو تلاش کر رہی تھی۔ ہماری ہدایات کے مطابق وہ سب کے بعد نمودار ہوا۔ تیور کے ساتھ رشتہ آگے بڑھی۔ تیور نے اس سے برف کس لیے لیا اور خان اعظم کو ہمتا دیا۔

"یہ کون ہیں؟" شاہ عالم نے کہا۔

"یہ کرل خان۔ انہی کی وجہ سے ہم اندر آ گئے۔ اور باقی سب معاملات بھی طے ہو گئے۔" تیور نے ہستہ سے کہا۔

شاہ عالم نے سلام کیا اور صورت حال ہے۔

"صورت حال بدستور تشویش ناک ہے" تیور بولا "تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ ہیں ڈاکٹر پوریو سال۔ کارڈ ارا جسٹ۔"

شاہ عالم نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکرا کے "تھک ماری" تمہارے اپنے دل کا کیا حال ہے؟" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔

تیور نے کہا "ہم باہر لگتے ہیں۔ کرل صاحب تمہارے سامان کی کلیئر نرس کرا دیں گے۔"

"تمیں کس راستے سے جاؤں گا؟" شاہ عالم نے کہا۔

"تم عام راستے سے بالکل نہیں جاسکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نکل جاؤ۔ ایمرلیس تیار ہے۔ ہم تمہیں ہوٹل میں ملیں گے۔ دس منٹ بعد۔"

"کیا اخبار کے لوگ آگئے ہیں؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ سب پہنچ چکے ہوں گے اور تمہاری پولیس کانفرنس کے منتظر ہوں گے۔" تیور نے کہا اور اپنے ساتھ رشتہ کو لے کر چل پڑا۔

خان جی نے میرے کان میں کہا "تم سے اب لاہور میں ملاقات ہوگی۔"

میں چوٹکا تو شاہ عالم کو خشک ہو جاتا۔ اپنے مؤرخ پر قابو رکھنا میرے لیے مشکل کام تھا۔ میں خان جی سے کوئی سوال بھی نہ کر سکا۔ شاہ عالم میرے انتظار میں تھا اور گیٹ تک پہنچ کے رک گیا تھا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا "تیور نے رات مجھے بتایا تھا کہ تم روپوش ہو۔" "میں روپوش ہی تھا۔ رات باہر بیٹے تیور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ جو پوچھتا ہے شاہ عالم صاحب سے پوچھتا۔ اب آپ بتائیں مجھے کہ ایسا کیوں ہوا۔ میرے اعتماد کو اس طرح زخمی کرنا۔"

وہ ہنسنا "یار ناصر عظیم! اب ملاقات ہو گئی ہے تو پھر جلدی کیسی۔ میں سب بتا دوں گا۔ ویسے تم بالکل ڈاکٹر لگ رہے ہو۔ اس لیے کسی نے غور نہیں کیا۔"

میں نے کہا "ایسا نہ کرنا تو آپ سے پہلے پکڑا جاتا۔ رادھر آتا نہیں یہ ہے ایمرلیس۔"

اس کا ہاتھ سلاؤنگ زور کی طرف بڑھایا تھا کہ میں نے پیچھے سے اس کی گردن اور شانے کے درمیان کھڑی پھیلی سے وار کیا۔ یہ کام میں نے اتنی پھلتی اور معافی سے کیا تھا کہ خود زور کی کی نظروں کچھ نہ دیکھ سکیں۔ میں نے شاہ عالم کو گرنے سے پہلے سنبھال لیا۔ پھر چنرا نے اسے اندر کھینچ کے سیٹ پر ڈال دیا۔

"نرس۔ جلدی کر۔" شاید انہیں وہ دہ پر کیا ہے "میں نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

چنرا نے فوراً ایک انکشن بھرا اور شاہ عالم کے بازو میں لگا دیا۔

"تم کیا دیکھ رہے ہو، چل" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"کہاں؟ ہوٹل یا اسپتال؟" ڈرائیور نے کہا۔

چنرا نے کہا "اسپتال، دل کے اسپتال۔ لائسنس آن کرڈ اور سائز بھی۔"

پھر میں پلٹ کے بھاگا۔ میں نے اندر پہنچنے سے پہلے اپنا گاؤن اور چشمہ اتار دیے۔ اشتیاق کوپ کے ساتھ میں نے ان چیزوں کو اس اسٹور جیسے کمرے میں پیچیک دیا۔ گاؤن کی وجہ سے ابھی تک صرف میری چٹون نظر آ رہی تھی۔ اب سوٹ نمایاں ہو گیا۔ یہ بہت عمدہ سلا ہو اور ایمرلیس نے کپڑے کا سوٹ تھا۔ اس کے ساتھ کچھ کرنے والی شرت اور مائی سب ایمرلیس تھے۔ میں نے شہرے فریم والا دمپ کا پشہ لگایا اور دلی آئی پی لاؤنج میں پہنچ گیا جہاں رشتہ اور تیور کے علاوہ درجن بھر اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر موجود تھے۔

ان سب نے ایک ساتھ مجھ پر یلغار کی۔ بیک وقت کئی فلش پکے اور پورٹریٹس چھوٹے چھوٹے پائٹ سائز ٹیپ ریکارڈ آگے بڑھائے اپنے اپنے سوال داغ دیے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے

محسوس کر لیا تھا۔

"آپ سٹا پور سے آرہے ہیں، ڈاکٹر کٹ؟" یہ سوال چار رپورٹروں نے کیا تھا۔

"یہ فلائٹ ہی ڈاکٹر کٹ ہے" میں نے اپنا ٹکٹ لہرا کے کہا "آپ لوگ جنازے سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ جنازہ جوت نہیں بولے۔"

ایک قسم پر "سٹا پور میں آپ کیا کر رہے تھے۔"

"آپ تو ایک کانگ میں تھے۔"

"سٹا پور کے کس ہوٹل میں قیام تھا آپ کا؟"

"اور کب سے تھا؟"

میں نے ہاتھ اٹھایا "مجھے معلوم ہے آپ سب لوگ بہت بے چین ہیں اور ان سب سوالات کا مقصد صرف ایک ہے کہ میرے پاس سٹا پور پر ایک کانگ میں اپنی موجودگی کا ثبوت کیا ہے۔ رائٹ! اور اگر میں باہر تھا تو مجھے اندر کرانے کی یہ احتیاط نہ پیش کس اہمیت کی ہے؟"

پھر کچھ لوگ ہنسے "آپ کو کسی وقت بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔"

"اس لیے میں یہاں بات نہیں کروں گا۔ آپ لوگ ہوٹل چلیں، مجھے سٹا پور سے آنے والے جنازے میں بہت لوگوں نے دیکھا۔ یہاں آپ سب نے دیکھا۔ پولیس بھی دیکھ رہی ہوگی۔ ویسے سرکار مجھے کسی وجہ کے بغیر بھی پکڑ سکتی ہے۔ پولیس کی فوٹی یا بیٹیس کی چوری کے الزام میں۔۔۔ جو میں نے سٹا پور میں ہونے کے باوجود کی۔"

لوگ پھر نے "میں بہت مطمئن تھا اور بہت برا محو۔ شاہ عالم کو چنرا نے گئی تھی۔ چنرا نے اسے خیر کا انکشن لگایا تھا۔ اس کا اگلے چھ گھنٹے کی زندگی میں سکون سے لیٹے رہنا یقینی تھا۔"

ہوش میں آنے اور آنکھیں کھولنے کے بعد اسے احساس ہو گا کہ وہ اب شاہ عالم نہیں رہا۔ اب میں شاہ عالم تھا۔

میں نے خان اعظم کی تلاش میں رادھر رادھر دیکھا مگر وہ نہ جانے کب کسی کی نظروں میں آئے بغیر چلے گئے تھے۔ شاید اس وقت وہ چنرا کے ساتھ کسی گاڑی میں لاہور جا رہے تھے۔ اسی ایمرلیس میں۔۔۔

اچانک میں نے خیم کو دیکھا۔ وہ اسی قیامت خیز انداز میں ہر قدم پر قند عرش گئی میری جانب آ رہی تھی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لیے رکے اور میرے بالکل سامنے آگے وہ ریک گئی اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا تو میرے یوں لگا کہ میں جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہوں۔

ایسا ہی میں نے برسوں پہلے بھی محسوس کیا تھا جب رئیس ضیبت نے مجھے اپنی آنکھوں کی خدمت میں پیش کیا تھا اور وہ اسی طرح میرے سامنے آگے کھڑی ہو گئی تھی اور ہلکے جھپکے بغیر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

رہیں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج رات ہی مجھے اس کی آپائی کے ساتھ جانا پڑے گا۔ انکار کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ بھی نہیں نے واضح کر دیا تھا اور یہ بھی کہ وہ میری مدد کرنا چاہتی ہے۔

رہیں نے جو کچھ مجھے اپنی آپائی کے بارے میں بتایا تھا اس کے بعد مجھے شاد کی ذات میں کچھ دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ محض ایک عابثانہ تجسس تھا جو رہیں کی باتوں نے پیدا کیا تھا۔

یہ بات بھی مجھے اچھی لگی تھی کہ شاد میری کسی بات سے متاثر ہوگئی تھی اور مجھ سے ملنے کا اسے بھی اتنی اشتیاق تھا۔ اس رات جب میں سڑک کے کنارے ایک کھمبے کا سارا لیے کھڑا ہوا تھا تو میرے ذہن میں تھوڑا سا تجسس تھا۔ کچھ خوف اور کچھ یہ خیال کہ شاد یا اس کے خوفناک باپ کی مدد حاصل ہو جائے تو میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو ابھی میرے لیے ناممکن سے کم نہیں۔ تاہم میں نے ایک فیصلہ تو یہ کر لیا تھا کہ میں اسے آپائی پر ہرگز نہیں کہوں گا۔ شاد کوں گا مجھے اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جی ہے لے نہیں لیتی نہ لے۔ دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ اس کی مدد غیر مشروط ہوگی تو میں قبول کروں گا ورنہ اس کو صاف بتا دوں گا کہ میں رہیں کے کئے پر گیا تھا۔ دوا دے دیا وہ نہیں آؤں گا۔ اس کی خاطر میں کوئی ایسا کام کر سکتا ہوں جو میرے نزدیک عزت سے گرا ہوا ہو اور مجھے زندگی کے بہت بڑے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی راہ سے دور کر دے۔

گاڑی اچانک میرے سامنے آگے دکی تو میں چونکا۔ اس وقت رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور سڑک کے کنارے دکانوں اور دکانوں کی لائٹس جلنے لگی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس روشن ہوگئی تھیں اور گاڑیاں بھی بیلے لائٹس جلا کے گزر رہی تھیں۔ میں اسی کھمبے کے نیچے تھا جس کی نشاندہی رہیں نے کی تھی اور میرے اوپر مرکزی بلب کی روشنی پڑی تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے آگے والا دوا دے کھولا اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوا دے بند ہوتے ہی گاڑی ڈوم سے آگے بڑھ گئی۔ یہ اندر سے بڑی آرام دہ کار تھی اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ایسی گاڑی کی انرکنڈیشنز کو دلا تھی۔

میں نے سب سے پہلے ڈرائیور کو دیکھا۔ اس نے ڈرائیوروں والی دودی پن رینگ تھی۔ غامی چٹون، غامی شرٹ اور ٹوٹی ٹوٹی کے نیچے اس کے کتے ہوئے سر کی سیاہ جلد پتک رہی تھی۔ وہ مضبوط تن و قوت رکھنے والے جسم اور چہرے کے سخت نعش والا پتہ قامت شخص تھا۔ مجھے اس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہی لگی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے اور میرے بیٹھنے کے بعد نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ مجھے غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس

کی نظر سامنے سڑک پر رہی۔

رہیں کی باتوں کی وجہ سے میں پہلے ہی ایک نفسیاتی قسم کے خوف کے دباؤ کا شکار تھا۔ خاموشی نے میرے اعصاب پر یہ دباؤ بڑھا دیا۔ نہ مجھ سے رہیں نے کوئی بات کی تھی اور نہ اس کی آپائی نے۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر ایک دوسرے سے الگ ہوئے بیٹھے تھے۔ رہیں بالکل ڈرائیور کے پیچھے تھا اور دائیں طرف کی کڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شاد میرے پیچھے تھی مگر میں اسے عقب نما آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے اس خواہ خواہ کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ میں نے پلٹ کے رہیں سے سوال کیا "یار آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

رہیں کا رنگ اڑ گیا "میں نے تجھے منع کیا تھا۔" سفید بالوں، پہلے کچھ بے پرواہی والے لباس اور پلانٹک کے رنگین منگول والی مالا پن کے خاموش بیٹھے والی شاد نے پلٹ لہجے میں کہا "تو چل جائے گا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ ڈرنا ہے تو گاڑی میں بیٹھا کیوں تھا؟"

میں کتنے والا تھا کہ کون الو کا پھڑکا رہا ہے مگر میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مخاطب ایک لڑکی ہے۔ چڑھوں لہجے میں متانت سے کہا "خدا کے سوا میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔"

پلٹے سے بڑھتا نظر آنے والی اس قسمی کی آواز میں شباب کی وی ٹھنک تھی جو سننے کے بارے میں توں کی آوازیں ہوتی ہے۔ جب وہ پرانے اور بوسیدہ ہو جائے ہیں تو ان میں سرسراہٹ تک باقی نہیں رہتی۔ آواز بدلنے کے باوجود شاد اس کرارے پن کو ختم کرنے سے قاصر تھی۔

اس نے غرا کے کہا "پھر پکا کیوں نہیں بیٹھتا؟" شاید میں اسے کوئی مناسب جواب دے رہا تھا کہ رہیں نے میں نے ڈرنے کی کون سی بات ہے۔ باتوں میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ رہیں میرا بے تکلف دوست ہے۔ میں اس سے تو باتیں کر سکتا ہوں۔ دنیو و نیو۔ لیکن اچانک ایک ایسی بات ہوگئی کہ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

ممنوعی غصے میں بات کرنے والی شاد کو آئینوں میں مجھے ایک خاموش التجا ہی محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کتنا چاہتی ہے کہ ہمیں سمجھتا چاہیے۔ جو باتیں میں کرنا چاہتی ہوں وہ اس وقت یہاں نہیں ہو سکتیں۔ یہ میری مجبوری ہے مگر میں سب کے سامنے خود کو مجبور نظر نہیں کر سکتی۔

پھر اچانک اس نے مجھے آنکھ ماری اور میں بھونچکا رہ گیا۔ میرے نزدیک تو لوگوں کا ایک دوسرے کو آنکھ مارنا بھی غیر شرعانہ فعل تھا اور لوہڑانہ حرکت۔ ایک لڑکی کسی اجنبی لڑکے کو پہلی ملاقات میں آنکھ مارے۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ حد ہوگئی بد معاشی کی۔ میں نے

سچا۔ یہ بڑھیا نظر آنے والی آپائی تو بڑی حرامی چیز ہے۔ مگر کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بلاوجہ جذباتی ہو رہا ہوں اور شاد کے بارے میں غلط رائے قائم کر رہا ہوں۔ اس کے لیے خاموش رہنے کا کوئی خفیہ اشارہ ممکن نہ تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھ سے چپ رہنے کی التجا کرتی ہوگیا رہیں غیبت اور اس ڈرائیور کے سامنے اس کی "بے عزتی" ہو جائی جو اس سے سخت مرعوب اور خائف رہتے تھے۔

آنکھ مار کے اس نے نظروں آنے والے اشارے کی زبان میں وہ سب کہہ دیا جو الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اپنا نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کرو۔ یہاں کچھ مت بولو۔ کوئی سوال مت کرو۔ مجھ سے میں نے تمہیں اتنے اصرار کے ساتھ بلوایا ہے تو صرف دیکھنے کے لیے نہیں۔ مجھے بھی بہت باتیں کہنی ہیں تم سے مگر یہاں سب کے سامنے نہیں۔ بے شک تم مجھ سے نہیں ڈرتے مگر کیا حرج ہے اگر تم بھی ڈر جاؤ۔ تاکہ جو ڈرتے ہیں مجھ سے ڈرتے رہیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا "اچھا شاد۔ تم کتنی ہو تو میں ڈر کے خاموش ہو جاتا ہوں۔ اگر رہیں نے تمہیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے تو تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ میں کیا چیز ہوں۔ میں کوئی غیر معمولی اور دیکھنے کی چیز نہ ہوتا تو تم مجھے بلاکے ملنے پر اصرار ہی کیوں کرتیں۔ رہیں کی آپائی۔ میں جوں جوں ذرا دکھ کی قسم کھا پتا چل جائے گا تمہیں بھی ہاں۔"

گاڑی شکر کے مضامات کی ایک کونجی میں داخل ہوئی۔ کونجی بالکل خالی تھی۔ رہیں نے اور بہت خوب صورت یا عالی شان بھی نہیں تھی مگر وہ کمال پر پنی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک کمال خالی جگہ میں داہنی سا باغ لگا ہوا تھا۔ چند درخت جو ابھی قد آدمی تھے اور گھاس جو کہیں بہت بڑھی ہوئی تھی کہیں خشک تھی اور کہیں سے غائب تھی۔

کوئی لال انڈیوں کی بنی ہوئی تھی اور اس پر پلاسٹر نہیں کیا گیا تھا۔ دیواروں پر گہرا رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ اس میں بالکل سفید کڑکی دوا دے ایچھے لگتے تھے۔ کیت لائٹس آف تھیں یا ان کے بلب ٹوڑ ہو چکے تھے۔ بیوی بھے میں صرف ایک لائٹ تھی جو اتنے وسیع رقبے کو روشن رکھنے کے لیے قلعی لائٹ تھی۔ اندر بھی دوی کمروں میں روشنی نظر آ رہی تھی چنانچہ مجموعی تاثر یہ رہا تھا۔

شاد گاڑی سے اتری اور اندر چلی گئی۔ اس کے لیے دوا دے خود ڈرائیور نے کھولا تھا۔ جب میں نے اپنی سائڈ سے دوا دے کھولا چلا تو میرا ہاتھ پینڈل تلاش کرنا نہ کیا۔ میں نے رہیں کی طرف دیکھا تو وہ ہنس رہا تھا۔

"آرام سے بیٹھ" وہ بولا "بڑے لوگوں کے لیے ڈرائیور خود کیت کھولتے ہیں۔ پھر اترتے ہیں وہ۔"

میں نے کہا "بڑے آدمی کی بولتی بند تھی ابھی۔ آپائی کے گھوڑے۔"

آزاد ہونے کے بعد رہیں نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "آپائی گھاس نہیں ڈالتی اس گھوڑے کو۔"

میں نے کہا "تو بھی رہتا ہے یہاں؟"

اس نے ایک آنکھ ماری "بے ایسی اپنی خدمت کہاں۔ میں تو اسے چھوڑنے آئی ہوں اور یہاں سے پیدل جاتا ہوں اپنے اصل بل تک۔ نزدیک ہی ہے۔ چل آ میرے ساتھ۔ تھوڑی دیر میں استاد آجائے گا۔"

"تو اتنا ڈر کیوں ہے سارے استاد کیا کھا جائے گا تجھے؟"

"نہیں۔ وہ مجھے ہی نہیں سمجھے تھے کہ کھا جائے گا اگر اس کا داغ گھوم گیا۔ پہلے بھی یہ کسی کو ایسے اپنے ساتھ لے کر نہیں آئی۔ خیر تو بچے رہے ابھی۔"

میں رک گیا "تو کہ رہیں غیبت۔ قد میں تیرے باپ کے برابر ہوں۔ کندھا مالکے دیکھ لے اور کتنی میں متاثر کرنا چاہتا ہے تو۔"

اس نے جینپ کے کہا "میرا مطلب تھا۔۔۔ تیری عمر کم ہے۔ وہ تجھ سے آٹھ سال بڑی تو ہوگی۔ مجھے پھر بھی رنگ آ رہا ہے تیری خدمت پر۔ ایک راز کی بات بتاؤں تجھے۔ اس کے سامنے مت کہنا۔ تجھے دیکھ گیا تھا اس نے اور ایمان سے مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے تو پند آ گیا ہے اسے۔"

رہیں نے مجھے آنکھ ماری تو مجھے شاد کے آنکھ مارنے والی بات یاد آئی مگر نہ جانے کیوں میں نے رہیں سے کچھ نہیں کہا۔ "میں کیا کہوں کہ اس نے مجھے پسند کر لیا۔ اور اس نے پسند کر لیا ہے تو مجھے کیا تکلیف ہے آخر۔"

اس نے انگلی سینے پر رکھی "تکلیف یہاں ہوتی ہے۔ میں کیا نہیں کرتا اس کی خاطر۔ قسم اللہ کی صرف اس کی خاطر خوار ہو رہا ہوں یہاں۔"

"درد کیا لندن چلا جاتا کھلے اترتے کی خدمت کرتا۔"

وہ اس پر "نہیں کا تو بچ نہیں مگر یہاں نہ رہتا۔"

ہم ایک راہدار سے گزرے۔ چھ فٹ چوڑے راستے کی لمبائی شاید چالیس فٹ ہوگی۔ اس میں بھی بہت سے سفل ایک ہی بلب روشن تھا۔ دائیں بائیں کمرے تھے جن کے دوا دے بند تھے ایک عجیب بات یہ تھی کہ کونجی کے باہر کی جانب کھلنے والے سب کڑکی دوا دے صاف سترے اور خوب صورت تھے۔ ان پر سفید ایشل پینٹ تھا مگر اندر والے سب دوا دے گندے اور بد نما تھے۔

رہیں کے ساتھ میں آخری حصے تک پہنچا جہاں سے ایک زینہ اوپر جا رہا تھا۔ اوپر دوی کرے تھے پہلے کمرے میں ایک بیڈ تھا اور ایک صوف سیٹ۔ فرش پر خوب صورت کتھیری قالین تھا۔ کڑکی دوا دے پر سرخ دیوٹ کے پردے تھے۔ قالین کا رنگ بھی سرخ تھا۔ بیڈ پر بیٹھا ہوا فیشنل کا کور بھی سرخ تھا۔ اس سے چادوں طرف روشن وال لائٹس کا اقبال دب گیا تھا اور کمرے کی تفصیلات

بوجھل پن محسوس ہوتا تھا۔

دوسرے کمرے سے گزرتا تھا۔ درمیان والے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے سامنے سے میں اچانک دھوپ میں گیا ہوں۔

اس دوسرے کمرے کی آرائش سے بھی دولت مندی کا غور تھا۔ قمارگاہیں مکمل نہیں تھیں۔ فرش پر سفید قالین تھا جس پر نیلے رنگ کے جگمگاتے چھپرے۔ یہی تھے مگر قالین کے برعکس ان کا رنگ آسمانی تھا اور ان پر کچھ سفید اور کچھ زرد چھپرے تھے۔ بڑے بڑے رنگ بٹا گلابی تھا اور اس پر پڑا ہوا سفید کا بڑے کورنگی گلابی رنگ کا تھا۔ ایک خوب صورت ڈرائیو تقریباً پانچ فٹ لمبا اور چھ فٹ اونچا تھا۔ اسے میں دی سی آر کے کھاکے کے حروف روشن نظر آ رہے تھے۔ بیڈ سے کچھ فاصلے پر مزید اندر جانے والے دروازے کے ساتھ ہی ایک فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ میری نظر سفید گول والے جزل کے اسے ہی پر جانے رک گئی جو ابھی ابھی آن کیا گیا تھا مگر کمرے میں خنکی کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔

اس شاندار بیڈ روم کی خوابگاہ فضا اور طلسماتی ماحول نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مشہور کی کوٹھی میں بھی یہ سب کچھ تھا مگر وہاں یہ حسن اور سلیقہ نہیں تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بہت بڑے ڈاکٹر کی کوٹھی میں کوئی بھی چیز عجیب اور حیران کن نہیں لگتی تھی۔ وہاں ہر کمرے میں ایسے ہی قیمتی پردے قالین اور اے سی تھے۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہاں ہر شخص کے لیے عیش و عشرت کے اسباب کو بھی زندگی کے لوازمات کی حیثیت حاصل تھی۔

میں میرے قصور میں ایک بڑھی نظرتانے والی فقیرنی تھی۔ دیسے مصنوعی سفید بالوں کی دگ لگائے والی بدبو دینے والے چیکٹ چھتروں میں طپوس کندھے پر بدو متع حیلانے لگائے اور گنگے میں موٹے موٹے رنگین مسکوں کی کالا ڈال کے پھرنے والی فقیرنی۔ وہ ایسی شہزادیوں کے شاندار شان خواب گاہ میں کیسی لگتی ہوگی۔ میرے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔

رکش میری حیرانی اور میرے اٹھناک سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر اس کی بولتی زبان اس کے پھر بند ہو گئی تھی۔ وہ باادب بالاحسن ہو شمار کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی اشارے سے منع کر دیا کہ میں نہ تبصرہ کروں نہ سوال۔ اس نے ایک پردے کی طرف منہ اٹھا کے دیکھا بھی تھا۔ خود سے سننے پر مجھے اس کے پیچھے سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ ایچ باجھ دوم تھا اور شادو غسل کر رہی تھی۔

میں نے کہا "ایسے کب تک کھڑے رہیں گے، بہ چل بیٹھ جا تو بھی۔"

رکش نے اٹھا رکھیں سہلایا تو میں نے اسے زبردستی بچھنے کے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ وہ ایسے بیٹھا جیسے اس کے پیٹ

میں سوزا غم رہا ہو۔

جب شادو پردہ پھا کے سامنے آئی تو مجھے یوں لگا جیسے ایک دم سارے بلب بلب ہو گئے ہیں اور کمرے کے اس حصے میں ہزاروں کی آرک لائٹ روشن ہو گئی ہے جہاں شادو سر ہوتا پینے لکڑی تھی۔ نہ وہ بے انتہا حسین تھی اور نہ اس کی جلد کا رنگ دودھیا لکھائی یا سرسبز تھا۔ وہ سانولے رنگ کی لڑکی تھی مگر اس کی صورت کے نقش میں ہلا کی کشش تھی۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کشش میں شادو کی کچھ کوئی کھوئی اداسی کا اثر دینے والی بڑی بڑی آنکھوں کا دخل تھا یا اس کے ہونٹوں کا جو رس کے پھرے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے بیٹھنے پرے کا یا اس کی بے حد متاسب ناک کا۔ اس کی گردن بھی مجھے صراحتی اداسی لگتی۔ شاید اس لیے کہ جو گول گلے کی قمیص اس نے پہن رکھی تھی اس کے اوپر اور پھر نیچے جہاں تک نظر جاتی تھی اس کے سانولے رنگ کا نرم رنگینی کس مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ گداؤں میں بھی نہیں تھی اور دلی بھی نہیں تھی۔ وہ درمیانے قدر کی عام سی لڑکی تھی مگر مجھے احساس حسن نے موت کر دیا تھا۔

مجھ پر کچھ تو رہیں کے سادہ بیانات کا اثر تھا کہ وہ تو وہ ہے جس میں ہو جائے گی الفت مجھ سے اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو اس نے فقیرنی کے کمرہ میں کے بعد اچانک بالکل بدلے ہوئے بیکر حسن و شباب کے ساتھ بڑے خیر کن انداز میں ڈرامائی انداز میں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرور و شادی تھی۔ اس نے آج کی ہوا میں نک گیا نہیں یہاں کیوں بیٹھا ہے؟" ریکش اس پرک کی طرح اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ "وہ آج ہی۔"

میں نے سوچا کہ اسے ساتھ لے جانا ہوگا۔

اس کے ہاتھ پر مل پڑ گئے "کیوں؟ یہ دودھ دیتا پچھ ہے یا تو اس کی انٹلی پکڑ کے لے جائے گا؟"

رکش کی صورت پر مقلوبیت، حسرت اور حسد کے جذبات دیکھ کے مجھے اس پر ترس آ گیا۔ شاید وہ توقع رکھتا تھا کہ میں اس کی حمایت میں کچھ کھوں گا مگر میں نے اسے ایس کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا "غلطی ہو گئی آپاجی۔"

میں نے کہا "میرا انتظار کرنا نہیں۔"

شادو نے تو کیا کھول کے بالوں کو پھیلانے کے لیے سر ہٹا کر "نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں انتظار کرنے کی کوئی بات۔"

رکش خاموشی سے نکل گیا تو میں نے کہا "آخر کیا ضرورت

تھی اسے بے عزت کر کے نکالنے کی۔"

وہ ڈرنگ نیل کے سامنے سے کچھ اٹھاتے اٹھاتے چلی گئی۔

میں نے چپ کر کے آگاہی عزت عزت ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "مگر تم مجھ سے ایسے بات کرو گی تو میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے ہیر ڈرائنگ کونگ میں لگا کے آن کیا اور گردن کو تھوڑا سا دائیں طرف جھکا کے بال خشک کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں "نہیک ہے۔ جاسکتا ہے تو جا۔ عزت کا بہت خیال ہے نا۔"

میں جو موسم بقی کی طرح سگ رہا تھا۔ بھر میں اس کے لیے کی پیش سے کھل کے پانی ہو گیا۔ مجھے اس کی صورت پر دوبارہ اپنی کامرانی کی سرخوشی یوں نظر آتی تھی اور آلود آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا چاندنی سے روشن ہو اور پھر تاریک ہو جائے۔

پہلے میں اس کو دیکھتے ہی دم بخود رہ گیا تھا۔ اب میں اس کی بات سننے سے پھر بیٹھ گیا تھا۔ وہ حکم چلانے اور منوانے کی عادی تھی مگر میرے بارے میں شاید ریکش نے کہا ہو گا کہ وہ سر ہٹا رہے ہیں۔

میں نے اپنے طرز عمل سے خود کو ایسا ہی ثابت کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اور ناکام ہو گیا تھا۔ یہ اس کے لیے طمانیت کی بات تھی کہ وہ اپنی قوت تحریر پر بھروسہ کر سکتی ہے۔

"تم نے کیوں بلایا تھا مجھے؟" میں نے اس کی ایکس رے کرنے والی نظریں گھبرا کے بے چینی سے پھلپھلایا۔

"مجھے ریکش نے تیرے بارے میں بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ سب جو تو نے اسے رازدار سمجھ کے بتایا تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ وہ اعتبار کے قابل نہیں" میں نے کہا۔

وہ ہیر ڈرائنگ کے سامنے بال پھیلاتی رہی "یہ بات نہیں۔ دراصل مجھ سے وہ کچھ نہیں چھپا سکتا۔ اس کی مجبوری ہے۔ اور پھر میں نے بھی تو اس سے پوچھا تھا کہ تیری مدد کروں؟ اگر تو کہے۔"

"میں کیا کروں؟" میں نے کہا "ہر بات معلوم ہے جس میں تو تم خود فیصلہ کر سکتی ہو۔"

وہ کچھ سوچتی رہی "تو قتل کرنا چاہتا ہے؟" اس کے چہرے پر ہراس تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر بے خوفی سے کہا "ہاں۔ اب ریکش اور بھی حاصل کر لیا ہے میں نے۔"

"کہاں ہے ریکش؟ تیرے پاس؟" ساتھ لے پھر رہا ہے؟" "نہیں۔ میں نے چھپا کر رکھا ہے ایک جگہ۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "تجھ میں ہے بہت اتنی کہ ریکش اور لے کر جائے اور اسے گولی مار دے۔"

میں نے جھٹ بولا "اس میں بہت کی کون سی بات ہے۔"

ایک منچے کے ہاتھ میں ریکش اور وہ تو گولی چلا سکتا ہے۔"

"تو پکڑا لیا تو پھانسی ہو جائے گی۔"

میں نے نفی میں سہلایا "میں پکڑا نہیں جاؤں گا۔"

"تو بلا گئی نہیں ہے بے وقوف بھی ہے۔ کیوں کرتا ہے ایسی باتیں ہر ایک سے۔ اپنی زندگی کا معاملہ ہو تو۔ اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔" وہ آخری جملہ کہتے ہوئے کی تھی۔ پھر کچھ دیکھ نظر آئے گی۔

"مجھے معلوم تھا کہ ریکش مجھے دھوکا نہیں دے گا۔"

اس نے خشک ہو جانے والے بالوں کو برش کرنا شروع کیا تو اٹھے ہوئے بازو کی ہر جنبش کے ساتھ اس کے بدن میں ایک لمبی آنکھ لگی جو اس کے وجود میں ظالم پیدا کر کے لوٹ جاتی تھی۔

"دھوکا نہ دینے والے مجبور تو ہو سکتے ہیں۔" وہ بولی "جیسے ریکش میرے سامنے تھا۔ کبھی آدمی غریب کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ کبھی رشتوں کی وجہ سے تو کبھی پولیس کی مار سے۔ ہر بات مجھے معلوم ہو گئی تو تیری مجبوری دیکھ لی ہوگی۔ تو مجھ سے بھی ڈرے گا؟"

رکش نے بھی۔

میں نے پھر کہا "میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔"

وہ آٹھ بڑی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ چند منٹ میں اس کی شخصیت میں کتنا واضح اور خوش گوار انقلاب آیا ہے۔ وہ بھکاروں سے آہانی بن گئی تھی مگر ریکش کے سامنے میں نے جس سخت گیر اور بے مروت لڑکی کو دیکھا تھا وہ دنیا روپ دھار چکی تھی۔

یہ سب مجھے بہت اچھا لگا رہا تھا۔ خشک ہونے اور برش کیے جانے کے بعد اس کے لیے کالے بال اس کی پشت پر پھیل گئے تھے اور اڑ کر اس کے چہرے پر بھی آئے تھے۔ اسے اڑ کر کھینچ کر لے میں ایک دلواؤں مسک سی پھیل گئی تھی جو بیعتا کی اعلیٰ خوشبودار صابن اور دھواں پکڑ کر تھی۔ میں اسے ایک نگ دیکھ کر جا رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" اس نے ہاتھ کو میرے سامنے لٹھرایا۔

میں چونکا "وہ۔۔۔ میں تمہاری بات پر غور کر رہا تھا۔"

"رکش نے بتایا ہے کہ تو غور بہت کرتا ہے۔" وہ میرا مذاق اڑانے والے انداز میں بولی "پڑھ پڑھ کے افلاطون بن گیا ہے ابھی۔ اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تو حد سے زیادہ پڑھتا ہے اور یہ کہ تو وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔

میں نے حسانت سے کہا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔ ریکش نے جو کچھ بتایا وہ ٹھیک ہے۔"

وہ میرے سامنے آ کے بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ خوشبو کا بھوکٹا میرے حواس پر مسلط ہو گیا۔ میرا حلق خشک ہونے لگا۔

"چھانسی چھ جائے گی تو وزیر اعظم کیسے گئے گا۔ پکڑے تو سب جاتے ہیں۔ وہ بھی جو کئی قتل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب انہیں کوئی نہیں چھو سکتا۔"

میں نے کہا "میں سہانی ہوں گا۔"

"اٹھ کے پی لے۔ میں تو کر نہیں ہوں میرے باپ کی" وہ بول۔
میں نے بہت سے کام لے کر کہا "شاید میرا باپ تم جیسی کو تو کر نہ رکھتا۔"

وہ ہنسی "کیوں؟ کام تو سب کر سکتی ہوں میں۔ اور دیکھئے میں بھی اتنی مڑی تو نہیں ہوں۔ تیرا کیا خیال ہے؟"
میں نے فرج کھولنے ہوئے اسے ہلکے دیکھا۔ یہ میرے لیے انتہائی حیرت کی بات تھی کہ جس شاد کو نہیں نے ہوا بنا رکھا تھا وہ میری کسی بات کا برا نہیں مان رہی تھی۔ وہ میری باتوں پر ہنس رہی تھی اور مجھ سے کسی پرانے بے تکلف لڑکھن کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تھا۔ وہ جواب کی گھڑی تھی۔

"اسی لیے تو کر نہ رکھتا کہ۔۔۔ کہ تم بہت اچھی ہو" میں نے کہا اور پھر ایک دم ہلکے کھنکھارے پانی کی بوتل نکال لی۔
فرج میں مجھے کوک اور سیون اپ کی بوتلیں بھی نظر آئی تھیں مگر میں نے فرج کے اوپر رکھا ہوا گلاس بھر کے پانی پیا اور بوتل واپس رکھنے لگا تھا کہ اس کی آواز آئی "دو بوتلیں نکال لائیں بھی بیوی کی۔"

مجھے یہ سب کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ خوف میرے دل سے نکل گیا تھا مگر اس کے باوجود میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔ یہ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک جوان حسین لڑکی کے ساتھ اس طرح غلط میسر آجائے تو جذبات بھڑک اٹھتے ہیں مگر میں خود کو جوان مرد سمجھتا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

میں نے ایک بوتل کو دانتوں سے کھولا اور اسے پکڑا دی حلالہ میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ بوتل کھولنے والی چالی کہاں ہے۔ وہ فرج کے کسی خانے میں سے نکال دیتی یا اندر سے لا دیتی۔
"نہیں نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا کہ تم بہت ظالم ہو اور بہت سخت ہو۔ سب ڈرتے ہیں تم سے۔ تمہارے سامنے کاپٹنے ہیں بات کرتے ہوئے اور تم جس طے میں بیٹھ کر مانتی ہو اس میں تو پڑیل گتی ہو۔"

وہ گھونٹ گھونٹ کوک پیتی رہی اور سکون سے سب سنتی رہی۔

میں نے کہا "تم یہ کیوں کرتی ہو شادو؟"
اس نے کہا "میں لے کر مجھے کرنا پڑتا ہے تو نیم خانے میں جو بھی کرنا تھا اپنی مرضی سے اور خوشی سے کرنا تھا۔"
اس نے میرے شادو کھینے کا بالکل برا نہیں مانا تھا۔ میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھ گیا مگر تم کسی نیم خانے میں نہیں ہو۔ اپنے باپ کے ساتھ ہو۔ اس کو بھی میں۔ اور ایسی شاندار زندگی گزار سکتی ہو۔ جس کا ابھی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ نہ جانے کیا سوچتی رہی اور ہاتھیں ہلاتی رہی۔ میں سرزد ہوا اسے دیکھتا رہا۔ ہر لمحہ مجھے یہ احساس تھا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگی کہ اب تم جاؤ۔ میرا باپ آنے والا ہے۔ وہ بڑا جلد ہے۔ اس نے جھین یہاں دیکھ لیا تو مجھے بھی ہارے گا۔ اور جھین تو جان سے مار ڈالے گا۔ پھر یہ حسین خواب ختم ہو جائے گا۔ شاید جوش کے لیے۔

اس نے اچانک کہا "نامر۔ تو ایسے لڑکوں کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔ رئیس جیسے ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ ذرا اپنی صورت دیکھ۔ اپنا طبع اور اپنا لباس دیکھ۔ اپنی عقل اور تعلیم دیکھ۔ اپنے خیالات دیکھ۔ اتنے اراک اور ان کا کیا ساتھ۔ وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا پانچ بج گئی کسی دن تو وزیر اعظم بن جائے۔"

شعیدگی سے بات کرتے کرتے وہ ہنس پڑی۔ جب وہ ہنسنی تھی تو اس کے مونچوں جیسے دانتوں کی لڑی جھلکتی تھی۔ اور اس کی ہنسی میں بڑی دلنواز ٹھنک تھی۔ جیسے شیشے کی میز پر کالج کی بونیاں گرنے لگی تھیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس کی باتیں تھیں۔ ایسی باتیں اس لیے میں مجھ سے کسی نے نہیں کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بوتلی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا اور اس کی آواز سنتا رہا۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ کوئی اختلاف نہیں کیا کہ کیس اس کی آواز کا اعتبار نہ رک جائے۔

"پھر مجھے کس سے ملنا چاہیے۔ میرا تو کوئی دوست ایسا نہیں۔ جیسی تم ہو" میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔۔۔ ایسی باتیں کرنے والا۔ وزیر اعظم بننے والی بات تو میں اس وقت کرنا تھا جب میں بچہ تھا۔"

"اور اب؟ اب تو بڑا ہو گیا ہے؟" وہ خوشی سے بولی۔
"ہاں۔ اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ تمہاری باتیں سمجھ سکتا ہوں۔"
اس نے اچانک میری بات کا دل "تمہارے مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔"

میں حیرت سے ٹھٹھکی رہ گیا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں نے الٹا سنا ہو گا۔ وہ میری مدد کرنا چاہتی تھی۔ رئیس نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

"مہول کرے گا میری مدد۔ جب رئیس نے مجھے تیرے بارے میں بتایا۔ تو میں نے کیرے کر کے پوچھا تھا اور سب معلوم ہونے کے بعد بہت سوچا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یقین آنے لگا کہ تو ہی کر سکتا ہے میری مدد۔ تجھ میں حوصلہ بھی ہے، عقل بھی ہے تیرے پاس۔ اگر تو نامر کی موت پر اندازہ بھی ہو سکتا ہے اور اس حد تک جذباتی کہ اس کے قاتل کو خود قتل کرنا چاہتا ہے تو پھر میں تجھ پر بھروسہ کر سکتی ہوں کہ تو میری بات بھی سنے گا اور مجھے تجھ سے کوئی غلطو نہیں تو ہر غلطو مہول لے کر بھی میری مدد کر سکتا ہے ہول کرے گا میری مدد؟"
اس وقت مجھے یہ خیال بالکل نہیں آیا کہ وہ ایک تو عمر لڑکے

کے جذبات سے مکمل رہی ہے اور اسے آلا کارنا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا تھا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ کیا میں نے کنایوں میں پڑھا تھا کہ عورت کیا کر سکتی ہے۔ اور اس کا مجھے یہ پہلا تجربہ ہوا تھا۔

میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ عمر میں مجھ سے آٹھ سال بڑی ہے۔ مجھے چودہ سال کی عمر میں سڑک کا نظریے آنے کے باوجود اس پر عاشق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مجھ سے عشق ناقابل فہم بات ہے۔ ایسا عشق تو فطرت میں بھی نہیں ہوتا۔ فطرت میں خاندانی نواب زادہ کسی چھین یا سپرن ر عاشق ہو جاتا ہے اور جلد ہی ہنسی ٹھٹھکی کرکے زادہ کسی ارب بچی کا ننگ یا کمر بچی صنعت کار کی اکلوتی دختر مرہ تھا پڑی مجال سے دل لگا کے اسے ساری دولت سیت اپنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر اب میں تیس سال کی بیرونی کسی چودہ سالہ بیرو کے ساتھ کسی کمائی میں فٹ نہیں ہوتی۔

مگر یہ فہمی کمائی نہیں تھی۔ زندگی کا پہلا عشق تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اور سینہ چمکا کے اور اپنی نیم مردانہ آواز میں پوری مگر ایسا شامل کر کے کہا "ہاں شادو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے بڑے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا "مجھے پتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو انکار نہیں کرے گا۔"

میں کچھ دیر اس شخص کی طرح بیٹھا رہا جس کو بجلی کا کرنٹ پوری قوت کے ساتھ لگا ہو۔ میرا ہاتھ سن ہوا تھا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی تھی اور بجلی بھرنی تھی۔ جہاں اس کے لب مس ہوئے تھے میری ہتھیلی کی پشت پر اس جگہ گلاب سا بکھل گیا تھا۔ یہ گلابی رنگ اس کے ہونٹوں کا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس گلاب کو چھالیا جیسے جڑی نظر کی دھوپ لگی تو وہ جھنجھکی طرح اڑ جائے گا۔ "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تھیں میری مدد کیوں درکار ہے؟"

وہ ہنسی "وہاں سے بیرو۔ وعدہ پہلے ہی کر لیا۔ خیر میں بتا دوں گی تجھے مگر ابھی نہیں۔ ضرورتاں تو کسی اگر تو نے کسی کو کچھ نہ بتایا؟"
"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔"
"کھا میری قسم؟" وہ ایک دم بلبل گیا "اچھی اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں پر اپنا لنگ لگانے لگی گھیشی میں بھی اس کی نظر مجھ پر جمی رہی۔"

"میں تمہاری قسم کھاتا ہوں شادو" میں نے بین فہمی لہجے میں کہا اور پھر اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ لپ اسٹک وہ اب گاری لگی تھی مگر یہ گلاب۔۔۔
"تو یہاں آیا تھا مجھ سے مدد مانگنے کے لیے۔ اور میں اتنے تیرے

گلے پڑی۔ کیا کام تھا تجھے مجھ سے۔۔۔ وہ ہنسی۔
میں نے کہا "نہیں۔ پہلے تم بتاؤ۔"
"میں نے کہا نا۔ بتاؤں گی۔ ضرورتاں تو کی۔ اب مجھے تسلی ہو گئی ہے اور میرا کام جلدی کا نہیں ہے۔ نامر کے بچا کا فون نمبر معلوم کر لیا ہے میں نے" وہ کمزری سے نیچے جھانک کے پھر میرے سامنے آئینی "تو کچھ کھائے گا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "تم نے کیسے معلوم کر لیا؟"
"پاکل۔ یہ کوئی مشکل کام تھا۔ تو فون کرنا چاہتا ہے اسے تو کرے" شادو نے میرے بائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کیا "مگر کچھ لمبی بات نہ کرنا۔ نامر تمہارا ہے۔"
"کیا جھین کہیں جاتا ہے؟" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔ اب کہاں جاتا ہے۔ مگر بابا کے آنے کا نام ہو گیا ہے۔ ابھی ہے تو اٹھنا ایک گھنٹہ۔ مگر اچھا ہے تا تو پہلے ہی نکل جائے۔"

"کیا تیرا بابا قتل کر دے گا مجھے؟ تیرے ساتھ یہاں دیکھ کر؟"
"تیرے ساتھ۔۔۔ نہیں" تمہارے ساتھ۔۔۔ میں بڑی ہوں تجھ سے بڑی تیز۔"

میں نے کہا "کتنی بڑی ہو؟ ذرا ساتھ کھڑی ہو کے دیکھو کون بڑا ہے؟"
وہ مسکرائی "بھئی تو مرد ہے۔ اب تو میرے ساتھ طاقت میں مقابلہ کرے تو غلط ہے نا۔"

"تو عمر میں بڑی ہے تو میں تو میں بڑا ہوں۔ طاقت میں بڑا ہوں، عقل میں بڑا ہوں تجھ سے۔ میں اسی طرح بات کروں گا جیسے تو کرتی ہے۔"

اس نے ایک مری سانس لی "اچھا۔ جیسی تیری مرضی۔"
میں نے فون اپنی طرف کھینچ لیا "میرا مجھے اس حرامی کا۔"
اس نے مجھے نمبر بتایا اور میں ایک ایک ہندسہ دیا تا گیا۔ دوسری طرف کھنکھنای رہی تھی "چو خنک کھنک پر کسی عورت نے ریسیو اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

میں نے ہماری آواز بنا کے کہا "وہ سم ہے؟"
اس نے چلا کے کہا "تمہارا فون ہے گی۔"
چند سینکڑے بعد وہ سم نے ہلو کہا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے پھر کہا "ہیلو۔"

میں نے نئے میں دست شخص کی طرح کہا "ہے۔۔۔ لہ۔"
"کس سے بات کر رہی ہے جھین؟"
"مجھے۔ تجھ سے۔۔۔ تو سم ہے نا؟ مجھے پچان۔"

"کون۔ کون تو؟"
میں نے ایک بیجا قسم کا بے ہنگم فتنہ لگایا "میں سس۔۔۔ ظاہر ہوں؟"

شعر کا مطلب یہ شائیں شائیں۔ نقل گالیاں۔
جب مشتق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو پھر کسی سے بھی
کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی کہاں رہتی ہے۔
اگلے دن شام کے وقت میں رہیں سے ملا۔ نہ جانے کے
باوجود میں چاہتا تھا کہ اسے شادو سے ملاقات کا سب احوال
سناؤں۔ اسے ہی کسی میں تو ساری دنیا کو بتانا چاہتا تھا۔ چلا چلا کے
کہنا چاہتا تھا۔ سارے شرم میں اعلان کرنا چاہتا تھا۔ سنے سنے
حضرات اور خواتین۔ ایک اہم اطلاع۔ کل بروز بدھ رات سات
بج کرچ ایس منٹ پر ناصر عظیم کو مرضی اٹھی سے شادو سے بڑا
ملک قسم کا مشتق ہو گیا ہے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی اور اخبار
میں اشتراک نہ تھا چاہتا تھا اپنی تصویر کے ساتھ کہ منکر منکر ناصر عظیم
برائے اطلاع خاص و عام بتائی ہوئی دوا حس مشترک کرنا ہوں کہ
میں بدھ مورخ نے ۷۰۰ مسیح کی رات سات بج کرچ ایس منٹ پر سما
شادو سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو سمجھاؤں
جائے۔
رہیں کا چوبیسویں بات سن کر تاریک ہو گیا۔ اسے خوشی نہیں
خفت ازیت ہوئی تھی۔ وہ بار بار کہتا تھا ابے نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا
ہے۔ بول خود تو نے نکالی فریخ میں سے؟ اپنے دانتوں سے کھولی۔
تو نے شادو کہنا شروع کر دیا اسے۔ ہاتھ چومنے والی بات پر تو وہ
اچھل پڑا تھا۔ میں نے اللہ رسول کی قسم کھائی۔
وہ مجھے گالیاں دینے لگا "سائلے کی ہے تیری یاری۔ چمرا
مکھوپ دیا چہ میں موقع ملے ہی۔"
میں نے کہا "یار ایسی کیا بات ہے؟"
"یہ مجھ سے پوچھتا ہے تو سوار کے جنبہ پہلی ملاقات میری
میری ماشوق تھی۔"

میں بہت ہنسنا "اے چڑا ہوا ہے۔ کس کی ماشوق کہاں کی
ماشوق۔ نہ تیری تھی نہ میری ہے۔"
اس نے کچھ مطمئن ہو کے کہا "ہاں میری تو ہے۔ البتہ تو بہت
چھوٹا ہے عمر میں اس سے۔ تیرا اور اس کا معاملہ فٹ نہیں ہوگا۔"
میرا جی چاہا اس سوکے گالے اور قد میں مجھ سے ایک بالٹ
چھوٹے نام کے رہیں کو سر سے اوپر اٹھا کے پوچھوں کہ اب بتا بیٹا
کون بڑا ہے۔ مگر اسے سب کچھ بتانے کے بعد مجھے خامسا سکون مل
گیا تھا۔ طبیعت میں جو بے چینی اور اضطراب کی کیفیت تھی اس
میں افادہ تھا۔ میں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے
اپنے جھوٹ سے اپنے آپ کو بھلا کے خوش ہونے کی اجازت دینے
میں کوئی حرج نہ سمجھا۔
"تو تک تھا وہاں؟ میں باہر انتظار کرتا رہا تیرا۔"
میں نے جھوٹ بولا "میں بچے نکلا تھا میں۔ اس کا باپ مجھے
یہ آیا اس نے مجھے بڑے کے نیچے چھاپا۔ پھر جب وہ نمائے کیا تو مجھے
چپکے سے باہر نکال دیا۔"

اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا "حرام زادی۔ کیا ضرورت
تھی اس کی۔ ہوتا کوئی مودم جیسا تو اورات تھی۔ باپ کتا کر
بادلوں کو بلاتی ہے چھپ چھپ کہ کسی بچے کے لیے تاکہ کیوں
کیا؟"
میں نے مڑا مان کے کہا "یار اب اتنا بچہ بھی نہیں ہوں میں۔
میرے ساتھ کھڑے ہوئے بالکل چھوٹی سی لکڑی تھی شادو۔ گود میں
اٹھالیتا تو۔"
"جمل چھوڑ۔ یہ بتا لایا کیوں تھا اس نے؟" رہیں کو ایسی
باتوں سے تکلیف ہو رہی تھی "تیرا کام نہ کہ نہیں؟"
میں نے کہا "ہاں۔ اس نے مجھے ناصر کے چچا کا فون نمبر دیا۔
جو شادو نے بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ وہیں سے میں نے اس
سے فون پر بات کی۔ سالے کی ہوا خراب ہو گئی۔ ہارٹ ٹپل ہوئے
پر مرتہ گیا ہوں۔"
میں نے اسے پھر اداکاری اور مددکاری کے بتایا کہ ناصر
کے چچا سے میں نے کیا کیا تھا اور کیسے کہا تھا۔ ہنسنے ہنسنے ہم دونوں کا
بڑا حال ہو گیا۔ پھر میں رہیں کو ڈنر پر لے گیا۔ میں خوش تھا اور
اس خوشی کی تقریب ایسے ہی مناسکتا تھا۔ مجھے شادو نے یہ احساس
بھی دلایا تھا کہ مجھ میں اور رہیں جیسے لڑکوں میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ اس کے باوجود میں رہیں کو کھانا نہیں چاہتا تھا۔ فی الحال وہ
دنیا میں میرا واحد دوست تھا جو مجھ سے خلص بھی تھا۔ تاہم اپنے
"ہائی اسٹینڈرڈ" کا عملی مظاہرہ میں نے یوں کیا کہ رہیں کو ایک
فرسٹ کلاس ریستورنٹ میں لے گیا جہاں لوگوں نے اس کے
لوفروں والے چرے اور ملنے کو پانپند یہ نظروں سے دیکھا تو رہیں
احساس کشی میں جلا ہو گیا۔
"اے یہ کہاں آگئے ہم۔ یہاں تو سب سالے شرفائیٹھے
ہیں۔"
میں نے کہا "ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ بیش کر بیٹے بیش۔"
میرے دہاں جانے کا ایک مقدمہ اور بھی تھا۔ مجھے شادو کو فون
کرنا تھا اور وہاں کا ڈنر پر رکھے ہوئے فون کو پالی اسٹینڈرڈ کے لوگ
استعمال کر سکتے تھے۔ جب میں نے شائنگلی کے ساتھ انگریزی میں
پوچھا "میں یہ فون استعمال کر سکتا ہوں؟" تو منجھرنے چک کے مجھے
دیکھا اور پھر "میں سر۔" خود بخود اس کے منہ سے نکل گیا۔ رہیں
خفت حائر ہوا۔
میں نے خبر ملا کے مسکراتے ہوئے کہا "ہیلو شادو۔ کیا ہو رہا
ہے۔ بھی میں ناصر مل رہا ہوں۔"
رہیں کی خفت ذہ مسکراہٹ بھی غالب ہو گئی۔ اب تک اس
نے یقین نہیں کیا تھا تو اب اسے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے اور شادو
کے "تعلقات" واقعی دوستانہ ہیں۔
"ناصر۔ کہاں سے بات کر رہا ہے تو۔ یہ شور کیا ہے؟"
میں نے کہا "اے دن ریستورنٹ سے بات کر رہا ہوں میں۔"

ایک دوست کی دعوت تھی۔
"چھاپا یہ دوست رہیں تو نہیں۔ دیکھ جھوٹ مت ہونا مجھ
سے۔"
میں نے مجبوراً کہا "ٹھیک سمجھا تو نے۔"
"تو نے کیا سوچا ہے پھر؟" وہ بولی "کب آ رہا ہے۔"
"ابھی آ جاؤں" میں نے کہا "سر کے بل۔"
وہ ہنسی "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے کہا تھا کہ تجھے
یہاں رہنا پڑے گا۔ میں تجھے بابا سے ملوانے کی پہلے تو اپنا سامان
اٹھا کے آ جا۔ کل ہی آ جا۔"
"مگر سامان اٹھا کے۔" میں نے کہا۔
"کیوں۔ میں رہتی ہوں یہاں۔ پھر تو کیوں نہیں رہ سکتا میرے
ساتھ۔ ہاں ایسے ہی وعدہ کر لیا تھا میری مدد کرنے کا؟ بہت نہیں
تھی تو مردوں والی بات کیوں کی تھی شادو۔ شادو نے تو بڑی آس
لگائی تھی۔"
ظاہر ہے اس کے بعد میرا جذبہ اور میری تمام مزاحمت اور
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی "شادو۔ میں آؤں گا" میرا انتظار
کرنا۔ اوکے "خدا حافظ۔"
منجھرنے بڑی مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا اور دو بار مجھے
احساس دلایا تھا کہ کال لپی ہو گئی ہے۔ "فون پر ایسی باتیں نہیں
کرتے بیٹے۔ اور دوسرے لوگوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"
میں نے "بچے" پر ناگوار کیا کا اظہار کیا "اگر کال لپی ہو گئی
تھی تو آپ مجھ سے ڈپل چارج کر لیں۔ اتنی دیر میں اور کون آیا فون
کرتے؟" اور ایسی باتوں سے آخر آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں اپنی
کزن سے بات کر رہا تھا۔"
کچھ میری انگریزی کام کر گئی۔ کچھ میری محنت اور شاید میری
شخصیت ورنہ یہی بات رہیں کو تو منجھرنے سے بے عزت کر دیتا۔
اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔
رہیں نے باہر آ کے پوچھا "کیا کہہ رہی تھی۔"
میں نے سوچ کے جواب دیا "یار وہ مجبور کر رہی ہے کہ اپنا
سامان ڈاکٹر صاحب کے گھر سے اٹھاؤں اور اس کے ساتھ
رہوں۔"
رہیں چلنے چلنے رک گیا "کیا اتنا وہاں رہے گا؟"
"ہاں۔ اب انتظار کیسے کروں گی؟"
"اس کا باپ قتل کر دے گا تجھے اور وہاں رہنے کا مطلب
ہوتا ہے تو۔ سالے بھیک انجی پڑے گی کچھ دوا بھی پھرتی ہے۔"
"یہ تو نہیں کہا اس نے" میں تنکڑ ہو گیا۔
"میں بتا رہا ہوں تجھے اس کا باپ فقیروں کا ٹھیکہ دار ہے۔
اڑبھ دو فقیر ہیں اس کے پاس اور ان سب کا استاد ہے وہ۔
انہیں بھیک مانگنا اسی نے سکھایا ہے اور وہ سب سے خزانہ بھی لیتا
ہے۔ پولیس کو بھرتا رہا ہے۔"

"یہ سب تو پہلے ہی بتا چکا ہے۔ مگر میں کیوں بھیک مانگوں گا۔
مجھے ایسی کون سی مجبوری ہے۔"
"پھر کیا وہ داد دینا کے رکھے گا تجھے اپنے ساتھ۔ شادو کا قصہ
بن کے رہے گا تو بچے" رہیں نے ایک طعنے لگا جس کا
مقدمہ میری تخیل تھا۔
میں نے مشتاق ہونے کے بجائے سکون سے کہا "ایسا ہو سکتا
ہے یار۔"
وہ ہنسنے پھرتا رہا ہو گیا "سالے آٹھ دس سال کا فرق ہو گا
تیری اور اس کی عمر میں۔ تو بچہ ہے اس کے سامنے۔"
میں نے کہا "اگر میں لوگوں کی میری عمر اٹھ سال ہے تو اس
کا باپ مان لے گا۔ اٹھ سال کا بچہ نہیں۔ بالغ مرد ہونا ہے۔
اور شادی تو لوگ اپنی ماں کے برابر عمر کی عورتوں سے بھی کر لیتے
ہیں۔"
رہیں مجھے انفسوس بھری نظروں سے دیکھتا رہا "تو واقعی پاگل
ہو گیا ہے ناصر۔"
"جمل چھوڑ یہ بات۔ ادھر چلتے ہیں۔ ناصر کے چچا کی طرف۔"
"نہیں یار۔ مجھے تو معاف کر۔ تجھے سمجھا تا ہے کار ہے۔ یہاں
بھی ہنگامہ ہوا بھی پڑے گا۔"
میں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی "اے
مت ڈرائے۔ میری جیب میں ریوالور ہے۔"
رہیں ہلکانے لگا "تو سمجھا اسے گولی مارنے جا رہا ہے۔"
"ابھی نہیں۔ یہ تو اپنی حفاظت کے لیے ہے۔ پہلے اس سے
بات کریں گے یار۔ دوا دے کی کھنٹی بھاگے بلائیں گے اور
پوچھیں گے کہ بول کیا ارادے ہیں؟ جان دے گا کہ جان کی قیمت
دے گا؟"
"جان کی قیمت؟"
"ہاں۔ پچاس ہزار تو اس نے ظاہر سے لیے تھے۔ ستر ہزار کا
زیور مار گیا ناصر کی ماں کا۔ ایک لاکھ بیس تو یہ ہو گئے۔ مکان بچا وہ
انگ اور اب سالے کو چھانی بھی ہو سکتی ہے دہرے قتل کے جرم
میں۔ اگر اڑبھ دو لاکھ دے کے جان بچالے تو یہ بہت کم سزا ہے
اس کے لیے۔"
رہیں نے اپنا بازو چھڑایا اور تیر خیز قدموں سے واپس لوٹ
گیا۔ وہ سخت دھشت ذہ نظر آتا تھا۔ ریوالور رکھے قتل کرنے اور
کسی قاتل سے لاکھوں وصول کرنے کی باتیں اس کے لیے سنا بھی
مشکل تھا۔
میں اطمینان سے تانگے میں بیٹھا اور ناصر کے چچا کے گھر پہنچ
گیا۔ میں نے کال بیل کے بجن پر انگلی رکھی تھی کہ ایک شخص
نے مضبوطی سے میری کال کی پکڑ لی۔ میرا حریف کتنا توانا ہے۔ اس کا
اندازہ مجھے اس کی گرفت سے ہو رہا تھا۔

اس شخص سے بچو لڑانا ایسا ہی ہوتا ہے جو ہے کالی سے معاملہ۔ وہ مجھ سے کوئی عرصہ اور صورت سے گریہ بار بار دیدہ نظر آتا تھا۔ اس کا رنگ جیسے جیسا اور جسم سائیکس طرح مضبوط تھا۔ چہرے کے کثرت نقوش اور آنکھوں کی سفاک خوبی چمک سے وہ پولیس والا نظر آتا تھا مگر اپنے اختیار اور دہشت کے سائن بورڈ کے طور پر اس نے ایسی گھنی سوچیں کھنکھیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے بے خفی سے کام لیا "کیا بات ہے جناب!"

"جناب کے گھوڑے!" اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا "مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا بات ہے۔" میں نے کہا "آخر کون ہو تم؟" اس نے مجھے گھمبیر لیا "میں آج میرے ساتھ۔ یہ بھی بتا چکے ہو گئے۔"

مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ جانے کا انجام کیا ہوگا "کیوں آجائیں میں تمہارے ساتھ چھوڑو میرا ہاتھ۔" اس نے دانت چپن کے مجھے کالی دی "سیدھی طرح چل میرے ساتھ۔ شور مت کرو ورنہ پھنکی ڈال کے ٹھٹھ سے مارا ہوا لے جاؤں گا۔"

میں نے جج کے کہا "کیوں کیا جرم ہے آخر میرا۔" میں نے میرے میں کون ہوں؟" اس نے میرے ایک زوردار چھینر سید کیا۔ اس کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ میرا سر گھوم گیا اور گال گرم ہو کے سنسنے لگا۔ اس وقت بہت بار جانا سب بار جانے کے مترادف ہوتا۔ چھینر کے جوابی رد عمل نے میرے دماغ کا لٹھوڑا اڑا دیا۔

میں نے اسے جواب میں زیادہ بڑی گالی دی اور پلٹ کے اس پر حملہ کیا۔ وہ شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کے پیٹ میں سرکھنے تھلی کی طرح پوری قوت سے گھرمادی تو اس کے قدم ٹوٹ کر اڑ گئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے پاگل گتے کی طرح اس کے ہاتھ پر گات لیا۔ میرے دانت اس کے بازو کے گوشت میں اتر گئے۔

خون کا لٹھ مجھے اپنے لبوں پر محسوس ہوا اور میری کھائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ہلچلا "اڑے کتے دیا پڑا۔"

میں نے پوری قوت سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب رہا۔ اس وقت تک اپنی ہنگامہ آرائی سے میں لوگوں کی توجہ بھی حاصل کر چکا تھا۔ اچانک دروازہ کھول کے دسم برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "مجھے پتا تھا کہ یہ حرای ضرور آئے گا۔ پکڑ لو اسے۔ جانے مت دینا اس کو۔"

خود کو چھڑاتے ہی میں تیر کی طرح لپکا۔ وہاں جمع ہو جانے والوں کی قدرتی بھر دی میرے ساتھ بھی مکران میں ایسا مزہ بابہ

کوئی نہیں تھا جو حق کا بول بالا کرنے کے لیے اور ظالم مکران کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے آئے۔ آنا اور میری مدد کرنا۔ کوئی سوال کر آیا قانونی اختیار کا مسئلہ اٹھاتا تو پولیس اسے بھی میرا سامنا ہی حتمی قرار دے کر ساتھ ہی لے جاتی اور اس کا ایک جرم یہ ہو تاکہ اس نے جرم کی مدد کی یعنی اعانت مجمانہ "اس پر یہ الزام بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے قانون کے عمل میں رکاوٹ ڈالی اور پولیس حکام کو اوائے قرض سے روکا۔"

جب کوئی تھانے کی عمل داری میں پہنچ جائے تو پھر اس کا اٹھ ہی حافظ ہے۔ اس کے نام سے کچھ بھی منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اسے کسی پرانی واردات میں مطلوب اور مفور مجرم قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے کچھ گناہوں کا اعتراف کرانے کے لیے مجسمیت سے ہندو دن کا ریمانڈ بھی لیا جاسکتا ہے تاکہ تحقیق کا عمل یکسوئی سے جاری رہے۔ مگر اب عدلیہ کا پروسیجر ہو یا کالسی موسیقی میں خان صاحب اس کی تحویل سے کچھ بھی برآمد کیا جاسکتا ہے۔

دلالتی شراب کی بوتل "زیر بار دہشت گردی۔" منسوب ہو گا خطرناک اسلحہ کوئی لاش "آواز قتل" متحول کو ظلم کی بیوی کا آتش تانے والے۔ چشم دید گواہ "ثبوت اور تحقیق کے لیے ریمانڈ۔" سب مل جاتے ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ میں کوئی بندہ ہاتھ آجاتا۔

جب دل پھند مینڈ ظلم ہاتھ آجاتا ہے تو پھر ایک دلچسپ مقابلہ شروع ہوتا ہے پکڑنے اور چھڑانے والوں میں طاقت آزمائی کا۔

بندے میں مار کھانے اور اپنی بے گناہی کے منقذ پر قائم رہنے کی کتنی طاقت ہے۔ اس کو مار سے بچانے کی خواہش رکھنے والوں میں معاوضہ ادا کرنے کی کتنی طاقت ہے۔ پرچہ کھانے سے بچنے کی کتنی طاقت ہے اور معمولی یا عظیم فز جرم سے بچنے کی کتنی۔ مینڈ ظلم کے پاس نہ سیم وڈر کی طاقت ہو نہ ٹھوڑی ستارش کی تو پھر پولیس اور قانون کی تلخ انگلی اٹھانے والے پر اسلحہ اٹھانے کا جرم ثابت۔ سوئی نہ چھوڑنے والا خنجر گھونپنے کا مجرم۔

صورت حال اس کے برعکس ہو تو سات خون معاف۔ پھندا اپنے پاس ہے تو کسی اور کی گردن سکی۔

میں یہ سب جانتا اور سمجھتا تھا چنانچہ موقع پاتے ہی میں نے راؤ فرار اختیار کی۔ لوگوں نے مجھے فوراً راستہ دے دیا مگر یہ میری بے وقتی یا بد قسمتی کہ میں نے بھاگنے کے لیے دو راستہ پکڑا جس پر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ وہ مجھے پکڑنے کے لیے نہیں آئے تھے وہ معمول کے مطابق گشت پر تھے جسے مزگفت کتا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ تین فیٹے والا ایک فرض شناس خوالہ دار اپنے منکے جیسے پیٹ میں گلیں کے حساب سے گنے کا رس ڈلوایا تھا۔ اتنے ہی مستند ماتحت بھی شاہک میں مصروف تھے۔ ایک سبزی کی دیرمی کے قریب کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گوشت کی دکان پر۔ ناچار

ہے وہ کسی کا قتل یا اشیا کے نرخ نہیں چیک کر رہے تھے۔ ان کی رائٹس سرکاری گاڑی میں پڑی تھیں اور تیسرا مستند خان وہیں بیٹھا اٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور آگے کیا کر رہا تھا۔ یہ میں نہیں دیکھ سکا مکران سب نے مجھے دوڑا دیکھا لیا۔

قانون کے محافظوں کی نظر شاہین کی طرح تیز ہوتی ہے۔ انہیں جرم اور مال (جن کا برہمال چلی دامن کا ساتھ ہے) کی موجودگی کا سب سے پہلے پتا چل جاتا ہے۔ منکوک نیت سے گھونسنے والے کو بچانے میں بقیہ ہنسی جس ان کی مدد کرتی ہے۔ کوئی لاکھ کے کہ حضرت میں تو یہ دیکھنے کے لیے کھڑا تھا کہ۔ ان کا آنکھل ہے کہ رخسار کہ یہاں ہے۔ کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلن رکھیں۔ مگر وہ اپنے منقذ پر قائم رہتے ہیں کہ وہ دھنکی کی نیت سے جانے واردات کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ ثابت بھی کر رہے ہیں۔

وہ کوئی سو یا ہزار میٹر کی ریس نہیں تھی۔ میں گلی میں دوڑ رہا تھا اور میرے تعاقب میں دو افراد تھے جو پکڑو پکڑو کی صدا لگا رہے تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا "مجھے گرفتار کرنے والا ناصر کے چچا کا ایک بھائی تھا جو اطفال سے محکم پولیس میں چھوڑا تھا۔" دار بھی تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ایک پہل والا وہ نہ ہوتا تو پولیس کے مجھے میں کوئی ہوتا ہی نہیں۔ لکائن جو ہے سوا دن گزرا۔ یہ کاوہ کچھ یوں ہو جاتا ہے کہ پولیس میں جو ہے سوا دن گزرا۔

سوا کل کا عملہ اپنی شاہک تھوڑی کر کے لپکا۔ ان کو سبزی یا گوشت خریدنے سے زیادہ قاعدہ ایک مفور مجرم کو پکڑنے میں نظر آیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کا ایک افسر بھی انہیں یہ توازنہ مقرر ہے رہا تھا کہ مجھے پکڑا جائے چنانچہ کسی دشواری کے بغیر انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ گاڑی میں او گھنے والا مستند جو ان سب سے پہلے بندوں تان کے میرے سامنے آگیا۔ باقی دو نے بھی بندوں اٹھانے سے پہلے ہی اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ مجھے گولی مار دیں گے۔

ایک اسے ایس آئی کو گات کے میں نے اپنا نام خطرناک بحران کی فرست میں گھسوا لیا تھا۔ اب میرے خلاف قانونی کارروائی کے احکامات کے سارے دروازے کھل گئے تھے۔ مجھ پر اقدام قتل کا الزام عائد کیا جاسکتا تھا۔ مجھے خطرناک قسم کا پاگل قرار دیا جاسکتا تھا۔ پاگل خانے تو بالآخر ایسا ظلم جاتا ہی ہے مگر اس سے پہلے تھانے میں کلا سے تحقیق سے اس کا دماغ خاما درست کر دیا جاتا ہے۔

انہوں نے مجھے ایسے درجہ لیا جیسے بھوکے بلی تھا اور محصور چہرے کو پکڑتی ہے۔ اس کے بعد وہی ہو جاو فرض شناسی کی دیرینہ روایات کا شاعر از مظاہرہ تھا۔ پولیس کے چار نو جوان مجھ پر بیسے جوش اور دلولے کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ پوری قوم میں یہ جوش اور جذبہ ہوتا تو شاید ہم کشمیر فتح کر لیتے۔

انہوں نے مجھے مارنے کے لیے چاروں ہاتھ پاؤں استعمال

کیے۔ آٹھ ہاتھوں کے ٹکڑوں اور تھپڑوں کے ساتھ آٹھ لاقوں اور ہونوں کے ٹکڑوں نے چھ منٹ میں مجھے دیکھنے والوں کے لیے قاشائے جبریت بنا دیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ ان کے مقابل میں ایک نوجوان لڑکا ہے اور یہ پوچھے بغیر کہ اس کا جرم کیا ہے وہ ایک خون آمیز سفاکی کے ساتھ مجھے اس دقت تک پہنچے رہے جب تک کہ میں قریش خاک پر ڈھیر نہیں ہو گیا۔

مستور کو کیوں پر رنگوں سے نقش اُٹھانے میں لطف آتا ہے۔ کرکر کو کچے کچے مار کے سرت لٹتی ہے۔ شاید پولیس کو بھی تشدد کے وشائے فعل میں ایسا ہی مزہ آتا ہے۔ وہ اسے انجوائے کرتے گئے ہیں۔

کسی میں دم فہم نہ تھا کہ قانون "انسانی بھر دی بیومن رائٹس یا اسلامی رواداری کے حوالے سے رحم کی اپیل کرتا۔ خود غرضانہ سوچ نے انسانوں کو چاہا بنا دیا ہے۔ کم سے کم پچاس افراد اور کمزور یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ شاید دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ وہ قاشائی ہیں "قاشائیں۔" پرانے پنڈے میں پرانا سب کے نزدیک پاگل بن تھا۔

پولیس نے میری بددیہ آزادی کو اسی طرح ناکام بنا دیا جیسے انگریز نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو فدر قرار دے کر طاقت کے ذریعے ختم کر دیا تھا۔ رات کو جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی حوالات کی منکس فضا میں آٹھ دس دیگر طران زیر تحقیق کے ساتھ غلیظ قریش پر پڑا ہوا تھا۔

یہ مشکل سے باہر فٹ چڑھا اور اٹھا فٹ لہا کر قاضی کے سامنے والے جھٹے میں لوہے کی سلاخیں اسی طرح نصب تھیں جیسے چڑیا گھریں بھالو یا شیر کے جگرے جھٹے میں نظر آتی ہیں۔ اس میں اتنے لوگوں کے لیے جگہ بھی نہیں تھی چنانچہ کچھ دیوانوں سے ٹمک لگائے غلامیں گھور رہے تھے۔ کچھ اس قابل ہی نہ تھے کہ بیٹہ نکلیں۔ وہ ایک دوسرے پر آڑے ترے پڑے تھے۔ گری "جس" ٹھکن اور بدلتے وہاں سانس لینا بھی عذاب تھا۔

فولادی سلاخوں والے آٹھ دروازے کے باہر ٹکڑی کے اسٹیل پر ایک کانٹیل اپنی گوراشائی رانٹل کو ٹانگوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ اگر یہ کوئی فلمی چوہن ہوئی تو بیرو پک جھمکتے میں ہاتھ بڑھا کے رانٹل اٹھا لیتا۔ اس کا منہ سنتری کی طرف گر کے اسے حکم دتا کہ قتل کو لے۔ سنتری ایسا ہی کرتا۔ پھر وہ سب قیدیوں کو ٹٹکے کا سوخ فراہم کرتا اور پھر خود بھی نکل جاتا۔ ڈڈاؤز گولیاں چلاتا۔ بندوں کی طرح چلاتا۔ راتا۔ دیواریں بھاندا اور سامنے آنے والے ہر شخص کو رانٹل کے بٹ سے ٹاک آؤٹ کرتا۔ پانچ سات بندے پولیس اسٹیشن میں لینے رہ جاتے۔

مکر میں کوئی بھی بیرو نہیں تھا۔ سب زبرد ہو گئے تھے۔ کوئی رانٹل کی طرف ہاتھ بھی بڑھاتا تو سنتری بٹ مار کے اس کا ہاتھ توڑ دیتا یا سب اس کے بعد جو ہوتا وہ الگ۔ بغرض حال کوئی رانٹل

لینے میں کامیاب ہو جاتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔ سنتری الارم کی طرح بجے لگا۔ بغرض حال وہ چالی سے فصل کھول دیتا تب بھی تھانے سے باہر جانا خود کشی کے مترادف ہوتا۔ فرار کی کوشش کرنے والے گتے کی موت مارے جاتے۔ تھانے میں آٹھ دس سزا یافتہ افراد عام طور پر موجود رہتے ہیں جو ہر طرف سے گولیاں برساکے انہیں چھٹی کر دیتے۔

حوالات کے باہر چالیس واٹ کا ایک بلب چھت سے معلق تھا اور اپنی زرد محسوس روشنی سے اندر باہر اجالا کرنے میں ناکام محسوس ہو رہا تھا۔ ایک دہرے کے ساتھ کوئی سرکاری مجرم اطمینان سے لمبی آتے سو رہا تھا۔ سرکاری مجرم پولیس کے خبر ہی نہیں معلوم بھی ہوتے ہیں۔ چار چھ مہینے بعد وہ بھی ایک تھانے میں مگر قمار ہو جاتے ہیں تو کبھی دوسرے میں۔ پولیس ان سے علاقے میں ہونے والی ہمت ہی چوری ذہنی کی وارداتیں منسوب کر دیتی ہے کہ ظلم چوری کی ہیں ذہنی کی تیس اور کاریں چھیننے کی چالیس وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ وہ تمام جرائم کا اعتراف کر لیتا ہے اور کسی تھانے دار کی ترقی ہو جاتی ہے۔ اتنی محنت اور جاں فشانی سے خطرناک جرائم پیشہ افراد کا شرلوک لگائے اور علاقے سے جرائم کا قلع قمع کر دینے کے لیے دن رات ایک کرنے پر کسی تھانے دار کو ایس بی یا ڈی آئی سی صاحب تعزیری سند سے نوازتے ہیں۔ اخبار میں خبر شائع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ کارنامہ سرا انجام دینے والوں کی تصویر۔ اس کے بعد تھانے کی ذمہ داری فحش ظلم بندہ ہیں دو ذہن اجازت لیتا ہے کہ اچھا جاتی پھر میں گے جب تک دوبارہ اس کی مگر قمار کی ضرورت نہ پڑے اسے پولیس کا تحفظ حاصل رہتا ہے اور وہ آزادانہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

ایک داڑھی والا صحت مند شخص دوسری دیوار سے ٹک لگے سگریٹ کے لیے لیے کھن لے رہا تھا۔ جس بھرا سگریٹ اس کی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا اور وہ بھی بند کر کے سانس اندر کھینچتا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے ڈھیروں بدبو دار دھواں خارج کرتا تھا اور پچھلی بھاکے رکھ بھاڑا تھا۔ حوالات میں ہر قسم کی بو بھری ہوئی تھی۔ خستہ حال قیدیوں کے پسینے کی بو، خون کی اور بول و برازی اور تھکی بو جو ان سے پھلتے آتے جانے والے چھوڑ گئے تھے دیواروں کے اور فرش کے خشک ہو جانے والے دھبوں کی بو، مگر ان سب پر پیشاب کی تخت چین رکھنے والی بو حاوی تھی۔ اس وقت بھی ایک ظلم دیوار کی طرف منہ کئے پیشاب کر رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس مقدمہ کے لیے دیوار کے پچھلے حصے میں ایک سوراخ کر دینا کافی سمجھا گیا تھا جو پیشاب برہ کر رہا نہیں جاتا تھا وہ اندر کی فضا کو مسموم کرتا رہتا تھا۔

میرا سر ایک ظلم کے چھت پر تھا اور میرے پیٹ پر دوسرے ظلم کی لات تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی لات ہٹائی اور

اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے اس کی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ مجھے پلک جھپکاتے بغیر دیکھ رہا تھا۔ میں ایک لمبے کے لیے خوف کی سرور کر دینے والی لہر سے مفلوج ہو گیا۔ وہ شخص پتیلی مرکا تھا۔ وہ جوان آدمی تھا جس کے بدن پر صرف ایک شلوار تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر آڑی لکیریں، خراشیں، سرنج اور سیاہ دھبے تھے مگر سانس کے زبردستی کی حرکت جو زندگی کا پتا دیتی ہے، مفقود تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھوا۔ اس کا جسم اچھی گرم تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ شخص زندہ تھا۔ شاید میرے ہوش میں آنے سے چند منٹ قبل ہی اسے وہاں لاکے ڈالا گیا تھا۔ اس کی شلوار لکیلی تھی۔ اس میں ازار بند بھی نہیں تھا۔

رات کے صیب ٹانے میں کہیں قریب سے ہی عجیب سی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی دیوار پر ریر کی گیند مار رہا ہو یا کوئی پتھر صوفے اور بستر کو دھرا ہو۔ پھر اچانک کسی نے دھڑا دھڑا پیچ ماری "ہائے رب جی۔" اوسے میں مرچاؤں گا۔ خدا رسول کی قسم۔ مجھے نہیں معلوم۔" اس کے بعد پھر وہی خاموشی اور وہی دہلی دہلی آوازیں۔

حوالات کے باہر اوجھنے والا سنتری اچانک مستند ہو گیا۔ اس نے بلیٹ سے اٹھی ہوئی چالی ٹکال کے قتل کھولا۔ دو دواڑے کے سامنے ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی نمودار ہوئے۔ سب انسپکٹر کچھ شکر تھا۔ ایک سپاہی نے لات مار کے ایک سونے والے کو اٹھایا۔ دوسرے نے مجھے کالرسے پکڑے کھینچا اور پیچھے پھینک دیا۔

سب انسپکٹر لاش کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے دونوں سپاہیوں کو سر سے اشارہ کیا۔ وہ مرنے والے کو کھینٹ کر فولادی سلاخوں تک لے گئے۔ اس کی کھلی شلوار وہیں پڑی رہ گئی۔ چرس بھرا سگریٹ پیٹنے والا۔ کابل ہے کسی کے ساتھ یہ سب دیکھتا رہا۔ دیوار کے ساتھ ٹک لگے کھینچنے والے تینوں خزان میں سے ایک کی حالت زیادہ غیر ہو گئی۔ اس کا رنگ پگھلا گیا اور ہونٹ کاٹنے لگے۔ پھر اس کا سارا بدن یوں کاٹنے لگا جیسے اسے جاڑا بخار ہونے والا ہو۔

میں دیوار کے ساتھ کرا کے جہاں گرا تھا وہیں پڑا تھا اور پلک جھپکاتے بغیر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے دروسے میرے جسم کا ہر جوڑو دکھ رہا تھا۔ میری بندھنوں میں نہیں آٹھ رہی تھی اور میرے لیے سانس کی حرکت میں بھی اذیت تھی مگر اچانک درد کا احساس مفقود ہو گیا تھا اور ایک دہشت ناک امکان "ایک روح فرسا خیال" ایک سوال بن کے میرے داغ پر بہتوڑے رہا تھا۔ کیا یہی سب کے ساتھ ہو گا۔ جو ہو آیا ہے "ایک انسان کی لاش کو مٹوہ گتے کی طرح کھینچنے والوں کے لیے اس میں کچھ بھی نیا، اٹوٹھا یا درد انگیز نہیں۔ گو کہ روز قبر میں اڑنے کے مٹوے کا ڈر ہے ہوئے کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔ گھمبیس ایسے مرنا نہیں چاہتا۔ مارنے والوں کے پاس پتھر کے دل ہیں اور مرنے والے بھی بہت ہیں مگر

میری تو یہی ایک زندگی ہے۔ کیا وہ یہاں اتنی بے توقیری، ایسی شرمناک رسوائی کے ساتھ رانگیاں جائے گی، ایک ناکردہ گناہ پر ضائع ہوگی؟

پولیس والوں نے لاش کو سلاخوں کے ساتھ نیم دراز کر دیا۔ مرنے والے کا سر سلاخوں پر تھا اور تڑخ حوالات کے فرش پر ترچھا پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے دب گیا تھا اور اس کی نیل پڑی سوئی ہوئی انگلی ناخنیں قابلِ غرت طریقے پر پھیل گئی تھیں۔

"ازار بند کہاں ہے اس کا؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

ایک سپاہی نے اسے میلا خون آلود ازار بند پیش کیا۔ "اوتے میں کیا کروں؟" یہ مجھے کیوں دے رہا ہے۔ اسے ٹھیک سے باندھنا پھل دے پڑ" سب انسپکٹر نے برہمی سے کہا "کتنی نوکری ہو گئی ہے تیری۔"

دوسرے نے اپنے ساتھی کو پیچھے کرتے ہوئے ازار بند جھین لیا۔ "چل بتا دھر سے۔ اور دیکھ لے" سب سمجھ لے۔ اگر نوکری کرتی ہے۔"

اس نے مرنے والے کی گردن میں ازار بند کا پھندا بٹا کے ڈالا اور اسے سلاخوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر اس نے تعریف طلب نگاہوں سے اپنے اسکر کی طرف دیکھا۔ سب انسپکٹر نے سگریٹ کو اڑی سے مسل کے بٹھایا اور مطمئن انداز میں سہلا کے باہر نکل گیا۔

"دونوں سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے انگلی سے اشارہ کیا "چل بھی تو آجا سونیا کھڑا ہو جا۔"

میں اتنا خوف زدہ تھا کہ میں نے قیل میں دیر نہیں لگائی۔ دوسرے نے دیوار سے ٹک لگے کھینچنے والوں کو مخاطب کیا "چلو تم بھی۔"

کاٹنے والا شخص رونے لگا "خدا کے لیے۔ مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"ادار کون مار رہا ہے۔ تجھے چل آجا۔ وڑے تھانے دار صاحب کے ساتھ ملاقات ہے۔ کیا پتا تیری جان چھوٹ جائے۔ وہ بے گناہ کو پچھاتے ہیں۔ بڑا تجربہ ہے ان کا۔"

دوسرے نے تائید کی "دوینے بھی دل کے بڑے پیچھے ہیں دو۔" ہم چاروں کے باہر آتے ہی اتنی دردناک پھر مقتول ہو گیا۔ ابھی تک سونے والوں میں سے کسی نے آنکھ کھول کے نہیں دیکھا تھا۔ یہ سکون کی گہری خند نہیں تھی، کچھ ہوش میں نہیں تھے ہوش مندوں نے آنکھیں بند رکھنے میں ہی غایت جاتی تھی۔

ایک کانٹیل نے داڑھی والے سے کہا "سگریٹ شمرٹ ہیں نا؟"

دوسرے نے کہا "تجھے تو کچھ سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں" ان کو بتادیا کہ معاملہ کیا ہے جو سورہے تھے "انہیں کچھ بتا نہیں۔"

داڑھی والے نے ہزاری سے کہا "او جا یا ر پتا ہے سب مجھے" اور سگریٹ باہر پھینک کے لپٹ گیا۔

ایک کانٹیل نے میری گردن پر مٹکا مارا "تو دھر کہاں چل پڑا سب کے ساتھ۔ انہیں تو ڈوڑے تھانے دار صاحب نے بلایا ہے۔"

میں نے کہا "اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو تم؟"

"میر کرانے۔ تو کیا بھیجی ہے نا۔"

اچانک میرے داغ کا کھینچن ہوا ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت ہے جب میں اپنی مشکل آسان کرنے کے لیے قتل کا استعمال کروں تو فائدہ ہو سکتا ہے۔

میں نے عاجزی اور لجابت کے ساتھ رقت آمیز لہجے میں کہا "تھانے دار سی۔ میری ایک عرض سن لو۔ آپ مائی باپ ہو، آپ کو اختیار ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "ایسی کون سی بات ہے؟"

"بات ہے نامرکار۔ بس پانچ منٹ میری بات سن لو۔ میں ساری زندگی آپ کا غلام رہوں گا۔ آپ کی خدمت کروں گا۔"

"خدمت کرے گا تو کیا خدمت کرے گا؟"

میں نے سرگوشی میں کہا "جو آپ بولو گے آپ کو شکایت نہیں ہوگی سرتی۔ میرے پاس جو بھی ہے آپ کا۔"

وہ سوچنے لگا "کیا ہے تیرے پاس؟"

"آپ کے خیال سے زیادہ۔ میری جبب میں نہیں تو کیا ہوا؟"

آپ بولو کیا چاہیے؟"

اس نے میری آنکھوں میں بے یقینی سے دیکھا "بڑا قائد اعظم؟"

میں نے کہا "جو حکم مائی باپ۔ بات صرف آپ کے اور میرے بچ ہے۔"

اس نے سہلایا "پکڑ دیا مجھے تو۔" (منہ)

میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک چارباٹی بچی ہوئی تھی۔ "مجھے کس نے پکڑ لیا ہے؟"

"تھانے دار بشیر چوہدری نے۔ تو اس کے بیٹوں کی قسم کے گھر میں کیوں گھسا تھا؟"

میں نے کہا "قسم خدا رسول کی۔ میں نے تو صرف تھنی کو ہاتھ لگایا تھا۔ اسے باہر لگانے کے لیے۔"

"اس نے دھورت کی ہے کہ تو بشیر چوہدری کی بہن کو اکیلا پا کے اس کا زور پھین رہا تھا۔ پتول بھی تھانے سے پاس۔ اس کا گھر والا کہیں گیا ہو یا تھا۔ اتفاق سے چوہدری صاحب پہنچ گئے اور انہوں نے تجھے پکڑ لیا۔ سارا کلمہ گواہ ہے۔ زانی کے پکڑے بھی چاڑھیں تھے تو نے۔ یا آمارے تھے۔"

"قسم اللہ کی۔"

"قسم مت کھا۔ ساں قسم نہیں چلتی۔ تھانے دار بشیر ہے"

شکایت کرنے والا۔ تیری جان ایسے نہیں چھوٹے گی۔
میں نے ڈرے کہا "پھر کیا ہو گا میرے ساتھ؟"
وہ ہنسا "جو ہو گا پتا چل جائے گا ابھی۔ اور آج نہیں روز
ہو گا۔ جیل جائے گا بعد میں اگر چاہے گی۔"
"کیا کیا۔ کیا تم لوگ مجھے بھی مار ڈالو گے؟"
"وہ نہ سمجھو۔ ہم صرف تفتیش کرتے ہیں۔ اب جو پہلے سے بیمار
ہو یا دل کا کڑور ہو۔ وہ مر جائے تو ہمارا کیا قصور۔ دیکھا نہیں اس
بندے نے ابھی خود کشی کی حالات میں۔ حرام موت لکھی تھی
نصیب میں۔"

میری باتیں کانپنے لگیں ".... خود کشی نہیں تھی۔"
اس نے میرے منہ پر ٹکڑا مارا "تھو سے کوئی نہیں پوچھے گا۔"
میں نے روٹے ہوئے کہا "سہی میرا کچھ کھا کر دو۔"
وہ حیران ہوا "کھا کھا۔ کون ہے تو؟ آگے پیچھے کوئی ہے تیرا جو
کھا کھا کر لے آجائے اور کاکا یہ چوہہ دیر شیر کا معاملہ ہے۔
کسی اور کا ہو تو تک مکا بھی ہو جاتا۔ تک مکا کا مطلب سمجھتا ہے تو
تجھے یہ بھی پتا ہو گا کہ مال ہونا چاہیے کیسے میں دس بیس ہزار یا
پچاس ہزار۔ ریت مقرر نہیں ہے کسی چیز کا۔ یہ تھا ہے اپنا کی
دکان نہیں۔ بندہ اور بندے کے کرتوت دیکھ کے سوا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں... میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں پچاس
ہزار بھی دے دوں گا۔"
وہ بھرپور ہنسا "تو میرے دے گا؟ تیرا تو گھر بھی کوئی نہیں۔
نہ چاہا مانا، لگتا ہے چور نہیں تو ڈاکو ہے۔ اتنا مال کہاں سے آیا
تیرے پاس؟"

میں نے کہا "دوست ہیں میرے۔"
"دوست؟" اس نے حقارت سے کہا اور مجھے باہر دھکیل دیا
"اوسے دنیا میں کون کسی کا دوست ہوتا ہے۔ چل آگے۔ پچاس
ہزار والے کی شکل دیکھو۔"

میں نے کہا "سہی... میری ایک بات سن لو۔"
اس نے فحشی میں سر ہلایا "میں چوہہ میری صاحب کے معاملے میں
کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کہتا ہے ان سے کہتا۔"

رات تین بجے میں نے وہ محبت خانہ دیکھا جو تفتیش کا کمرہ
کہلاتا ہے اور جیسے لوگ ذرا تنگ دم بھی کہتے گئے ہیں۔ میرا سارا
جسم وہاں کے ماحول کو دیکھ کے لرز رہا تھا اور اندر سے میرا دل
کانپ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تفتیش کرنے والوں کے ساتھ
کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا مجھے بتانا چاہیے کہ میں
ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہتا ہوں اور ان کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔
نہیں "اس سے پولیس متاثر نہیں ہوگی۔ انا ڈاکٹر مشہود کے گھر سے
میرا آپ وانا اٹھ جائے گا۔ وہ میری مدد خاک بھی نہیں کریں
گے۔ انا اسے اپنی بدنامی کا کس بنائیں گے۔ مجھ پر ظاہر ہوں گے کہ
ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے ماسٹر کے چچا سے انتقام لینے

کے خیال کو دل سے نہیں نکالا۔ شاید وہ میری ایک نہ تھیں۔
تھانے دار چوہہ دیر بشیر کی جان میں جو ماسٹر کے چچا کا سالا ہے۔ میں
کر لیں کہ میں واقعی قسم کے گھر میں گھس کے اس کی بیوی سے
زبردستی زور آتروا رہا تھا۔ سارا محلہ جھوٹ تو میں بولا۔ اس پتھر
میں کہیں میرا وہ سراپہ نہ ڈوب جائے جو ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں
ہے۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے پولیس میں سے کہا "میں
تم کو ایک نئی فون نمبر لکھ کر دیتا ہوں۔"
اس نے جیب سے بال پوائنٹ نکال کے مجھے دیا "جلدی کر۔
اپنے ساتھ مجھے بھی مروا گے۔"

میں نے فرش پر سے سرگرت ایک خالی پکٹ اٹھایا اور اسے
پھاڑ کے نئی فون نمبر لکھا۔ ابھی وہ پڑھ میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ
تین افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک وہ تھا جس نے مجھے پکڑا تھا۔
اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے دو آڑہ بند
کیا اور دس فٹ لمبے اور چوڑے اس کمرے میں موجود واحد کرسی
پر بیٹھ گیا۔ ایک نے ٹیکل بسپ کا گھڑ اس کی طرف کر دیا۔ مجھے دیکھ
کے اس نے کسی خاص رویہ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

میں ایک دم دوڑ کے اس کے قدموں میں گر گیا۔ "چوہہ دیر
صاحب، مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

اس نے مجھے ایسے لات ماری جیسے میں باؤلا کتا ہوں۔ میں کراہ
کے دوڑ جا کر۔ دونوں سپاہیوں نے مجھے اٹھایا۔ کمرے میں داخل
ہوئے والے ایک دروازے کے سوا اس کمرے میں نہ کوئی کھڑکی
تھی اور نہ روشنی ان تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ کالا تھا جیسے ان
پر تار کول پھیرا گیا ہو۔ فرش پر زنجیریں۔ چوڑے کے لمبے لمبے
گھڑے۔ رسیاں۔ چھوٹے بڑے ڈنڈے۔ کچھ مستروں کی درکشاپ
کے آواز۔ ڈبل شٹین اور ایک ٹیکے جیسے چیز پڑی تھی۔ یہ سب
آلات تفتیش تھے۔ اقرار جرم کرانے کے اسباب۔ چچا لکھوانے
کے لوازمات۔ ایک کونے میں پانی سے بھرا ہوا ٹب بھی اسی لیے
ہو گا۔

سپاہیوں نے میری چیخ بکا رہائی اور فریاد کو نظر انداز کرتے
ہوئے مجھے کمرے کے وسط میں لگی ہوئی میز پر اٹھا کر کے میرے
کپڑے اتار دیے "یہ شاید روشت چوڑی پانچ فٹ لمبی اور تین فٹ
اوچی تھی۔ میرا سر اور میرے پاؤں اس میز کی لمبائی سے باہر تھے۔
انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو میز کے نیچے ملا کے مضبوطی
سے باندھ دیا۔ میں چیخ رہا تھا اور جو کچھ ہونے والا تھا اس کے خیال
سے میرا پیشاب خطا ہو چکا تھا مگر کام کرنے والے اپنا کام پڑی
بکروٹی کے ساتھ کر رہے تھے۔ میرے پیروں کو ملا کے باندھنے کے
بعد پھر کھول دیا گیا۔ تھانے دار نے کہا تھا کہ انہیں الگ کرو۔ اب
ہر جہز کو میز کی ایک ٹانگ کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ میں
صرف اپنا درمیانہ دھڑ توڑا بہت اوپر نیچے کر سکتا تھا۔ میز کے

پائے فرش میں نصب تھے۔ میرے پائے سے میز نہیں مل سکتی تھی۔
میرا سر میز سے آگے نیچے جھکا ہوا تھا۔

میرے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد کسی سے کچھ پوچھنے بغیر
پولیس والوں نے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ
میں چوڑے کا ڈنڈہ دو فٹ لمبا نکلا تھا جس کی چوڑائی انسانی ہاتھ
کے برابر ہی ہوگی۔ جب اس کی پہلی ضرب میری کمرے کے زیریں حصے
پر لگی تو مجھے اپنی جلد میں آگ کی جلن سی محسوس ہوئی اور درد کی
شدت سے میرا پر اور وجود کرب میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے قانون کے
رکھوالے نے ٹھٹھوں سے نیچے ٹھٹھوں اور ٹھٹھوں تک کے حصے کو
مضبوطی سے لے لے پھینک دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جس سے وہ
مستقل چو نہیں لگا رہا تھا۔ یہ صارت اور تجربے کا کام تھا۔

میرے کان چوڑے کے ٹکڑے کی بھینک آواز سن رہے
تھے۔ ہر بار جب وار میری کھال پر ہوتا تو میرا درمیانہ دھڑ تپ کے
اوپر ہوتا تھا۔ میرا سر ایک جھٹکا لگا تھا مگر کچھ میرے حلق میں گھٹ
کر رہ جاتی تھی۔ درد میرے جسم میں بھرتا جا رہا تھا اور ناقابل
برداشت ہونے لگا تھا۔

پولیس کی اصطلاح میں یہ "ٹرول" یا "چھڑول" کا عمل تھا
اور وہ ازراہ تعین چوڑے کے اس ڈنڈہ فٹ ٹکڑے کو تیرہ نمبر کا
چھڑکتے تھے۔ یہ تفتیش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ تشدد کی سائنس کے
نصاب کا پہلا سبق "ہر ظلم کو اس کی ساتی حیثیت اور سبب نسب"
صحت یا عمر کا لحاظ کیے بغیر سب سے پہلے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ
وہ صرف ظلم ہے۔ وہ اپنی عزت نفس اور اپنے اعتماد کے قوا سی
وقت محروم ہو جاتا ہے جب اسے اپنے جیسے انسانوں کے درمیان
جانور کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ انصاف کے عمل، رشتوں اور
ساروں پر اس کا تعین تھانے کے ذرا تنگ دم میں دم توڑ دیتا
ہے۔ اس کی قوت ارادی اور مزاحمت دوران تفتیش اس کا ساتھ
چھوڑ جاتی ہے۔

مجھ سے کسی نے بھی نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور میں
نے کیا جرم کیا ہے۔ جرم کیا ہے تو کیا؟ ایک منہنی تسلسل کے
ساتھ وہ میرے جسم پر ہر جگہ وار کر رہے تھے اور میں کرب کے
جھکوں سے زلزلے کی کیفیت میں تھا۔ آہستہ آہستہ جسمانی اذیت
کے احساس کا مغریت اپنے نیچے میرے وجود کی گہرائی میں اتارنے
لگا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ میرا جسم درد سے اسی طرح پھٹ جائے گا
جیسے زیادہ ہوا بھرجانے سے فباہ پھٹ جاتا ہے۔

تکلیف کے "آؤ" گھٹی ہوئی چیزوں کا شور اور اذیت کی تڑپ
کا خود کار عمل رفت رفتہ ست چلنے لگا اور مجھ پر بے بسی طاری
ہونے لگی۔ یہ احساس کچھ دیر باک رہا۔ میرا بدن بے بس پر آزاد
اور طاقتور انسانی ہاتھ ابھی تک ظلم کی ساری توانائی صرف کر رہے
ہیں۔ پھر یہ احساس بھی نہ رہا۔ اپنی موت کا تعین مجھے مرنے سے
پہلے ہی کیا تھا۔

لیکن میں اسی حالات کے فرش پر دوبارہ ہوش کی دنیا میں
لوٹ آیا۔ وقت ایک بے معنی لفظ ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ
میں نے کتنی دیر تشدد برداشت کیا تھا اور وہ چند اذیت ناک منٹ
تھے یا گھنٹے۔ اس کے بعد میں کتنی دیر ایک سردار جانور کی طرح
میں پڑا رہا تھا۔ یہ سب جاننے کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔
میں نے نزع کے کرب میں آنکھیں کھول کے روشنی دیکھی۔
میرا بدن درد کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور انگڑوں میں جکس رہا
تھا۔ اچانک مجھ پر ٹھٹھ کی برسی پھرے ٹھٹھ میرے اندر بھرنے
لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے حواس بیدار ہونے لگے۔ میں
آوازیں بھی سننے لگا۔

کسی نے کہا "پانی پانی، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"
میں نے پانی کا ایک اور گھونٹ حلق سے اتار کے دیکھا۔ کسی
نے مجھے سارا دے رکھا تھا۔
"کیا ہوا ہے اسے؟" یہ ضرور کوئی صحافی تھا۔
"تیار ہے۔ جی۔ ہمیں تو دقت ڈال رہا ہے اس نے۔ اب اس
کے لیے ڈاکٹر کہاں سے لائیں۔"

"کیا جرم ہے اس کا؟"
"چوہہ دیر۔ کئی زانی کا زور و جھین رہا تھا حرا۔۔۔ محلے کے
بندے آگئے روند اس کی عزت بھی لوٹ لیتا۔ کپڑے تو چھڑا دی
دیتے تھے۔"
"کیا اس نے بھی خود کشی کی واردات کرنے والے کو دیکھا
تھا؟"

"اوسیں سری۔ یہ تو بعد میں آیا تھا۔ باقی سارے بندے گواہ
ہیں۔"

کسی اور نے کہا "آئیں جناب عالی۔ کچھ چائے پانی نوش
فرمائیں۔ ایس ایچ او صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"
میں نے پوری آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ اخبار کی نمائندے
تھے جو سلاخوں کے ساتھ اگڑی ہوئی لاش کو غور سے دیکھ رہے
تھے۔ ان میں تین مرد تھے اور ایک عورت تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ تشدد سے ہلاک ہوا ہے۔" کوئی بولا۔
"اب دیکھو! آواز بندہ خرد مرنے والا ایسے باندھتا تو کیا ایسے
ہی رہتا۔ گردن پر کوئی اور نشان نہیں۔ جیسے پھندا لگا کے آرام سے
مر گیا۔"

"نشان دیکھتے ہیں تو ماحول پر دیکھو۔ کیسے ہیں یہ نشانات تشدد کی
بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

"آخر کرب تک چلے گی یہ لغو کمانی۔ اتنا ہے ہو وہ جھوٹ ہے
جس کو یہ سچ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

"صحافیوں کو بھی گدھا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟" مختلف تبصرے ہوتے رہے۔
"اور سمجھتے رہیں گے۔ ہم کچھ بھی کہیں۔ کچھ بھی لکھیں۔ ان
کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے قتل ہوتے رہیں گے۔ یہ تو از عورت

کی تھی اور مجھے جانی پہچانی لگی۔
 میں نے اسے غور سے دیکھا اور چٹایا "آہا جی۔"
 باہر کھڑے سنتری نے مجھے ڈانٹا "چپ کر کے بیٹھ آہا جی دے
 پڑ۔"
 مگر میری آواز نے عورت کو متوجہ کر لیا تھا "کیا بات ہے؟"
 میں نے اٹھنے کی کوشش کی "آہا جی۔ خدا کے لیے مجھے
 بچاؤ۔۔۔ آپ نے پکڑا نہیں مجھے؟"
 "تم کون ہو تم؟" اس نے کہا۔
 "آہا جی۔۔۔ میں آپ کے دفتر آیا تھا اخبار کی کاپی لینے۔"
 "اے۔۔۔ ہاں" وہ بولی "مگر تم۔۔۔ یہ کیا حالت ہو رہی ہے
 تمہاری؟"
 میں چیخ چیخ کر رونے لگا "انہوں نے۔۔۔ بہت مارا ہے جی۔"
 "یہ کتنے ہیں تم نے کسی گھر میں گھس کے زبردستی ایک عورت
 کا زیور اتارنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔
 "یہ۔۔۔ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے آہا جی۔ آپ میری بات
 سُن لوئی؟ آپ کو کچے رب کا واسطہ" میں دھڑکیں مار مار کے رونے
 لگا۔
 ایک سب انسپکٹر مسکراتے لگا "سب ایسا ہی کہتے ہیں جناب۔
 آپ معلوم کر لیں۔ یہ سچا ہے تو سوا گواہ جھوٹے ہیں؟ دن دھاڑے
 پکڑا ہے اسے کھلے کے لوگوں نے پچاس ہزار روپے کی بات کر رہا
 تھا ہمیں پکا چور ہے۔"
 میں نے پھر کہا "قسم خدا رسول کی۔ آپ بس پانچ منٹ میری
 بات سُن لو ورنہ یہ لوگ مار ڈالیں گے مجھے۔"
 "اچھا اچھا" سُن لیں کی تیری بھی کیا ہو گا اس سے؟"
 ایک ٹیکسٹ والے نے سُننے سے کہا "ہاں۔ تمہارے بچ کے
 سنے کو بھلا کون کھوتا کہہ سکتا ہے۔ کل اگر یہ بھی خود کٹی کر لے گا تو
 کیا ہو گا؟ ہم خبریں چھاپ کے بھگ ماریں گے تمہارا اپنا ایس ڈی
 ایم انکوائری افسر مقرر ہو جائے گا۔ وی ایس ڈی ایم جس کے
 چاند پر یہ قاتل ہے۔ کیا وہ تمہارے خلاف رپورٹ دے سکتا
 ہے۔"
 دوسرے ٹیکسٹ پوش نے کہا "کہنے کو وہ انچارج ہے مگر یہ اس
 کو بھی ڈک سکتے ہیں۔ اب دیکھ لیتا پوسٹ مارم بھی وی کی ہے جو
 یہ فرما رہے ہیں۔ پولیس سرجن ان کا اپنا۔"
 "اسی لیے تو عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ کیا
 مذاق ہے انصاف کے نام پر۔ جو ایس ڈی ایم پولیس کو حکم دیتا ہے
 کہ لاٹھی چارج کرو" آنسو گیس پھینکو "قازمک کو مظاہرین پر۔
 مگر قازمک کے جانے والے اسی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ضمانت
 کے لیے اٹھتے دن۔"
 "اگر اگلے دن وہ کسی دی آئی ٹی کے استعصال کے لیے
 انرپورٹ پر قانون نہ بچا رہا ہو۔ اسکول کے بچوں کو ہاتھ میں گھسے

دے کر قطار میں نہ کھڑا کر رہا ہو۔" سب صفائی اپنے دل کی بھڑاس
 نکال رہے تھے۔
 سب انسپکٹر نے پھر کہا "جلو جناب عالی۔ آپ بارشاہ لوگ ہو۔
 جو چاہو چھاپ دو ہمارے خلاف۔ ہم تو نوکری کرتے ہیں۔ چائے
 ٹھنڈی نہ ہو جائے۔"
 "بندہ ٹھنڈا کر کے بات کرتے ہو چائے ٹھنڈی ہونے کی"
 عورت نے برہمی سے کہا "فلت تمہاری چائے پر۔"
 میں پھر چٹایا "آہا جی۔ مجھے تو بچالو۔ آپ نے کہا تھا تم اپنی عمر
 سے زیادہ ذہین ہو۔"
 "یہ تو ہے۔ اس عمر میں جو کام دکھایا ہے تو نے" سب انسپکٹر
 بولا۔
 عورت نے باؤسی سے کہا "دیکھو۔ میں تمہاری کیا مدد کروں۔
 اتنے لوگ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ ہاں تمہارے گھروالے ہیں
 یا کوئی وکیل ہے تو مجھے بتا دو کوئی پیغام ہے!"
 میں نے کہا "آہا جی۔ آپ شادو کو فون کرو۔ اس کا نمبر لکھ
 لو۔ اسے بتا دو کہ نامہ کماں ہے۔ مگر وہ شام کو ملے گی۔ سات بجے
 فون کرنا۔"
 اس نے ایک نوٹ پیڑ پر نمبر لکھا "ٹھیک ہے۔ میں بتا دوں
 گی۔"
 میں نے کہا "اور مئی۔۔۔ ان سے کہو۔ رحم کریں مجھ پر۔ وہ مجھے
 نہ ماریں۔"
 اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ جیسے وہ مجھے بتانا چاہتی تھی کہ
 میرے کہنے سے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ یہ نظام جس کی خرابی کی جڑیں
 صدیوں کی گمراہی تک پہنچی ہوئی ہیں۔ انگریز کے دور غلامی سے
 آزادی کی نصف صدی تک۔ اس کو بھلا میں کیسے بدل سکتی ہوں۔
 اس کے چلے جانے کے چند منٹ بعد دو موت کے فرشتے
 نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹا
 "شکایت کرتا ہے اخبار والوں سے" وہ تیری ماں کے بارے میں کیسے
 پچاتے ہیں ہم سے۔"
 میرا سر فرش سے گرا آیا۔ وہ مجھے سمجھنے کے باہر لے گئے۔
 پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا گیا مگر میں کھڑا نہ رہا۔ وہ
 پھر مجھے اسی قتل گاہ کی طرف لے جا رہے تھے جہاں بڑے بڑے کج
 کھانا اپنا سر نمودار کی خدائی کو تسلیم کرنے کے لیے جھکادیے ہیں۔
 ایک سب انسپکٹر نے کہا "اوتے ذرا خیال سے۔ وہ لوہری
 ہیں ابھی۔"
 "آپ فکری مت کرو سہی۔ بندے کا جی نہیں چل سکتا
 کہ کہہ کر گیا۔ آپ بول دیں کہ ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔"
 دردناک انداز پر پھر میرے پیچھے بند ہو گیا اور کالی دیو ایدوں
 والے کرے کا ستفک اندھرا مجھے ٹھٹھکے لگا۔ ایک اندھے بلب کی
 روشنی میں مجھے وہی نمیز نظر آئی جو مڑے کو غسل دینے والے تختے

کی طرح چر آسب محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس بار میز پر سے میری
 لاش اٹھائی جائے گی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔
 "بڑا اونچا اڑنے لگا تھا اخبار والوں کے سامنے غبار ہے۔"
 "میں نے مجھے غبارہ مٹاتے ہیں" دوسرے نے مجھے ہیز کے ساتھ
 بانہ مٹنے کا مکمل شروع کیا۔ میرے کپڑے پھراٹا دے گئے تھے۔
 "پہلے ایک انجکشن لگاؤں طاقت کا؟ کیا خیال ہے؟"
 "اوتے مر جائے گا حراسی۔ پہلے ایک معیت سے منٹ
 لیں۔ دوسری کچھ عرصے بعد کسی اور قاتلے میں ہونی چاہیے۔"
 دوسرا کانسٹیبل بولا "مجھے پپ دے۔ اس نے اخبار والوں کے
 سامنے کچھ اس نہ کی ہوئی تو ادھر تھی۔"
 پہلے والے نے سائیکل کی ٹیوب میں ہوا بھرنے والا پپ
 اٹھایا اور پھر بولا "..... منٹ بند نہیں کیا تو بوا نکل جائے گی۔"
 انہوں نے میرے منہ کو انڈکٹ کر دیا۔ پھر ایک سپاہی نے مجھ
 میں یوں ہوا بھرنی شروع کی جیسے میں واقعی غالی ٹیوب ہوں۔ اس
 نے پپ کو ایک پاؤں سے دبا رکھا تھا اور پینڈل کو اوپر نیچے کر رہا
 تھا۔ آہستہ آہستہ میرا پیٹ پھولنے لگا۔ میں غبارہ بن رہا تھا۔ کیا
 میں غبارے کی طرح پھٹ بھی سکتا تھا؟ اذیت میرے لیے ناقابل
 برداشت ہونے لگی۔
 اچانک دردناک کھلا اور سب انسپکٹر نے کہا "اوتے چھوڑو
 اسے۔ دشت ڈال دیا ہے اس حرام زادی نے۔"
 ایک منٹ بعد میرا جذبات ختم ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ سب
 انسپکٹر نے یہ خطاب کس کو دیا ہو گا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے
 بیویں پر چل کے حالات تک پہنچا۔ ایک موبوہ سی امید نے میرا
 حوصلہ اور احوال بحال کر دیا تھا۔ اس خاتون صفائی نے یقیناً میرے
 حق میں کوئی نیکی کی ہوگی ورنہ آج مجھے اپنی زبان درازی کی زیادہ
 سخت سزا ملتی۔
 میں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ سوائے اس مار کے
 جس نے مجھے اندر سے بھی کھوکھلا کر دیا تھا۔ میں حالات کے فرش
 پر دھڑام سے گرا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ لیکن اس بار وقت بہت مختصر
 رہا۔ شاید اس کا سبب تسکین اور اطمینان کا یہ احساس تھا کہ میں
 اب لاوارث اور لاپتا نہیں۔ پولیس مجھے مار کے میری لاش دیا میں
 نہیں بھاگتی اور کسی پائے خاں کا سالانا سنی آسانی سے مجھے غائب
 نہیں کر سکتا۔ حالات میں ایک قیدی کی ہلاکت میرے حق میں
 باعث رحمت ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے اخبار والے آئے تھے۔
 انہیں پولیس کے خلاف ایسی منفی خبر سُنی بہت کم ملتی تھی۔
 مرنے والے کی وجہ سے میں اپنی اس قاتلے میں موجودگی کی خبر
 شادو تک پہنچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وقتی طور پر قاتلے والے
 بھی قاتل تھے اور دوسرے تعیشی قتل کا خلوص مول نہیں لے سکتے
 تھے۔ ایسی خبروں کے بدلے میں نہ کوئی قتل کے اہرام میں پڑا جاتا
 تھا اور نہ نوکری سے برطرف ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ

قاتلے کے انچارج کا چارلہ نیچے والوں کی لائن حاضری اور بہت
 شور شرابا ہوا تو عارضی طور پر معطل۔ اگر میرے حالات میں وارد
 ہونے سے پہلے ہی ایک موت نہ ہوتی تو ترجیح اخبار والے میری
 خود کشی کی خبر بنانے کے لیے آتے۔ اللہ اس کی منفرت کرے جس
 کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا مگر اس نے اپنی جان دے کر مجھے
 فوری موت سے تحفظ عطا کیا تھا۔
 مجھ میں اٹھنے کی طاقت نہیں تھی مگر میرا داغ کام کر رہا تھا۔
 میری قنات کا ایک سبب بھوک بھی تھی۔ میں دجہ پہے کہ گرم
 چائے کی خوشبو نے مجھ پر چارو کا اثر کیا۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔
 داڑھی والا جو رات کو سکرٹ کے دم لگا رہا تھا اب ہلاتی پانچ
 مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پیٹ میں بن کھن رکھا ہوا
 تھا۔ بن کو دو دھنوں میں کاٹا گیا تھا۔ ایک اس کے ہاتھ میں تھا اور
 دوسرا پیٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے جڑے مل رہے تھے اور
 دوسرے ہاتھ سے وہ چائے ایک کپ میں اڈھل رہا تھا۔ اس کے
 لیے چائے کی بد وضع پتیلی ہوش سے منگو اتنی تھی۔ وہ حالات
 میں مسماں خصوصی کا درجہ رکھتا تھا۔
 میں کچھ دیر اسے بن کھن کھاتے اور شرپ شرپ کر کے
 چائے پیئے دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔
 "مولوی صاحب۔۔۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ تمہارا سا!"
 اس کے جڑے رک گئے اور اس کی آنکھوں میں جیسے خون
 اُتر آیا۔ اس نے مجھے مولوی صاحب کہنے پر ایک ناقابل اشاعت
 گالی دی۔ مگر میری صورت دیکھ کے شاید وہ مجھ گیا کہ میں قابلِ رحم
 اور قابلِ معافی ہوں۔ اس نے ادھر بن کھن اور چائے کا کپ
 میرے سامنے رکھ دیا۔
 میں نے دو منٹ میں سب صاف کر دیا اور ان قدیوں کی طرف
 بالکل نہیں دیکھا جو میری قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ بھوک ان
 کی نظروں سے بھی عیاں تھی مگر وہ خاموش انچاکا حد سے آگے
 جانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ چپنے کے لیے تو ب کچھ کھا پڑنا
 ہے۔ شرم اور غیرت کو بالائے طاقت رکھنا پڑتا ہے۔ مانگے سے نہ
 لے تو چھیننا پڑتا ہے۔
 داڑھی والے نے سنتری سے کہا "اوتے میرے لیے دوسرا
 ناشتالاکے دے۔ ایسے شکل کیا دیکھا ہے میری۔ جا کے بول ڈیولی
 افسر کو۔"
 سنتری نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔
 میں نے کہا "ٹیکسٹ لے سب۔ آپ بڑے ٹیکسٹ دل ہیں۔"
 اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا پھر کچھ سی مسکراہٹ اس کی
 مونچھوں اور داڑھی کے جنگل میں یوں نظر آنے لگی جیسے مجھے
 درخت کی شاخوں میں سے دھوپ جھلکتی ہے۔ "اوتے ٹیکسٹ دل کے
 گھوڑے۔ چپے ہے نہیں کون ہوں؟"
 میں نے فنی میں سر ہلایا "آپ جو بھی ہوں۔ ان سب سے

”میں آجاؤں گا کہ ہوں۔“ اس نے بڑے فخر سے خود کو متعارف کرایا۔

”کیا کرے گا پڑھ کے۔ یہی لائن ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی تیری عمر نہیں اکیلے کام کرنے کی۔“

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تاریخہ کاری کے باعث پچاس ہزار میں
 ایک ملائی کہ چش کش میری حماقت تھی۔ کاشفیل کے تو مجھ پر یقین
 ہی نہیں کیا تھا اور سب افسوسکے صحافیوں کے سامنے میری بات کو
 سند بنا کر پیش کر دیا تھا کہ اتنی رقم کی رشوت دینے والا میری عمر کا
 بڑا کافر صرف رزا کو ہی ہو سکتا ہے۔

سائنس دانوں نے تحقیق اور انکجاء میں صدیاں گزار کر کے اور
ایوں کھربوں ذرا سالانہ خرچ کر کے ذرے کا دل چیرا اور اہم بن
جلا۔ خلا کو کھیر کیا اور جانے پر قدم رکھا۔ پھر کیمیا بن گیا۔ کتنا
قرن پہلے اگر میکسل سائنس کچھ توجہ دے کر انکجاء اور انکجاء کر سکتی
کہ ایک انجمن لگا اور دن سے ہوس کے غلات ختم اور طبیعت
میں قاصد جیسے وسیلہ کے ایک انجمن سے اضطرار کی کیفیت ختم

پہلے میں کچھ جانے سے مجھے راحت ملی تھی اور مجھ پر غنودگی طاری تھی مگر اس میں بھی خیالات کی بے سمت اور بے ہمار پرواز جاری تھی۔ جو ملی فون نمبر میں نے تفتیش سے قبل سپاہی کو دیا تھا قہقارہ کا گھنہ کے ٹپڑے پر لکھا ہوا میرے اٹھ بیس روپے کا تھا مگر اس خاتون صحافی نے نمبر بڑی احتیاط سے نوٹ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شاد کو پیغام ضرور پہنچا دے گی۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا شاید میری رہائی کے لیے کچھ کرے گی؟ وہ رہیں کو بھیجے گی۔ ہاں، رہیں میرا دوست بھی ہے۔ مگر کیا پولیس اس کو گھاس ڈالے گی۔ نہیں وہ پولیس کو گھاس ڈالے گا۔ پولیس کا من بھاتا چار اہن کے سامنے رکھے گا۔ نوٹ... چھوٹے بڑے نئے ٹرائے بھیجے ہوں۔

میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ شام سات بجے شاد کو فون کرے پھر اس وقت میری مشکل کیسے آسان ہوگی کیا اس نے جس کا میں نام تک نہیں جانتا تھا انجمن صاحب کو اپنی زبان میں ”ڈی ڈی“ ہی۔ ڈی ڈی دے دے سکتا ہے جس کے پاس اختیار ہو۔ پولیس کے باور، طاقت کے باور، صحافی کے باور، قلم کے

داڑھی والے نے کہا ”پھر کیا سوچا؟ کام کرے گا میرے ساتھ؟“

میں چونک رہا "تمہارے ساتھ؟ تمہارا مطلب ہے میں ڈاکے والوں؟ تمہارے گروہ میں شامل ہو جاؤں؟ کیا سمجھ رکھا ہے آخر تم نے مجھے؟"

وہ مجھے سپاٹ نظروں سے رکھتا رہا۔ ”ابھی تو ہے کیا آخر کہ کوئی تجھے کچھ سمجھے۔“

میں نے کہا ”آدھا بن کباب اور ایک کپ چائے کے بدلے تم مجھے اتنے جیسا ڈاکو ملاتا چاہتے ہو؟“

”اور کیا ہے کاغذ وزیر اعظم؟“ وہ اس پر۔
 ”ہاں۔ میں وزیر اعظم بنوں گا۔ یہ بات آج میں پہلی بار نہیں
 کہہ رہا ہوں۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تب بھی کہتا تھا۔“

دھنڈے لگے۔ اس کی ہنسی میں بڑی کھنکھرتھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگاتے لگا۔ حوالات میں ایسے قہقہے وہی لگا سکتا تھا۔ برقع پوش اکڑوں بھی ہوئی صورت اسے حیرانی اور ستائش کے ساتھ سمجھنے لگی۔ اس کے نزدیک وہ آئینہ بل مرو تھا، ایک کراہیل جوان۔ جان بھرتی پر رکھ کے چہرے والا۔ خفرت سے کھینڈ والا اور دولت کو کمر کی لوٹری کہنے والا۔ اس کا بد فحوق اور ملعون شوہر مسکراتے لگا تھا۔ چند اور حوالات بھی جو مسکرا سکتے تھے، مسکراتے

تاج بادشاہ نے ایک انتہائی خوش محرم حسب حال الخفیہ ستایا۔
برقع پوش نیک بی بی۔۔۔۔۔ پلو میں دبا کے سنبھلنے لگی اور شرم سے
قہقہے مچانے لگی۔

ایک سنتی دیوانے پر نمودار ہوا "اوسے تو ہے ناصر عظیم میں کل باہر۔" اچانک صاحب ہارے ہیں۔ "میں انہی کے دیوانے کی طرف بھاگا۔" انا نے اچانک ایک ٹانگ آگے بڑھا دی۔ میں ٹھوکر کھانے منہ کے بل گرا۔

”وکیلہ کے وزیر اعظم صاحب! یہاں حکومتیں ایسے ہی گرائی جاتی ہیں۔“ تاج نے کہا۔ ایک بار پھر وہ گھبراہٹ کے ہنسنا گھبراہٹ میں نے اسے پلٹ کے نہیں دیکھا۔ میں اطمینان سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

انہماج اسی کو فر کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا جسے شہنشاہ اکبر اپنے تخت پر بیٹھتا ہوگا۔ اس کے لیے وادی لباس شانہ تھی اور نوبی تاج شای۔ اس کا عالی شان کمر اس کا ہزار تھا جس میں اس وقت بھی نورتن حاضر تھے۔ پھیل ہیڈ محراب تھا۔ ملا دیارہ وہ دیباہی جس کو میں نے تک مکار کرنے کے لیے پچاس ہزاری کی آفر کی تھی۔ یہ خانہ، خانہ، ایک سب انسٹل۔

تھانے دار کے سامنے ایک گلاس میں کوئی مشروب تھا۔ وہ کوک بھی ہو سکتی تھی اور شراب بھی۔ وہ اسے مزے لے لے کر مکھنٹ مکھنٹ پیتا رہا اور مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں تجریدی آرٹ کا سمجھ میں نہ آنے والا نمونہ ہوں۔

”بھئی اے ایس بی صاحب آرہے ہیں انکو انری کے لیے“
 بولا ”اس سبھری نے آتش جا کے اے ایس بی سے بات کی۔ کتنی
 ہے میں جانتی ہوں اسے۔ صرف ایک بار ملی ہے۔۔۔۔۔ اور کتنی ہے
 میں جانتی ہوں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ تھانے دار نے خاتون صحابی
 کو منہ کھلا دیا۔

میں نے جواب میں کچھ نہ بولنا بہتر سمجھا۔

”لیکن اپنے چودہویں بیڑ صاحب کو اس میں کسے تیری
ان کی کیا دشمنی۔ اے ایس کی کیا خود آئی جی صاحب آجائیں
انگریز کے لیے ہو گا کچھ نہیں کاغذی۔ اور امرانی بادشاہت ہے۔
کسی بھیلے میں مت رہنا۔ تو ابھی چھڑا ہے چھڑا۔ بڑے بڑے سانہ
قیہ کر کے کھلا ہے میں نے اپنے کتوں کو اور وہ ہم ہو کے نکل
گئے۔ جائے تو ہے؟“

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں چونک پڑا "ہاں۔۔۔ ہاں کی
تسبیح ڈاکو نے پلائی۔"

میں کہتا ہوں ابھی وقت ہے سنبھل جا! اس کا جواب
بدلا ہوا تھا "اپنے چوہدری بشیر صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ اور
یار بھی ہیں میرے گھر میں راضی کر لوں گا انہیں" پچاس ہزار کیسے
دے گا تو؟

”پچاس ہزار“ کیسے پچاس ہزار؟ میں نے سخت حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ ٹوٹے اس سے کما تھا کہ پچاس ہزار میں کم کر دو۔ چوتھے ہمارے پچاس ہزار؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا "سہمی۔ میرے پاس پچاس ہزار۔"
 اس نے گلاس جیڑی طرف پہنچے مارا کمر میں بچ گیا۔ ایک سو
 ایک گالیاں دینے کے بعد اس نے کہا "ابھی ساری ایک سو نکال
 دوں گا۔ اوئے کیا کہا تھا اس نے؟"

ملا دو پناہ دست بستہ آگے بڑھا اور میری بات دہرا دی۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے سوئی۔ یہ مجھے اس کمرے میں لے گیا تھا۔ جہاں ایک چارہائی پٹھی ہوئی تھی۔ میں اے ایس پی صاحب کو ضرور بتاؤں گا کہ وہاں اس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔“

ملا دوپہا زون کی حالت غیر ہو گئی۔ شہنشاہ اکبر نے اسے دہلی سے نکال دیا یہ اخبار والے جنہیں مروادیں گے۔ آج ہم نے جنہیں چھوڑ دیا تو کل پھر پکڑ لیں گے کسی اور تھانے میں۔ پھر کسی اور تھانے میں۔ اتنے راجے کٹ حاکم، گے تمہارے خلاف کہ کوئی

تفاہر شادیت ہنس کے بندو اثر قلم سے ایک نیا جہول

تہذیب

۱۔ طلحہ عالم سکندر اعظم کے دور کے ایک یوٹیلیٹی غلام کی سرگزشت۔

۱۔ ایک شوریدہ سر غلام کی داستان جس نے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکا۔

ایک ایسے سرکش انسان کی داستان جو ایک حسین یونانی شہزادی کی خاطر
دلوں اور آگ اور خون کے سمندر میں کود پڑا۔

قیمت: ۳۳۰/- ژاکت خروجی: ۳۳۰/-

اینے ہا کر یا قرسی بک سٹل سے طلب فرمائیں

نعلی میاں = پہلی کیشمن

علی بابا

شاہد

عدالت ہماری ضمانت نہیں کرے گی۔ اسے لاؤ تو اس کو لمانش دکھاؤ۔“

سب انکسز نے مختلف اشیاء میز پر سجائیں۔ قہانے دار نے ایک لمبی سی چمڑی اٹھائی اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ بیرونی کی پڑیاں ہیں۔ پچاس پچاس گرام والی۔ یہ بڑا دور ہے۔ یہ جملی نوٹ اور یہ دست۔ اور یہ ایک خنجر۔ اس پر مشعل کا خون ہے۔ فگر پرنٹ کسی کے نہیں مگر ڈالے جاسکتے ہیں۔ مشعل کے خون آلود کپڑے مال خانے میں ہیں۔ کس عدالت میں چل رہا ہے۔ ہمارے اپنے مال خانے میں چوری کا بڑا مال ہے۔ لی وی اور وی سی آر سے لے کر موٹر سائیکل تک جو ابھی برآمد نہیں ہوا۔ کیا کریں گے اخبار والے اگر یہ تیرے قبضے سے برآمد ہو جائے۔ کچھ عرصے بعد یا تیرے فگر پرنٹ اس خنجر پر مل جائیں، قانون کے مطابق یہ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اس کے دعوے کو غلط نہیں کہا، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر رات بھر میں تجھے مشعل نہیں آتی تو آج تجھے دو سراسیمہ دیں گے۔ دوسری کا امتحان پاس کر لیا تو تیری میں زیادہ مشکل ہوگی لیکن تو نے ہمدردی سے کام لیا تو دوسوں کر لے گا۔ یہی چاہتا ہے۔ آج ایک میچ بند میزک پاس کر کے کیا تھا تیرے سامنے۔ کل اخبار والے۔ کا ڈور لگیں۔ اپنی نوکری کی ہے پڑ۔ یہ تین پھول جس کی وردی پر لگ جائیں اس کے سامنے وزیر اعظم بے اختیار ہے۔ تو خیم خانے سے بھاگا تھا۔“

ایک بار پھر میں اچانک کیے جانے والے سوال پر چونک پڑا۔ یہ اس کا خاص طریقہ تھا۔ ”اپنی مرضی سے خیم خانہ چھوڑا تھا میں نے۔“

”اے مرضی دے تم۔“ اس نے گرج کے کہا ”کتنی ہے تیری عمر؟“ اٹھادھ سال سے پہلے تیری مرضی نہیں چل سکتی۔ نابالغ ہے تو۔ خیم خانے والوں نے بھی رپورٹ لکھوائی ہے تیرے خلاف۔ چندے کے سڑ بزار لے کر بھاگا تھا تو خیم خانے کے دفتر کی دو گھڑیاں۔ ایک گولڈ میڈل۔ تو نے مولانا قاسم علی قاسمی پر مظاہرہ حملہ کر کے انہیں بھی سخت زخمی کیا تھا۔“

”وہ کیسا کرتے ہیں۔“

سب انکسز ایک دم مجھ پر چل پڑا۔ اس نے بڑی وحشیانہ قوت کے ساتھ مجھے کے رمارہ کے لہا لٹا دیا۔ پھر کھینچ کے سیدھا کھڑا کر دیا۔

انجام دینے گھڑی دیکھی ”خیمیت چاہتا ہے تو اپنے چوہدری شیر صاحب سے بات کر لے۔ ان کے بیٹوں کا چچا چھوڑ دے۔ ورنہ تیرا جو مشر ہو گا وہ تجھے معلوم نہیں۔ اس شہر سے دفع ہو جا۔ آئی بات سمجھ میں۔ تیری میں بھی نہیں۔ وہ دیکھوں میاں ورنہ جس دن نظر آیا مجھے وہ تیری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“

یہ اس کا اختتامی بیان تھا۔ اس کے اشارے پر مجھے وہاں سے

دفع کر دیا گیا مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب مجھے واپس حالات کے بجائے قہانے کے معنی مجھے ملے جایا گیا۔ یہ بالائی کو راز تھے۔ ایک لمبی سی جھک میں آٹھ دس چار پائیاں چھٹی ہوئی تھیں۔ چار پائیاں کے ساتھ سی گھڑی کے ثبوت نماد وضع کس رکھے ہوئے تھے جن پر ہر سپاہی کا اپنی سرب سفید حروف میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس میں دو ذاتی اور سرکاری استعمال کی تمام اشیاء رکھتے تھے اور جہاں وہ جاتے تھے یہ پتلی ان کے ساتھ جاتی تھی، سوائے قبر کے۔

کچھ لوگ سو رہے تھے اور ظاہر ہے یہ رات کی ڈیوٹی دینے والے تھے۔ ان میں مجھے وہ ملا کو خان اور چنگیز خان بھی نظر آئے جنہوں نے مجھے قہانے کے آداب سکھائے تھے۔ بے شک وہ حکم کے غلام تھے مگر قہانے میں ان کا ذوق و شوق اور جوش و جذبہ ان کے اپنے اپنے تیار ذہن کی دلالت کرتا تھا۔

مجھے سرکاری مقام میں نما کے کپڑے بدلنے کا حکم دیا گیا تو میرے لیوں پر خود بخود مسکراہٹ آئی جو میرے محافظوں کو غصے سے زیادہ ناگوار۔ گھڑی گرا بھی وہ مجبور تھے۔ انہیں مجھ کو اسے ایسی لٹی کے سامنے ایسے پیش کرنا تھا کہ میں بالکل صحت مند اور تروتاوند نظر آؤں۔ اگر میں تشدد کی شکایت کروں تو اسے آسانی سے غلط جاتی قرار دیا جاسکتا۔

اے ایس بی ڈائریکٹ آنے والے کم مرتبہ خیم یا نہ اور عمو مذہب مگر انوں کے افسر ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی سطح بھی کانشیٹل سے قہانے دار اپنے دلوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ لی اے پاس کر کے اعلیٰ پولیس افسر بن جانے والے ذہنی طور پر پولیس کے پورے سسٹم کی ساری خرابیوں کے تحت خلاف ہوتے ہیں اور شروع شروع میں ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ اس نظام کو یکسر بدل کے رکھ دیں گے۔ بعد میں انہیں احساس ہوتا ہے کہ قہانے دار کے تعاون کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتے اور اختیارات کا اصل مرکز تو قہانہ ہے۔ چند سالوں کے بعد وہ بھی انگریزی عمارتوں کے مطابق۔ روم میں جا کر رہی کرنے لگتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی۔

اس لیے اعلیٰ افسر کا انگریزی کے لیے آقا تھا انعام اور ہمنواؤں کے لیے دخل در مشغولات کی طرح نا پسندیدہ تھا مگر معاملہ اخبار والوں کے باڈ کا بھی تھا چنانچہ اے ایس بی کو کچھ تو کرنا ہی تھا۔

معلوم نہیں وہ کس کے کپڑے تھے مگر وہ چلی کے ڈھلے ہوئے صاف کپڑے پہن کے میں ایک دم پُرانا نامر تعلیم بن گیا۔ وہ نہیں جو ملاؤں کے سامنے دربار تھا مگر گزرا ہوا تھا اور ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ مجھے بازار سے کھانا کھوکھا کے کھلایا گیا پھر ایک مولانا صاحب وارد ہوئے۔ انہوں نے کالی داڑھی جیسی اور اتنی ہی بڑی ٹوٹی پن دھکی تھی۔ اگر ان کی اپنی تصویر کھینچی جاتی تو ٹوٹی پر داڑھی کا گمان ہوتا۔

بڑی قزاق سے سلام کر کے انہوں نے میرے سر پر اپنا دست شفقت پھیلا۔ مجھے شیطان ملعون سے متعارف کرایا کہ وہ کیسے میرے پیسے لوگوں کو برکا تا ہے۔ پھر مجھے رادو راست پر چلنے کی تلقین فرمائی۔

رادو راست ان کے نزدیک یہ تھی (جس میں میری صلاح تھی) کہ میں قہانے، اعلیٰ اختیار رکھنے والے افسران کے بارے میں لب کشائی سے گریز کروں۔ عزت اور زلت دینے والا خدا ہے۔ وہی بندے کو قہانے دار بناتا ہے چنانچہ قہانے دار کے احکامات کی خلاف ورزی (غور باللہ) رشتائے اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے اور خدا کے قہر غضب کو دعوت دینا درجہ گھبراہٹ وغیرہ وغیرہ۔ وہ پولیس لائن کی مسجد کے امام تھے۔

اے ایس بی مذہب اور نوجوان آدمی تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا مگر بات شرافت سے کی ”نامر عظیم تمہارا کتا ہے کہ حمیس دھننی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں میرے سامنے کم سے کم ایک درجن افراد کے بیانات ہیں جنہوں نے تم کو ارتکاب جرم میں ناکامی کے بعد فرار ہونے دیکھا تھا اور پکڑ کے پولیس کے حوالے کیا تھا۔“

میں نے کہا ”گواہ تو ایک درجن اور بھی آجائیں گے مگر اس سے میرا ج نہیں بدلے گا۔“

”سب انکسز چوہدری بیکر کو تم سے کیا ذاتی دشمنی تھی؟“

”دشمنی اس کو نہیں۔ اس کے بیٹوں کو تھی۔ وہ ایک قاتل ہے۔ سر اس نے اپنے بھائی کی بیوی کو قتل کیا۔ پھر اس کے بیٹے کو۔ ان کے مکان پر قبضہ کر لیا اور نامر کی ماں کے سارے زیورات ہتھم کر لیے۔“

”یہ نامر کون ہے؟“

”دوسم کا بھتیجا۔ وہ خیم خانے میں میرے ساتھ تھا۔ اس نے ہی سب مجھے بتایا تھا کہ جب اس کے باپ کو چھاپی ہو گئی تو اس کے بچپنے کے مکان اپنے نام کر لیا پھر اس کی ماں سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے نامر کی ماں کو ایک بڑے فروش طاہر کے ہاتھ بیچ دیا مگر طاہر کو نامر کی ماں نے قتل کر دیا۔ سر اس کے بعد وہ خود ماری گئی اور دوسم نے اسے اپنے ہی مکان کے چھن میں دفن کر دیا۔ نامر کو وہ جلی نام سے خیم خانے میں چھوڑ آیا تھا۔ نامر وہاں سے بھاگ گیا تو پچھلے اس کو بھی قتل کر دیا۔ بھلا میرے ایک حادثہ تھا۔“

اے ایس بی حیرانی سے سب کچھ سمجھتا رہا ”یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟“

میں نے کہا ”سر یہ سب اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ میرے پاس اس خبر کے تراشے کی نقل ہے۔ میں اس واردات کے بارے میں ہر ثبوت فراہم کر سکتا ہوں۔ وہ خاتون صفائی اس کیس کے بارے میں جاتی ہیں۔“

”تمہارا نام بھی نامر ہے۔ یہ دوسرا نام تو صرف تمہارا دوست تھا۔ چند دن خیم خانے میں رہنے سے دوست بن گیا تھا۔ تم کیسے ثابت کر سکتے ہو کہ وہ حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا؟ قتل کیا کیا تھا؟“

”سر۔ اس کی ماں کے قتل کا ثبوت تو ہے۔ آپ اس کے چرانے مکان کا چھن کھدوا کے دیکھ سکتے ہیں۔“

”یہ چھین کس نے بتایا کہ چھن میں ہی دفن ہے وہ لاش؟“

میں نے سوچ کے کہا ”خود نامر نے مرنے سے پہلے۔“

اگر میں کتا کہ ایک مدح نے وہاں تک میری راہنمائی کی تھی تو میری بات بے اثر ہو جاتی۔

”قرض کرو ایسا ہی ہے۔ مگر یہ نامر کا بچا، کیا نام ہے اس کا۔ سیم؟ یہ کیوں دشمن ہو رہا ہے تمہارا؟“

”اس لیے کہ میں نامر کا انتقام لینا چاہتا ہوں سر۔“

”کیا مطلب؟ تم قتل کرنا چاہتے ہو اسے؟“

”ہرگز نہیں سر۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو قانون کے مطابق سزا دی جائے اسے دہرے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تفتیش کی جائے۔ وہ سب قبول کر لے گا۔ اگر اس کا سلا چوہدری شیر سب انکسز وطن نہ دے۔ خیم خانے والے بھی اس سے مل کے میرے دشمن ہو رہے ہیں سر۔ اس قتل کے ذمے دار وہ بھی ہیں۔“

چند سینکڑی خاموشی کے بعد اس نے کہا ”تمہا۔ اکیلے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟“

میں نے کہا ”سر۔ میں جن کے ساتھ رہتا ہوں وہ بڑے معزز لوگ ہیں اور میرے محسن ہیں۔ وہ اختیاری باڈ بھی ہیں مگر میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ اگر میں ان کو فون کروں تو وہ مجھے فوراً رہا کرالینے مگر ان کی بددعا ہوئی سر۔ میرا ٹھکانا مجھ سے چھن جاتا۔ ان کی نظریں میری عزت ختم ہو جاتی۔“

”تم خیمیت جانتے ہو؟“ اس نے انگریزی میں کہا۔

”موسوی سر۔ بات جب زبان سے نکل جاتی ہے تو پرائی ہو جاتی ہے۔ یہاں مجھ پر کتنا بھی تشدد ہو۔ مجھ پر کتنے بھی الزام عائد کر دیے جائیں۔ مجھے جیل جانا منظور ہو گا مگر ان کا نام میں نہیں بتاؤں گا۔ اور اگر آپ کی مہربانی سے مجھے رہائی مل گئی تو میں مگر جا کے انہیں بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ دن سے میں کہاں تھا۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے میرے لیے۔ میں جھوٹ بول کے انہیں مطمئن کروں گا مگر یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ دن سے مجھے پولیس نے پکڑ رکھا تھا۔“

صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے میرے پُرانا انداز گفتگو نے متاثر کیا تھا۔ اگر میرے سامنے قہانہ انجام نہ ہوتا تو میں یہ بھی بتا دیتا کہ مجھ پر کس طرح جسمانی تشدد کیا گیا تھا۔ کچھ پوچھتے اور جانے بغیر میری گتے بغیر۔ اور میں حالات کے تشدد سے ہلاک ہونے والے کی خودکشی کے بارے میں بھی ضرور بتاتا مگر اس کی

دھکی میں بھولا نہیں تھا۔ میرا مقصد اپنا دفاع تھا۔ پولیس کو اپنا دشمن بنانا نہیں۔

اے ایس بی نے کہا "میں نے تمہاری بات سُن لی۔ تمہیں اور کچھ تو نہیں کہتا ہے؟"

"نہیں سر۔ بس آپ مجھے انتہائی کارروائی سے بچالیں۔"

"میرا ایک مشورہ ہے تمہیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا "تم ذہین لڑکے ہو۔ اس ذہانت کو جرم کے لیے مستعمل کر دو۔ ذہین سے ذہین مجرم بھی ایک دن تختہ دار پر نظر آتا ہے یا جیل میں۔ مثلاً چارلس سوہراج۔ کارلوس ممدان خوشگ۔"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں سرکہ میں اس راہ کا مسافر ہی نہیں ہوں۔ میری منزل کچھ اور ہے۔"

"جھوٹ بچ کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ یہ میرا کام ہی نہیں۔ مگر تم کو ہر ایک سے بچنا لینا بیٹھ مگنا پڑے گا۔ تمہارے ساتھ زیادتی اور ظلم ہو گا تب بھی تم اکیلے ساری دنیا سے انتقام نہیں لے سکو گے۔ معاف کرنا اور برداشت کرنا کیونکہ دنیا میں سب تمہارے دوست نہیں ہیں اور سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق نہیں ہو گا۔ وہ ناکلے کر دو دنوں کی طرف بڑھا۔

"مجھے اس کیس میں پھنسا لیا ہے سر۔"

"تو پھر دیکھو کہ اب تمہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم بے گناہ ہو تو عدالت بھی تمہیں چھوڑ دے گی۔"

اے ایس بی اس سے زیادہ واضح الفاظ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے سب معلوم ہے کہ حقیقت کیا ہے مگر اس نے عدالت کی تو قانون کا شکنجہ اپنے ہاتھ میں رکھنے والے مجھے ایسا ثابت کریں گے کہ میں مارا جاؤں گا۔ اسی طرح جیسے آج صبح ایک شخص مارا گیا تھا۔

اے ایس بی تھانہ انچارج کے خلاف رپورٹ نہیں دے سکتا تھا۔ اسے مجھ سے ہمدردی تھی اور شاید اس نے میری بات کا یقین بھی کیا تھا کہ چودہری بشیر کے بیان اور دس گواہوں کے بیانات کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ اس دلدل سے نکلنے کے لیے مجھے خودی کھ کرنا ہو گا۔

اس کے جانتے ہی صورت حال میں ایک بار پھر تبدیلی آئی۔ مجھ سے میرے کپڑے لٹوا لئے گئے اور تھانہ انچارج نے مجھے اپنے کمرے میں مرقا بنا دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ اس نے مار مار کر میری کھال اڑھڑادی۔

"انتقام لے گا اپنے بار کے چچا سے۔ چھانی کے تختے پر پھانسنے کا تو چودہری بشیر صاحب کے بیٹوں کو؟" اس نے مجھ میں پھنکارتے ہوئے کہا "مجھے دشمنی میں پھنسا ہے۔ تمہی قسم۔" اس نے میرے ساتھ اخبار دلوں کو بھی ایک سے ایک غلطی گالی دی۔

وفاؤتاس کا ہاتھ بھی چٹا رہا۔

چھری کی ہر ضرب کے ساتھ میری جھجک جاتی تھی۔ مجھے بیہوش

خانے کے یک چشم صلی کی بیدار آری تھی جسے وہ سولا بٹن کی گھر والی کہتا تھا۔

طاہر پناہ کسی بھانے اندر آیا اور میری گوشالی کے کنارے سے بہت چھوٹا ہوا "سرتی" کیسا بد معاشی کا الزام لگا دیا اس نے مجھ پر تو بہ تو بہ۔"

خواب میں تھانے دار نے کہا کہ اسے وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کہا تھا ورنہ اب اسے الزام کو کچ کر دینا چاہیے۔

"لے جاؤ اس۔۔۔ کو اپنے ساتھ اسی کمرے میں" انچارج نے مجھے ایک لٹ مار کے لٹھکا دیا۔

"چھوڑو گا نہیں سرتی! اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "میں ذرا اس قابل ہو جائے۔"

مجھے حالات کے فرش پر پیچھک دیا گیا۔ اتنی دیر میں اس شر خرابی کے کہیں بدل گئے تھے۔ مجھے تین سے چہرے نظر آئے۔ آجبا ڈاکو فرار ہو گیا تھا۔ بیکار مجھے بد میں معلوم ہوا اس نے اے ایس بی صاحب کے دورے سے فائدہ اٹھایا۔ تھانے کی نفی تو سلائی پیش کرنے اور تھانے کو قاطبی معائنہ بنانے میں مصروف تھی۔ افسر کا کیا بھروسہ۔ انکوائری کر کے آنے اور معائنہ کر جائے۔

تیسرے ڈاکو نے حالات کے باہر والے سنز کو بھانے سے قریب بلا کے روک لیا۔ اس سے راکٹل اور حالات کی چال چلی اور فرار ہو گیا۔ یہ قسمی اسٹوری تھی مگر اس کی شوٹنگ کا شیڈول یقیناً

پہلے سے تیار ہو گا۔ ڈائریکشن کی غلطی کون دیکھتا ہے۔ ڈاکو ایسے ہی "فرار" ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اس واردات کے چشمہ زید گواہ بھی حالات ہی میں تھے اور غالباً انہوں نے ڈاکو صاحب کے ہر کاہ جانے کی دعوت عام کو کھڑے کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔

سنے آنے والوں میں ایک نورمال کے بیٹے اور ایک ستر سال سے زائد عمر کے سفید ریش بوڑھے کو دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کے بدن میں ورثہ تھا اور اس کا سر بھی پتا تھا۔ وہ بے آواز بلند دوبا تھا اور سورہہ یسین کی تلاوت بھی کرتا جاتا تھا۔

ایک خال خالی نے بڑے دکھ کے ساتھ دوسرے کو بتایا "باپے پر الزام ڈال دیا ہے کہ گھر میں کدو کے جوان عورت کی آہر لوت لی۔"

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی "ان کا کیا ہے۔ دو سال کے بیٹے پر بھی الزام لگا دیں۔ بابا سید حاکمڑا ہونے کے قابل نہیں" دیوار سے پچھتاہٹا ہوا ہاتھ میں دم نہیں۔

میں کسی اور کے معاملے میں دلچسپی لینے سے قاصر تھا۔ مجھ پر شدید دباؤ کاغذ تھا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اے ایس بی مجھ کو خابطے کی کارروائی پوری کرنے آیا تھا۔ اس نے میری بات اخذ قانون کی تھی کیونکہ وہ شریف آدمی تھا اور جو کدو شریف آدمی تھا اس لیے مجھے صاف بتا گیا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

جنگل کے بادشاہ کے ظلم کے خلاف خرگوش کی شکایت پر شر کے چڑیا گھر سے ایک فائنڈ پراسن پٹائے باہمی کی اہمیت سمجھانے چلی گئی تھی۔ بشیر دستور جنگل کا بادشاہ تھا۔ جنگل کا قانون بدلا نہیں تھا۔ بدل بھی نہیں سکتا تھا۔ اٹنا اس کی عمل داری شہروں تک پھیل گئی تھی۔

شام سے رات ہو گئی۔ مجھ پر چٹار سے پہلے کا لرزہ طاری ہونے لگا۔ پہلی رات تعارف ہوا تھا۔ اصل تفتیش آج ہو گی۔ تفتیش ہوتی ہے جرم کا سراغ لگانے کے لیے۔ جرم کیا تھا مگر کے بچانے میں نے تفتیش کر کے اس کا سراغ لگایا تھا۔ یہ میرا جرم بن گیا تھا۔

دس بجے کے قریب کسی نے مجھے نام لے کے پکارا۔ میں بڑا دکھ بھرا "رہیں۔۔۔ تو گیا۔۔۔ مجھے پتا تھا تو آئے گا۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مسکرایا "تجاری کا حکم تھا" آتا کیسے نہیں!

میں اپنی ساری اذیت اور ذلت بھول گیا "دوسرے وہ بھی آئی ہے؟"

رہیں نے نفی میں سر ہلایا "کیسے آسکتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ استار کو بھیجا ہے۔ وہ انچارج کے کمرے میں بیٹھا ہے۔ تو اب بالکل گھرمٹ کر انچارج آجائے" پھر تو ہمارے ساتھ چلتا۔

میں سلاخیں پکڑ کر رہیں کے سامنے کھڑا ہو گیا "رہیں۔ وہ کیسی ہے" اس نے کچھ کہا؟

رہیں ہنس پڑا "سالے ذرا اپنی شکل دیکھ اور اپنی حالت دیکھ۔ لگتا ہے ٹھیک ٹھاک خاطر تو واضح ہوئی ہے تمہی۔"

میں نے کہا "میں نے شاید کافون نبردے دیا تھا ایک صحافی کو۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ سات بجے کون کرے۔"

"وہ فون نہ کرتی تو میں کیسے معلوم ہوتا۔"

"کیا بتاؤ تھا اس نے؟"

رہیں نے مسکرت جھلکی "وہی جو اصل بات تھی۔ تو مگر کے چچا کے گھر سے پکڑا گیا تھا۔ اور پکڑنے والا تھا اس کا سالہ۔ کوئی سب انپکچر چودہری بشیر ہے۔ مگر تھانے والوں نے اور بھی کیس ڈال دیے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا وہ سخت فتنے میں تھی پہلے تو کہنے لگی کہ اچھا ہے اس کا داغ درست ہو جائے گا۔ مگر رپورٹان بھی بہت تھی وہ۔"

"اچھا۔۔۔ پریشان تھی سو اچھی؟" میں نے ہنس کے کہا۔

رہیں نے مجھے افسوس کے ساتھ دیکھا "پہلے وہ مجھے بیچ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرے بھی تعلقات ہیں تو تجربے پر پس لگا۔"

"یہ بات اسے بھی معلوم تھی؟"

"پتا نہیں کیسے معلوم تھی۔ میں تو خود یہ بات سُن کے حیران رہ

گیا مگر انکار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ اس نے دس ہزار دیے مجھے کہ یہ ان کتوں کے آگے ڈال دتا۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ پھر شاید اسے شک ہو گیا کہ میں دس ہزار خود بختم کر جاؤں گا۔ تجھے ایسے ہی چھڑا لوں گا۔ بے نا افسوس کی بات؟ میں شاید کے اعتبار کو دھوکا دے سکتا ہوں؟ اور کیا میرے کئے سے پولیس تجھے چھوڑ دیتی۔ میں کیا سب انپکچر چودہری بشیر سے بھی بڑا افسر ہوں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ دس ہزار بھی جاتے اور میں جا کے کتا کہ انہوں نے تجھے نہیں چھوڑا تو شاید جان سے مار ڈالتی تھی کہ حرامی! اتنی آسانی سے دس ہزار نہیں کھانے دوں گی تجھے۔"

میں نے کہا "یاد رہے کوئی بلا تو نہیں ہے۔ کیوں ذرا تپے تو اس سے اتنا۔ اچھی لڑکی ہے وہ۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں جیئے" میرے لیے اچھی ہے کیونکہ دل لایا ہے اس کا تھپہ پر۔"

میں نے خوشی سے ہاتھ دلائے والے دل کی دھڑکن کو دہرایا "اے بیس بیس یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں بھی سمجھتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال بڑی ہے تھہرے مگر دیکھ لے یہ ہو گیا۔ عشق پر زور نہیں تو نہ دیکھی تھی یہ قسم؟"

"نہیں۔"

"ایک بات بتا۔ کیا تجھے بھی محبت ہو گئی ہے اس سے؟"

میں نے خامے غور آہستہ انکار کے ساتھ اعتراف جرم کر لیا "وہ چڑی ایسا ہے یار۔ میں تو دیکھتی ہی رہا وہ ہو گیا تھا۔"

"وہ تو میں بھی ہو گیا تھا اور آج بھی ہوں۔ مگر اس کی نظریں میری اوقات ایک نگار دار تھے جیسی ہے۔ میں اس کی حفاظت کرتا ہوں۔ اس کے سامنے ڈم ہلاتا ہوں۔ اس کے اشارے کا غلام ہوں۔ تو بادشاہ ہے" وہ تجھے چاہتی ہے۔ دیکھ کیسے دس ہزار نکال کے پیچھک دیے تھے۔ لے۔ اور پھر پاپ کو بیچ دیا کہ اسے چھڑا کے لاؤ۔"

"اس کا پاپ کیسے مان گیا؟ کیا کہا اس نے باپ سے؟"

رہیں اور اس ہو گیا "اس نے اپنے باپ سے کچھ نہیں کہا۔"

مجھ سے کہا کہ تو استاد سے بات کر۔ اسے یہ دس ہزار دے اور اپنے ساتھ لے جا چیسے بھی ہو۔ ہاتھ جوڑے کا پاؤں پڑے۔ وہ پوچھے کہ دس ہزار کس کے ہیں تو کتنا میرے دوست کے گھروالوں نے دیے ہیں مگر وہ خود تھانے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ پولیس انہیں بھی بند کرے گی اور دس ہزار بھی رکھ لے گی۔ میں کیا کرتا کرتا جو ہوا اس کا۔ پتا ہے اس وقت میرے دل میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کیا خیال آیا تھا؟"

"میں نے سوچا۔۔۔ شاید سے کوں۔۔۔ میں سب کدوں کا جوڑو کہتی ہے۔ بس ایک بات میری بھی مان لے۔ ایک چھوٹی سی بات ایک بار میرے سینے سے نکل جا۔ مگر یہ بہت بڑی بات تھی۔ میں نے

سوچا کہ اس سے کہوں "ایک بار مجھے پار کرنے دے اپنے کالوں پر آہستہ سے۔۔۔ یہ بھی مشکل تھا۔ آخر میں یہ سوچا میں نے کہ۔۔۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر۔۔۔ چوم لوں۔۔۔ بس ایک بار۔ مگر میری ہمت نہیں بڑی یا "اچھا ہی ہوا۔ ورنہ وہ کتنی کہ دہن ہو جا رہا ہے اور مجھے اپنی کلک مت دکھانا گئے یا وہ استاد سے شکایت کر دیتی اور میں پھر اسے دیکھ بھی نہ پاتا۔۔۔ اسی لیے میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔"

"رہیں!" میں نے اس کے لیے اپنے دل میں بڑا درد محسوس کیا "یہ پاگل ہیں چور زورے اور ہمت ملیں گی تجھے۔" اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "مگر شاید نہیں ہوں گی وہ۔ مگر کیا تو شادی کرے گا اس سے؟"

"شادی! ابھی سے۔۔۔؟" میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

"ابھی نہیں! چار پانچ سال بعد بھی شاید انہی ہی ہوگی۔ سوہن طوے جیسی! آؤں کریم فالوے جیسی۔ دس ملائی جیسی۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں ہنس پڑا "اؤں کے چمٹے بندے! بھوکے۔" حالات کے باہر کھڑا ہوا سنتری یہ گفتگو بڑی دلچسپی سے سُن رہا تھا مگر اس نے ایک بار بھی دخل اندازی نہیں کی۔ عام طور پر وہ ملاقات مختصر کرنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں اور اضافی وقت دینے کی اضافی قیمت وصول کرتے نہیں بھولتے۔ غالباً یہی اس سے پہلے ہی معاملہ طے کر چکا تھا۔

"جی نہیں! یار کب آئیں گے انچارج صاحب! رہیں نے کمزوری دیکھ کر کہا "بادشاہ لوگ ہیں بھائی۔ جب چاہیں جائیں جب چاہیں آئیں۔ نہ آئیں تو ان کی مرضی۔ کھٹ پر لگتے ہیں۔" سنتری نے اچانک کہا "آگئے ہیں انچارج صاحب۔"

اس کا ثبوت چند منٹ بعد میری طبی کی صورت میں ملا۔ ایک کانٹیل مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ رہیں پر آمدنے میں پڑی ہوئی بیچ پر بیٹھ گیا۔ جہاں اور بھی فریادی بیٹھے تھے۔ یہ حالات میں بند قیدیوں کے سمیت زور مزور اقامت تھے جو ان کی رہائی کے لیے یا انہیں "تحقیق" سے بچانے کے لیے اپنی باطل سے بڑھ کر نذرانے پیش کرنا چاہتے تھے۔ کسی کی سنوارش لائے تھے یا اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ انچارج صاحب کے پاؤں پڑے اور ان کے جوتوں کو آنسوؤں سے دھو کر وہ ان کا دل موسم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ عمارت مظاہرے پتھر کی موس نہیں ہو سکتا۔

انچارج صاحب کے دوشن کمرے کی پُربت لٹھائیں آٹھ دس افراد باادب بالاجت ہوشیار بیٹھے تھے۔ جو سات خاصے قاضی پر دوار کے ساتھ گلی کر سوں پر اپنی باری کے منتظر تھے۔ قاتلے دار کے بالکل سامنے صرف دو قوی تھے۔ ان میں سے ایک سب الیکٹر چوہدری شیر کھڑے۔ دوسرا اپنے نیچے سے زمیندار رکش اسٹیلی یا دیر

نظر آتا تھا۔

وہ بیٹالیس سال کا دراز قد اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے اور رنگ سانولہ تھا۔ اس کا قد رے چوڑا اور پٹوے ہوئے کالوں والا چوکلیں شیو تھا۔ وہ بالکل سفید کلف لگے اور بے داغ جینز میں لٹے کی کڑک شلوار قمیض پہ سیاہ مکمل جیسے کپڑے کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس میں سنتری دھاریاں سی جتنی تھیں۔ اس کے سر پر گول قرمزی ٹوپی تھی اور ہاتھ کی کلائی میں پیش قیمت سنتری لٹھی۔

انچارج نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ہوشیار جی! اُٹھالو اپنا بندہ۔" شہابی نے سر کھانکے مجھے دیکھا۔ ایک لمبے کے لیے اس کی اور میری نظر ملی۔ اس کی آنکھوں کے لال دورے بڑے جلاتی تھے۔ میں نے خود کو زور سے محسوس کیا۔ میں کچھ گیا تھا کہ وہ شاید کا پاپ ہے۔

"اس پاگل دے پڑنے ایک بار بھی آپ کا نام نہیں لیا۔ ہم نے تو اس کی چڑی آبادی تھی" انچارج بولا "زبان بے قابو ہے اس کی۔"

چوہدری شیر نے کہا "آگئے آپ کی ذمہ داری ہے شہابی۔ بعد میں اس نے بد معاشی دکھائی کبھی تو بس پھر آپ مت بولنا چ" میں۔

شہابی نے سر ہلایا "زور نہ آگے۔"

میں ان کے قریب چلا گیا۔ شہابی کے اور میرے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

"معافی مانگ اپنے چوہدری صاحب سے۔" شہابی کی فیصلی آواز بڑی بات راہ تھی۔

میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے اندر کے شیلے اڑی ہوئی گردن والے آدمی نے مجھ سے کہا۔ معافی کس بات کی۔ معافی تو ان کو مانگنی چاہیے جو ایک قاتل کو قانون کی دھال سے بچانا چاہتے ہیں۔ انصاف مانگنے والے کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسی وقت میرے تصور میں شاید کچھ آگیا۔ وہ چوہو میں نے ایک رات شہنم سے دھلے گلاب کی طرح نم لٹو اور ترو تازہ مسکا اور دھکا اور دھکا رکھا تھا۔ تو لپے کے ڈیڑھ میں لپٹے گیلے بالوں والا اور پھر کتنی سرسراہی آؤنی زلفوں کے ساتھ۔ اس نے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں میں اداسی بھر کے مجھ سے کہا "مانگ لے معافی۔ میری خاطر کیا جاتا ہے اس میں آخر حیرا۔ اگر انہوں نے تجھے نہ چھوڑا تو مجھ سے کیسے لے گا تو؟"

میں نے کہا "مجھے صاف کوئی چوہدری صاحب!" انچارج نے کہا "پھر پکایا یا کاکالی تو پھر ادھر سے شہابی بھی تیری لاش ہی لے جائیں گے۔"

شہابی کمرے ہو گئے "میں کسی جگہ تک نہ جی۔" رہیں ہمارے باہر آتے ہی سکرٹ بجاکے کھڑا ہو گیا۔ ہم

ایک ساتھ تھانے کے باہر کمری گاڑی تک پہنچے۔ ذرا تیرا پانی سیٹ پر موجود تھا۔ شہابی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"چل پھٹ۔ راست پکڑ اپنا" شہابی نے غرا کے کہا اور دوڑا بند کر لیا۔ گاڑی روم سے آگے بڑھ گئی۔ میں اور رہیں وہیں کھڑے رہ گئے۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لی "تھیک ہو رہیں تو نے حق ادا کر دیا دوستی کا۔ تو نہ ہوا تو میری جان اس عذاب سے نہ چھوٹی۔"

"اب کیا خیال ہے؟" داغ سے بھرت نکلیا نہیں بڈلے کا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "ابھی میں نے ایک جھوٹ بولا تھا میرے استاد سے۔"

"ستار سے جھوٹ بولا تھا کیوں؟" "بس یار۔ مجبوری تھی۔ اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ وہی جھوٹ پھر لال دہن کو دوبارہ کچھ نہیں کروں گا۔ اس کا سالا تھانے دار ہے اس لیے ہر گز اب تو مجھ پر پہلے سے زیادہ قرض ہو گیا ہے اس کا۔ ایک رات اور ایک دن میں نے جو ذلت اٹھائی ہے اور عذاب جھیلنا ہے اس کا حساب کیسے برابر ہو گا۔ مجھے میں آج تک وہ دن نہیں بھولا جب میں نے نامرکی خون آلود گھٹن میں لپٹی ہوئی لاش دیکھی تھی۔ ایسے ہی میں بھول سکتا ہوں وہ وقت جب مجھے تھانے میں جانوروں کی طرح نگار کر کے اور میز پر اٹا لٹا کر میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے اور میں میں کپڑا فٹوٹنے کے مجھ پر ڈھوٹے اور جوتے برساتے گئے تھے؟ آخر کس جرم میں؟"

اس نے میرے کندھے پر چمکی دی۔ "ابھی تو تھنے میں پاگل ہو رہا ہے۔"

"مفتے تو خیر مجھے آہا ہے مگر غصہ اُتر جانے کے بعد بھی یہ سوال تو باقی رہے گا یار کہ کیا ایسا ہونا چاہیے؟ مجرم اور قاتل آزاد اور بے خوف پھریں۔ کوئی ان کی طرف اٹھائے تو زور زبردستی سے اس کی آواز بادی جائے۔ اسے مارا کر انصاف مانگنے سے روک دیا جائے۔ ایسے تو دنیا سے حق اور انصاف ہی ختم ہو جائے۔ قاتل اور مجرم ہمہ جا نہیں گے کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہیں۔"

"جیالار! ابھی وقت نہیں بات کرنے کا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے تو بھی جا کے آرام کر۔"

میں نے کہا "ستاد کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا تو نے۔"

میں کہاں رہتا ہوں گیا کرتا ہوں؟" "میں نے بتایا تھا کہ ماں باپ تو ہیں نہیں! جیم خانے والوں کے ظلم سے شک آگے بھاگ آیا تھا۔ اب کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ جو کامل مل جائے کر لیتا ہے۔ یہاں جگہ مل جائے سو جاتا ہے۔" "شبابش۔ بڑا سیانہ ہو گیا ہے تو۔"

اس نے پھر بھڑکی سانس لی "شہابی نے کہا تھا کہ استاد کو بھی بتاتا ہے۔ مجھ میں اتنی عقل کہاں۔ میں بتاتا کہ کسی ڈاکٹر کے گھر

میں رہتا ہے۔ اس کے بچوں کو پڑھاتا ہے۔" "شہابی واقعی کچھ دار ہے۔ تو ایسا کتنا تو استاد شاید تیرے ساتھ نہ آتا۔ وہ کتنا کہ ڈاکٹر خود چھڑالے گا اسے۔"

میں کتنا چاہتا تھا کہ شہابی کا شہر ادا کر دیا اور اسے بتا دیا کہ دس ہزار جو اس نے میری رہائی کے لیے دیے تھے میں کل ہی ادا کر دوں گا مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ بات رہیں سے کیوں کہوں؟ مجھے خود شہابی کے سامنے جا کے اس کے ہاتھ چوم کے احسان مند کی اور شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔

رہیں کہتا ہے "اس کا دل آگیا ہے مجھ پر۔ آخر ایسی کیا بات ہے مجھ میں۔ مجھے تو خیر وہ ابھی کتنی ہے۔ بہت ابھی کتنی ہے۔ ایک میں ہی کیا رہیں اور میرے جیسے نہ جانے کتنے اس پر مرتے ہیں۔ مگر وہ مجھ پر اتنی مہمان کیوں ہے؟ دس ہزار اس نے یوں پیسہ دے دیے میرے لیے جیسے دس دے دیے صدقہ کعبے ہوں۔ وہ پریشان رہیں میرے لیے۔ اس نے رہیں کے ذریعے باپ کو مجبور کیا کہ مجھے چھڑائے آخر کیوں؟"

میرے دل میں ایک غلطی سی تھی کہ شاید اس میں بھی کوئی راز ہے۔ کوئی بات ہے جو میری کچھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ خوب صورت ہے۔ کچھ دار ہے۔ جسائی طور پر تو ہر عورت ہی مرد کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے مگر وہ بحال عمر میں مجھ سے زیادہ ہے۔ وہ جس کو چاہے اس کو ایک نفرتیں اپنا نظام بنا لے پھر اس کی نظر لے لے بھی یہ کیوں منتخب کیا۔ ضرور کوئی بات ہے۔ خیر جو بات ہوگی ایک دن سامنے آ جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی میں ایک کامی تیار کر چکا تھا جو ان کے لیے قابل تھیں ہو۔ وہ شوک کا فکارتہ ہوں۔ میرے لیے ان کے دل میں ہر دوری کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ میرا طبع اور میری حالت دونوں بہت خراب تھے۔ میں یہ کہہ کے جان نہیں چھڑا سکتا تھا کہ کسی دوست کے گھر رات گزارنے نے ٹھیک کیا تھا کیونکہ وہاں کوئی قریب تھی یا مجھے بخار آ گیا تھا۔ ہر صورت میں ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ تم نے فون کر کے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟

وہ سب واقعی میرے لپٹا ہونے سے پریشان تھے۔ جیم صاحب نے تو کئی بار ڈاکٹر صاحب کو مجبور کیا کہ وہ تھانے جا کے میری کشمکش کی رپورٹ لکھوا لیں مگر ڈاکٹر صاحب کا کتنا تھا کہ تھانے والے صرف چوبیس گھنٹے کی کشمکش کو قاتلی تشویش بات نہیں سمجھتے۔ وہ کہیں کے نوجوان لوترا ہے یا دو رستوں کے ساتھ محکم پھر رہا ہو گا۔ آجائے گا دو چار دن میں۔ آپ کون سے ماں باپ ہیں کہ وہ آپ کی پریشانی کا سوچے۔

میں نے انہیں لمحہ اغوا کی اسٹوری سنائی اور یہ کہہ کر مجھے دو افراد گاڑی میں ڈال کے لے گئے تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اس لیے مجھے کچھ بتا نہیں کہ مجھے کہاں لے جایا گیا

تھا۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹہ چلتی رہی حتیٰ کہ مجھے سرت کا کوئی اندازہ نہیں۔ انہوں نے قید میں رکھ کے مجھے بہت بار اور بار بار کیسے کہے کہ ہماری بہن کہاں ہے؟ تو کیا تھا اپنی بہن کو منکر ساتھ لے جانے کے لیے اور وہ بے وقوف تیری باتوں میں آکے تیرے ساتھ رکشائیں بیٹھ کے چلی گئی تھی۔

”یعنی غلط فہمی میں لے گئے تھے وہ جنہیں کوئی اور سمجھ سکے۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”مگر تو جیسے وہ پاگل کے بچے؟“

”مجھے نہیں معلوم سر۔ میں نے بہت یقین دلایا انہیں، دویا دیا، قسمیں کھائیں مگر وہ ماننے والے نہیں تھے۔ اندھے کرے میں باوجود کے ڈال دیا تھا مجھے اور دن رات گونجتے تھے۔ بھی ایک آجاتا تھا بھی دوسرا۔“

”کم بحث و حاشی“ بیگم صاحبہ نے دکھ میں ڈوب کے روت بھرے لہجے میں کہا۔ ”خاتونوں نے کیا حال کر دیا ہے۔“

”غیر یہ بتاؤ کہ تمہاری جان کیسے چھوٹی؟“

”میرا خیال ہے سرکہ انہیں یقین آگیا۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ اتنی بار کھاکے بھی میں اپنی بات پر اڑا ہوا ہوں تو انہوں نے میرے بارے میں معلوم کیا۔“

”تم نے بتایا ہو گا کہ تم کون ہو تمہارا رشتہ ہو؟“

”وہ تو شروع میں ہی بتا دیا تھا سر۔ میں نے کہا تھا کہ تم فون کر سکتے ہو کیا کسی نے فون کر کے پوچھا تھا؟“

”نہیں۔ فون تو کسی کا بھی نہیں آیا تمہارے لیے“ بیگم صاحبہ نے کہا۔

”پھر وہ خود معلوم کر گئے ہوں گے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے انہوں نے سڑک پر چھوڑ دیا مجھے۔ کتنے گے کہ بھی معاف کرنا غلطی ہو گئی۔“

”غلطی کی اولاد۔“ ڈاکٹر صاحب نے خفگی سے کہا۔ ”چلو جا کے اپنا یہ طیلہ ٹھیک کرو۔ مگر غصہ، پہلے میں دیکھ لوں۔“

جلد پر پڑے ہوئے نشان دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے ”خاصا تشدد ہوا ہے تم پر۔ کہیں وہ پولیس کے لوگ تو نہیں تھے؟ تم نے ان کی باتیں سنی ہوں گی۔ صورت سے بھی پتا چل جاتا ہے ویسے تو۔“

میں نے معصومیت سے جواب دیا ”مجھے پتا نہیں چلا سر۔“

”بالکل پولیس اسٹائل میں چارچ کیا ہے۔ علامات بہت واضح ہیں۔ عام آدمی کسی کو مارا ہے تو تالوں کون سے۔ ڈنڈا استعمال کرے تو شانوں پر اور کمرے اور بھی ضربات نظر آتی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ HURED لوگ ہوں۔“

”کیا مطلب سر؟“

”کسی نے ان کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ چلو خدا کا شکر ادا کرو کہ سب ٹھیک ہے۔ کھانا کھاؤ پھر میں دوا دیتا ہوں۔ کل تک تم فٹ ہو جاؤ گے ہنڈرڈ پر سنٹ۔ یہ نشانات بھی چند دن میں غائب ہو جائیں گے۔ اور دیکھو، تم اپنے لباس کا بالکل خیال نہیں

رکھتے۔ کپڑے اچھے ہونے چاہئیں آدمی کے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ شیخ سعدی کے زمانے سے ایسا ہو رہا ہے۔ وہ کہیں گئے تھے دعوت میں اور مصلحہ قادی قندرانہ۔ کسی نے اندر ہی نہیں جانے دیا۔ دروازے سے ہی فقیر کچھ کے بھاگ دیا۔ وہ لوٹ کے گئے اور اچھے کپڑے پہن کے آئے تو ان کی معزز مہمانوں کی طرح آؤ بگلت ہوئی۔ اس کے بعد وہ کچھ بدبالی ہو گئے اور کھانا اپنے کپڑوں پر ڈالنے لگے کہ عزت میری نہیں، ان کپڑوں کی ہے۔ تو آج بھی ایسا ہی ہے۔ پہلے سے آدمی کی شناخت ہے۔ شریف اور مذہب آدمی صورت سے نہیں، لباس سے نظر آتا ہے۔ دو چار پنٹ شرٹ لو اچھے سے۔ پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔“

یہ سب گفتگو انہوں نے میرا تفصیلی معائنہ کرتے ہوئے یعنی دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار، بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرتے ہوئے کی۔ کھانے کے بعد مجھے ایک انجکشن دیا اور دو گولیاں کھائیں۔ ایک ملازم سے کہا کہ میرے جسم پر ایک لوشن لے۔ ملازم ابھی بالٹل کرسی پر کھاکر میں سو گیا اور باہر گھٹنے تک سوتا رہا۔

جب میں اٹھا تو میری حالت میں حیرت انگیز انقلاب آچکا تھا۔ فضل کے بعد میں نے ذہل بتا دیا تو میں خود کو ہارن کا سلا محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ابھی جا کے سب انجیکٹر چوہدری بشیر، اس کے سہیلی اور تھانے کے عملے کو دنگل کے لیے لگا دوں اور سلطان راہی کی طرح کشتوں کے پٹے لگا دوں مگر اس قسم کے خیالات محض ایک نفسیاتی دواؤں کا نتیجہ تھے۔ آدرو سے بے فکرت آدرو مطلب مجھے۔

گزشتہ شب بیگم صاحبہ کو مجھ سے زنانہ تجسس آمیز گفتگوئی سوالات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب انہوں نے کریڈ کر انگو اکرنے والوں کی شکل و صورت، لباس، ہیرا سناں کے ان کے حسب و نسب تک ہر چیز کے بارے میں ایسے سوالات کیے کہ مجھے بڑی سمارت سے سوچ بچھ کے جھوٹ بولنا پڑا۔ درمیان میں بیگم صاحبہ نے انہیں مناسب کوسٹوں اور زنانہ لفت کی چیدہ چیدہ گالیاں سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر صاحب جاتے ہوئے بیگم کو تاکید کر گئے تھے کہ مجھے دوا کھادیں، اکیلا کہیں نہ جانے دیں اور میری حالت اس قابل ہو تو مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اچھے شرفانہ کپڑے دلا دیں۔ یہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا ازالہ کرنے کی ہمدردانہ کوشش تھی اور ان کی شرفانہ فراخ دلی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میرا ذوق لباس کتنا عامیانا تھا۔ جو کپڑے میں پہن کر آتا تھا بیگم صاحبہ اسے ہانک بھوں چڑھاکے اور ”چیپ“ کہہ کے مسخرہ قرار دیتی تھیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی چوڑائی سے سب کچھ لیا اور اسے میری پسند قرار دے کر خوش ہوئیں مگر اپنے کمرے میں آکے میں نے وہ کپڑے جو تھے پہنے تو آئینے میں خود کو دیکھ کے میں بھی حیران رہ گیا۔

کسی خیم خانے میں خیرات پر پٹے والا اور خیرات میں ملنے والے کپڑے پسند والے کا کیا TASTE ہو سکتا تھا۔ وہ جس کلاس میں رہتا ہے اس کی پسند کا میار بھی اسی کی عکاسی کرتا ہے۔ معاشرے میں پھلا، پھلا متوسط، متوسط اور اعلیٰ طبقے کے اپنے اپنے کیس کیس ہیں جو ان کے رویے میں جتنی نہیں لباس میں بھی واضح نظر آتے ہیں۔

میں اچانک نپٹے طبقے سے اعلیٰ طبقے میں شامل ہو گیا تھا۔ جیسے انتہائی ذہین بچہ ایک کے بجائے دو کلاس میں چپ کر جائے۔ میں بھی درمیان کے دو طبقوں کی معاشی، سماجی اور اخلاقی سوچ اور ہمدردی کے دور پر سے ملانی اور کر گیا تھا۔ عام لوگ کامیابی کی ایک ایک منزل طے کر کے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور نصیب یا دھرتی اپنے آباؤ اجداد کے نفرت انگیز، قابلِ شرم اور افلاس زدہ ماضی کے آسیب سے بچنا پھرانے میں ان کی ایک دو سلیس مکرر جاتی ہیں۔

مجھے فرسٹ کی کرسی سے عرش کی بلندی تک ڈائریکٹ خلافت مل گئی تھی۔

شام کو مجھے خواہش کے باوجود بار جانے کی اجازت نہیں ملی۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ مجھے کم سے کم تین دن آرام کرنا چاہیے۔ رات کو ڈاکٹر صاحب نے نظر بندی کی معیار ایک ہفتے کر دی۔ ان کے نزدیک تو میرا اکیلا بار جانے ایک غیر قابلِ مذاق فعل تھا۔

”پھر اٹھالے جانے کا کوئی؟“ انہوں نے فرمایا ”تم نہیں جانتے ان مجرموں کی نفسیات کو۔ ایک بار غلطی میں میں پکڑ لیا تھا مگر کیا پادہ غلط فہمی تھی یا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ تمہاری سماجی حیثیت کیا ہے اور تمہیں بچانے والے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اب وہ تمہیں کوان کے لیے بھی لے جاسکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ تم ڈاکٹر مشہور کے ساتھ رہتے ہو۔“

میں نے ایوی سے کہا ”لیکن سر۔ ایسے میں کب تک قید میں رہوں گا۔“

”الاحول دلا قوت۔ اس مگر کو قید خانہ سمجھتے ہو تم؟“

میں نے کہا ”سواری سر۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔“

”تم ہمارے ساتھ چلو۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ۔ ڈرامیور کو لے جاؤ۔ اس کے پاس گن ہوئی ہے۔“

”دور میری ٹوش!“

وہ مجھ کے ”چھوڑ دو۔ لفت سمجھ دو ہزار روپے ہانڈ کی ٹوشن پر۔ کسی چیز کی ہے تمہیں؟“ ہے تو تارا!

”کی کچھ نہیں سر۔“

”تم بس تعلیم میں دل لگاؤ۔ میٹرک کرو۔ میں انٹر سائنس میں داخلہ دلا دوں گا تمہیں۔ نمبر تمہارے اتنے ہی ہوں گے دو سال بعد میڈیکل کالج“ انہوں نے دوبارہ اپنی پرانی خواہش کی تفصیلات کا اعلان کیا جس کے مطابق وہ مجھے ڈاکٹر اور پھر ایک اسپیشلسٹ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں شادو سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میرا اس سے ملنا ہی بھی ضروری تھا کہ اس کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے خود غرض، مطلب پرست اور کینڈ سمجھے۔ اس نے جو کچھ میرے لیے کیا تھا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کے اس سے اپنے جذبات کی زبان میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مجھے رسی انداز میں اس سے فون پر تنیک یو کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔

دوسرے دن یہ ممکن ہی نہ رہا کہ میں شام کا وقت گھر میں اُدھر سے اُدھر بے مقصد پھرتے گزاردوں۔ بیگم صاحبہ سے میری یہ اضطرابی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے ناصر! بہت بے چین ہو رہے ہو۔ کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا کیا؟“ انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں نے جھپٹ کر کہا ”نہیں بیگم صاحبہ!“

”بھئی تیار تو ایسی ہی ہے اور لگ بھگ بھی بہت اسرار رہے ہو تم۔ دیرالت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔“ وہ شرفی سے اُس پر دس ”باشاء اللہ“ قہر قدیمی خوب نکالا ہے تم نے۔“

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حُسن کی تعریف کر چکا تھا۔ انہیں یقین

میں نے جھپٹ کر کہا ”نہیں بیگم صاحبہ!“

”بھئی تیار تو ایسی ہی ہے اور لگ بھگ بھی بہت اسرار رہے ہو تم۔ دیرالت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔“ وہ شرفی سے اُس پر دس ”باشاء اللہ“ قہر قدیمی خوب نکالا ہے تم نے۔“

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حُسن کی تعریف کر چکا تھا۔ انہیں یقین

میں نے جھپٹ کر کہا ”نہیں بیگم صاحبہ!“

”بھئی تیار تو ایسی ہی ہے اور لگ بھگ بھی بہت اسرار رہے ہو تم۔ دیرالت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔“ وہ شرفی سے اُس پر دس ”باشاء اللہ“ قہر قدیمی خوب نکالا ہے تم نے۔“

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حُسن کی تعریف کر چکا تھا۔ انہیں یقین

میں نے جھپٹ کر کہا ”نہیں بیگم صاحبہ!“

”بھئی تیار تو ایسی ہی ہے اور لگ بھگ بھی بہت اسرار رہے ہو تم۔ دیرالت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔“ وہ شرفی سے اُس پر دس ”باشاء اللہ“ قہر قدیمی خوب نکالا ہے تم نے۔“

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حُسن کی تعریف کر چکا تھا۔ انہیں یقین

میں نے جھپٹ کر کہا ”نہیں بیگم صاحبہ!“

”بھئی تیار تو ایسی ہی ہے اور لگ بھگ بھی بہت اسرار رہے ہو تم۔ دیرالت میں ہوتے تو تم سے ڈیٹ لینے والی لڑکیوں کی لائن بڑی لمبی ہوتی۔“ وہ شرفی سے اُس پر دس ”باشاء اللہ“ قہر قدیمی خوب نکالا ہے تم نے۔“

پہلے کئی بار میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے اور کچھ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ان کے حُسن کی تعریف کر چکا تھا۔ انہیں یقین

دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ تھوڑا سا وزن کم کر لیں تو کھانا
بہرہ کن سے کم نہیں۔ انہوں نے اس کے بعد اپنا وزن خاصاً کم کر لیا
تھا۔ ڈاکٹر صاحب شریف آدمی تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے
مگر ان کی مصروفیت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ پہلے
کی طرح بیوی کو پوری توجہ دے سکیں۔ بیوی کے سنے لباس پر غور
کر سکیں یا اس کے بیڑا مسائل کی تعریف کر سکیں۔
دل سے آپ کتنی بھی محبت کیوں نہ کرتے ہوں مگر زبان سے
جذبات کا اظہار ایک عملی ضرورت ہے۔ ہر مصوف شوہر کی بیوی
بھی خوش اور مطمئن رہ سکتی ہے اگر شوہر اسے کبھی کا دبا کی طرح
ایک ذلت داری سمجھتے ہوئے جتنے میں یا دس دن میں ایک بار اس
کے کسی انداز حسن پر تعریف کا ایک جملہ خرچ کر دے۔ یا کبھی
کبھار اسے کوئی تحفہ دواہد اور ایک پھول ہی کیوں نہ ہو، جذباتی
ڈائلاگ کے ساتھ پیش کر دے۔ آخر وہ گھر سے باہر بھی تو اچھی
خاص اداکاری کرتے ہیں۔ اس سے چاہے جانے کی خواہش کا وہ
ظہور ہو رہا تو رہتا ہے جو سبک دوز کے انبار سے پڑ نہیں ہو سکتا۔
ہیگم صاحب نے کہا ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“
میں چونک پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کبھی بھی نہیں دیکھ رہا تھا
مثلاً یہ کہ ان کا لباس کیسا ہے۔ کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔ اور
جہاں نہیں ہے وہاں نظر کو کہاں تک دیکھنا چاہیے اور کیا نہیں
دیکھنا چاہیے۔ جب انہوں نے احساس دلایا تو میں کچ جچ چور بن
گیا۔

میرا چہ اس سے سنسنی خیز تجربے سے متاثر ہو گیا ”جی... کچھ
نہیں۔“
انہوں نے اپنی کامیابی پر جیسے ہوئے آنچل سنبالا۔ ”اچھا
دل بہت چاہ رہا ہے تو جاؤ کہیں گھوم آؤ۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے
آنے سے پہلے لوٹ آنا ورنہ پریشانی ہے۔“
میں نے مسکرائے کہا ”میں آ جاؤں گا۔“ حالانکہ میں بہت
اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔
”سنو تو سنی۔ جاؤ گے کیسے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ کہیں
جانا ہو تو گاڑی میں جانا۔“
میں رُک گیا ”لیکن اس وقت ڈرائیور کہاں ہے؟“
”پھر میں چلوں تمہارے ساتھ؟“ انہوں نے کہا۔
میں گھبرا گیا ”جی... سنی نہیں۔ آپ گھر مت کریں۔ میں
چلا جاؤں گا۔“
”گاڑی تم چلا لیتے ہو نا؟“
ان کے بیٹے نے اندر سے نمودار ہو کے کہا ”آئی سر نے
ڈرائیور سے سیکھی ہے۔“
لڑکی نے اس کی تائید کی ”ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ بہت اچھی
چلاتے ہیں۔“
لڑکے نے اسے دیکھ کے آنکھیں نکالیں ”تم نے نہیں دیکھا

کیا؟ اس دن ہم گئے تھے آئس کریم کھانے، تو کس نے چلائی تھی
گاڑی؟“
ہیگم صاحب مسکرائے لکھیں ”جو بھی، اب تو سفارشی گواہ بھی
مل گئے۔ تم گاڑی لے جاؤ۔ مطمئن ہے نا چلائی کہاں رہی ہے؟“
جب میں ان کی جھولی کی گاڑی..... میں نکلا تو یہ مجھے پورا
عجب لگا۔ میرے پاؤں میں بہترین جاگڑ تھے۔ میں نے بہت اعلیٰ
جینز پہن رکھی تھی اور میری نئی دھاریوں والی شرٹ بھی
اچھوتی تھی۔ اور میں خود ایک کار چلا رہا تھا۔
صرف چوبیس گھنٹے پہلے میں حوالات کے فرش پر نمونہ مہرت
پا پڑا تھا۔ عام اعلیٰ تجربوں کے ساتھ ذلت و رسوائی میرا مقدور
تھی اور شدید پاداش کی حالت میں مجھے اپنا مستقبل دیکھنا ہی سہی
کی موت نظر آتا تھا جو مجھ سے پہلے والے ناصر عظیم کو نصیب ہوئی
تھی۔ وہ وقت بھی اتنا پیچھے نہیں تھا کہ میں پلٹ کر اس لڑکے کو نہ
دیکھ سکوں جو جیم خانے میں ٹخوں سے اڑھکی ”میلی“ بعض اوقات
پہنی ہوئی شوار کے ساتھ کوئی بے جہم کرتے گلے میں ڈالے پھرتا
تھا۔ کسی بھی رنگ اور سائز کا۔ کبھی بہت اونچا تو کبھی بہت نیچا۔
کبھی اس میں بنی نہیں ہوتے تھے تو وہ گریبان چاک بھرتا تھا یا خود
اس میں بنی ہوا تھا نظر آتا تھا۔ اس کے پیچوں میں باریا کی حرمت
شدہ ہوائی چل ہوتی تھی اور وہ جیم خانے کی رسید بک لیے دور در
چندہ جگہ کرنا پھرتا تھا۔
اس وقت میرے سر میں شواہد کی کاغذی تھیم خانے سے
نکلے ہی تھے۔ ہر خوش ختی کے سارے دور مکمل گئے تھے۔ میں ایک
معزز خاندان کے فرد کی طرح کوٹھی میں رہتا تھا اور اس وقت دیکھنے
میں بھی انہی کے ماحول کا پورہ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے صبح
فرمایا تھا۔ آدمی کی شخصیت اس کے لباس سے نظر آتی ہے۔ وہی
سی کمر کار نے پوری کردی تھی۔ ہیگم صاحب کا اچھا بھلا پیرانا
مہیاں ہو جانا میرے لیے ناقابل فہم تھا کہ مجھے اس کا خیال نہیں
تھا۔ میں شادو سے ملے جا رہا تھا۔ شادو میری اب تک گزرنے والی
زندگی کا سب سے حسین احساس تھی۔ سب سے زیادہ کھیاں کو
آبادی دینے والا ستارہ تھی جو میری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوا
تھا۔
میں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اور میرا تصور مجھ سے آگے
ر تھاں تھا۔ میں نے فرض کیا کہ اس وقت کی خوشی کے حساب سے
میں دنیا کا سب سے دولت مند شخص ہوں۔ اور میری ہر چیز
تعلق ہے کہ میں شادو کو اپنے ساتھ بھاگے چاہوں کہ یہ عوی رنگ
رکھنے والی نازک اور ابلیلی سی کارڈن کھولا بن جائے تو یہ ہو سکتا
ہے۔ میں نکلتاں تک اس کے قرب کی خوشبو کے ساتھ پرواز
کر سکتا ہوں۔
میں نے کار کو بڑے اعتماد کے ساتھ کوٹھی کے اندر لے جا کر
روکا۔ پھر دو اڑھویں بند کیا جیسے یہ میری ذاتی کار تھی اور کار تو میں

نے آنکھیں کھولتے ہی دیکھی تھی جب بااڈر نیوٹک کرتے ہوئے
ماں کو محبت سے دیکھ رہے تھے اور ماں شرف کے سب سے بڑے میزبان
ہوئے تھے مجھے اپنے ساتھ لاتے ہوئے مجھ پر بڑی پرغا فرماتا بھری
نظریں ڈال رہی تھیں۔ میرا داغ خراب ہو رہا تھا۔
میں کی جین کو ایک انگلی میں پکھٹا، ”میلی“ جہاں میڑیاں چڑھ
گیا۔ اس اعتماد کے ساتھ جیسے یہ میری سرسرا ہے۔ میں پہلے
کمرے سے گزرا اور دروازے میں پہنچ کر ایک دم رُک گیا۔
کمرہ اس کے وجود کی لطافت اور ملک سے رشک گشتاں بنا
ہوا تھا۔ وہ گل بدین گل پیریں ہمسرہ رشتائی بھاری کھڑی تھی۔ یوں
جیسے اس کی ہر سانس میرے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہی تھی۔
میں چند لمحوں کو سورا کھڑا پھر مگر اس کے آگے بڑھا۔
شادو ایک قدم پیچھے ہٹے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں
غیرت اور بے رحمی آئی ”کیوں آیا ہے تو یہاں؟“
اس کے لیے میں نفرت کی کات تھی جس نے مجھے مدد سے
سے نکل کر دیا تھا ”میں..... تیرا شہر یہ ادا کرنے آیا تھا۔“
”شہر کے لیے۔“ نکل جا، اسی وقت دغ ہو جا۔“ اس نے
نفرت سے معمور آنکھیں لہجے میں کہا ”میں تیری صورت دیکھنا
نہیں چاہتی۔“
میری سرسستی اور غور کی فلک بوس عمارت پر نیوٹک خاک
ہو گئی۔ اپنی شواہد کے ساتھ بادلوں میں پرواز کرنے والا شواہد
کھانا گندے پتھر سے بھرے جو ہر میں منہ کے بل گرا جس میں
زہریلے سانپ گھلا رہے تھے۔
میں نے بڑی مشکل سے کہا ”شادو..... میری بات تو سن لو۔“
”مغیرا جو اپنی زبان سے میرا نام بھی لیا۔“ وہ چلائی۔
میں نے سوچا کہ اگلے قدم لوٹ جاؤں مگر یہ بھی میرے اختیار
میں نہ تھا۔

○☆☆○

جیم کو اپنے مقابل دیکھ کے میں نے سوچا تھا کہ میں اگلے قدم
لوٹ جاؤں۔ مگر یہ بھی میرے اختیار میں نہ تھا۔ تصور میرے ساتھ
تھا اور مجھ پر ایک نہیں دس دنوں پر روز کی آنکھیں اور کمرے
تو کس تھے۔ اگر میں ذرا بھی بد عوامی کا مظاہرہ کرتا تو یہ اگلے دن
کے اخبارات کی ایک دلچسپ اور پُر لطف خبر بنتی۔
وہ سب جو میں نے جیم کے ساتھ کیا تھا اور وہ جو جیم نے
میرے لیے کیا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی۔ ایک ضرورت کے تحت
میں نے اس کا جذباتی استحصال کیا تھا اور جب اس نے اپنی آنکھوں
میں آنے والی رات کے لیے خوب صورت خواب سجائے تھے تو
میں انتہائی کینکھی کے ساتھ اسے جکڑ دے کر فرار ہو گیا تھا۔ اس
کو عزم رازینا کے لیے غلطی کی تھی اور مجھے اس کا کھانا ادا کرنا
تھا۔
جیم کے لیے میں نے ملامت تھی نہ دکھ کا اظہار تھا۔ نہ

شکایت تھی اور نہ غصہ تھا۔ اس نے پات لہجے میں کہا ”کیا حال
ہے شادو عالم صاحب؟“
میں نے بڑی خوشی اور حیرانی کا اظہار کیا ”میرے تمہ۔ جیم“
جیسے کبھی پہلے کیا۔
اس نے کہا ”مجھے... ہاں... مجھے پہلے جمل کیا تھا۔ بتایا کسی نے
نہیں مگر۔“
جیم کے شادو عالم سے جذباتی تعلق کی شہرت میں اب کوئی
بدنامی یا ایکٹیل کا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کے سامنے خود اپنے
بے طرفہ عشق کی رسوائی کو اپنے لیے باعث افتخار قرار دیتی تھی۔
ظاہر ہے اس کے بند کی کے کچھ بھی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا
تھا۔
اس کے باوجود جیم کے ناکام رہنا مراد عشاق، جن کی تعداد
خاص لمبی تھی، بلے دل کے پھپھوے پھوڑے کا کوئی موقع نہ ہوتا
نہیں تھا۔ نہ سی واصل تو حسرت سی سی۔
کسی نے آواز لگائی ”ہاں جی، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“
کسی نے پیچھے سے گرہ لگائی ”ہاں یار۔ ٹیلی فون کی اطلاع بعد
میں آتی ہے۔ ٹیلی فونی سے پہلے پہل جا تا ہے۔“
میں نے بے حد عیاری اور سیاسی شائستگی سے کام لیا ”کچھ بدلی
ہوئی لگ رہی ہو شاید بہت دن بعد دیکھا ہے اس لیے۔“
اس نے کہا ”مگر آپ بالکل نہیں بدلے۔ دیکھتے ہی جی چھے
کل تھے۔“
کل سے اس کی مراد واقعی گزرا ہوا دن تھا مگر دوسروں نے
اسے ماضی قریب کا حال سمجھا۔ میں نے اس کا وار غالی کرتے
ہوئے سب سے مخاطب ہو کے کہا ”اگے کیڈز اینڈ جینٹلمین، ابھی
کچھ دیر بعد آپ سب سے ہوئی میں ملاقات ہوئی۔ تب تک آپ
لوگ لابی میں تشریف رکھیں۔ چائے پکے، آپ میرے مہمان
ہیں۔“
میں نے رخشہ کا بازو بڑے دھانک انساں میں بے باکی
سے تھام لیا اور دوڑنے کی طرف بڑھا۔ اس پوز کو بھی چند فوٹو
گرافرز نے محفوظ کر لیا۔ رشتی کے لیے میرا ساتھ دینا ایک مجبوری
بن گیا تھا۔ یہ کام دو بادل ناخواست اور خاص بدلی کے ساتھ کر رہی
تھی۔ اس کے رویے میں خوشی کا شائبہ تک نہ تھا حالانکہ ہر بیوی
اتنا عرصہ ملک سے باہر رہنے والے شوہر کی دانہ پری کو شش کر کے
ضرور مسکراتی ہے۔ رشتی کا چہو پات تھا اور آنکھوں سے
بیڑاری عیاں تھی۔
لاؤنج سے ان پورٹ ہوئی کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ تیمور کی
جھنڈے والی گاڑی گیٹ کے مین سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ تیمور نے
ڈرائیور تک سیٹ سنبھالی تو میں پچھلی سیٹ پر رشتی کے ساتھ بیٹھ گیا۔
میں نے گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کہا ”رشتی۔ تمہارا رویہ
سب کے سامنے بالکل نامناسب تھا۔“

اس نے توجہ نہ دیا کہ اس کی بات کی سی ہی تھی۔
 "کیا مجھے رہیہ کرتے ہوئے تمہیں خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے؟"

"خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کیا قہقیرے لگائی۔ بے اختیار لپٹ جاتی تھی۔ کوئی وجہ بھی ہو خوش ہونے کی۔"
 میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ میں شوہر ہوں تمہارا۔ اور تم میرا استقبال کرنے کے لیے آئی ہو۔"
 اس نے بے دردی سے کہا "میں نہیں آئی، تم لائے تھے مجھے۔ اگر شوہر کا خیال نہ ہوتا تو میں اس ڈرائے میں بٹھتی نہ لیتی۔ معلوم نہیں تم کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔ مجھے شروع میں ہی انکار کر دینا چاہیے تھا کہ تم جو مداری کا ٹھیل دکھا رہے ہو اس میں مجھے ڈنڈ کی طرح استعمال مت کرو۔"
 "جب تک تم میری بیوی ہو تمہیں میرا ساتھ نبھانا پڑے گا۔"

"ساتھ ہی بھاری ہوں ورنہ میرا دل کتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی بات ایسی ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہے ہو۔ جتنا نظر آتا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک معاملہ ہے۔"

"خطرناک معاملہ تو ہے۔"
 "عالی۔ سچ بتاؤ محمود راز کو تم نے قتل کیا ہے؟" وہ بولی۔
 "فرض کرو کیا ہے؟" پھر... وہ دشمن تھا میرا۔ اس سے میرے مستقبل کو اور میری زندگی کو خطرات لاحق تھے۔ اور۔۔۔"

"یہ فرض کرنے کی کیا امت لگاؤ۔ تم نے قتل کیا تھا اسے یا نہیں؟"

"تم کیوں اقرار جرم کروانے پر اتنی مصر ہو؟" میں نے ہلکے سے کہا۔
 "میں صرف سچ جانتا جاہلی ہوں اور یہ میرا حق ہے۔ میں بیوی ہوں تمہاری اور تمہارا ساتھ بہر حال دے رہی ہوں۔" وہ بھی تیز ہو کے بولی۔

"کیا سمجھتی ہو؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"عالی یہ جھوٹ ہے یا سچ؟"

میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا نفسیاتی مسئلہ ہیث کے لیے ختم کر دوں۔ وہ کسی طرح بھی میری بے گناہی پر اعتبار کرنے والی نہیں تھی۔ کسی ثبوت یا شہادت سے قائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور دلائل سے اس کا یقین حتمی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی محمود راز کا قاتل ہوں پھر انکار سے کیا حاصل۔ اس کے سامنے اعتراف جرم سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ پھر میں کیوں بڑی کا مظاہرہ کروں۔ شاہ عالم کا اصل کردار اس کی بیوی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا تھا۔

میں نے کہا "محمود راز کو قتل کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔" "یعنی تمہارے ہونے ہو کہ تم ہی اس کے قاتل ہو؟"

میں نے غرا کے کہا "ہاں جانتا ہوں" اب کیا لکھ کے دے دوں؟

اس نے بڑے سکون سے کہا "عالی۔ یہ جھوٹ ہے۔" میں بھونچا ہوا گیا "یہ بھی جھوٹ ہے؟"

"ہاں۔ تم خود کچھ نہیں کرسکتے۔ اور کیا ضرورت ہے تمہیں خود کوئی کام کرنے کی جب کہ تمہارے پاس حکم کے ظالموں کی کمی نہیں۔ تم تو کبھی نہیں دیتے۔ بس اٹھا کر دے اور کھینچنے والے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ تمہارے پاس پیشہ ور قاتلوں کی فوج ہے جس کے کاغذ ایکٹ ایمر تیسور صاحب ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تم نے خود یہ کام کیا ہو گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس میں قصور تمہاری سمجھ دانی کا ہے۔" "تم سمجھاؤ مجھے کہ اتنا لبا پکڑ کیوں چلایا تم نے۔ تم یہاں تھے مگر تم نے خود کو ملک سے باہر نکال دیا۔ وہاں کوئی تم بیٹھا تھا۔ جو تمہارے لیے اور آواز میں مجھ سے بھی بات کرتا رہا۔ ایسا کوئی مل گیا تھا۔ جس میں جو شاہ عالم کا دواں شاہ عالم کی طرح کر سکتا تھا۔ دنیا کی بات چھوڑ دو۔ میں نے اس سے کئی بار فون پر بات کی تو میں فرق محسوس نہ کر سکی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت تم سے دشمن بن کے بات کرتی رہے اور تم اس کی کسی بات سے اندازہ نہ کر سکو کہ وہ دشمن نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو صرف شاہ عالم میرا شوہر کر سکتا تھا، کوئی اجنبی نہیں جو یہ بدل نبھاتا ہو۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تم یہاں تھے۔ میں جتنا اس بارے میں سوچتی ہوں اتنی میرا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔"

میں نے جس کے کہا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ دماغ کو مزید خرابی سے بچاؤ۔ جتنا خراب ہو سکتا تھا ہو گیا۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی کیونکہ گاڑی ہوٹل کے پورچ میں پہنچنے کے رک گئی تھی۔ امیر تیسور نے میری اور رخشہ کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا حالانکہ ہم کوئی نئی قیمت کی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ ایک بار دشمن نے تیسور کا نام بھی لیا مگر اس پر بھی تیسور خاموش رہا تھا۔

میں نے کہا "محمود راز کو قتل کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔" "یعنی تمہارے ہونے ہو کہ تم ہی اس کے قاتل ہو؟"

میں نے غرا کے کہا "ہاں جانتا ہوں" اب کیا لکھ کے دے دوں؟

اس نے بڑے سکون سے کہا "عالی۔ یہ جھوٹ ہے۔" میں بھونچا ہوا گیا "یہ بھی جھوٹ ہے؟"

"ہاں۔ تم خود کچھ نہیں کرسکتے۔ اور کیا ضرورت ہے تمہیں خود کوئی کام کرنے کی جب کہ تمہارے پاس حکم کے ظالموں کی کمی نہیں۔ تم تو کبھی نہیں دیتے۔ بس اٹھا کر دے اور کھینچنے والے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ تمہارے پاس پیشہ ور قاتلوں کی فوج ہے جس کے کاغذ ایکٹ ایمر تیسور صاحب ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تم نے خود یہ کام کیا ہو گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس میں قصور تمہاری سمجھ دانی کا ہے۔" "تم سمجھاؤ مجھے کہ اتنا لبا پکڑ کیوں چلایا تم نے۔ تم یہاں تھے مگر تم نے خود کو ملک سے باہر نکال دیا۔ وہاں کوئی تم بیٹھا تھا۔ جو تمہارے لیے اور آواز میں مجھ سے بھی بات کرتا رہا۔ ایسا کوئی مل گیا تھا۔ جس میں جو شاہ عالم کا دواں شاہ عالم کی طرح کر سکتا تھا۔ دنیا کی بات چھوڑ دو۔ میں نے اس سے کئی بار فون پر بات کی تو میں فرق محسوس نہ کر سکی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت تم سے دشمن بن کے بات کرتی رہے اور تم اس کی کسی بات سے اندازہ نہ کر سکو کہ وہ دشمن نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو صرف شاہ عالم میرا شوہر کر سکتا تھا، کوئی اجنبی نہیں جو یہ بدل نبھاتا ہو۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تم یہاں تھے۔ میں جتنا اس بارے میں سوچتی ہوں اتنی میرا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔"

میں نے جس کے کہا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ دماغ کو مزید خرابی سے بچاؤ۔ جتنا خراب ہو سکتا تھا ہو گیا۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی کیونکہ گاڑی ہوٹل کے پورچ میں پہنچنے کے رک گئی تھی۔ امیر تیسور نے میری اور رخشہ کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا حالانکہ ہم کوئی نئی قیمت کی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ ایک بار دشمن نے تیسور کا نام بھی لیا مگر اس پر بھی تیسور خاموش رہا تھا۔

میں نے کہا "محمود راز کو قتل کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔" "یعنی تمہارے ہونے ہو کہ تم ہی اس کے قاتل ہو؟"

میں نے غرا کے کہا "ہاں جانتا ہوں" اب کیا لکھ کے دے دوں؟

اس نے بڑے سکون سے کہا "عالی۔ یہ جھوٹ ہے۔" میں بھونچا ہوا گیا "یہ بھی جھوٹ ہے؟"

"ہاں۔ تم خود کچھ نہیں کرسکتے۔ اور کیا ضرورت ہے تمہیں خود کوئی کام کرنے کی جب کہ تمہارے پاس حکم کے ظالموں کی کمی نہیں۔ تم تو کبھی نہیں دیتے۔ بس اٹھا کر دے اور کھینچنے والے اس کا مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ تمہارے پاس پیشہ ور قاتلوں کی فوج ہے جس کے کاغذ ایکٹ ایمر تیسور صاحب ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تم نے خود یہ کام کیا ہو گا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس میں قصور تمہاری سمجھ دانی کا ہے۔" "تم سمجھاؤ مجھے کہ اتنا لبا پکڑ کیوں چلایا تم نے۔ تم یہاں تھے مگر تم نے خود کو ملک سے باہر نکال دیا۔ وہاں کوئی تم بیٹھا تھا۔ جو تمہارے لیے اور آواز میں مجھ سے بھی بات کرتا رہا۔ ایسا کوئی مل گیا تھا۔ جس میں جو شاہ عالم کا دواں شاہ عالم کی طرح کر سکتا تھا۔ دنیا کی بات چھوڑ دو۔ میں نے اس سے کئی بار فون پر بات کی تو میں فرق محسوس نہ کر سکی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت تم سے دشمن بن کے بات کرتی رہے اور تم اس کی کسی بات سے اندازہ نہ کر سکو کہ وہ دشمن نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو صرف شاہ عالم میرا شوہر کر سکتا تھا، کوئی اجنبی نہیں جو یہ بدل نبھاتا ہو۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تم یہاں تھے۔ میں جتنا اس بارے میں سوچتی ہوں اتنی میرا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔"

میں نے جس کے کہا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ دماغ کو مزید خرابی سے بچاؤ۔ جتنا خراب ہو سکتا تھا ہو گیا۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی مگر خاموش ہو گئی کیونکہ گاڑی ہوٹل کے پورچ میں پہنچنے کے رک گئی تھی۔ امیر تیسور نے میری اور رخشہ کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا حالانکہ ہم کوئی نئی قیمت کی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ ایک بار دشمن نے تیسور کا نام بھی لیا مگر اس پر بھی تیسور خاموش رہا تھا۔

اس نے سب کچھ دیکھا اور سنا تھا۔ مطمئن ہوئے بغیر وہ خاموش ہونے والی نہیں تھی۔

اس کی یہ ذہنی عداوت میرے سارے پٹان کا جیوا غرق کر سکتی تھی۔ وہ پریس کانفرنس کے دوران میں آگے بنگامہ کر دیتی کہ شاہ عالم ایک نہیں دو ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ان میں سے اصل کی کون ہے اور کتنی کون۔ کون میرا مگشا شوہر ہے اور کون سولتا۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنس ہنس کے ڈہرسے ہو جاتے اور مجھے کچھ نہ کچھ ضرور کہنا پڑتا کہ خاتون نشے میں ہیں یا ذہنی عدم توازن کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ ہر صورت میں میرے سیاسی مسئلے سے میری نجی زندگی کا یہ واقعہ کہیں زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیزی کا باعث ہوگا۔

اگلے دن اخبارات خوب نیک نیک سرچ لگا کے یہ تصویر خبر صفحہ اول پر شائع کر کے کہ "نشے میں مت ہو کے صف اول کے سیاسی لیڈر کی بیوی کا بنگامہ" یا "بی بی ایل ایف کے سربراہ کی نفسیاتی مریض بیوی کا پریس کانفرنس میں عمل غیازا" اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے۔ تجھے اور تیرے اور ہر قسم کی قیاس قرائن۔ اس نے شراب کیوں پیا؟ شراب شاہ عالم کے کمرے میں کہاں سے آئی۔ وہ کب سے شراب پیتی ہے اور اپنا کون سا نم نشے میں ڈبو چاہتی ہے؟ وہ پاگل ہوئی تو کیسے؟ یہ ذہنی مرض نفسیاتی ہے یا موروثی۔ کیا اس کی ذمے داری مجھ پر اور میرے غلط رویے پر عائد ہوتی ہے۔

ملا کا ایک طبقہ مجھ پر اور میری بیوی پر ام الفیاض شراب نوشی کی عادت کے باعث تحفہ کا توہنی جاری کر دیتا اور مجھ پر حدود آراستہ کے تحت مقدمہ چلا کے مجھے سرعام چھاپسی دینے کا مطالبہ کرتا۔ یہ مطالبہ اب ایک مذاق بن گیا ہے۔ سب کے مطالبات مان لیے جائیں تو ملک بھر میں بجلی کے برقیے سے ایک مجرم چھاپسی پر ٹکنا دکھائی دے۔ میرے خلاف مجھے سیاست سے باہر کرنے کے لیے کردار کشی کا یہ سوخ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مردوں کے معاشرتی جبر کے خلاف سرگرم عمل خواتین میرے خلاف محاذ بنائیں گیں میرے سلوک نے ایک مظلوم عورت کو ذہنی اور جسمانی تشدد سے پاگل کر دیا۔

یہ سب سوچنے میں مجھے چند سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ اس وقت میرے پاس بحث کے لیے نہ وقت تھا نہ دلائل تھے۔ میں نے ریاست کی سیاست کے اصول پر عمل کیا کہ دیکھ لے ہو تو طاقت سے اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز دبا دو۔ میں نے رشتی کو تاک آؤٹ کر دیا۔

اب میں کم سے کم آدھے ہون گئے تھیں تاک افشائے راز کے خوف سے بے نیاز ہو کے پریس کانفرنس کر سکتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ دروازے کو باہر سے قفل کر دینا کافی ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ رشتی کو جلدی ہوش آگیا اور پریس کانفرنس دیر تک جاری رہی تو گریز ہو جائے گی۔ وہ تھیل بجائے کہ ہوش کی انتظامیہ کو مدد کے

لے لے لے لے گی یا پریس کو فون کر دے گی۔ دیوانگی کی حالت میں بھیجی ہوئی نیچے پہنچ جائے گی۔

باہل ناخوامتہ میں نے اس کے دوپٹوں سے اس کے ہاتھ پیچے باندھے۔ ایک دوپٹا اس کے منہ میں ٹھونسنا اور ایک اس کے پاؤں باندھنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ ہوش میں آجاتی تو اس حالت میں بھی دروازے تک پہنچ سکتی تھی اور دروازے پر لٹا بیٹھ کر مارے لوگوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ یہ غیر شرفانہ بلکہ غیر انسانی فعل تھا مگر میرے پاس وقت کم تھا اور اس کے سوا میرے پاس چارہ کار نہ تھا۔ اگر چندا ہوئی یا خان جی ہوتے تو مجھے یہ ظالمانہ کارروائی نہ کرنا پڑتی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے کے بعد بند کے سر پائے کو استعمال کیا۔ اس کا ڈیزائن ایسا تھا کہ میں درمیان کے خلا سے دوپٹے کو رشتی کی طرح گزار سکتا تھا۔ میں نے رشتی کا چوڑا دوپٹہ یوں استعمال کیا کہ پہلے اس کو گردن کے گرد ایک ٹیل ڈالا اور پھر سر پائے کے ایک حصے سے گزار کے گرد حلقہ تک ہو جانا۔ وہ اس طے کو ڈھیلا کر کے اس میں سے اپنا سر بھی نہیں نکال سکتی تھی۔

مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر افسوس بھی تھا مگر رشتی نے اچانک میرے لیے یہ سب باز کر دیا تھا۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھ سکی اور جو اس کے ذہن میں تھا وہ اس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔ اس کو اپنے اعصاب پر قابو ہوتا تو وہ مجھے بتائے بغیر اپنے شکوک کی تصدیق کے ذرائع تلاش کرتی اور خاموشی سے حقیقت کی نہ تک پہنچ جاتی۔ اس کے بعد باہلی اس کے ہاتھ میں ہوئی۔

میں نے فون کا ریسیور اٹھ کر دیا۔ دروازے کے باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا بورڈ لٹا ہوا تھا اور گھر کے کوٹھیل کر کے نیچے آؤٹ کیا۔ اگھر بڑی محاورے کے مطابق اب بی بی خیل سے باہر آؤٹ کی۔ لے کو خان اعظم نے پکڑ لیا تھا اور بی بی خیل سے باہر آنے کے باوجود میرے قابو میں تھی۔ ایک بار اسے ذہنی طور پر خاموش کر دینے کے بعد رشتی کو قائل نہیں کیا جاسکتا تھا کہ دال میں کچھ بھی کالا نہیں ہے۔ اس کا یہ شک کہ کہیں نہ کہیں کوئی گریز ضرور ہے۔ یقین میں ڈھل گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ عالم دو ہیں۔ ایک اس کا شوہر ہے۔ ایک مرد راز کا قاتل۔ اب کون سی بات تھا اور کون سا گورنر۔ اس کا شوہر ہی قاتل تھا یا قاتل اس کا شوہر تھا ہوا تھا۔ یہ اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

لاؤنج میں پہنچنے ہی مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے خاموش کیا اور ایک مختصر بیان دیا۔

"حضرات اور خواتین۔ اپنی معافی پیش کرنے سے پہلے میں نے یہ ضروری سمجھا ہوں کہ اس سیمینار قتل کی بھرپور مذمت کروں۔ سیاست میں تشدد کا عنصر آہستہ آہستہ ہمارے قومی مزاج

میں شامل ہو رہا ہے جو انتہائی شرم کی بات ہے۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں، کس منہ سے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم انسان ہیں، ہم مسلمان ہیں اور ہم جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں۔"

"سب اسی منہ سے دعوے کرتے ہیں جو ہر مرد آئینے میں دیکھتے ہیں، ایک داڑھی والے نے جیسے ہوئے لیے میں کہا۔

"شعبہ کرتے وقت" کوئی اور بولا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

میں نے کہا "میرے عہد راز سے سیاسی اختلافات تھے۔ بی بی ایل ایف کا نام ہی اس آزادی اور انصاف کی ضمانت ہے۔ ہم آمرانہ سوچ کے خلاف ہیں اور ہر طاقت ذہن رکھنے والی پارٹی کے خلاف ہیں جو آزادانہ اختلاف کے اظہار پر قدغن لگاتی ہے۔ کسی پارٹی کا دو دھڑوں میں بٹ جانا یا پارٹی ارکان کا اصولی اختلاف پر پارٹی چھوڑ دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس پارٹی کے لیڈر کا مزاج جمہوری ہے۔"

"لیکن پارٹی کون بنائے گا اور کب؟" ایک اور صحافی بولا۔

دوسرے نے اس کی تائید کی "ابھی تک پاکستان میں تو ایسی کوئی سیاسی جماعت نہیں۔"

میں نے کہا "مرد راز نے اختلاف کی بنا پر پارٹی چھوڑ دی۔ اس نے میرے خلاف محاذ بنالیا۔ میرے بہت سے ساتھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ وہ میرے خلاف بولنا رہا۔ بیان دیتا رہا اور تقریریں کرتا رہا۔ یہ اس کا حق تھا۔ یہ ہر پارٹی دکن کا بنیادی حق ہے۔ اس اختلاف کو دشمنی نہیں سمجھنا چاہیے۔"

"سرسراہ عالم" ختم کھڑی ہو گئی "کسی نے آپ سے یہ نہیں پوچھا ہے کہ مرد راز کا قاتل کیوں ہوا۔ لیاقت علی خان کی شہادت سے آج تک کسی کو بھی اس کیوں کا جواب نہیں ملا۔"

"اور نہ ملے گا" داڑھی والا سختی سے بولا "آپ کی کشن بخائیں لاؤ نیوٹل۔ اس میں بھی قاتلوں کے نمائندے ہوں گے۔ ایسے ہر نیوٹل اور کشن کا مقصد کبھی قاتلوں کو بے نقاب کرنا نہیں ہوتا بلکہ انہیں تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ حقائق کو مسخ کر کے کنفیوژن پیدا کرنا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ جان تو ہیں عدالت کے حرافہ ہے۔"

"ہاں ہاں" نیل بیج دیں مجھے۔ چھاپسی چھاپسی دی دیے ہی کوئی مادیہ۔ ہر مرد اسے لوگ مارے جاتے ہیں۔ ایک میرے مرغانے سے کیا فرق پڑے گا مگر شاہ عالم جب۔۔۔ میں اپنے قاتلوں سے۔"

"ارے بھائی! کبھی قتل نہیں ہوئے تم کسی نے کہا۔"

داڑھی والا پچھلے لگا "ہو جائیں گا ہو جائیں گے قتل میں بھی۔ کیونکہ میرے قاتل مقرر کیے جا چکے ہیں پھر تم احتجاج کرنا۔ جلتے کرنا پریس کلب میں اور کالی بیٹیاں باندھ کے چیخ فشرنا اس تک جانا۔ میں پوچھتا ہوں تم سب سے آخر تم کب جانو گے کون بتائے

کا جس کی قاتل کون ہے؟ لیاقت علی خان کا، سرور دی، ڈاکٹر خان صاحب، نواب کالا باغ سے شہداء الحق تک۔ دنیا کو دکھانے کے لیے ہی کسی کو قربانی کا کرنا پڑتا ہے ہی چھاپسی چھاپسی۔ ریکارڈ پر تو آجاتا آئینے میں کہ انصاف ہوا، قاتل پکڑا گیا۔"

"پیارے تمہارے قاتل کو میں پکڑوں گا" کسی نے کہا۔

"بس تم اس کا نام پتا نادر" کوئی اور بولا۔

"غالب خست کے بغیر کون سے کام بند ہیں" داڑھی والا مٹکا لڑا کے بولا "مرد راز کے قتل کی بات کیوں کرتے ہو بے وقوف۔ یہاں تو کتنے والوں نے یہ بھی کہا کہ قاتل اعظم اور قاتل جناح بھی قتل ہوئے تھے۔"

"چھاپس جاکے ایف آئی آر کھو دو۔ قتل ہونے سے پہلے۔"

"بلکہ اپنی بھی کھو دو اور اپنے وائس۔"

میں نے پھر بیٹھے والوں کو خاموش کیا "پلیز۔ آپ لوگ سیریس ہو جائیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ ابھی تک صوفی لپیٹے سارے تھے؟ کوئی بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ بد قسمتی یہ ہے ہماری کہ ہم ایسی باتوں کو لپیٹے سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ مس ختم" آپ سوال پورا کریں۔"

"تھینک یو۔" اس نے کہا "آپ صرف اتنا بتادیں کہ مرد راز کو آپ نے نہیں قتل کیا تو پھر کس نے کیا؟"

میں نے کہا "اسے میں کیسے قتل کر سکتا تھا۔ میں تو سکا پور میں تھا۔"

"مگر میں بھی تھے آپ۔ جانے واردات پر جو چشم دید گواہ تھے ان سب نے آپ کو دیکھا تھا۔ کیا وہ سب جموت بولتے ہیں؟"

"بات یہ ہے مس ختم کہ اتفاق رائے سے کوئی مقصد حاصل کرنے کے لیے بڑے سائنٹیفک طریقے پر منظم جموت بولنا بھی سیاست میں جائز سمجھا جانے لگا ہے۔ جموت کے پاؤں نہیں ہوتے۔"

"جموت دیکھل چیز رمل سکتا ہے" کسی نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک نظریہ لولا مضور جموت تھا۔ صرف میرے مخالفین نے ہی شاہ عالم کو مریاں دیکھا۔ قتل کرتے دیکھا۔ جب کہ شاہ عالم سکا پور میں تھا۔ اس سے پہلے میں ہانگ کاک میں تھا۔ یہ دیکھنے میرے ٹھٹ "پاسپورٹ کے اندراجات۔ اس کے علاوہ میں آپ کو چند مستتر نام بتاؤں۔ وہ گواہ ہیں میرے اور وہ ویسے گواہ نہیں ہیں جیسے عدالتوں کے باہر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کسی بھی واقعے کے چشم دید گواہ بننے کے لیے تیار۔ میں پوچھتا ہوں آخر کسی اور نے شاہ عالم کو کیوں نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا" میں نے "ختم نے بڑے مضبوط لیے میں کہا۔"

”جیل جھوٹی“ پیچھے سے کسی نے بڑی ادا سے زمانہ لیے جس کا ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ جنیم کا چہرہ دستور پات رہا۔
 ”کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں بھی جھوٹ بول رہی ہوں؟“
 جنیم بولی۔

”آپ پرانی صفائی ہیں مس جنیم۔ آپ ضرور جانتی ہوں گی کہ جھوٹ یا سچ کی لغوی تعریف اور قانونی تعریف میں کیا فرق ہے۔“
 میں نے کہا ”گوئی سچ اس وقت تک سچ نہیں ہے جب تک کہ سچ ثابت نہ ہو جائے۔ اگر آپ نے مجھے لاہور میں دیکھا تھا تو ثابت کر دیں کہ وہ میں ہی تھا۔ پولیس آپ کے سچ پر مجھے سزا دے گی۔“
 ”میں پولیس کی بات نہیں کرتی، آپ خود بتائیں۔“

”میں نے تو بتا دیا۔ سارے ثبوت پیش کر دیے۔“ میں نے کہا
 ”اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ درمیان میں صرف ایک دن کے لیے چند گھنٹوں کے لیے میں ایک فلائٹ سے آیا اور دوسری سے واپس ہاگ کاٹ گیا۔“

”آپ نے ضرور ایسا ہی کیا ہوگا“ جنیم نے کہا۔
 ”کیا ہو گا کیا تھا؟“ میں نے کہا ”بے شک آج کل کی تیز رفتار دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اور ہر آدمی کی ایسی بہت سی کمائیاں آپ نے بھی چڑھی ہوں گی۔ لیکن ایک مفروضہ پر کام کر کے آپ یقیناً خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کی امید ضرور کر سکتی ہیں۔ معلوم کریں کہ میں کب آیا اور کب گیا۔ میں نے کس نام سے سفر کیا اور کیا مجھے کسی نے شناخت کیا تھا؟ یا میں مجس بدل کے آیا تھا۔ مجس بدل کے آیا تھا تو اصلی چوہے کو خود اپنے ہاتھوں سے عمر راز کو زہر دینے کیوں چلا گیا۔ ایک عام آدمی سے بھی ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میرے پاس ایک ایک منٹ کا حساب ہے کہ کس وقت میں کہاں تھا۔ اب میں نے لکھ لیا ہے کہ اس الزام کے بعد مجھے یہ حساب پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی ہے۔ اگر آپ میرے ان دعوئوں سے مل گئی ہیں جو اس لغو الزام کے ذمے دار ہیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔“

جنیم کا چہرہ تاریک ہو گیا ”آپ بے عزتی کر رہے ہیں میری۔“
 ”اور آپ کیا میری عزت افزائی فرما رہی ہیں؟“ میں نے برہمی سے کہا ”یہ کتنی پکارتا ہے بات سے مس جنیم کیا ملے گا میرے سیاسی مخالفین کو اس سے؟ سوائے جگ بھائی کے۔ رسوائی کے میرے سیاسی کیریئر سے حسد کرنے والے ضرور پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ فرمائیں کہ مجھے آپ نے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ اس واردات سے پہلے یا اس کے بعد؟ اگر بعد میں دیکھا تھا تو آپ نے پولیس کو اطلاع دی تھی؟ آپ نے مجھے گرفتار کیوں نہیں کرا دیا؟“
 کوئی بولا ”جو خود گرفتار ہو کسی کا وہ کسی کو کس دل سے گرفتار کرانے کا؟“

”بھئی سبحان اللہ۔ کیا عرض کیا ہے۔ مکرر ارشاد! ایک صاحب نے پھرک کے یوں داد دی جیسے یہ پریس کانفرنس نہیں

مشامو ہے۔
 جنیم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاری تھی۔ وہ اضطراری کیفیت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی ”ہر سوال کا جواب ہے میرے پاس شامو ہے۔ لیکن میں سب کے سامنے نہیں دوں گی۔“

پہلے پیچھے سے کسی نے کچھ کہا پھر چند لوگ ہنسے۔ کچھ نے اپنی ہنسی کو دبا دیا۔ جنیم کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ یہ اس کے اپنے ساتھی تھے جو اس کو سر محفل قہقہا بتا رہے تھے۔ اس کی ہر بات کو اپنے صفائی پستار سے جھے اور اس کے جذبات کو اپنی کندی زبان کی چھری سے بھروسہ کر رہے تھے۔

میں نے کہا ”آپ تشریف رکھیں مس جنیم۔ آپ فرمائیے۔“
 پیچھے سے ہاتھ اٹھانے والے ایک شخص نے کہا ”آپ نے عمر راز کے قتل کی مذمت ضرور کی ہے مگر کیا اس سے پامانی کے واضح طور پر دو دھڑوں میں بٹ جانے کا امکان نہیں ہے؟ ایک شہید عمر راز اگر وہ اس سیاسی قتل سے فائدہ اٹھائے آپ کا دوش پینک تو نہیں سکتا؟“

میں نے کہا ”بلاشبہ ہمارے ملک میں ایسا ہوتا ہے۔ ہم لاشوں کی سیاست کے چلن میں ساری دنیا سے آگے ہیں۔ خود ہمارے پڑوسی ملک میں ’سری لنکا اور بنگلہ دیش میں ہر مقتول ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کے وارث اپنی سیاست کی دکان اسی کے نام پر چلاتے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں عمر راز کے سب کاراض ساتھیوں سے جو پہلے ہمارے ساتھی تھے خود ملوں گا۔ ان کی ساری غلط فہمیاں اور سب شکایات دور کروں گا۔ اور آپ دیکھ لیں گے کہ عمر راز کے قتل کی سازش سے مجھے نقصان پہنچانے کے خود فائدہ حاصل کرنے کے خواہش مند ایسے ہوں گے۔“

”آپ کے رویے نے پامانی میں جو بھارت کے آثار پیدا کر دیے ہیں اور جس طرح آپ کی آمرانہ روش کے خلاف جذبات بھڑک رہے ہیں اس کے پیش نظر۔“

”آپ وہ سب پرانی باتیں بھول جائیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”بہت جلد آپ پامانی کی قیادت کے رویے میں تبدیلی محسوس کریں گے۔ ضرورت پڑی تو میں پامانی کا شخصی ڈھانچا بدل دوں گا۔ پامانی کی تنظیم نو عوامی سطح پر ہوگی۔“

”پھر تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے“ کسی نے کہا۔
 ”کیا اس تبدیلی کو وہ جاگیر دار اور وزیر اگر وہ قبول کر لے گا جو اس وقت پامانی پر قابض ہے؟“
 میں نے کہا ”اول تو ایسا ہے نہیں لیکن کوئی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ پامانی اس کے بغیر چل نہیں سکتی تو میں واضح کر دیتا چاہتا ہوں کہ ہماری جڑیں عوام میں ہیں۔“

”عوام کی جڑوں میں بیٹھ گئے ہیں آپ“ واڑھی والا بولا۔
 ”عوام اب اتنے بے وقوف نہیں رہے کہ ایسی باتوں سے بل جائیں۔“

واڑھی والا پھر بولا ”ارے بھائی۔ ان لوگوں کی بھی تو خوش قسمتی ہے کہ عوام اتنے ہی بے وقوف ہیں جتنا یہ سمجھتے ہیں۔“
 میں نے کہا ”میں نے جیڑہن کی مشیت سے پامانی کا نام بھی پل ایل ایف سے بدل کے پی بی ایف کر دیا ہے۔ چار جنس۔“

واڑھی والا زور سے ہنسا ”خود کا نام جنوں رکھ دیں جنوں کا خود۔ لیبل بدلنے سے کیا ہوتا ہے سب لفظوں کا آٹ پھیر ہے۔“
 ایک عینک پوش ڈھانچے نے کہا ”چھاپا کیا آپ نے شاہ جی محبت کرنے کی نہ عوام کو ضرورت ہے نہ فرمت۔“
 کوئی بولا ”یار جنوں۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔“

ایک سفید ریش اور بے بال بزرگوار نے سر ہلایا ”پوچھ لو اپنی مرس جنیم سے۔“

جنیم نے اسے گھور کے کہا ”آپ نے بہت کوشش کی تھی مجھ سے کرنے کی۔ اپنی تیسری منگوتہ کی رحلت کے بعد۔“

ایک قہقہہ پڑا۔ بزرگوار جینپ کر اپنی نقلی ہتھی کی نمائش کرنے لگے۔ بظاہر اب کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی اور خود کو شاہ عالم بھی تسلیم کر لیا تھا ”سوائے جنیم کے میری شناخت کی اہلیت کے بارے میں کسی کے ذہن میں نہ ابھام تھا اور نہ شک۔ ہم نے لاہور کے کسی صفائی کو اطلاع نہیں دی تھی مگر اس تک یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ اخبار والوں کے آپس کے روابط میں کاروباری مقابلہ ضرور ہوتا ہے اور پیش دراند حسد اور رقابت کا جذبہ بھی مگر ان کا آپس کا اتحاد اور اتفاق بھی ریاست کے چوتھے ستھان کی مضبوطی کا ضامن ہے۔“

جنیم کا مسئلہ بھی وہی تھا جو ریشی کا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ریشی مجبور تھی اور معاشی طور پر کمزور۔ تاہم جنیم کی آزادی اور صحافتی بے باکی بھی شاہ عالم کو تاہم عظیم ثابت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے پاس بھی صرف یقین تھا کہ وہ شاہ عالم کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا جس نے اسے عمر راز کی موت کے بعد مدد کے لیے بلایا تھا۔ جو جنیم کے ساتھ اس کے لٹیت تک گیا تھا۔ وہاں اس سے بڑی امید افزا میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں اور پھر چھٹا دوسرے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

جنیم کے لیے اپنے یقین کو بھٹکا بھی مشکل تھا اور میری کسی بات کو جھوٹ قرار دینا بھی۔ بنیادی مسئلہ ثبوت کا تھا۔ میرے پاس ثبوت تھا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں، میں ہاگ کاٹک اور سنگا پور کے دورے پر تھا اور ابھی ابھی دو ہفتے بعد پاکستان واپس آیا ہوں۔ اس کے پاس ثبوت نہیں تھا کہ عمر راز سے ملاقات کے لیے جانے والا اور اسے زہر دے کر بھاگ کر آنے والا بھی شاہ عالم تھا اور اسے صرف اس کی آنکھوں نے نہیں روٹوں افرار نے اسی طرح قریب سے دیکھا تھا جیسے پریس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں نے۔

جنیم اتنے بڑے جھوٹ کو تسلیم کرنے پر مجبور تھی اور یہ احساس اسے کوفت اور جھٹلاہٹ ہے کسی کے غصے اور پاگل کردینے والے خیالات کے انتشار میں جٹا کرنے کے لیے کافی تھا کہ تمام دستیاب وسائل اور اپنی پیشہ ورانہ حقیقت شناسی کی صلاحیت کے باوجود وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے سے قاصر ہے۔ وہ بہت سے لوگوں کی طرح فرض کر سکتی تھی کہ شاہ عالم نے بیک وقت دو جگہ اپنی موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے چالاکی اور فریب کے کون سے حربے استعمال کیے ہوں گے شاید اس نے اپنا کوئی ہم شکل تلاش کر لیا ہو گا جسے میک اپ سے معمولی فرق دور کر کے شاہ عالم کا ردول سمجھا دیا گیا ہو گا اور اس کام کا معقول معاوضہ ادا کر دیا ہو گا۔ کام بھی بہت آسان تھا۔ ہاگ کاٹک کے کسی فائے اشار ہوئی میں رہو۔ کھاد پیو اور سوچ اڈاؤ لیکن ہر وقت اور ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کچھ کرتے رہو۔ کسی معزز صحن کے ساتھ زبان درازی سے کسی حینہ کے ساتھ دست درازی تک سب جائز ہو گا۔ چھوڑا کوئی بھی واقعہ جو فوس میں آجائے۔ وغیرا نیچر کو یاد رہے۔ نئے میں تو پھوڑا اور پھر معذرت۔ کوئی حادثہ، لڑائی، جھگڑا، کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ۔ ٹائٹل، ٹیپا ڈز کے دوران۔ علی اصل شاہ عالم ادا کرے گا۔ ممکن ہے اس نقلی شاہ عالم نے کاروباری نوعیت کی میٹنگ بھی کی ہو اور خود ایسے لوگوں سے ملا ہو جن کی گواہی کو مسترد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

اور وہ بے نقلی شاہ عالم ہاگ کاٹک یا سنگا پور میں صرف پیش کر رہا تھا۔ اصل شاہ عالم نے یہاں عمر راز کو ٹھکانے لگانے کا کارنامہ سر انجام دیا اور پھر پہلی فلائٹ سے واپس چلا گیا۔ نقلی شاہ عالم کا ردول ختم۔ آج وہ سب کے سامنے سنگا پور سے لوٹا ہے تو اس کے پاس پاکستان سے دو ہفتے تک غیر حاضری کے فوس ثبوت ہیں۔ جنیم فرض کر سکتی تھی کہ شاہ عالم نے آنے جانے میں دو دن صرف کیے۔ ان دو دنوں میں نقلی شاہ عالم نے اس کی ہدایات کے مطابق پیش کرنے کے ساتھ سچ سے شام تک ہر جگہ اپنی موجودگی کے ناقابل تردید ثبوت چھوڑے۔ فرض کرنا اس کے لیے محال تھا کہ کسی نقلی شاہ عالم نے اس کا جیس بدل کے عمر راز تک رسائی حاصل کی اور شاہ عالم کے کتے پر اسے قتل کر دیا۔ یہ کوئی عام قتل نہیں تھا جس کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کو معاوضہ ادا کر دینا کافی ہوتا۔ پامانی کے سارے معاملات کو سمجھتے ہوئے عمر راز سے ملاقات کرنا اور پھر اسی ہوشیاری سے اس کا کام تمام کرنا صرف شاہ عالم جیسے شیطان ذہن رکھنے والے عیار اور نگار شخص کے لیے ممکن تھا۔ اگر کوئی نقلی شاہ عالم ہوا تھا تو وہ ہاگ کاٹک یا سنگا پور میں تھا اور وہ جو بھی تھا دو تین دن شاہ عالم کا ردول کر کے غائب ہو گیا تھا یا غائب کر دیا گیا تھا۔ اب کوئی اسے کیسے تلاش کر سکتا ہے اپنا کام اس نے کسی دشواری کے بغیر بڑی خوش اسلوبی سے

اداکار اور شاہ عالم کی غیر حاضری کا کسی کو چاہ نہیں چلتے۔
 یہ خیال ختم کے فرشتوں کو بھی نہیں آسکا تھا کہ ناصر عظیم
 نام کا ایک شخص اسی شہر لاہور میں کس طرح شاہ عالم بننے پر مجبور
 ہوا اور اس نے کتنی ذہانت کے ساتھ اصل شاہ عالم کا کردار یوں
 نبھایا کہ غیر توغیر اس کے اپنے ماں باپ اور اس کی بیوی اس کے
 ملازم اور پائی کے مدد سے دار تک اس کی جہلازی کو نہ چکے۔
 ختم کی ذہنی حالت پر مجھے بھی اتنی ہی اور افسوس بھی ہوا
 تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے اکیلے میں ملاقات کرنے اور کل کر
 بات کرنے کا موقع ضرور تلاش کرے گی۔ سب کے سامنے وہ مجبور
 تھی کہ اپنی اور شاہ عالم کی بے حد پرانی ملاقات کا احوال کسی
 پر ظاہر نہ ہونے دے۔ ثبوت وہ سب باتیں تھیں جو میں نے اس
 سے کہی تھیں۔ قوت کے وہ چند لحاظ تھے جو میں نے اس کے
 ساتھ گزارے تھے لیکن گواہ بھی وہ خود ہی تھی۔ مدعی اگر خود ہی اپنا
 گواہ بھی ہو تو دعوے کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں
 رہتی۔

میں نے رکی طور پر اپنی پریس کانفرنس ختم کی۔ رپورٹرز اور
 فوٹوگرافرز آہستہ آہستہ لاؤنچ سے باہر جانے والے دروازے کی
 طرف بڑھے مگر ختم وہیں کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں مجھ پر یوں جم
 کے رہ گئی تھیں جیسے وہ میری ANATOMY یعنی جسمانی ساخت
 میری آنکھوں ہالوں اور جلد۔ ان کے رنگ۔ میرے چہرے کی
 بناوٹ، ہاتھوں اور پیروں کی ظاہری صورت سے ہی میرے شاہ عالم
 ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے بعد اب میڈیکل سائنس کے
 جدید طریقوں سے میرا تجزیہ کرنا چاہتی ہے۔ میرے فکر پر جس
 میری بیٹھی یعنی DENTURE اور میرے ایکس رے سے مجھے
 اصل یا نقلی شاہ عالم ثابت کرنے کا سوچ رہی ہے۔ میرے DNA
 یعنی موروثی خلیاتی نمٹ سے میری شناخت کے چکر میں جب پاگل
 ہوئی وہ سب جو دنیا میں ہوتا ہے ابھی پاکستان میں تسلیم ہی نہیں کیا
 جاتا۔ یہاں تو ابھی معاملہ فکر پر جس سے آگے نہیں بڑھا۔

اچانک وہ آگے آئی "سر کیا میں آپ سے علیحدگی میں مل
 سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ تم پہلے بھی اپنی رہی ہو" میں نے سنی خیر انداز
 میں منکراہت ہونے کا "لیکن آج نہیں۔"

"آج کیوں نہیں؟ میں صرف پانچ منٹ مل گئی۔"

"وکیو۔ یہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ ہوں۔ وہ بہت شکی
 مزاج اور حامد عورت ہے۔"

ختم کا موڈ خراب ہو گیا "دیکھئے شاہ جی۔ اول تو میرا آپ سے
 تھمائی میں ملنے کی درخواست کرنا ایک خالص پیشہ ورانہ ضرورت
 ہے۔ مجھے کچھ ایسی باتیں یاد ہیں جو میں سب کے سامنے نہیں
 پوچھ سکتی تھی۔ آف دی ریکارڈ محض کسی پریس کانفرنس میں نہیں

ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی بیوی میرے بارے میں کیا سوچتی
 ہے؟ اس کی میں پروا نہیں کرتی۔ میرے بارے میں لوگ کیا کہتے
 ہیں یہ مجھے معلوم ہے مگر میں سب کو رکھتی ہوں جو آپ کی نوک
 پر۔"

"مگر اس سے بدنامی ہوتی ہے تمہاری اور تم ایک عورت
 ہو۔"

"مگر بدنامی سے ڈرنے والے تم ہو" ایک مرد۔ "اس نے سچی
 سے کہا۔"

"اس کی بات یہ ہے آخر۔ جو اتنی اہم بھی ہے۔"

"اس کا تعلق تمہارے سیاسی مستقبل سے ہے۔"

میں نے کہا "پھر آپ سے لاہور میں بات ہوگی۔ یہ کوئی
 آرجنٹ معاملہ نہیں ہے۔ یو ٹی وی۔"

اس نے چلا کے کہا "نہیں۔ میں انتظار نہیں کروں گی۔
 برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں انجام کی پروا
 کیے بغیر وہ سب کہہ دوں جو مجھے معلوم ہے اور جو سچ ہے۔ ایسا سچ
 جس کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم بھی جانتے ہو وہ سچ کیا
 ہے اگر تم ختم کے انکار کرو۔"

"میں ختم کمانے کا دبیسے بھی قائل نہیں۔ عموماً جھوٹے لوگ
 ختم کمانے ہیں مگر لوگ ان کی بات پر یقین کر لیں" میں نے کہا۔

"شاہ عالم تم میرے برداشت کے حوصلے کو آزار ہے ہو۔
 میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گی کہ تم میرے سچ پر بھی مجھے سب
 کے سامنے جھوٹا کہتے رہو اور خود اسے بڑے جھوٹ کے ساتھ
 سچائی کی سند حاصل کرلو۔"

میں نے کہا "چلاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ تم کیا کرو گی؟"

"نہیں۔ میں سب کو بتا دوں گی کہ تم فریجی اور دھوکے باز ہو۔
 پھر چاہے میرا مستقبل داؤ پر لگ جائے میں خود بھی برباد ہو جاؤں
 گی مگر تم کو بھی برباد کر دوں گی۔"

میں نے کہا "تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو۔ تم خود کتنی بھی
 کر سکتی ہو مگر دوسروں کی زندگی پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ تم
 شاہ عالم کے خلاف قلعہ چنار، فیصل آباد اور یاجپور پاکستان پر چڑھ
 کے اعلان کرو، پورے چنار، فیصل آباد اور یاجپور میں سرخشاں
 لگاؤ۔ شاہ عالم بھی تم کو جوئے کی نوک پر رکھتا ہے۔ بس ختم شاید
 تم دیوار میں دخن ڈال سکتی ہو مگر کسی پناہ کو ہلانے کا دعویٰ مت
 کرو۔ جو تم کو پاگل سمجھتے ہیں وہ تم کو پاگل خانے پہنچا دیں گے۔
 چلائی رہتا وہاں ساری عمر اور دیوانوں کو کشتی رہتا۔
 سر کرنا کرنا کے جان دے دیتا۔"

ختم کا رنگ زرد اور پھر سفید پڑ گیا۔ اسے ہرگز ایسے جواب
 کی امید نہیں تھی۔ شاہ عالم اس سے مضے میں بھی یوں بات نہیں
 کرتا ہو گا۔ وہ مشہور صحافی تھی اور ایک فاحش عورت جو صاف کی
 تجربہ کاری اور حسن و شباب کی قوتِ تغیر دونوں سے اپنی توقعات

کے جھنڈے گاڑنے کی عادی تھی۔ یہ انک بات تھی کہ شاہ عالم
 کے معاملے میں اس نے شکست کی رسوائی کو بھی کسی حد امت کے
 بنیاد پر انکار کچھ لکھا تھا۔ بالکل اس کی طرح جس کا بد صورت
 ترین بچہ بھی اسے دنیا کا سب سے خوب صورت بچہ لگتا ہے اور وہ
 کسی کی طرف دیکھے بغیر کسی کی گھٹنے بغیر اسے شہزادہ گلجام کہتی
 رہتی ہے اور سمجھتی رہتی ہے۔

شاہ عالم نے ختم سے تعلق کا اپنی سیاسی نیک نامی کی خاطر
 کسی کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے محبت بھی
 نہیں کرتا تھا مگر وہ ایک حسین عورت سے نفرت تو دور کی بات ہے
 قطع تعلق کی محبت بھی نہیں رکھتا تھا اس کی ضرورت نہیں سمجھتا
 تھا۔ منت باہر آئے تو پڑا کیا ہے۔ اور وہ عورت بھی عام عورت
 نہیں تھی۔ اس کے جذباتی اتصال کو صاف کے میدان میں نیک
 نامی کمانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

میرا مدیہ اور میرا اس کے لیے غیر متوقع الیکٹرک شاک سے
 کم نہیں تھا۔ مگر میں پرانے شاہ عالم کی کسی کمزوری کو اپنی کمزوری
 بنانے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اس کی ذات میں کچھ
 خدیاں تھیں تو انہیں اپنانے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہو سکتا تھا مگر
 میں اس کے کردار سے منسوب تمام برائیوں سے نجات حاصل
 کر کے شاہ عالم کو ایک نئی نصیبت دینا چاہتا تھا۔ یہ نصیبت میری
 اپنی تھی جس پر مجھے ٹھیک بدلہ تھا۔ مگر مسئلہ صرف یہ ہونے کا ہوتا
 تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ پہلے حالات سے مجبور ہو کے اور اب انتقام
 یا جنتی سمجھ کے میں نے ایک سیاسی پارٹی کی قیادت پر نامانہ قبضہ
 کر لیا تھا۔ مجھے اس پارٹی کو حقیقی معنوں میں امن، انصاف اور
 آزادی کے حوالے سے ایک ایسی قیادت فراہم کرنا تھی جس کی
 اس ملک کو ہمیشہ ضرورت تھی مگر کسی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اگر یہ ایک دیوانے کا خواب تھا تو میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ میں یہ
 کچھ کے بہت بارے والا نہیں تھا کہ اکیلا چنا ہوا مجھ کو جو کچھ
 سکنا۔ زیادہ سے زیادہ اس کھیل میں میری جان جاسکتی تھی تو بقیہ
 نہیں۔۔۔ مگر یہ گئے تو کیا کمانا؟ بارے بھی تو بازی بات نہیں۔

تیمور نے اخلاقی ختم کی دیکھ کر "میں ختم! آپ ہر امت
 بائیس۔ سر شاہ عالم تخت جذباتی داؤ میں ہیں۔ ایسے بے بنیاد
 الزامات۔"

"بے بنیاد۔۔۔؟ ختم نے اس کی بات کا ڈی ۳ میر تیمور۔
 تمہارے منہ میں تو اپنی زبان بھی نہیں ہے۔ تم خاموشی ہی رہو تو
 بہتر ہے۔"

"آپ بلاوجہ تھا ہو رہی ہیں۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر" میں نے
 کہا۔

"میں ساری غلط فہمیاں دور کر دوں گی شاہ عالم صاحب۔ اپنی
 ہی اور آپ کی بھی۔" اس نے تندرلیے میں کہا "مگر تم اس ساری
 کائنات میں سیاہ و سفید کے مالک ہو تے۔۔۔ مجھے تمہارے کہنے سے

سیاہ بھی سفید نہ ہوتا اور نہ تم سفید کو سیاہ ثابت کر سکتے۔ تم کی
 مجھے پاگل خانے بھجواؤ گے۔"

"میں صرف جھوٹ اور سچ کے فرق کو واضح کر رہا تھا" میں نے
 کہا۔

"ہم صحافی اپنی آنکھیں الگ رکھتے ہیں۔ سر۔ ہم کسی کی مدد کے
 بغیر ہی جھوٹ اور سچ کو الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ دکھا بھی سکتے ہیں
 اور منہ بھی سکتے ہیں۔ میرا بھی نام ختم ہے یا رکھنا۔"

"کیا یہ دیکھی ہے میرے لیے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں۔ میں بتانا چاہتی تھی کہ میں کیا ہوں۔ شاعر مشرق کی
 زبان میں۔ جس سے جگہ جگہ میں ٹھنڈک ہو وہ ختم۔ دریاؤں کے
 دل جس سے دہلی جا میں ہو وہ ختم۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا "دیری گڈ۔ یہ علامہ اقبال تمہارے
 لیے فرما گئے تھے۔ ہمیں چاہی نہیں تھا۔ پانی داوے" یہ لالہ جی
 کون تھے جس کے جگر میں تمہارے نام سے ٹھنڈک پڑنے کا حوالہ
 ہے۔ لالہ بری چند۔"

وہ چلی اور پھر چلی ہوئی داک آؤٹ کر گئی۔

"ٹھنڈکی کچھی۔ یہ ہمارے لیے سمیت پیدا کر دے گی" تیمور
 بولا۔

میں نے کہا "عورت جب سے پیدا ہوئی ہے یہی کر رہی ہے۔
 ہم خود اس سمیت کو گنگے لگاتے ہیں اور پھر دیتے ہیں۔"

"اس کی وجہ سے ہمارے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔"

"وہ مسائل پیدا کرے یا سمیت۔ مگر وہ اصل شاہ عالم کو پیدا
 نہیں کر سکتی۔ ویسے جتنے شاہ عالم چاہے پیدا کرے۔"

تیمور سکرانے لگا "ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"صحت سمجھو اس پر" میں نے کہا "میرے لیے رخصتی نے مسئلہ
 کھڑا کر دیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟"

"میرے ذیل دول کا۔ وہ جانا چاہتی ہے کہ جب میں اس کے
 ساتھ تھا تو پھر شاہ عالم منگا پور والی فلاٹ پر کیسے تھا۔ وہ ہنگامہ
 کرنے پر آمادہ تھی کہ اسے اصلیت بتائی جائے اصل شوہر سے
 ملایا جائے۔"

"اس نے جس اصل ماننے سے انکار کر دیا ہے؟"

"ہاں۔ اس کا خیال ہے کہ میرا مدیہ غیر فطری تھا۔ جب
 میں نے یادداشت کو جانے کا زور لگایا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ میں
 نقلی ہوں۔ اصل شاہ عالم باہر تھا اور باہر ہی رہا۔ وہ فون پر جو گفتگو
 اپنی بیوی سے کرتا تھا وہ ایک شوہر ہی کر سکتا ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہاں کوئی نقلی شاہ عالم موجود ہے؟"

"ہاں۔ اس کی یہ دلیل بھی وزن رکھتی ہے کہ اصل شاہ عالم
 بھی عمر و زکوٰۃ کو خود قتل کرنے نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے لیے کسی کو
 قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ شاہ کرا اور کام ہو جاتا۔"

"بالکل صحیح ہے اس کا اندازہ" تیمور بولا "اب تم کیا کر گئے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اصل شاہ عالم سے ملنا چاہتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے ملنا پڑے گا۔ آج نہ کسی کل۔ وہ مجھے شاہ عالم مانتے پر راضی نہیں، پھر شوہر کیسے مان سکتی ہے۔"

"شاہ عالم کہاں ہے اس وقت؟" تیمور بولا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ اسے خان اعظم انزپورٹ سے ہی کہیں لے گئے تھے۔ چنانچہ ان کے ساتھ تھی۔ اب ان کا فون آئے گا تو پتہ چلے گا۔"

"کیس انہوں نے؟" تیمور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میں نے کہا" نہیں تیمور۔ وہ شاہ عالم کو ایسے قتل نہیں کریں گے۔"

"پھر کیسے قتل کریں گے؟"

"میں نے کہا" اسے قتل کرنا ضروری نہیں۔ مگر اسے زندہ رکھنے میں بھی رک رک ہے۔ آخر اسے کب تک قید میں اور خاموش رکھا جا سکتا ہے۔ ابھی تو میں نے رشتی کو خاموش کر دیا تھا کیونکہ میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا مگر اس کا منہ بھی بیش کے لیے بند کرنا ضروری ہو گا۔"

"جیسا کہ لیے زبان بند کرنے کا تو ایک ہی طریقہ ہے۔"

"میں نے کہا" نہیں۔ دو طریقے ہیں جو سیاسی تاریخ میں بھی رائج ہیں اور عام زندگی میں بھی پابند یہ آواز ایسے ہی دیا جاتی ہے۔ رحمانہ طریقہ یہ ہے کہ بڑے خاموش رکھنا ہو اسے خاموشی سے شہر خوشامی میں لٹا دو کہ وہ آواز حق نہ ملنے کے لیے پوم شہر کا اغیار کرے۔ یا اسے کالا پانی "سابرہا" کسی جزیرے یا قلعے۔ یہ خانے یا مظلوم مقام پر زندہ میں ڈال دو جہاں اسے پانی یا درک کی طرح کچھ بھی کھنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ سنا ہے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ دیواروں سے باتیں کرے یا ان سے سر کر کے جان دے دے مگر میرے نزدیک یہ بھی خالانہ طریقہ ہے اور خاصا مشکل "مکھ اور خلیہ رنگ۔"

تیمور کے چہرے پر تشویش کا سایہ آگے گزر گیا "تم کیا کر گئے؟"

"خالانہ طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ پہلے شاہزادوں کی اور دشمنوں کی آنکھیں نکال لی جاتی تھیں۔ غلاموں کی زبان کاٹ دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی میرا طریقہ بھی ہو گا۔ ان رحمانہ اور خالانہ طریقوں کے علاوہ۔"

"اگر شاہ عالم اور اس کی بیوی کی طرف سے یہ عنایت حاصل ہو جائے کہ وہ کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔"

"ان کی طرف سے تم دے سکتے ہو یہ عنایت" میں نے کہا۔

"اور میری جگہ تم ہو تو اختیار کر لیتے؟ نہیں، میں شاہ عالم کو قتل کرنا بھی نہیں چاہتا اور اسے زندہ رکھنے کا خطہ بھی مول نہیں

لے سکتا۔ تیسرا طریقہ کیا ہو گا۔ یہ ابھی میں نہیں بتا سکتا۔ مگر ابھی کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل نہ ہو۔ فوری طور پر تو مجھے رشتی کو خاموش رکھنے اور خاموشی سے واپس لے جانے کا مسئلہ درپیش ہے۔"

میری جب میں رکھے ہوئے فون کی تھنی بچتے گی۔ میں تیمور کے ساتھ لاؤنج کے آخری کونے میں لگی ہوئی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے ہماری نگاہ کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے ریسپور آن کر کے کہا "ہیلو۔"

یہ کال میرے ایک نائب صدر جس کی تھی "سری۔ آپ بڑی خاموشی سے لوٹ آئے۔"

"میں نے کہا" جیسا میں سب ہی خاموش تھے۔ جس صاحب میں اکیلا شور مچاتا اور پیچ پکار کرتا اتنا قیود حاکم باطل خانے میں بھیج دیا جاتا۔"

وہ ہنسا "میرا مطلب تھا سر کہ آپ نے ہمیں بھی مطلع نہیں کیا۔ ہم آپ کے شاہان شان استقبال کرتے۔ جیٹ باجے کے ساتھ۔"

"مکھوڑے اور قاضی کو بھول گئے آپ۔ وہ کیا قریشی صاحب لائے؟"

اس نے ایک زبردست مصنوعی قہقہہ لگایا "اس کا آپ مکھوڑوں کے فعل لگا تھا اور دادا سائیں تھا۔ خوب کہا آپ نے۔"

"آپ جیٹ باج لائے تو قریشی ضرور اعلان کرنا کہ خاندانی اعتبار سے آپ میرا ہی ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے۔"

"مگر اخبار والوں کو معلوم ہو گیا" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"انہیں کس نے بتایا۔ سنا ہے وہاں انزپورٹ پر ہی پریس کانفرنس ہوئی تیمور لنگ نے۔"

"میں نے کہا" "میر تیمور۔ جس صاحب جنہیں تیمور لنگ کہہ رہے ہیں۔"

تیمور نے برا سانس دیا "ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا مجھے۔ جس کا آپ تھا۔"

جس گھبراہٹ بولا "سری۔ آپ بھی حد کرتے ہو۔ تیمور سے کہہ دیا آپ نے۔"

"تم نے تیمور کی بات سنی یا میں نے سنا؟" دیکھو جس صاحب میں چاہتا ہوں کہ اب ہماری سیاست میں کچھ حسانت اور شرافت آجائی چاہیے۔ آپ لوگ ماشاء اللہ تیمور (MATURE) ہیں۔ ایسی گھٹیا باتیں نہ بنیں جتنی میرے نائب صدر کہہ رہے تھے۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔"

"اور کچھ فرماتے ہیں آپ کہ کوئی اہمیت ہے؟"

"نہیں جناب اللہ لاہور میں ملاقات ہوگی۔ اس نے

خود ہی اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

میں نے ریسپور کو آف کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بجی۔ "شاید یہ قریشی صاحب ہوں گے" میں نے کہا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ قریشی کا لہجہ بھی شکایت آمیز تھا مگر خوش اندازہ کم اور جارحانہ زیادہ تھا۔ "آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ہم نائب صدر ہیں۔ ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ آپ نے اخبار والوں کو بلایا۔ ہمیں نظر انداز کر دیا، ضرور ہے اس لشکرے کی سازش ہوگی۔ کسی دن میں اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔"

میں نے کہا "تیمور۔ قریشی صاحب تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑنا چاہتے ہیں۔ تاریخ اور وقت ابھی نہیں بتایا۔ غالباً پھر سے بگڑے دستیاب نہیں ابھی۔"

قریشی نے فحش لہجے میں کہا "یہ تو بڑی غلط بات کی آپ نے۔ تیمور کو اور مجھے لڑانا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے کہا "جب تم اس کی دوسری ٹانگ توڑو گے تو کیا لڑائی نہیں ہوگی۔ کیا وہ دوستانہ طریقے پر ٹانگ آگے کرے گا اور ہمد میں مسکرائے گے کہ شکریہ قریشی صاحب تمہارے ہاتھ میں جدی پستی تجربے کی صفائی ہے۔ میں آپ کو وارن کرنا ہوں قریشی صاحب۔ ایک دوسرے کے خلاف ایسی گھٹیا باتیں بالکل بند کر دیں۔ میں پارٹی کے ہر حصے دار کو تنبیہ اور شرافت سکھانے کا وعدہ کر چکا ہوں۔"

"آپ تو یہ سب سمجھ آئے ہوں گے باہر سے؟" اس نے تھکی سے کہا۔

"نہیں۔ شرافت سے یہاں کوئی کام نہیں ہوتا۔ قریشی صاحب۔ اس قوم کی ترقی کا راز ڈنڈے میں مضمر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کمال آواز تک بحال نامہ سے کہیں تک سب نے گزری ہوئی قوم کو شرافت کے راستے پر ڈالنے کے لیے زہرا ہی استعمال کیا تو کامیاب رہے تھے۔ میں پارٹی کو شرافت کا چلن سکھائیں گا مگر شرافت ختم نہیں، امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

قریشی نے یقیناً میرے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیا ہو گا اور اسے کچھ عجیب بھی لگا ہو گا مگر میں اپنے انتہا پسندانہ عوام کی تھوڑی بہت تشہیر چاہتا تھا۔ جو حیران ہوتا چاہے حیران ہو اور پریشان ہوتا چاہے پریشان ہو کہ اب شاہ عالم بے ساداری وارنگ کی ڈنگنی جھاکے کون سا ناکیل شہر کرنا چاہتا ہے۔ مرد راز کی مڑ مڑ محض کر کے اس نے وہ قماش دکھائی تھا کہ سب کی عقل پکڑا لی تھی۔ اس نے سب کے سامنے دن دھارے مرد راز کے ٹھکانے پر لگی کے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا اور دیکھنے والے ابھی تک سپریت رہتے تھے مگر یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ شاہ عالم عین واردات کے وقت ہانگ لاکھ میں بھی کیسے موجود تھا۔ اور ہانگ لاکھ سے ٹکرا پڑا ہوا برا کر اپنی پٹا تھا تو لاہور میں اس نے کیا شہید دکھایا تھا کہ خود مرد راز سے ملاقات کی تھی اور اسے زبردستی کے ہمد

ملا وہ یں کے غائب بھی ہو گیا تھا۔ کیا اس نے اپنے مہزاد کو قابو کر لیا ہے؟ کیا وہ اپنی مدح کو جسم سے جدا کر کے اپنی مرضی کے مطابق کیس بیچنے اور اس سے کوئی بھی کام لینے پر قادر رہا ہے یا وہ اپنے جیسا دوسرا سامنے لا سکتا ہے؟ یہ نظر بندی ہی یا جادو تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ناگہن ہے۔

شاہ عالم نے خود کو سب سے بڑا مداری تسلیم کر لیا تھا۔ تیمور نے سارا کھیل خود کھینچا تھا اور کچھ لیا تھا۔ اس کھیل کو شروع کرنے والا بھی وہ خود ہی تھا لیکن کھیل شروع ہوجانے کے بعد ایسے ختم نہیں ہوا جیسے وہ چاہتا تھا۔ اس نے میرے لیے جال پھیلایا تھا اور اب خود اس میں پھنس چکا تھا۔

ہوئی کا عمل بھی کچھ کنفیوژن کا شکار تھا۔ وہ میری پریس کانفرنس سے خاصے مرحوب تھے ورنہ ضرور پوچھتے کہ سر یہ پکار کیا ہے آخر۔ آپ تو کل سے یہاں موجود ہیں۔ پھر آپ کے سنگا اور والی فلائٹ سے تشریف لانا چہ سستی دارد۔ اگر کوئی پوچھنے کی غلطی کرنا تو میں کتنا مشت آپ" اور بس۔

میں نے تیمور سے کہا "اب ہمارا یہاں کوئی کام باقی نہیں رہا۔"

اس نے سہلایا "اب تو لاہور جلد از جلد پہنچ جانا ضروری ہے۔ پارٹی کے لوگ بے چینی سے مستقبل کے لاکھ و مل کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مرد راز کے قتل نے ان کے لیے خاصی مشکلات پیدا کی ہیں۔ بہت سے لوگ جو توڑ اور سازش کا آغاز بھی کر چکے ہوں گے کہ موجود ہے یعنی اور بدگمانی کی فضا سے قانکہ اٹھاتے ہوئے جذبات کی مد میں بر جاتے والے کارکنوں کو توڑ لیں۔"

"وضاحت تو پہلے بھی کی جا چکی تھی۔ آج کی پریس کانفرنس کے بعد کوئی بے چینی کی فضا باقی نہیں رہنی چاہیے۔ کارکنوں کا اتحاد بحال کرنے کے لیے یقیناً میں کچھ کرنا ہو گا۔ کیا خیال ہے اگر ہم لہجے کے بعد روانہ ہو جائیں۔"

"جنور اہم" تیمور نے کہا "اب ہم نین ہی تو ہ گئے ہیں یہاں۔"

"ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر۔ میں دیکھتا ہوں رشتی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے کہا "طبیعت سے زیادہ اس کا موڈ خراب تھا۔"

رشتی ہوش میں آجانے کے بعد سخت اذیت اور اشتعال کی کیفیت میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کے آتش لٹھیاں کا خاسترہ کیسے والا لاوا تھا اور اس کے ساتھ ہی خود مل کے خاک ہو جانے کی رشت تھی۔ شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے شک کا اظہار کر کے خود اپنی موت کو آوازی دی تھی۔ اٹھائے راز کے بعد جلی شاہ عالم اس کے دعو کی کسی اخلاقی یا انسانی وجہ کو قبول کرنے کا رسک کیسے لے سکتا تھا۔

اسیب

اسیب خوف دہشت اور اسرار میں
دوبنی ایک خوفناک داستان۔
اسیب، ایک سرگرم بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جوازل سے جاری ہے اور ابد
تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۵۰ روپے

برادر است سنگھ لائے کا بیٹہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

فون: ۲۳۴۲۱۲

اسٹاکٹ: علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاکی پریسٹیج بکسٹال سٹال فنانس

کے سیاسی رفیق اور کارکن۔ اس کے حریف اور دشمن۔ سب
جو کاٹھا جاتے تھے۔
میں نے کہا: ”مگر تم۔ اس کی بیوی۔؟“
”میں اس کو سمجھتی تھی۔ چوری طرح نہیں مکر دو سوں سے
نزد۔ ہماری ازدواجی زندگی ایک مسلسل دھوکا تھی۔ میں اس کی
مادی ہو گئی تھی۔ ہر بیوی اپنے شوہر اس کے گھر، ماحول اور مزاج
کی عادی ہو جاتی ہے۔ یہ شہر شوہر بھی ہو جاتے ہیں اور مہوشی کے
ساتھ اس بندھن کو قبول کرتے ہوئے تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ وہ
خوش رہے پتا پھر یہ کامیاب ازدواجی زندگی تھی۔“
”یہ ذہنی سمجھوتہ ضروری ہوتا ہے۔ خوش رہنے اور نظر آنے
کا سمجھوتہ ہی نہ ہو تو کچھ لوگ ساری عمر ایسے ساتھ رہے ہیں جیسے
رہنے ایک ساتھ کائنات والے۔ ان میں بہت ہو تو وہ الگ ہو جاتے
ہیں۔“
”خوشی تو پھر بھی نہیں ملتی۔ جب بچپن سے ہی ساتھ
ہو جائیں۔“
”ہاں۔ خوشی تو تھا کاش یہ ہے۔ تم جانتی ہو ہمارے کتے ہیں۔ یہ
بک فرضی پرندہ ہے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس کے سر پر
بڑا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ جسے خوشی مل جائے وہ واقعی بادشاہ
ہوتا ہے۔ دور رساری مریضوں میں گزار دیتا ہے۔ بچکتے ہوئے اور
بڑی کے سراب کا تعاقب کرتے ہوئے۔ دوسروں سے خوشی کی
بات مانگتے ہوئے۔ خوشی خریدنے کی احتیاج نہ کر کے
ہوئے۔ تم نے اچھا کیا مان لیا کہ نہ تم شاہ عالم کے ساتھ بیوی کی
جست سے خوش نہیں اور نہ وہ تمہارا شوہر بن کے خوش تھا۔ تم
میں ایک دوسرے کو سمجھتے بھی نہیں تھے لیکن ساتھ رہنا ضروری
ہو گیا۔ آئندہ کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“
”مجھے نہیں کیا ہے میرے سوچنے کی بات ہے؟“
”تم اپنے شوہر کو چھوڑ کے خوش رہ سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔
”جی ہاں۔ میں اس سے!“
”وہ جی سے سترائی۔“ اس نے مجھ سے واضح الفاظ میں کہ
نا کر میں صرف اس کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہوں۔ میرے لیے
میں مانگنے کا مطلب موت مانگنے کے مترادف ہوگا۔ وہ نکالی
کی افزائش نہیں کر سکتا۔ اپنی نئی زندگی میں بھی یہ الزام قبول
کر سکتا ہے۔ مجھے اجازت ہے کہ مرنا چاہوں تو خود ہی کروں میری
ت کو آسان بنانے کے لیے میری ہر ممکن مدد کرے گا لیکن
میرے کرنے کے بعد یہ خود کسی کی واردات کسی چور یا ڈاکو یا سیاسی
ان کے کھاتے میں ڈال دی جائے گی۔ اس کے گھر سے اکیلے یا
ان کے ساتھ جانے کا انجام بھی یہی ہوگا پالا خر۔ ایک
نسل میں رشتہ کے سب گھروالے مارے جائیں گے۔ مان

”بانی۔ مجھے پانی دے دو تو ہوا سا چلیز!“ وہ بولی۔
”تھوڑا کیوں۔ ایک لیٹر، ایک گیلن، ایک پورا نیٹر پانی کا
ماہر ہے تمہارے لیے۔ کراچی میں سمندر بھی ہے۔“ میں نے
اسے فرج کی بوتل سے ایک گلاس پانی نکال کے پلایا۔ تھوڑا سا پانی
کناہوں سے اس کی گردن پر چھلکا اور پیچھا اڑ گیا۔
”تھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں جو بھی ہوں۔“
میں نے کہا میں شاہ عالم ہوں۔ جس میں مان لیتا چاہیے کیونکہ
دوسرا کوئی شاہ عالم اگر کہیں تھا تو وہ تمہاری مدد کے لیے نہیں
آ سکتا۔“
”کیا تم نے۔ اسے مار دیا ہے؟“
”نہیں۔ ابھی مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کے
ہاتھ بھی مکھل دیے۔
اس نے اپنی کلائیوں کو ملا۔ اس کے اُبلے گلابی گوشت میں
بلکے نیل سے بڑے تھے۔ پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے
نیچے دیکھتے ہوئے اپنے پیروں کے بندھن کھولنے کے لیے اٹھ
پڑھا۔
وہ اب بھی ڈری ہوئی تھی ”شاہ عالم تم مجھ سے کیا پوچھنا
چاہتے تھے؟“
میں نے کہا ”ہاں۔ یہ بتاؤ کہ اپنے موجودہ دوسرے سے میں
جس کا کیا لگتا ہوں۔ وہی شاہ عالم جو تمہارا شوہر تھا، تھا کیا؟“
اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں نہیں اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں
کہہ سکتی۔“
میں نے کہا ”مکمل ہے۔ تم اپنے شوہر کو نہیں پہچان سکتیں۔“
اس نے ایک لمبی سانس لی ”میت کی بد قسمت بیویاں ہوتی ہیں۔
میں میرے جیسی جو ایک سو کو پکارتی ہیں۔ وہ مروان کے ساتھ رہنا
ہے۔ ان کے بچوں کا پاپ بھی ہوتا ہے مگر اسے بچانے کا دعویٰ پھر
بھی نہیں کر سکتیں۔“
”ایسا تو پیروں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہر شخص کی
ظاہری شخصیت کے پردے میں اصل شخصیت پوشیدہ رہتی ہے۔ وہ
اچانک سامنے آجاتے تو وہ بالکل ایسی محسوس ہوتا ہے۔ بعض
اوقات وہ کسی کے سامنے نہیں آتے۔ اکیلے میں نظر آتے ہیں۔
بالکل الگ کسی دنیا میں جہاں اس کو بچانے والا ہی نہیں ہے۔
تمہارے شوہر کے ظاہر میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟“
”مجھے نہیں۔ ایسے ہی وہ بھی رہتا تھا میرے ساتھ۔ وہ
کیا وہ بھی کر سکتا تھا۔ وہ بھی کوئی عام شریف توی نہیں تھا۔
مجھ سے متشکل بلکہ نامکمل تھا۔ میرے لیے بھی نہیں ہو سکتا
لیے بھی۔ ان سب کے لیے جو اس کے سامنے دوست۔“
”اس کا دوست کون ہو سکتا ہے جو کسی کا دوست نہ ہو۔“
”ہاں۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرنا تھا۔ جو اس پر اعتماد کرے
بے وقوف ہوتا تھا۔ اس سے کامیابی قطع رہنے والے تھے۔“

”ڈیئر فرینڈ“ میں دواؤں بند کر کے صوفے پر بیٹھ گیا ”مجھے تو
ایسا وہی نہیں تھا کہ تم اتنے دیر کے ساتھ لائی ہو۔ خیر اچھا ہوا کام
آگئے۔ ان کے ساتھ سوٹ بھی ضرور ہوں گے۔ سب شائع جائیں
گے۔ میرا مطلب ہے تم نے نہ چنے تو دینے ہیں گے ستارے ہی کو
اتنے اچھے سوٹ۔ وہ رکھ دیتے ہیں لاوارث لڑکیوں کے چیزیں۔
پس لے لے اس آئرن کو بھی کوئی دیکھ۔ کیا بھی تم نے کورے لٹھے
کا سوٹ پہنا ہے۔ کون نہیں۔“
اس کے بدن میں گھڑی سی پیدا ہوئی۔ وہ میری بات کا مطلب
سمجھ گئی تھی۔
”مزد و صاف کے لیے میں نے کہا۔ تم بڑے بڑے گھروں میں
ری ہو۔ ان کو گھر کتنا بھی ان کی توہین ہوگی۔ وہ بچکے اور کولیاں
جس یا مل تھے۔ بڑے بڑے وسیع آرامت اور ہر تکلف بڑے۔
کیا تم ایک کمرے کے تاریک گھر میں رہنے کا تصور کر سکتی ہو؟ جس
میں نہ کڑی ہو نہ روشن دان۔ اندر مکمل اندھیرا ہو اور کپا فرش۔
بکی دیواریں جن میں سے کڑے کوزے، ٹیبلٹ اور کچھ۔
کن سجورے اور کچھ تک نکل آتے ہوں۔ اور وہ کراچی میں اتنا
ہو۔ چھ ساڑھے چھ فٹ لمبا اردو ڈھائی فٹ چوڑا۔ اور اتنا اونچا
کہ آدھی چاہے بھی تو اس میں سیدھا نہ بیٹھ سکے اور آس پاس ہو
دیر اندہ۔“
اس کا جسم بھی طرح کا بنے گا۔
میں نے کہا ”ہو سکتا ہے کہ جس میں اس ہوٹل کے کمرے سے
دوہیں شفت ہو جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اس وقت کو مال
دو۔ اپنے لیے کچھ صلت حاصل کرو۔ جس صلت سکتی صلت چاہیے۔
ایک دن یا ایک ہفتہ۔ ایک ماہ و سال یا ایک عمر۔ اس کا انحصار خود
تمہاری خواہش اور کوشش پر ہے۔ ابھی میں تم کو ایک موقع دوں
گا۔ جس تم سے کچھ سوالات کروں گا جن کا جواب تم اپنی زبان سے
دوگی۔ زبان کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے حلق
سے نکلنے والی آواز ہی آخری آواز ہو جو تمہارے کانوں تک پہنچے۔
آج کل دوش بے گلے میں ڈال لیا جاتا ہے۔ مگر یہ کون سا شخص
ہے۔ دوش بے گلے میں ڈالنے کا۔ ٹیک لٹ اڑی۔ تمہاری صراحتی وار
گردن ہٹنا زک ہے اور میرے ہاتھ دیکھے ہیں تم نے یہ دیکھو۔“
میں نے ٹاپ کوئل کے کمرے میں بیٹھنے سے قانع ہو کر صوفے کا
اچھا خاصا منہ بواؤں باز دور سامان سے ٹوٹ گیا۔ ”اس صوفے کی قیمت
پچھلے ایک لاوارث لاش کے ٹکڑے دفن کے خرچ سے زیادہ ہوگی۔ مگر
کوئی بات نہیں۔ میں ادا کر سکتا ہوں۔“
میں نے اس کے منہ میں ٹھوسا ہوا وہ پیلے نکالا پھر اس کی
گردن میں پھندے کی طرح بڑا ہوا دوش بے گلے دیا۔ وہ لمبے لمبے
سانس لینے لگی مگر اس نے کوئی جھنجھٹ نہیں ماری۔ مدد کے لیے چلانے
کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک کمرے کے پیچھے بندھے
ہوئے تھے مگر وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

باپ بھائی بس 'شاہ عالم بال بال' جے جانے گا۔ رشتہ کو قاتل اغوا کر کے لے جائیں گے اور کانون کی رقم کا مطالبہ پر راند ہونے پر مار دیں گے۔ چند دن یا چند ہفتے بعد۔ جیسے ہی میرا سراغ ملا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بہت بزدل اور کمزور عورت ہوں میں۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسی باتیں کر کے مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے۔

"تم واقعی اتنا زور قوتی ہو مجھ سے" میں نے کہا "فرض کرو میں یہ کہوں تم کو اجازت ہے مجھ سے طلاق لے لو اور جہاں چاہو جس کے ساتھ چاہو خوش رہو۔"

شاید اس نے یقین کر لیا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں مگر اس کا شہر نہیں ہوں۔ میرے سوال پر وہ چوکی اور پھر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "تم میرے ساتھ ایسا کھیل کیوں کھیل رہے ہو آخر مجھے صبر کے عذاب میں مبتلا رکھنے سے کیا حاصل۔ بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم میرے شوہر ہو یا نہیں؟"

"میں شاہ عالم ہوں" میں نے کہا۔

"میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا تھا۔" وہ بولی۔

"کیا وہ مرد اس حد تک ایک ہو سکتے ہیں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے بالکل ایک" اس کے علاوہ۔ جب سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے جس پتھر ضرور ہے۔ مگر اس طرح جیسے کوئی اجنبی مرد سارا دینے بد کرنے اور بچانے کے لیے عورت کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ انہیں اٹھا لیتے ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔"

اس نے ایک غصہ سی سانس لی "میرا شوہر بھی ایسے ہی رہتا تھا میرے ساتھ۔ جب بھی وہ گھر آتا تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو بار تو اس کے روتے میں طلب کی کوئی بے قراری چاہت کی کوئی خواہش یا قوت کے احساس کی کوئی خوشی نہیں ملتی تھی۔ اکثر وہ تھا ہوا، ہزار ہوتا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ جلد از جلد منہ لپیٹ کر سو جائے۔ اس کا اندر یہ ہوتا تھا کہ کئی دن سے نیند پوری نہیں ہوتی۔"

"میں غلط نہیں کرتا تھا۔ دن بھر رانی کے کام۔"

"پانی کے کام" وہ طعنے بولی "رات کو جو پارٹیاں ہوتی تھیں، نیند کی کمی وہاں پڑتی تھی۔ دن میں تو سب ہی کام کرتے ہیں۔ جب کوئی باہر سے پیٹ بھر کے آئے تو گھر میں کھانے کی خواہش کہاں رہتی ہے۔ اس کے لیے میں اپنے ہاتھوں سے من پسند چیز سامنے رکھوں تب بھی وہ بس ذرا رہی کرتا تھا۔ کیوں کرتے تھے تم ایسا؟"

میں نے کہا "میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"میری ہر چیز جو تمہیں پسند تھی اب بڑی گنتے لگی تھی۔ میرے کپڑوں کا رنگ۔ میرا ہیرا اشیاں، ایک سینک کی فلم، آخر کیوں؟ تم میرے شوہر ہو تو بتاؤ مجھ سے اتنا کچھ پوچھنے کے بعد مجھے تو معلوم ہونا چاہیے۔" اس نے میرا کریان پکڑ لیا۔

میں نے اپنے آپ کو چمکرایا۔ "وکیو" میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔ میں تمہارے کسی سوال کا کیا جواب دوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاہ عالم بے وقوف اور بد نصیب تھا۔ تم جیسی بیوی ہو کسی کی تو اسے کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت کا مطلب بدلنا خوب جانتے ہو تم مرد۔ حالات کے ساتھ تمہاری ضرورت کے پیمانے اور معیار بدل جاتے ہیں۔ ہر عبت پہلے ایک جذباتی ضرورت ہوتی ہے پھر عبت کا مطلب جسم کی طلب رہ جاتا ہے۔ اور تم ایک کے بعد دوسری عبت اور پھر تیسری عبت کرتے ہو۔ پھر عبت کو ایک عادت یا معمول بنا لیتے ہو۔"

میں نے احتجاج کیا "سب مردوں کو سو درالزام قرار دینا زیادتی ہے۔"

اس نے سہلایا "عام مرد مجبور ہوتا ہے۔ وہ ایک بیوی کے ساتھ وفادار نہ رہے تو کیا کرے۔ تمہی کار فکری تھکے یا اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھنے کے شوق کی طرح عبت کا شوق بھی دیکھنا ہے۔ عام آدمی اگر خاص ہو جائے تو پھر اسے بھی وفاداری کی مجبوری لاحق نہیں رہتی۔"

"تم وفاداری نام کی کسی چیز کے وجود سے انکاری ہو؟ اور تمہارے خیال میں فیض نے ٹھیک کہا تھا۔"

مجبوری دو عوائے گرفتاری الفت دست = سنگ آمدہ بیان دفا ہے۔

"تم واقعی میرے شوہر نہیں ہو۔ اب مجھے یقین آ گیا" وہ بولی "نہ وہ فارسی جانتا ہے اور نہ اسے شعرو شاعری سے لگاؤ ہے۔"

"جہلی آدمی کیسے نہ کہیں پکڑا جاتا ہے۔ خواہ خرابی کے باعث پکڑا جائے یا خوبی کی بنا پر" میں نے کہا۔

"شاہ عالم مجھے بتاؤ کہ میرا شوہر کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے یا نہیں؟"

"ابھی وہ زندہ ہے" میں نے کہا "شاہ عالم کی جگہ میں نے لے لی ہے مجبوراً مگر تمہارے شوہر کی جگہ میں کیسے لے سکتا ہوں؟"

"ہوس اقتدار کو تم مجبوری کا نام دے سکتے ہو۔ ظاہر ہے تم زیادہ جلاک اور طاقتور تھے اس لیے کامیاب ہو گئے۔ کسی نے مگر پوائنٹ پر نہیں کہا ہو گا کہ تم شاہ عالم بن جاؤ۔"

"میں پوائنٹ پر شاید میں انکار بھی کر دیتا۔ میرے سامنے جس سے زیادہ خطرناک صورت حال تھی۔ شاہ عالم یعنی تمہارے طور کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ اس نے گڑھا میرے لیے گھورا تھا مگر خود اس میں گر گیا۔ اس وقت وہ ہماری قید میں ہے۔ اسے کوئی موقع تھا کہ وہ اپنا دفاع کر سکتا۔ اس کے فرار ہونے یا اپنے آپ کو کسی کو اطلاع دینے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔"

"وہ پریشان نظر آتے لگی" تمہیں اس کے ساتھ کیا گھرے؟

"مجھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم اس کا مستقبل ظاہر

تاریک ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم اس زندگی پر خود موت کو ترجیح دے یا ایسے حالات پیدا کر دے کہ ہم اسے مار دیں۔"

"میں تم ایسا نہیں کر سکتے" وہ چلائی۔

میں نے کہا "خوشہ۔ سیاست کا کیا چلن ہے۔ اس میں کوئی اخلاقی مسئلہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ اقتدار کی جنگ میں رشتے حاکم نہیں ہوتے" تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ میں اسی لیے تم کو صاف صاف بتا رہا ہوں تاکہ تمہیں فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔ تمہارے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ تم رواجی دقا شعرا اور شوہر پرست بیوی کی طرح اس کے ساتھ رہو۔"

"میں اس کے ساتھ رہوں گی۔"

"خواہ وہ کیسے بھی رہے مثلاً پاگل ہو کے۔"

اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "پاگل ہو کے کیوں؟"

"کی تو مسئلہ ہے" میں نے کہا "تم کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر اسے زخمہ رہنے کی اجازت دی جائے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اس کا اپنے نامی سے کوئی رشتہ کوئی شعل باقی نہ رہے۔"

"مگر وہ خاموش رہنے کا وعدہ کرے؟"

میں نے ہنس کے کہا "جو ایسے وعدے پر اعتبار کا خطرہ مول لینے پر راضی ہو وہ بھی پاگل ہی ہو گا۔ میرے معینہ مدت تک اس کو قید میں رکھنا بھی مشکل ہے، خطرناک بھی۔ اور خواہ خواہ کا دور سر بھی۔ انسان طریقہ تو یہ ہے کہ ایک شاہ عالم ختم کر دیا جائے۔ اصل نقص کا پکری نہ رہے۔"

"خدا کے لیے۔ اتنے سفاک مت بنو۔ رحم کرو مجھ پر۔"

"دوسرا حوالہ طریقہ یہ ہے خاتون" میں نے اٹھ کے بیٹھے ہوئے کا ہنر ہم اس کو ایک نئی شخصیت دے کر تمہارے حوالے کر دیں۔ یا دماغی اس کے لیے عذاب نہ ہو۔ اس لیے ہم شاہ عالم سے اس کا حافظہ چھین لیں۔ وہ بھول جائے کہ وہ کون تھا، کون سے وقت کی ایک یاد کی پھر جانیں بھی اسے پریشان نہ کرے۔ پھر اسے اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔"

"تم۔ خواہ اسے پاگل کر دو گے؟"

"ہرین دافک ایک سائنس ہے۔ اس کو میڈیکل سائنس کی ایک سیاسی شاخ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی شخص کے ذہن سے انکڑ کشی کی کتاب کا ہر صفحہ ہر سطر کی ہر سطر کا ہر لفظ ایسے لکھا جاتا ہے جیسے بلیک بورڈ پر ڈسٹر پیر کے چاک کی تحریر صاف لکھی جاتی ہے۔ پھر اس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا ہے یا اسے بلیک بورڈ جاسکتا ہے۔ یہ گواہ تمہاری شوہر مگر ممکن ہے وہ خود کو برا نظریا علماء الدین کے۔ باپ کا نام بھی کچھ اور بتائے۔ تمہیں کئی نہیں رکھا مجھے۔ اسے یہ یاد ہو کہ وہ سنڈی باؤ الدین میں اعلیٰ تھا۔ یا چنڈی میں آٹا چلاتا تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔"

اس نے اپنا سر تھام لیا "وہ میرے خدا۔ میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "اس کا ساتھ نبھانا تمہارے لیے سخت آزمائش اور عذاب کا مسئلہ ہو گا اگر تم پہلے خوش نہیں تھیں تو آئندہ کیسے خوش رہو گی۔ لیکن تم کتنی ہو اس بد بختی کی زندگی سے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس سے طلاق لے لو۔" میں نے کہا "بھائی ہوش و حواس وہ تم کو چھوڑ دے۔ پھر تم اپنی زندگی جہاں چاہو جس کے ساتھ چاہو گزارو گے۔"

"جو کہتا ہے کہ ڈالو۔" وہ رونے لگی۔

"تمہارے لیے اور تمہارے خاندان کے لیے سبقت زندگی سے کھل لاشعقی ہی تحفظ کی ضمانت ہو گی۔ شاہ عالم کا کوئی حوالہ صرف تمہیں نہیں سب کا مشکل میں ڈال دے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کبھی کوئی تمہیں اکسائے کہ یوٹو بول کہ لب آزاد ہیں تیرے اور یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور میرا قانون ہے تمہاری حفاظت کے لیے۔ عدالت ہے اور فوج ہے۔ اور تم ہمارے بن کے کوئی پریس کاغذیں کر ڈالو۔ بس یہ بات کبھی مت بھولنا کہ جنگ کا قانون ہو تو شہر کی جگہ اس سے زیادہ طاقتور شہری لے سکتا ہے۔ اور نو مزی کچھ۔۔۔ قبضہ کرنے والے شہر کو جنگ سے بے دخل نہیں کر سکتی خواہ اس کی حمایت میں جنگ کے سارے خرگوش مگید اور بندر تھو۔۔۔ رہ جائیں۔ ابھی وقت ہے تمہارے پاس۔ سوچ لو کہ تم کیا کرنا چاہو گی؟"

"میں پاگل ہو جاؤں گی۔ سوچنے سے کیا ہو گا؟"

"ہم دوسرے کا کھانا کھا کے واپس جا رہے ہیں۔ اگر تم نے اسی طرح سڑک یا جیسے آتے وقت کیا تھا تو سب پریشانی سے بچ جائیں گے۔ ہم بھی تم بھی اور تمہارا شوہر بھی۔ ایک تجربہ تم کو ہو گیا۔ امید ہے تم حکم عدولی کی حمایت نہیں کرو گی۔ تمہاری خاموشی مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہے۔ کیا میں تمہیں انکشاف لگا کے اسی طرح لے جاؤں جیسے کرمل خان اور عرس خان تمہارے شوہر کو لے گئے ہیں۔"

اس نے ہلکا کے کہا "کرمل خان۔۔۔ کون۔۔۔؟"

میں نے کہا "وہی جس کو تم ڈراؤر بھجھتی تھیں۔ ابھی تک میں نے اس سے زیادہ بے ضرر اور اس سے زیادہ خطرناک آدمی نہیں دیکھا۔ اس کی پوتی کھانی خان ہے۔ شاہ عالم کا تخت اٹھنے کی سازش ان کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ چندا۔۔۔ میرا مطلب ہے کھانی خان بھی ایسی چیز ہے کہ اکثر لوگ اس کے حسن اور مصومیت سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ان کی عقل ماری جاتی ہے۔ پھر وہ خود مارے جاتے ہیں۔ وہ تمہارے شوہر کو از پورٹ سے ہی لے گئے تھے۔ ایسے نہیں۔"

"اس وقت۔۔۔ کہاں ہیں وہ؟"

"مجھے انہی کے فون کا انتظار ہے۔ کیا تم نے میری بات سمجھ لی ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے میرے شوہر سے ملنے کا موقع ملے گا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ملنے کے بعد ہی تم صبح فیصلہ کر سکو گی کہ تمہیں اپنی زندگی اس کے ساتھ گزارنی چاہیے یا نہیں۔ بس ایک بات کہی مت۔ بھلا کہ تمہارا شوہر کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ شاید تمہاری وجہ سے اس کو شاہ عالم سے کچھ اور سائے کے بعد چھوڑ دیا جائے۔ ورنہ سیاست میں شوہر کے کیے کی سزا یہی ہے۔ بچوں کو بھگتی ہی پڑتی ہے۔ تم بھگدیش کے شیخ حبیب الرحمن کی مثال لے لو۔ شاہ ایران کی یا مارکوس کی۔ تمہارا شوہر اور تم پہلے مراٹھ پر سے گزرو گے، راجی لکھنؤ کی گنجائش نہیں ہے تمہارے لیے۔ جہاں بھی انقلاب آتا ہے یا کسی کا تختہ الٹا جاتا ہے وہاں انسانی جانوں سے زیادہ اقتدار کا تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ تختہ اٹھنے والے رحم دل نہیں ہو سکتے۔ تم یا تمہارے گھروالے 'شاہ عالم کے اہل خانہ' سب غیر محفوظ ہیں۔"

میں نے کہا "تم کو سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی جنگ ہے۔ جنگ میں جب آبادی پر بم گرتا ہے تو سب ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بوڑھے اور عورتیں۔ اسکولوں میں پڑھنے والے بچے اور اسپتالوں میں لیٹے ہوئے مریض۔ امام اور پاروی۔ ہر مذہب ان کے قتل کی ممانعت کرتا ہے۔ جیہذا کونشن کی قرارداد بھی یہی کہتی ہے مگر ایسا ہم ابھی تک ایجاد ہی نہیں ہو اچھا۔ ظالمین اور مزاحمت کرنے والے دشمن کو ہلاک کرے اور دودھ بچ جائیں جو اسن چاہتے ہیں۔ میں بلا سب زہریلی ہند نہیں کرنا۔ مگر رحم دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قابل و معاف کرنا بھی میرے نزدیک جرم ہے۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ابھی مجھے شاہ عالم کے جرائم کی سمجھ نہیں آئی۔ شاہ عالم کے ساری صورت حال اب تمہارے سامنے ہے۔"

میری باتوں سے اس کا حوصلہ انتہائی پست ہو گیا تھا۔ وہ شدید مایوسی اور زچہ پیش کا شکار تھی۔ اچانک زندگی کا مفہوم اور مستقبل کا تصور بدل گیا تھا۔ اسے اپنے شوہر کے روپے سے بہت شکایت تھی مگر اس نے بھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ سارے مین و آرام عزت اور شہرت اسی کی زندگی سے مشروط ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایمان اقتدار کی راہ پر مسلسل آگے بڑھنے والا اچانک سازش کا شکار ہو کر اپنی غلطی سے قاتل ہلاکت میں گر جائے گا اور اس کے سارے خواب بھن جائیں گے۔ سیاسی جوئے میں شاہ عالم پانسہ بٹ جانے سے بازی ہار گیا تھا۔ پھر رشتہ دہانی گھٹت کیسے قبول نہ کرتی۔

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ میں نے اور تیمور نے اپنے کمرے میں ہی دوسرا کھانا منگوایا تھا۔ رخصتی نے اسے دکھا تک نہیں۔ دو بجے خان کی کا فون آیا جب پورے ہمارا اسباب بچے لے جا چکا تھا اور ہم روانہ ہونے ہی والے تھے۔

میں نے کہا "سہی۔ بڑی سخت گزیر ہو گئی ہے۔ میرے لیے دعاے مغفرت فرمائیے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"پہلے میرے پیٹ میں سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے غور سے سنا تو آنتیں قل ہو انا پڑھ رہی تھیں۔ اب انا کھانا ہے کہ ہائے اللہ کا شور مچا رہا تھا۔"

"میں نے لپٹنے سنے یا سنانے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔"

"میں سب آپ فضیلت میں دقت ضائع نہیں کرتے۔ لطیفہ سُن کے تو مسکراتا یا ہنستا پڑتا ہے۔"

"ہم نرین سے لاہور جا رہے ہیں۔ ایک یوگی کا الگ کپار ٹنٹ ہے ہمارے پاس۔"

"کافوری کلاس میں دو روزے کے ساتھ ہی الگ کپار ٹنٹ ہوتا ہے۔ اس میں دل و دھوبھی ہوتے ہیں۔ میں باز نہ آیا۔"

"اے سی سلیم میں چار برس تھیں حاصل کر لی ہیں میں نے اس کپار ٹنٹ میں دو سفر تھے۔ ہماری درخواست پر وہ دوسری جگہ شفٹ ہو گئے۔"

"یہ تو برا تھیں مسئلہ پیدا ہو گیا آپ کے لیے۔ ایک برقع ہو گئی چندا کی دوسری میری۔ باقی دو پر آپ اگلے کیسے سوئیں گے؟"

"تم کتنی دیر میں روانہ ہو رہے ہو؟"

"دیر تو آپ کی وجہ سے ہو رہی ہے خان جی۔ نہ آپ فون کرتے نہ مجھے رکن پڑا۔ وقت کی کوئی قدر نہیں ہے آپ کو۔"

"لوکیشن کرنا کہ نرین سے پہلے لاہور پہنچ جاؤ اور ہمیں ریسے کرنے آ جاؤ۔ تمہاری گاڑی ہو تو سہرے۔"

"رازمی ہو تو سہرے؟ آپ کتے ہیں تو رکھ لینا ہوں۔ آج بھی شیو نہیں کی تھی۔"

"اور کچھ کتنا ہے؟"

"کھانا تو ہے مگر آپ سے نہیں گرد نواح میں چندا ہے تو۔"

چندائے کہا "بھلی آدمی۔ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "چندائے میں تم سے قربت۔ میرا مطلب اعلیٰ ہو رہی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے مگر قسمت کے کھٹے گٹھائیں جاسکتا۔"

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آہ نادان اور بے خبر حیدر۔ ابھی تم کو اندازہ ہی نہیں کہ تم پر کیا امدہ ناک حادثہ گزر چکا ہے۔ تم نے تو سوچا تھا کہ میرے جیٹا شہزادہ گھنٹام اور مٹالی شوہر مل جائے گا جس لائری میں مگر انسانی کہ لائری کسی اور کی شکل آئی۔ میں اب تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ریڈی میڈ بیوی مل گئی ہے۔ تم سے لاکھ روپے بہتر نہیں مجبور ہوں۔"

"تم اپنا تھکس مجبور رکھ لو۔ وہ نہیں۔"

"تمہاری بیوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم صدے سے پاگل ہو گئی ہو لیکن چندا! آج بے وقوف کون ہوتا ہے کہ اس کے سامنے جین دوست رکھا ہو اور وہ اپنے جین میں خود خندے پکائے کھا کر صرف اس لیے کہ غصوں کا دل ٹوٹ جائے گا اگر اس نے۔"

خان جی نے کہا "ایک بات بتانا بھول گیا تھا میں گاڑی ہے تیز گاڑی کی گھر جا رہا۔" پھر فون بند ہو گیا۔

"انوکھی جی" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ نہ جانے کب ریسے ردا دہائی کو پکڑا تھا۔ اور دادا صاحب نے بھی غصوں کی دل آزاری کے طعنے پر کچھ نہیں فرمایا کہ یہ کیا کواں ہے۔

ہم ڈھائی بجے روانہ ہوئے۔ نرین اگر لیٹ نہ ہو اور وقت پر پہنچ جائے۔ جیسا کہ غلطی سے سال چھ مہینے میں ایک بار ہو جاتا ہے تو خیر کام لاہور تک کا قافلہ اٹھانے میں طے کر گئی ہے۔ اس سے بھی کم وقت میں سڑک کے راستے لاہور پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم بغیر ٹکے سفر کریں اور رفتار بھی کم نہ ہو۔ لیکن ہمیں دو تین گھنٹے کا انسانی وقت مل گیا تھا۔ تیز کام شاید چوبیس گراہی کیٹ سے چلتی تھی۔ اس وقت تک ہم حیدر آباد سے بھی آگے ہوں گے۔

واپس میں بھی ہمارے ساتھ اسباب سفر تھا۔ میں نے ایک تھراپس میں گرم پانی لے لیا تھا تاکہ جب ضرورت محسوس ہو کانی بنا کے پی لوں۔ رخصتی نے خودی قربان کی کہ اسے بھی سکون اور گولیاں فراہم کر دی جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے سڑک کا زیادہ حصہ... سیٹ پر سو کر گزار دیا۔

اگر چندا ساتھ ہوتی تو میں آدھے راستے ڈرائیو تک کرتا۔ آدھا راستہ تیمور گاڑی چلا دیتا چندا خودی میری مدد کر سکتی تھی۔ میں کسی قسم کا خلصہ مول نہیں لینا چاہتا تھا کہ میں تیمور پر بھروسہ کر کے سو جاؤں اور تیمور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رخصتی کے ساتھ مل کے میرا سارا منصوبہ ناکام بنا دے۔ میری آنکھ کھلے تو چاہے کہ میدان حشر میں ہوں یا کسی قید خانے میں بندھا پڑا ہوں۔ شاہ عالم کا تختہ پھریا ہوا گیا ہے اور میرا کام الٹا ہو گیا ہے۔

مجھے خیال آیا کہ سفر میں خان جی نہ ہوتے اور چندا میرے ساتھ ہوتی تو میں اٹھانے گھٹنے گاڑی بھی چلا سکتا تھا اور زبان بھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تیمور گاڑی چلا کر رخصتی آگے اس کے ساتھ ہوتی اور پچھلے سیٹ پر چندا کے ساتھ میں۔

دوسرا خیال فوراً ہی آیا۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے۔ چندا ابھی ریلے اسٹیشن پر موجود ہے۔ میں خان جی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ چندا کو میرے ساتھ کر دیں یا خود میرے ساتھ چلیں۔ میں اٹھانے گھٹنے تک مسلسل گاڑی چلاؤں گا تو ہو سکتا ہے لاہور کے بجائے عدم آباد پہنچ جاؤں اور یہ انتہائی معقول اور جائز معاملہ ہو گا۔ خان جی خود میرے ساتھ ڈرائیو تک کی ڈیوٹی شیئر کرنے میں

آئیں گے۔ اس طرح انہیں چندا کو شاہ عالم کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا اور وہ اکیلا اس مشکل ڈنٹے واری سے کیسے نکلے گی خان جی یقیناً چندا کو میرے ساتھ بھیج دیں گے۔

میں نے گاڑی کا سٹینڈ اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ گاڑی کو میں نے گیٹ کے قریب روکا اور تیمور کو اندر بھیج دیا کہ خان جی کو تلاش کر لائے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد خان اعظم نمودار ہوئے۔ کیا بات ہے؟

میں نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو نہیں چندا کو گولیاں دیا تھا۔"

تیمور نے کہا "مگر مجھ سے تو تم نے کہا تھا کہ کرل خان کو بلاؤ۔"

میں نے اسے کینہ توڑ نظروں سے دیکھا "چھا۔ غلطی سے کہہ دیا ہو گا۔ خیر آپ آگے ہیں خان اعظم تو اس ناچیز کی فریاد سن لیں۔"

انہوں نے میرا مسئلہ سُن کے سر ہلایا "تم نے اچھا سوچا۔ میں ابھی آتا ہوں چندا کو کتا کے۔"

میں نے کہا "آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔"

"بھئی میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔ تجھے اکیلا واقعی نہیں جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر کیا چندا سنبھال سکے گی 'شاہ عالم' کو۔ آپ کو ہونا چاہیے اس کے ساتھ۔"

وہ میری صورت دیکھ کے مسکرائے۔ "اچھا اچھا۔ میں چندا کو بھیجتا ہوں۔"

"تم محبت کرتے ہو چندا سے؟" رخصتی نے پیچھے سے سوال کیا۔ "نہیں" میں نے کہا "وہ محبت کرتی ہے، مجھ سے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسے دو کونٹوں سے ضرب دی جائے یا تین کو دو سے۔"

میں منٹ بعد بھی چندا نہیں آئی تو میں نے تیمور کو پھر اندر بھیجا۔ "دیکھ کے آؤ کیا مسئلہ ہے؟"

"تمہاری بے قراری سے یہ ظاہر ہوتا ہے؟" رخصتی بولی۔ "ظاہر نہیں۔ ثابت ہوتا ہے کہ میں نے کواں فرمایا تھی۔"

میں ہی محبت کرتا ہوں اس سے "میں نے کہا۔"

انتظار میں آدھے گھنٹے کا مشکل وقت کاٹنے کے بعد میں نے خود اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں رخصتی کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتا مگر اس وقت تیمور نمودار ہوا۔ اس کی صورت پر بار بار بچے ہوئے تھے۔

اس نے مجھے بتایا کہ کرل خان اور چندا دونوں کا کیس پنا نہیں۔

میں نے کہا "تیسرے صاحب دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو غائب ہو سکتی ہیں مثلاً گھر کے سرے سے بیگ۔ میری طرف ایسے مت دیکھو۔ میرے بیگ تھے ہی نہیں۔ اگر تم خان اعظم کو جن اور مس خان کو چڑیل سمجھتے ہو جو غائب ہونا چاہتے ہیں تو پھر مجھے بھوت مان لو۔ درنہ تسلیم کرلو کہ قصور تمہاری آنکھوں کا ہے۔"

"میری آنکھیں ٹھیک ہیں" اس نے ناگوار سے کہا۔

"پڑھتے وقت مجھے چشمے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ہوں۔۔۔" میں نے سوچ کے کہا "کیا تم جاہلیت کر سکتے ہو کہ جب تم انہیں تلاش کر رہے تھے تو تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں؟ آنکھ اور کھل پناڑا جمل۔"

وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تمہیں یقین نہیں تو نہ، جا کے دیکھو۔"

میں نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اس خیال سے کہ وہ تمہیں بھی نہ ملے تو کیا ہو گا؟"

"نہیں۔ اس خیال سے کہ تم میری بیوی۔۔۔ سو رہی۔۔۔ رخشندہ کو لے کر بھاگ گئے تو کیا ہو گا۔ بستر کی ہو گا کہ میں چندا کو بھول جاؤں۔ کسی اور سے دل لگاؤں۔"

رخصتی نے طنز سے کہا "واہ۔ کیا محبت ہے۔"

میں نے اس کی طرف ڈھٹائی سے دیکھا۔ "کیا کر سکتا ہوں اس کے سوا میں۔ یہ تیسرے رفاہی کا غلامی دور ہے۔ وہ سلوموش عشق اب کوئی کیسے کر سکتا ہے جس میں کسی دن گزر جاسے تھے خیال چار کرتے؟" وہی بھرتے۔ پھر بختوں پار بھرے گیت گاتے خدا لکھے یا ڈانڈا لگ بولتے۔ اس کے بعد مینوں ظالم سانچے سے لڑتے یا فراق میں آہیں بھرتے۔ صبراً نوروں کرتے یا کھل کھل کر مرتے۔ اب تو محبت بھی نان اسٹاپ پیرسٹک فلاسٹ ہے۔ ایک بس ہو سکتی تو دوسری پکڑاؤ۔"

"اور یہی اگر عورت سوچنے لگے۔۔۔ پھر؟" رخشندہ بولی۔

"آپ بھول رہی ہیں کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ امریکا اور یورپ کی خواتین بھی شور مچاکے اور بہت رو پیٹ کے یہ حقیقت تسلیم کر چکی ہیں۔"

تیور نے کہا "میں اب کب تک وقت ضائع کریں گے بہ۔"

میں نے نفی سے کہا "میں ایک عمر گزار سکتا ہوں انتظار میں اور اس سے یاد دہانہ امید سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میرے بعد میری دونوں اسی جگہ چشم براہ رہے گی بغیر شاعر۔ ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔"

"مجھے تو قیامت آ رہی ہے۔" رخصتی نے کہا "تم گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کا بے ی چلاؤ۔ گری ہو رہی ہے۔"

میں نے انجی اسٹارٹ کر کے فین چلائی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اور پھر دو منٹ بعد اسے ہی تن کر دیا۔ "تم نے انہیں

کس دیکھا تھا تیور؟"

تیور نے جماعتی "وہیں جہاں وہ پہلے لے تھے" ویشنگ روم میں۔

"شاہ عالم بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ زندہ؟"

"ہاں۔ وہ ایک اسٹریچر پر سوتا تھا۔"

رخصتی نے بے چینی سے پوچھا "وہ۔۔۔ ٹھیک تو تھا؟"

تیور نے سہلایا "جب وہ کراچی ایئر پورٹ پر اترتا تھا تو بالکل ٹھیک تھا اور بہت اچھے موڈ میں تھا۔"

میں نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے مٹا کے ساتھ لے جانا ہماری ضرورت تھی۔ وہ جب سو کر اٹھے گا تو پہلے سے زیادہ فریش ہو گا۔"

رخصتی نے کہا "میری ایک درخواست ہے۔ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جانے دو۔ اس کا پارٹنر میں دور تھیں خالی ہوں گی۔ مس خان کی جگہ میں نہیں سے چلی جاتی ہوں۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔"

میں نے کہا "اور تمہارا خیال کون رکھے گا؟ میں نے چندا کو یہاں اس لیے لایا تھا کہ میں بیک وقت تم پر اور تیور صاحب پر مسلسل غمازہ مکنے چلا کر تمہارے بغیر نظر نہیں رکھ سکتا۔ چندا ساتھ ہوگی تو میں بھی چار چھ مکنے کی فینڈ لے لوں گا اور میرے لیے فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم مس خان کی جگہ نہیں لے سکتیں کیونکہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو جس پر مجھوسا کرتے ہوئے کرمل خان کی ماں کے سوا میں۔ ان کے لیے یک نہ شدہ دوشد والا معاملہ ہو جائے گا کہ میاں پر بھی نظر رکھیں اور بیوی پر بھی۔ چندا ان کی مدد کرتی گھر اسے میں نے طلب کر لیا کیونکہ ذرا نیوٹنگ ذہنی اور اعصابی دباؤ کے ساتھ جسمانی تھکن سے دوڑا ہوا ہے۔ بوجا ہے۔ نہیں خود چلتی رہے گی اور شاہ عالم بھی انجکشن کے اثر سے خیز میں رہے گا تو کرمل خان بھی ایڑی رہیں گے۔ وہ سو جائیں گے تب بھی مسئلہ کوئی نہیں ہو گا۔ انجکشن کا اثر ایک دم ختم نہیں ہوتا کہ شاہ عالم آنکھ کھلے ہی مستند ہو کے انجکشن میں آجائے۔ غمزدگی اس پر غالب رہے گی۔"

تیور نے اچانک کہا "لو انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں تمہارے لیے۔"

میں نے قریب آتی ہوئی چندا کو دیکھا "تم نے ملاحظہ کیا جذبیہ دل کی تاحیر کو۔ اگر میری زندگی تمام ہو جاتی انتظار میں تو چندا کی روح اسی جگہ میری روح سے ملنے آتی اور کہتی۔ سو رہی مجھے توڑی ہی رہی ہوگی۔"

"میں نے تو۔۔۔ سب جگہ دیکھ لیا تھا۔"

"تیور صاحب۔ میں بتاؤں یہ کہاں تھی؟ چندا تصدیق کرے گی میرے خیال کی۔ یہ شاہ عالم کو اور خان اعظم کو نہیں میں چمڑنے لگی تھی۔ اسی لیے ویشنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ نہیں

ویسے تو روانگی سے آدھا گھٹنا یا گھٹنا کیلے پلٹ فارم پر لائی جاتی ہے مگر واشنگ روم میں دو گھنٹے پہلے ریڈی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ کمان کی خاطر اور جگہ پکڑنے کے لیے وہاں جا کے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ چندا نے صرف سولت دیکھی ہوگی۔ جب ٹرین پلٹ فارم پر گئے گی تو خان اعظم بھیڑ بھاڑ میں دھکم پیل سے نکل جائیں گے۔ اس وقت اسٹریچر کے ساتھ شاہ عالم کو اندر پہنچانا مشکل ہو گا۔"

تیور نے خفیف ہو کر کہا "سو اگر راستہ۔۔۔ اور میرا دھیان ہی نہیں کیا، تم اسی لیے مطمئن تھے۔"

چندا نے بیٹھے کے بعد ردو بند کیا اور بولی "مٹے مہاراج۔"

میں نے گاڑی نکالتے ہوئے کہا "مہاراجی۔ آپ غما ہیں کچھ؟"

"تم نے کیا کہا تھا خان جی سے؟" وہ بولی۔

"میں نے۔۔۔ جو کہا تھا وہ سب کے سامنے بتا دوں؟"

"کہا ہو گا کہ ابھی مٹا ہی ہو گا سب نے؟" وہ بولی۔

"میں نے کہا تھا کہ۔۔۔ نہیں انہوں نے کہا تھا کہ لاہور تک تم ایک سب کچھ کیسے کرو گے؟"

"سب کچھ کیا۔ صرف ذرا نیوٹنگ کرنی تھی نا۔ تیور صاحب بھی تھے تمہارے ساتھ۔" چندا کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"تیور صاحب۔۔۔ وہ سب نہیں کر سکتے تھے جو میں کرتا۔ ذرا نیوٹنگ کے ساتھ تمہیں یاد کرتے ہوئے ہر تیس سیکنڈ بعد ایک ٹھنڈی آہ بھرنا۔ پھر غم فرقت کے موضوع پر کوئی دردناک شعر پڑھنا۔ جیسے کہ ہرگز کے پیچھے لکھے ہوئے ہیں مثلاً۔ سترے پہلے آنکھ پانی چپک کرنا ضروری ہے۔ مرنے سے پہلے کسی ظالم حیدر پر مرنا ضروری ہے۔"

"خان جی نے نہیں؟" تم نے کہا ہو گا کہ میں اکیلا نہیں جا سکتا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بھی غلط نہیں۔ تمہارے بغیر میں سفر آخرت پر بھی نہیں جا سکتا، جنم میں بھی نہیں جا سکتا۔"

"جا سکتے ہو۔ تم نے بھی کو شش ہی نہیں کی؟" وہ بولی۔

میں نے افسوس سے سہلایا "تمہارے سینے میں دل نہیں پھر ہے۔ اور اس پھر سے تم میرے دل کا غمزدگی کی طرح توڑ رہی ہو۔"

اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا۔ "تو کی کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی شکست کا خیال تھا؟ خان جی کا نہیں۔ میں ان کے ساتھ جاتی تو کچھ مدد ہو جاتی ان کی۔ پتا نہیں کہاں ضرورت پڑ جائے انہیں میری۔"

میں نے بٹانے کہا "پھر کیا ضرورت تھی اتنے کی؟ کیا میں تمہیں مٹا کر گیا تھا؟ میں نے تو بتا دیا تھا کہ تمہاری شتر ہے مہار اور شتر غمزدگی کے کمانے والی خطرناک بیٹی ہے تو میں اکیلا ہی بھلا مگر وہ تو اٹھارہ کمانے بیٹھے ہیں تم کو میرے سر منڈھنے کے لیے۔"

"گاڑی روکو۔ میں اتر کے واپس چلی جاتی ہوں" وہ بکڑے بولی۔

میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ٹرین بھی مس کر دی تھی۔ اب تو بھگتنا ہی پڑے گا جس کا لاہور تک۔"

"حیدر آباد میں آ کر پناہ لے۔"

میں نے کہا "راستے میں کوئی حیدر آباد نہیں آتا۔ پہلے پشاور آئے گا۔ پھر کوئٹہ اس کے بعد ایبٹ آباد۔ سو رہی وہاں تو ریلوے لائن ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد میاں والی پھر بیوی والا۔ گو جراتاں اور لاہور۔ اس کے سوا یہ نان اسٹاپ سروس ہے۔ راستے کی سواری نہیں بٹھاتے بہ۔ جب گاڑی کے بریک ٹل ہو جائیں تو وہ نان اسٹاپ ہو جاتی ہے۔ تم کو اترنا ہے تو چلتی گاڑی سے کود جاؤ۔ آگے دوپٹے سندھ پر گھڑی پیراج آئے گا۔ نہایت مناسب جگہ پر چھلانگ لگنے کے لیے۔ امید ہے قلمی فارمولے کے مطابق تمہیں پچھڑے یا خانہ بدوش نکال لیں گے اور تمہیں سردار کے سامنے پیش کیا جائے گا تو تم آنکھیں کھول کے پوچھو گی۔ میں کہاں ہوں؟ اور اسی لیے سردار کا بد قماش بد بخت اور بد عمل بیٹا تم پر فریضہ ہو گا۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لے "اُف۔ میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔ کیوں بولے جارہے ہو؟"

میں نے اسٹریچر پر غلبہ بھاتے ہوئے گانا شروع کیا "ہم حالی دل مٹا نہیں گے، سننے کہ نہ سننے اتنی سننے کہ نہ سننے۔ اس کے علاوہ مس خان، میں تمہیں سنانے کے لیے نہیں بول رہا ہوں۔ میں زمانے کو سنا رہا ہوں اور یہ آواز حق ہے جس کو دیا گیا نہیں جا سکتا۔ تم نہیں روک سکتیں مجھے، میں تمہارے، میرا مطلب ہے کسی کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے۔"

"نا صراحتہ کے لیے میں پاگل ہو جاؤں گی" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں قلم لیا۔

"اچھا؟ گویا اتنی بے خبر ہو تم حلالا کہ جب عشق سکھاتا ہے تو اب خود آگاہی۔ تو آدمی کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے کیونکہ کہتے ہیں جس کو عشق، عقل بے دماغ کا۔ اور جو تک پاگل میں بھی ہو چکا ہوں تمہاری دید کی مسامتہ اول سے۔ چنانچہ خوب گزرنے کی جوتل بیٹھیں گے، اتنی الحال نہیں گے، بچے اے۔"

"تمہاری کہ جو چنانچہ کی ایسی تھی" اس نے میرے بال اپنی منہ میں پکڑ کر کہا "مادوں تمہارا سرا شیرنگ پر" سارا پاگل پن ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے چلا کے کہا "اُف۔ غضب خدا کا۔ ہاتھ پائی مردوں سے۔۔۔ بلکہ ناختم مردوں سے۔۔۔ تو یہ تو یہ۔۔۔ میں تمہارا ہونا چاہتا ہوں۔ سارے بال تمہارے ہاتھ میں آجائیں گے۔ میری جان پر چندا چپکے کا تو چاندنی منگن ہوگی تمہارے رخ روشن پر چندا؟ تم گاؤ گی۔ تو میرا چاند میں جی جاتی ہے۔"

اس نے میرے بال نہیں چھوڑے اور میرے سر کو آہستہ سے آگے بھکایا میں نے بڑی مشکل سے اسٹیرنگ کو سیدھا رکھا "بک بک بند کرتے ہو یا نہیں؟"

میں نے ایک دل خراش آواز بلند کی "خدا کے لیے مجھے تنہا مت کرو۔" حسین شاہ رخ خان کے اسٹائل کی قسم مجھے انور کبیر مت بناؤ۔ میرے بال جڑے انگریز جیسے گے۔ دیکھو بال بال بیٹے تم نے کیا کیا۔ یہاں وہ چار دو چار دکھا کر کہا "سیا دے۔ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بھائے عذرا۔"

تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے مگر میں ہنستا رہا اور برداشت کرنا رہا یہاں تک کہ ٹھک آئے اور پریشان ہو کے چند آنسو خودی میرے بال چھوڑ دیے۔ "بہت ڈھیٹ ہو تم" اس نے کچھ خفیف ہو کے کہا۔

میں نے کہا "تھیک ہے۔" اس کو ہم اردو میں احتیاط کہتے ہیں اور دوا کہتے ہیں۔ جو تم کر رہی تھیں اسے بخانا اور شوق باز۔" چند آنسو گرا "آئی ایم سوری۔" مجھے بلاوجہ غصہ آ گیا تھا۔ میں نے زیادتی کی۔

میں نے فراق دلانا مسکراہٹ کا مظاہرہ کیا "ہاں۔ مگر تم چاہو تو اس کی عطا ہی کر سکتی ہو لگے آئندہ ہر زیادتی کرنے کا غیر مشروط اجازت نامہ بھی حاصل کر سکتی ہو۔"

اس نے کہا "چھاتی وہ کیسے؟" "ہاں ایک جملہ بول کے۔" میں نے قیادی اور "صومیت کے ساتھ کہا "اگرچہ بڑی کے تین لفظ ہیں۔"

وہ مجھ سے زیادہ عیار ثابت ہوئی "وہ تو میں بول چکی" آئی ایم سوری۔

میں نے سوچ کے کہا "وہ جملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آئی پر شروع ہو کے پورے ختم ہوتا ہے۔ درمیان میں تیسرا لفظ ہے جو بڑا مقدس رشتہ ظاہر کرتا ہے اور دوستی، پسندیدگی اور وفاداری کا عنوان ہے۔"

"بات یہ ہے سر کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتی" اس نے کہا "ہاں میری زیادتی سے تمہارا بیڑا اسٹائل خراب ہوا۔ کو تو اسے ٹھیک کر دوں؟"

اس نے اپنے جیک میں سے برش نکالا اور میرے سارے بال پوں آگے پھیلا دیے کہ میری آنکھوں پر آگے "مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے" ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا۔

"کوئی بات نہیں مگر تم راقی بہت اچھے لگ رہے ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنا بیڑا اسٹائل بناؤ۔"

میں نے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کیا اور غرا کے کہا "یہ بیڑا اسٹائل بناؤ اس کا سر کے سر سازش میں خیمے ہیں اور سازش میں میرے تڑو جیسے سر میں سازش میں تو کہ عقل ہے اسی لیے جڑل نہیں بن سکا۔"

"صاف گوتا۔ نام لینے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے ایک اور آواز دہرائی "ڈرنا پڑتا ہے جناب۔"

○●○

کسی بھی تحریک یا منصوبے، ایجاد یا انقلاب کی بنیاد پہلے صرف ایک مفروضہ یا خیال ہوتا ہے جو ذہن میں کسی کو نیک کی طرح چھوٹا ہے پھر پیچھے پیچھے اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں اس کا وجود ایک حقیقت بن کے ابھرے لگتا ہے۔ پہلے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک تباہ و درخت کی طرح اس کی وسعت اور بلندی سے صرف نظر ممکن نہیں رہتا۔

تیمور کے ذہن میں بھی ناصر عظیم کو شاہ عالم کا آواز کارہانے کا خیال بہت پہلے آیا ہو گا۔ رنڈ رنڈ اسے احساس ہوا کہ یہ خیال تھوڑی سی محنت اور ذہانت سے حقیقت بھی بن سکتا ہے اور اس نے پوری کوشش بھی کی مگر جیسے جیسے بچ بچنے والا کسان آنے والے موسموں کی نامرانی اور زمین کے اچانک بخر ہو جانے پر تقدیر کو الزام دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا ایسے ہی تیمور کو ناموافق حالات اور غیر متوقع حادثات نے ناکامی سے دوچار کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی کامیابی کا خواب ایسے بکھر گیا جیسے گیس بپ کا میشل ذرا سے جھٹکے سے گرجتا ہے تو روشنی کی جگہ تاریکی لے لیتی ہے۔

دوسرے خیال نے میرے ذہن میں جنم لیا تھا۔ وہ حقیقت اس کی بنیاد بھی وہی خیال تھا جس پر تیمور نے بڑے سوچ بچار کے بعد عمل شروع کیا تھا مگر جب یہ قیادت کی جنگ بن گئی تو میں نے اپنی ساری توانائی خود کو بچانے کی جدوجہد میں صرف کر دی۔ میں ایسا نہ کرتا تو شاہ عالم باقی رہتا مگر ناصر عظیم نہ رہتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ میری کامیابی میں تقدیر کی باری شامل تھی۔ میرا خیال حقیقت میں دخل کیا تھا اور آج میں یہی ناصر عظیم اپنی تقدیر کا مالک تھا مگر شاہ عالم کے قاب میں۔ شاہ عالم کی پوزیشن وہ تھی کہ۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ وہ دنیا میں ہونے کے باوجود دنیا کے لیے بے وجود ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے آسمان کی وسعت میں موجود ہوتے ہی سورج کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔

تیمور نے اپنی ناکامی اور شکست کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں قبول کر لیا تھا۔ وہ جی جی کے سارے زمانے کو جیج کر لیتا اور انگلی کے اشارے سے بتاتا کہ دیکھو وہ ہے چاند گر دیکھنے والے اس پر جیتے۔ اسے دہانہ قرار دیتے اور پوچھتے کہ کہاں ہے چاند۔ ہمیں تو صرف سورج نظر آ رہا ہے۔ اس کو اندازہ تھا کہ وہ اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ مجھے جھوٹا اور جعلی ثابت کرنے کی تھی اس میں بہت تھی اور نہ صلاحیت۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنے سے آدمی عمر کے نوجوان کا نائب حکم بردار اور رئیس میں نہ ہوتا۔

وہ قیادت کی اہلیت سے محروم تھا چنانچہ اس نے تھید کو شعار اور مزاج کا لقب بنالیا تھا۔ جو بھی حاکم ہو اسے سلاہ و فاداری بدلتا اس کے لیے ضرورت پڑنے پر گھیر بدلنے کی طرح تھا۔ چڑھائی

آئے تو بدل دو! آڑائی ہو تو پھر بدل دو۔ ورنہ جس گھیر میں گاڑی چل رہی ہے چلتی رہے۔ نائب صدر رہنا اس کا مقصد تھا جس پر وہ قانع تھا۔ صدر کون ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہیے۔ تیمور کے لیے یہی خیال وجہ عافیت تھا۔

رشتی نے اتنے پرسکون اور حقیقت پسندانہ انداز میں زندگی کی اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے ذہنی اور جسمانی مزاحمت کی تھی۔ اس نے صرف آواز دیکھ کے اور ناک پر سمجھتے ہوئے شکست کو ایک منطقی نتیجے کے طور پر خاموشی سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ پھر پھر جارحیت کے بعد اور اپنی آنکھوں سے اپنی بار دیکھ لینے کے بعد اس نے میرے سامنے تو ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اس کے اندر کی جنگ ابھی تک جاری تھی۔ جبوری کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی جنگ۔ اپنے نقصان کا صدمہ برداشت کرنے کی جنگ۔ اپنی بے چارگی ماننے کی جنگ۔ غصے اور بے بسی کے احساس کا زہر پینے کی جنگ۔ چنانچہ وہ سخت اعصابی رہا میں تھی۔

میں اور چند انہیں میں اسی طرح باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے اور ہنستے پھیلے رہے تھے جیسے نہ کوئی ہمیں دیکھتے والا ہے اور نہ ہماری باتیں سننے والا۔ زندگی کا چلن جو کل تھا وہی آج بھی ہے۔ ہم نہ پریشان تھے اور نہ پریشان۔ صورت حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی اور ایسے ہی ہمارے جذبات اور خیالات۔ یہ خان اعظم کی تربیت اور ہماری ریاضت کا نتیجہ تھا۔ آج سے آج کے دن اور گزرنے والے لمحے کے مسئلے کو خیال کی ساری توانائی اور خیال کو کنٹرول کر۔ گزرنے ہوئے کل اور آنے والے کل کے بارے میں سوچنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

تیمور میں چندا کے پیچھے میرے بائیں جانب پیچھے والی سیٹ پر خاموش بیٹھا باہر دیکھتا رہا تھا۔ میں نے جیک دیو مرد کو ایسے اپنے دست کر لیا تھا کہ میری نظر تیمور کو دیکھ سکتی تھی۔ خود تیمور کو اوپر دیکھنے سے میرا چہرہ دکھائی نہیں دیتا ہو گا۔ اسے اندازہ ہو گا کہ میں پیچھے کی ٹریفک کو نہیں اسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ احساس اس کو اعتماد اور ضرور مسائل جرات آزمائی کے مظاہرے سے روکنے اور اس کی حوصلہ شکنی کے لیے کافی تھا۔

رشتی سیٹ کے دوسرے کنارے پر میرے پیچھے بیٹھی مخالف سمت میں دیکھ رہی تھی۔ یہ دیکھنا غلامی دیکھنے کے مترادف تھا۔ اس کی آنکھیں بائیں کے مناظر پر مرکوز تھیں مگر خیالات کی دنیا میں وہ نہ جانے کہاں تھی۔ انٹرنیشنل جیکرو کے نیلے سرمئی TINTED شیشوں سے دھوپ کی چمک بھی پوں لگتی تھی جیسے اوپر ابر آلود آسمان ہے۔ لوگ چلتے پھرتے خاموش سامنے نظر آتے تھے جو باتیں کرنے کے لیے لب لہاتے تھے اور ہنسنے کے لیے نہ کھولتے تھے مگر آواز برآمد نہیں ہوتی تھی۔ جیسے کوئی ٹی وی کی سائڈ بزنڈ کر دے اور بکچر دکھاتا رہے۔

رشتی اور تیمور نے اگر ہماری باتیں سنیں تو ان میں کدو

تھیں۔ نہ کوئی ہماری باتوں پر ہنستا تھا اور نہ کسی نے دخل اندازی کی تھی۔ جذبات کے رشتوں کے اعتبار سے ہم دی تھے جو برسوں سے تھے۔ تیمور یا رشتی کے لیے زندگی کا مضمون بدل گیا تھا۔ وہ اندیشہ ہائے دور دورا نہیں سمجھتے۔ کل کیا ہو گا؟ کیا نہیں ہو گا؟ جو کل تک تھا وہ کل نہیں ہو گا تو کیا ہو گا اور جو تصور میں بھی نہ تھا وہ ہو گا تو کیا ہو گا؟ شاید تیمور نے سب سوالوں کے جوابات تلاش کر لیے ہوں اور کسی نہ کسی طور خود کو مطمئن کر لیا ہو گا کہ اسے وہی کرنا چاہیے جو ابھی کر رہے ہیں۔

THE KING IS DEAD. LONG LIVE THE KING

(بادشاہ سلامت مر گئے۔ بادشاہ سلامت زندہ باد)

لیکن رشتی کے لیے اچانک آجائے والے اس انقلاب کے

مقبول عام مصنف ایم۔ اے راحت کے سدا بہار قلم سے شاہکار ناول

سامون

مستقبل کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان کا احوال

★

وہ شاندار ماضی سے منہ موڑ کے آگ اور خون کے راستے پر چل نکلا۔

سامون

نماعت منظر پر اسرار سلسلہ

★

کمل تین حصوں میں شائع ہو گیا ہے نی حصہ ۱، ۲، ۳ روپے

علی عباس بلی کیشر

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 7247414

اسٹاکس۔ ۲۔ علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ 7223853

نتائج کو خوشہ تقدیر کی طرح قبول کر لیتا آتا آسان نہ تھا۔ زندگی اس کے لیے کل جتنی مشکل اور مہربان تھی، آنے والے دنوں میں اس سے زیادہ دشوار ہو سکتی تھی۔ اسے ایک بڑے فیصلے کے لیے بہت سے چھوٹے فیصلے کرنا ضروری تھا مگر فوری طور پر اس کی قوت فیعلی ہی خستہ ہو گئی تھی۔

اس نے اچانک کہا "تمہیں شاید یاد نہیں رہا میں نے کہا تھا کہ مجھے کچھ گولیاں چاہئیں" سکون آ رہا۔

میں نے کہا "میں واقعی بھولی گیا تھا۔ مگر کیا ان کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا؟"

"کس کس چیز کے بغیر گزارا کروں میں آخر؟" وہ چڑھ کے بولی "ساری عمر میں کا ایک ہی تو دوا تھا میرے پاس۔"

"یعنی تم عادی ہو ان گولیوں کی؟"

"اب ہوتا ہی ہے گا۔ پہلے تو کبھی کبھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ پھر اکثر ہونے لگی "وہ بولی "ایسا ہی ہوتا ہے ان کے ساتھ جو عارضی سکون کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں موت کو کھلے لگ سکتی تو واقعی سکون مل جاتا۔ یہ نیکی تم کر سکتے ہو میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "پلیز اسٹاپ۔ کون سی گولی استعمال کرتی ہو تم۔۔۔ نام؟"

"ATIVAN اور رات کو سونے کے لیے LAXATONIL پہلے ایک لیا کرتی تھی۔ اب دو بھی نا کافی محسوس ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "کسی دن تم کو چار چھ یا آٹھ دس گولیوں سے بھی سکون نہیں ملے گا۔ تم پر دیریشی ٹھہر چکی ہو۔ مجھے یا کسی اور کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں "اپنی سب سے بڑی دشمن تم خود ہو۔" "کیا اپنی زندگی کا سکون بھی میں نے خود جیتا تھا۔۔۔ یہ کبھی بے رحمی کی بات ہے کہ الزام بھی تم مجھے ہی دیتے ہو اپنی خوشی سے کون مرنے ہے۔"

میں نے کہا "بے وقوف اور بزدل لوگ۔ جو حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ آسانی سے مرنے لگتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔ ان کی زندگی جینے کے قابل نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "زندگی کو جینے کے قابل بنانا پڑتا ہے جیسے مگر کو سہا سنوار کے رنگوں اور پھولوں سے "دوشنی سے اور مسکراہٹوں سے" "ذکر رہیں جس رکھ کے تصویریں لگا کے اور پردے ڈال کے خوب صورت بناتے ہیں" "حسن بچانے اور تلاش کرنے سے نظر آتا ہے۔"

"تم تقدیر کے قابل ہی نہیں۔"

"تقدیر تو ایک سودا کرتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ایک بیکہ PACKAGE دیتی ہے کہ سکھ کے ساتھ دکھ۔ کامیابی کے ساتھ نا کامی۔ محبت کے ساتھ نفرت۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے اور دن کے ساتھ رات کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ کوئی یہ سودا نہ کرنا

شلوار قمیض پہن رکھے تھے اور غالباً رازد گزراں ہی باندھی ہوئی تھیں۔ ان کی آہ و تاب سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔

اپنی شناخت کے لیے ان کے پاس ملنے کے علاوہ دو چیزیں تھیں۔ ایک نئے مائل کی لینڈ کروڈر "دوسری جدید خود کار ہتھیار راور۔ سینے پر آؤر ہاں میگزین کی ٹیلٹ۔ ہونٹ کے باہر بیٹھے ہوئے لوگ ان کو دیکھتے ہی سرا سر ہونے لگتے تھے۔ جو انہیں پہچانتے نہیں تھے وہ بھی خوف زدہ نظر آ رہے تھے اور جلد از جلد واپس جا کے بس میں بیٹھ جانا چاہتے تھے یا ٹرک لے کر روانہ ہو رہے تھے۔ اس ڈر سے کہ کسی تقدیر کا قریب فال ان کے نام کھل آیا تو حیل کے بجائے وہ ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔

غالباً تشریف رکھنے کے بعد مالک نے ہماری "بھیرو" کے بارے میں سوال کیا ہوا اور اس میں سز کرنے والوں کے بارے میں پوچھا ہو گا۔ چندا یہ سب دیکھ رہی تھی اور اس نے مجھے بعد میں تفصیلی رپورٹ دی تھی۔ ہونٹ کے مالک نے چندا کی طرف اشارہ کیا جو بڑی فرخندگی سے اب گاڑی کے آس پاس ٹھلنے میں مصروف تھی۔ اسے تیمور کے اور میرے واپس آنے کا انتظار تھا۔

ہونٹ کا مالک چندا کی طرف بڑھا اور قریب آ کر بولا "آپ کو وڈیرا سامیں نے بلایا ہے۔"

چندا نے بے نیازی سے کہا "کون وڈیرا سامیں؟"

"آپ کے سامنے بیٹھے ہیں جناب!"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں مگر نام کیا ہے ان کا؟ کیوں بلارہے ہیں وہ مجھے آخر؟" چندا نے کہا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ آپ خود جمل کے پوچھ لیں۔"

چندا نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا "تم جاؤ۔ میں کسی وڈیرے سامیں سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔"

"یہ تو قسم بڑی غلط بات ہوگی جناب۔۔۔"

"شٹ آپ غلط بات یہ نہیں ہے کہ تمہارا وڈیرا سامیں ایک عورت کو دس مردوں کے سامنے بلارہا ہے۔ تیز نہیں ہے اسے اتنی کچھ سے کام ہے یا بات کرتی ہے تو خود جمل کے یہاں آگے میں کیا اس کی رحمت ہو یا غلام ہوں اس کی۔ جاؤ اور یہ سب کہہ دو اس سے۔ جاؤ۔" اس نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ سب نے ہی سنا۔

اب ہونٹ کا مالک مجبور ہو گیا کہ اس گستاخ اور سرکش لڑکی کے بارے میں وڈیرے سامیں کو خوب تنگ منہ لگا کر رپورٹ دے۔ اس نے بھلائی کے خیال سے چندا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ انکار کی جرات نہ کرے مگر چندا نے اسے ہی بے عزت کر دیا تھا۔

وڈیرے سامیں نے چندا کا اشتغال انگیز اور توہین آمیز جواب سنا اور نظر اٹھا کر اسے دیکھتے رہے۔ ان کے بازو گاڑڈ مشتعل ہو کے کئی بار اٹھے اور انہوں نے کندھے سے اپنی

کلا خشکوف بھی اٹا لی مگر وڈیرا سامیں نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے صبراً انتظار کرنے کو کہا مگر وہ خود اپنے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر غصے سے بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

چندا نے سوچا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کے قلعہ بند ہو جائے مگر وہ اپنا خوف کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اطمینان سے ان کو قریب آتا دیکھتی رہی۔ ہیر سامیں کے بازو گاڑڈ بھی دائیں بائیں مگر ایک دم پیچھے ان کے ساتھ چلے آ رہے تھے اور ایسے مستند تھے جیسے مقابلے پر ایک نازک اندام اور خالی ہاتھ لڑکی نہیں ان کا کوئی جانی دشمن راکٹ لانچر لیے کھڑا ہے۔

قریب آ کر انہوں نے کہا "ہم نے بلایا تھا تمہیں لڑکی۔"

"کیوں بلایا تھا؟" چندا نے نرمی سے کہا "میں تو آپ کی صورت اور نام سے بھی آشنا نہیں۔"

"لڑکی۔ ہم انکار سننے کے عادی نہیں" وہ برہمی سے بولا۔

"میں بھی ہر ایرے کے غیرے کا حکم نہیں مانتی۔ کیا چاہتے ہو آخر تم بس لینڈ کروڈر میں بھرتے ہو؟ تیز تیز دیکھو کچھ نہیں۔ یہ نہیں جاننے کے خواہش میں ہے کیسے بات کی جاتی ہے؟" چندا نے کہا۔

"وڈیرا سامیں!" ایک بازو گاڑڈ نے کہا "اس سے زیادہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

"باجازت دو ہمیں کہ اس کو تمہارا سبق سکھائیں۔" دو سرا بولا۔

چندا ایک دم پیچھے ہٹ گئی "اپنے ان شکاری ٹوتوں سے کہو کہ مجھ سے دور رہیں۔ اپنی طاقت اور مردانگی کا مظاہرہ کرنا ہے تو انتظار کریں۔ میرے ساتھ بھی مرد ہیں۔"

"تو کس کرتی ہے ہمارے سامنے" ایک بازو گاڑڈ آگے بڑھا۔

"بھولکتی ہے کتیا کی طرح!" دو سرے نے بھی پیش قدمی کی۔

وڈیرا سامیں نے ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اب وہ بھی مزید بے عزت ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

چندا نے ایک دم خطرے کو اپنے سر پر محسوس کیا۔ دونوں گاڑڈ اس کے مقابلے میں ڈگنے قدم قامت کے وحشی مرد تھے۔ انہوں نے دو طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے چندا کے لیے فرار کے راستے مسدود کر دیے تھے۔ اپنی خود کار راکٹیں کندھے پر لٹکانے کے بعد وہ دیکھ پیچھے بازو بھیلانے اسے یوں روک لیتا چاہتے تھے جیسے عقاب اپنے بٹوں میں چڑیا کو پکڑتا ہے۔

چندا نے ایک بار پھر چلنے کے کہا "میں کتنی ہونٹ رک جاؤ۔ ہیر سامیں! اپنے مریدوں کو متخ کریں۔ اکیلی عورت پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔"

مگر اس وقت تک وہ چندا کے بہت نزدیک آچکے تھے چندا اگر چاہتی تو دوڑ کے گاڑی میں بھی پناہ لے سکتی تھی مگر یہ پناہ گاہ اسے کوئی تحفظ نہیں فراہم کر سکتی تھی۔ وہ گاڑی کے شیشے کا خشکوف کے ہٹ مار کے توڑ دیتے اور اسے اندر گھس کے پکڑ لیتے۔

آخری لمحے میں چندا نے وہی کیا جو اس کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا مگر حملہ کرنے والوں کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ اس نے ایک ایریز پر محسوس کے ایک کے پیٹ برلاٹ ریسید کی اور دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ایک جھٹکا دے کر گاڑی پر دسے مارا۔ پھر وہ پہلے کی طرف متوجہ ہوئی اور دوسری لائٹ اس کی گردن پر ماری کیونکہ وہ ہلکا کے ڈیرا ہو گیا تھا۔ اس لائٹ کے پڑنے ہی ایسی آواز آئی جیسے سوکھی مٹی ٹوٹتی ہے "چندا کا خیال تھا کہ لائٹ اس کے سر یا منہ پر لگے گی مگر وہ جب اٹھا تو گردن سامنے آگئی اور ٹوٹ گئی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

گاڑی سے کھرانے والا بھی منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے چندا نے کلا خشکوف پر قبضہ کیا اور ہٹ مار کے اسے وہیں لٹا دیا۔

"پیچھے۔ ایک دم پیچھے۔ ہیر سامیں کی اولاد۔" اس نے کلا خشکوف کو بڑی مہارت کے ساتھ فائر کرنے کی پوزیشن میں کیا۔ "کوئی مرنا چاہتا ہے تو آگے آئے۔ خبردار جو کسی نے ہاتھ بھی اٹھایا۔"

دور سے تماشہ دیکھنے والے بہت سے لوگ اتنی دیر میں قریب آچکے تھے اور ایک قلعہ بنائے کھڑے تھے۔ ہیر سامیں سمیت ان سب کی آنکھیں اس ناقابل یقین منظر کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے حلقوں سے اُٹتی پڑی تھیں۔ شاید ہیر سامیں کے آقا و اجداد نے بھی ایک معمولی لڑکی کے ہاتھوں سرعام ایسی رسوائی اور ذلت نہ برداشت کی ہوگی۔

یہ مرحلہ تھا جب میں رختی کے ساتھ واپس لوٹا اور میں نے چندا کی آواز سنی۔ تیمور نے یقیناً مجھ سے پہلے اپنی گاڑی کے گرد اس مجمع کو دیکھ لیا ہو گا مگر وہ عداوت سے دور رہا۔ اس کے پاس بیت الخلا میں ہونے کا مستقل خطر تھا کہ میں اندر سے باہر کیسے دیکھ سکتا تھا۔

رہا اور میرے پاس تھا مگر میں نے اس کو ٹھاننا غیر ضروری سمجھا۔ میں نے چندا کے قریب جا کے کہا "کیا تماشہ ہو رہا ہے یہاں؟" بس خان! اور پھر ایک نظر ان پر ڈالی جو وہاں پڑے ہوئے تھے اور کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ بد معاش ہیر مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا۔ مجھے تو یہ دونوں اس کے ہاتھوں کو لگتے ہیں" چندا نے سکون سے کہا۔

یہ ہیر سامیں کی ذلت کی انتہا تھی۔ اس کا چو غلط غضب سے زیادہ مسخ ہو گیا تھا۔ اس کے لیے اپنے بلند پیکٹر کو کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ ایک بازو گاڑڈ کو چند سینکڑوں میں جام شادت نوش کرتے اور دوسرے کو اٹھا کھینچتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس میں اسل اور بارودی سرنگ سے زیادہ خطرناک لڑکی کی طرف اٹکی بھی اٹھاتا۔

میں نے کہا "کون ہو تم؟" اوھر آگے آگے بناؤ مجھے۔" میں نے

اسے سردخاک نظروں سے گھورتے ہوئے اشارہ کیا۔
”سائیں۔ ہم تو بس بات کرنا چاہتے تھے چھوڑ کر ہی ہے۔۔۔“ وہ بولا۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے کمرے کو گردن کے پاس سے پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ کے چارپائی پر دھکیل دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ آگے آگے بات کرو۔ تم کیا چھوڑ کر ہو جو چھوڑ کر سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اب کو چھوڑ کر سے جو کہنا ہے۔“
”دیکھو۔ میں میر زمان شاہ ہوں۔ روزی سے آگے میرا نام۔۔۔“

میں نے جوتوں سمیت اپنا پاؤں اس کی ٹانگ پر رکھ دیا اور اس پر جھک گیا۔ ”تم نے غلط بتایا۔ تم جیسے لوگوں کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ شیطان، ابلیس کی اولاد ہو تم۔ مجھے اپنے نام ’نام‘ سب اور بد معاشی کی طاقت سے امپریس کرنے کی کو شش مت کرو۔ تم نے چھوڑ کر کا ہاتھ دیکھا؟ ایک ہاتھ میں نے مار دیا تو تم بھی ایسے ہی مردہ گتے کی طرح بڑے نظر آؤ گے۔“

اس نے اٹھنے کی کو شش کی اور ہاتھ سے دھکادے کر میرا پاؤں ہٹا دیا۔ ”چھوڑ کر نے آدمی مار دیا ہمارا۔“
میں نے اس کو سیدھا کھڑا کیا۔ اپنا ٹھکانا اس کے پیٹ میں مارا۔ وہ ڈبڑا ہوا تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کو اوپر اٹھایا اور سر کے اوپر لے جا کے اتنی قوت سے چارپائی پر پٹکا کہ چارپائی ٹوٹ گئی۔ نجع پر ایک نر خوف سناٹا چھا گیا۔ کچھ لوگوں نے کھسکنا شروع کیا۔ بس والے کی آواز پر مسافر دوڑ دوڑ کر بس میں بیٹھنے لگے۔

چندائے گلا خشکوف کا رخ آسمان کی طرف کرتے ہوئے غار کھول دیا۔ رات کے ستارے میں گلا خشکوف کے برست کی آواز نے لوگوں کی رگوں میں خون کو بھی جماد کر دیا ہو گا۔ عورتوں نے بے اختیار رنج ماری۔

”واہیں۔۔۔ سب والیں۔۔۔ جب تک اجازت نہ ہو کوئی اپنی جگہ سے نہیں لے گا۔“

چندائے علم دیا۔ اس کا یہ حکم بالکل مناسب تھا۔ اس جھک چیل اور افزائری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی بھی مجھے یا چندا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

سب اپنی اپنی جگہ ٹک جھکے۔ رشتی نے گاڑی کے اندر سے چلائے کہا ”چلو اب جانے دو شاہ عالم۔“

اسی وقت تیمور نمودار ہوا ”شاہی۔ کیا مسئلہ ہے؟“
بلنگ پر پڑے ہوئے پیر سائیں کے جسم میں حرکت ہوئی ”آپ شاہ عالم ہوں۔ سائیں مجھے بھی شک ہوا تھا۔“

میں نے سیات لے کر کہا ”تم جانتے ہو نا مجھے؟“

”سائیں۔ آپ تو اسمبلی کے ممبر ہو ہی بے ایف کے چیئرمین ہو۔ آپ کو ہمارا کون نہیں جانتا۔“ وزیر اسائیں کا لہجہ اچانک عاجزانہ اور خوشامدانہ ہو گیا۔ ”ہم تو خادم ہیں آپ کے

آپ کے ٹکٹ پر صوبائی انتخاب بھی ضرور لڑیں گے انشاء اللہ۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مجھے پچھاننے کے باوجود تم نے اتنی جرات کی؟“
”غلطی ہو گئی سائیں۔ ابھی غصہ تھوک دو۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”ایسی غلطی تم اکثر کرتے ہو گے۔ اگر یہ چھوڑ کر کڑو یا غریب ہوئی اور اس کا گھر والا یا باپ تمہارا باری ہو گیا پھر بھی تم معافی مانگ لیجئے؟ سائیں معصوم بری ہو تو تم شہر میں جاتے ہو۔ شیرنی سے واسطہ پڑا ہے تو گتے کی طرح دم دیا کے قدموں میں لوٹ رہے ہو۔“

اس کا چہرہ تاریک ہو گیا ”میں بھی آپ ہم کو کیوں ذلیل کرتے ہو سب کے سامنے۔ ہم تو دوست ہیں آپ کے سائیں۔ ہم نے بولا نا کہ اگلی بار انتخاب میں ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔“
میں نے کہا ”چلی بات تو یہ کہ اگر تم جیسے شیطان آج تک میری پادشائی میں مجھے تو آئندہ نہیں ہوں گے۔ تم کو ٹکٹ دینے کا کیا سوال۔ دوسری بات یہ کہ جس وقت تم نے میرے گھر کی عزت کو بُری نظر سے دیکھا تھا اسی وقت سے تم میرے دشمنوں میں شامل ہو۔“

”وہ بات ختم ہو گئی سائیں۔ ہم نے معافی مانگ لی۔“
”صرف معافی مانگنے سے تمہارا جرم ختم نہیں ہو جاتا۔ ایسا ہو تا تو سارے چور ڈاکو اور قاتل عدالت میں معافی مانگ کے صاف چھوٹ جاتے۔“

”بالا قتل ہم نے نہیں۔۔۔ تمہاری۔۔۔ گھر والی نے کیا ہے۔۔۔ سب کے سامنے سو توئی گواہ ہیں۔ سزا ہم کو دینے کی بات کرتے ہو۔“

میں نے کہا ”بدبختی سے اسے دیکھنے کا گناہ تم نے کیا۔ اس کی طرف اپنا ناپاک ہاتھ بڑھانے کا جرم تم نے کیا۔ اسے اغوا کرنے کی کو شش تم نے کی۔ اپنے حکم کے غلاموں کے ذریعے۔ جب چور ڈاکو گھر میں کھس آئیں اور جان و مال اور آبرو کو خطرو لاحق ہو تو قانون اپنے دفاع میں قتل کرنے کا پورا حق دیتا ہے۔“

وہ سوچوں کو بل دے کے سٹرائے گا ”قانون! ٹھیک بولتے ہو سائیں۔ قانون کی کتابوں میں ایسا لکھا ہے۔“

”ٹھیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ رائٹ! میں نے کہا میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھے افسوس ہے کہ اس نے تمہیں کو کیوں نہیں مار دیا۔ اصل جرم تم تھے اور تم مجھے لیکن کوئی بات نہیں! ایک عورت کی عزت کا اصل محافظ ہونا ہے مرد۔ تمہارے یہ سو گواہ چہ ہیں جو تمہارا دیکھنے کے لیے اپنے اپنے بلوں سے نکل آئے ہیں۔ تم نے یا میں نے انہیں گواہی کے لیے لایا تو یہ دوڑ کے اپنے اپنے بلوں میں کھس جائیں گے۔ اندھے گوتے اور میرے ہو جائیں گے۔ سچے اور بے خوف گواہ ناپید نہ ہوں تو اس ملک میں شاید انصاف ہوتا۔ کیونکہ قانون صرف گواہ پر فیصلہ دیتا ہے اور

جہاں گواہ بزدل ہے ضمیر خود غرض اور لالچی ہوں وہاں قانون کی کڑی پر بیٹھا ہوا نج مجبور ہو جاتا ہے کہ بے گناہ کو تختہ دار پر بھیج دے اور اصل جرم کو بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دے۔ سو گواہ میں بھی لے آؤں گا میر زمان شاہ۔ سارے چشم دید گواہ ہوں گے۔ ان کے سامنے میں تم گتے کی موت مار دوں گا مگر گواہ کہیں گے کہ تم ڈاکو ٹھاکر لے گئے تھے یا تمہیں سیاسی دشمنی کی بنا پر تمہارے حریف نے قتل کر دیا۔“

چندائے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”ہمیں دیر ہو رہی ہے سرائے۔“

”ہاں۔ ابھی وقت نہیں ہے حساب برابر کرنے کا اس لیے تم جاؤ اور کچھ دن کی مصلحت ہے تمہارے پاس۔ میرے خلاف بیان دو رپورٹ لکھو اور یا سازش کرو۔ میرے دشمنوں کے ساتھ مل کے اپنے ساتھ دو نہیں چار یا آٹھ باڑی گاڑو رکھو۔ اپنی حوصلی کے گرد توہیں نصب کر دو لیکن تم نج نہیں سکو گے پیر سائیں۔ انتظار کرو اس دن کا جب میں موت کا فرشتہ بن کے تمہارے اوطاق میں نمودار ہو جاؤں گا۔ یا تمہارے فرشتہ کے میں داخل ہو کے تم سے اپنا نام پوچھوں گا۔ بہت زیادہ دن نہیں ہیں تمہارے پاس۔ زیر زمین سیٹھ اور کلرٹ کا فولادی دروازے والا مقبوضہ بنا کے بیٹھ جاؤ یا اس ملک کی سرحدوں سے دور بھاگو۔ زمین کے آخری کنارے پر ٹاؤنٹ اپورٹ پر یا بحر الکاہل کی تہ میں جا بیٹھو۔ تمہاری موت تمہیں آگے کی۔ ابھی تم جاؤ۔“

سو سو افراد کا مجمع سانس روک کے کھڑا تھا۔ انہیں اتنا یقین ضرور آ گیا تھا کہ وہ محفوظ ہیں۔ ان کی جان و مال اور ان کے ناموس کو کوئی خطرو لاحق نہیں۔ میر زمان شاہ اگر ڈاکوؤں کا سرغنہ یا سرپرست تھا تو میں اس کی گھر کا حریف تھا۔ وہ اپنے بھین سے گلیوں میں سانپ اور نو لے کی لڑائی دیکھتے آ رہے تھے۔ غلوں میں میر اور دولن کی دل خوش کر دینے والی مسرکہ آرائی دیکھ رہے تھے۔ آج انہوں نے حقیقی زندگی میں نیکی اور بدی کا ٹھکانا دیکھا تھا اور وہ خوش تھے کہ انسان نے شیطان کو شکست دے دی۔ غلوں کی بات اور ہے۔ محلی زندگی میں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ یہ بالکل کسی حکم کے آخری منظر کی طرح تھا اور دیکھنے والوں نے چند منٹ میں پوری فلم دیکھ لی تھی۔ اب وہ اس ناقابل یقین واقعے کو تمام عمر یاد رکھیں گے اور جہاں جائیں گے اس کا ذکر کریں گے یا دیکھنا تاکوں وہ لڑکی کیا تھی؟ لو میاں جی تم اسے دیکھ لیجئے تو شش کھاتا ہے۔ بھول جاتے نیلی بلی کو اور اپنی رعایت کر کہ بھائی وہ تو بلی تھی بلی۔ ایک کو یوں لات ماری۔ دوسرے کو یوں پھینکا۔ یوں کا خشکوف چھینے۔ اس نے ان سواد جیسے بے ہوشے بد معاشوں کا ایسے بل کر دیا جناب کر واہ داکہ کیا تاکوں کیا عجیب ظلمہ دیکھا ہم نے۔ اور اس کا سامنا بھی۔ لوتی اس نے تو بری سخی کسر پوری کر دی۔ اور میاں جی! ایسے کھڑا ہو گیا وہ پیر سائیں پر پاؤں رکھ کے جیسے پہلے شکاری ڈنڈا اُڑاتے

تھے۔ شیر مارنے کے بعد اس کی لاش پر پاؤں رکھ کے اور منٹے والے کچھ یقین کریں گے کچھ نہیں کریں گے۔ یو زھوں کی بات پر جو ان مسکرائیں گے۔ دادا می کو نازا اور جان کاؤس کے زمانے کی کسی حکم کا سین یاد آ رہا ہے۔ ہندو والی ڈاکو کی لڑکی خوب صورت نکلا اور جوانوں کی بات پر بے نہیں گے۔ اوارا چاہنے کی عادت رہے کہ مارنے کی۔ عورتیں نہیں کیں کی! رہے وہ تو ایسے ہی بے پر کی اڑاتی ہے۔ ایک نمبر کی جھولی ہے! بس سخی رہو تباہی۔

لیکن ابھی وہ سب بہت ابھارے کر رہے تھے کہ کچھ میاں جو کچھ ہوا تھا وہ میں ان کی خواہشات کے مطابق تھا جو زندگی میں پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ غمیں دیکھتے تھے۔ اپنی حسروں کے لیے ان کے دل داغ دار میں کوئی جگہ نہ تھی مگر غلوں میں تھی۔ کاش اصل زندگی میں بھی میر روز بر جگہ ایسا ہی ہوتا۔ میرد مارتا! دلن مار کھاتا۔ عورت اپنی عزت کی حفاظت اسی طرح کر سکتی۔ مظلوم اسی طرح ظالم کے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کے دھماڑ سکنا۔ حق کا بول بالا ہوتا۔ جھوٹے کانت کلا ہوتا۔ جھوٹ کی کھیتی سدا چلتی نہیں ناک کا گند کی سدا چلتی نہیں۔ یہ شعر غلط نہ ہوتا۔ پھر بھی زندگی میں ایک بار کہیں تو ایسا ہوا جس کے وہ خود چشم دید گواہ بننے کوئی مانے نہ مانے۔

میں نے لوگوں سے کہا ”آپ لوگ جائیں بلیر۔ سو رہی کہ آپ کو اس بد معاشی کی وجہ سے کرنا پڑا۔“

ایک صحت مند سفید سردالا بوڑھا میری طرف بڑھا۔ قریب آگے اس نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا ”میں صوبے دار عطا محمد ہوں۔ میں نے ہلاہ کی جنگ بھی لڑی تھی اور پھر بے ایف کی بھی۔ مگر اس کو بھی بائیس سال ہو گئے۔ لگتا ہے وہ بچکے جنم کی بات ہے۔“

میں نے کہا ”آپ جیسے لوگ ہی وطن کا سرمایہ ہیں۔“
وہ بخٹی سے مسکرایا ”او نہیں چڑ۔ ہم جیسے تو اب نالو ہو گئے ہیں۔ آج مجھے دیکھ کے بڑے عرصے بعد میرا دل خوش ہوا کہ ابھی جو انمو ہیں۔ پاکستان کے محافظ ہیں۔ اللہ تیری عمر دلا کرے۔ تجھے اپنی حفاظت میں رکھے۔ اور یہ۔۔۔ تیری دوہٹی۔۔۔“ میں نے چندا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

چندا خاموش رہی۔ میں نے بھی تیرید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”جب تک میں زندہ ہوں تیرے لیے دعا کروں گا پڑ۔“ وہ بولا ”تیرے جیسی ہو میں سب کر لیا تو خیال تھی کسی کی خواہش بن اور نیکی کی طرف بری نظر ڈال۔ پر ایسا ہے نہیں ہوتا ضرور چاہیے۔“
وہ ایک دم چلا اور تیرہ قدموں سے بس کی طرف بڑھا۔ تیمور بھی خاموش تھا اور میر زمان بھی۔ رشتی گاڑی میں سے سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ رات جیسے ٹھہر گئی تھی۔ رات کا سکوت جماد ہو گیا تھا۔ ٹک ساکت تھے کچھ قاتلے پر چلے والے ہوئیں کے بلب اپنی پلکیں جھپکا بھول گئے تھے۔ نیپ ریکارڈر چپ

مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک میرے ہی جیسا انسان مرا
 ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے چند سکول کے عوض اپنی زندگی
 کو غیر مشروط طور پر گروی رکھ دیا تھا۔ شاید وہ مجبور تھا۔ شاید اس
 میں بھی اتنی صلاحیت اور ہمت نہ تھی کہ وہ آزاد رہے ہوئے اپنی
 محنت اور جدوجہد سے چند نکلے کا مسکن۔ حکم کا دوسرا غلام گاڑی کے
 پاس بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آقا سے شرمندہ تھا کہ وہ اس کے لئے
 اپنی جان قربان نہ کر سکا اور ایک چمکوری سے مار کھا گیا حالانکہ وہ
 مرد تھا۔ خطرناک طور پر مسلح تھا اور دیکھنے میں بھی نہیں زیادہ
 مختار تھا۔

اچانک میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو گاڑی کے سامنے بیٹ
نی کھڑی تھی۔ صوبے دار کے جاتے ہی وہ لپک کر سامنے آگئی۔ کسی
سے کچھ کے بغیر وہ بیڑاں شاہ کی طرف بڑھی۔ وہ عمر رسیدہ عورت
بڑیوں کا ڈھانچا تھی۔ اس کے چہرے پر جھروں کا جال تھا اور اس
کے سونے بازو کی کمال خشک پتھریلوں کی طرح لٹک رہی تھی۔
اس کے سفید بال اٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دیرانی تھی۔
پٹاخ کی ایک آواز کے ساتھ ہی بیڑاں شاہ کا ہاتھ اپنے
گال کی طرف پھرا۔ بڑھیا نے تجسّس مارنے کے بعد اس کے منہ پر
تھوک کے قندہ لگایا۔ ایک دیوانی عورت کا پاگل ہیں سے بھرپور
زخمی اور ترپتا ہوا ہرناک قندہ۔

پیر زمان شاہ نے حج کر اسے ایک گالی دی۔ اگر میں فوراً ان کے درمیان حائل نہ ہو جاتا تو شاید وہ طیش میں اس بڑھیا کی گردن مروڑ دیتا۔

”بہت ہو گیا سائیں شاہ عالم بہت ہو گیا۔ ابھی تم اور کیا چاہتے ہو، یہاں جتنے کفرے ہیں سب مجھ پر تھوکیں۔ اتنی بہت پلے کیوں نہیں تھکی کسی کس۔ یہ کئے سب تسمادی وجہ سے شیریں رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایسا ہی ہوتا ہے ہر سائیں۔ جب ستارے اپنی جگہ بدلتے ہیں تو سلام کے لیے اُنھیں والے ہاتھ پھراٹھالیتے ہیں۔ یہ تو ایک باگل عورت ہے، خود اس وقت سے جب دیوانے ہی نہیں ہوئیں والے بھی اس جیسے ہو جائیں گے“

”بھی سیں آئے گا وہ وقت۔ پاگل ہیں سب جو ایسا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر تم اس سے بچو“ اس کے ساتھ میری کون سی پرانی دشمنی تھی جس کا بدلہ لینے یہ میاں آگئی۔“

بڑھانے میرے پیچھے سے پھر ایک قہقہہ لگایا اور اس کی عمرو
 بھانک نہیں کی مدائے بازوشت رات کے صیب سناٹے میں ایسے
 کوئی جیسے آسیب زہ جنگل میں کسی چڑیل کا قہقہہ ہر سمت سے
 سنائی دیتا ہے۔

”میری صفراں کو بھی ایسے ہی ایک اڑدے نے نکل لیا تھا۔“
انگل اٹھا کے بولی ”یہ بھی اڑدہ ہے، دوسرا ہی۔“

میں نے کہا "تم کس کس اڑ رہے کو مارو گی؟"
 "سب کو۔ سب کو مار دوں گی میں۔" وہ ہنسی اور پھر بھاگتی ہوئی
 رات کے اندر چھرے میں گم ہو گئی۔

”کون گھمائیہ بڑھایا؟“ چنانچہ اس نے ہنس کر کہا: ”ایسے ہی ایک پاگل ہے جناب! پتا نہیں کب سے اس ملاقمے میں پھری ہے“ وہ ہلکا۔

میں نے کہا "کیا اس کی مفرات نام کی کوئی بیٹی تھی؟"
 "ہوگی جناب۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں تو چار سال پہلے ہی
 یہاں آیا ہوں۔ اس سے پہلے کا مجھے پتا نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں
 قہر کی کچھ کہتے ہیں۔"

”کیا کہتے ہیں؟“ میں نے کہا ”بولو۔“
 ”میری کہہ۔ اس علاقے کا ایک زمیندار تھا، سردار اللہ
 بخش۔ اسی نے۔۔۔“ وہ پھر رک گیا۔

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ کمانی ایک سی ہے، نام اور کردار ملتے رہتے ہیں" اس نے تو اللہ بخش کے سی تھپڑ مارا تھا۔ اسی کے لئے نہ تھوکا تھا۔ اسے سب اڑھ ہے نظرتے ہیں اور اڑھوں کے ام نہیں ہوتے۔"

بہنیں والے روانہ ہو گئے تھے۔ نرگس ڈرائیور بھی اپنے اپنے کونوں میں بیٹھ رہے تھے مگر آنے والے نرگس ڈرائیور اپائیٹیوں پر بیٹھ رہے تھے اور پتھر تھے کہ ہوٹل کا مالک انہیں دیکھے۔ وہ دور سے دیکھ رہے تھے کہ شاید جیپرو کے پاس کوئی گزیرا لا معاملہ ہے مگر وہ جھگے ہوئے تھے اور ان میں سے کسی نے قریب آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی پھر ایک بس بھی آئی اور ہوٹل کا مالک اجازت لے کر چلا گیا۔

سائیں بچہ زنان شاہ نے چادر سے اپنا چہو صاف کیا اور گویا
 اری کالک پیچھے دی جو اس دلت نے ان کے منہ پر مل دی تھی۔
 کسی بھی سے غیرت اور بے خمیر آدمی کے لیے جیسے کی طرح عزت
 یا ماتم کا سبیل ہے۔ آتی جاتی چیز ہے۔ جو بھی میرا ہو اس کو کس
 نے نہ رکھا۔ ایک اس کا ڈرائیور تھا ایک باڈی گاڑا اور ایک ہوٹل
 مالک۔ ان کو سمجھایا جاسکتا ہے کہ اس معاملے میں اپنی زبان بند
 تھیں۔ ایک باڈی گاڑا مارا جا چکا تھا اور غیر متعلقہ لوگ رخصت
 کئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی بچہ زنان شاہ کا مرید معتقد نہ رہا یا
 نہیں نہیں تھا۔ وہ اپنی دلت کی کمائی پر بخت سنسرپ عائد کر سکتا تھا
 اور بیلے کی طرح باعزت رہ سکتا تھا۔

”سائیں! ہمارے لیے آپ کیا حکم ہے؟“ وہ بولا۔
 ”میں نے کہا تاکہ تم جا سکتے ہو۔“
 ”پلے تو جائیں مگر یہ جو بندہ مار رہا ہے، آپ کی ہیتم صاحبہ
 خدا اس کا کیا ہو گا؟“

میں نے کہا "جو تم چاہو۔ یہاں قریب کوئی پولیس اسٹیشن ہے
اپنے ڈرائیور سے کہو کہ غانے دار کو بلا لائے۔ فون تمہارا"

کاڑی میں بھی ہو گا۔ تم بھی کسی سے بات کرو۔ خنات کی ضرورت نہیں بھی پڑے گی۔ میں بھی ڈی آئی جی صاحب سے بات کر لیتا ہوں اپنے فون پر۔“

”سوی لو بابا۔ کل عورت نے کیا ہے ہم تو الزام اپنے سر لیے ہیں مگر چالان میں مگر کی عورت کا نام آئے یہ برداشت نہیں کرتے۔“

میں نے کہا "ایک غلط فہمی ہے، میں جو دور ہو جاتی ہوں۔" یہ میری بیوی نہیں ہے۔ مس خان کے والد جس کو قتل خان۔ جو ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس کے عہدے پر۔

عمل کرنے دتا تو میں کہتا کہ وہ مرزا نے ہوتے تو اس محلے پر ہوتے مگر محلے کا نام سن کے ہی اس کی وزیر ایشانی اور بی بی کے غبارے کی اوپر نکل گئی۔

”تو کیجو سائیں۔ ابھی بات کو ختم کرتے ہیں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو اس چھو۔ جس خانہ نے جرم کیا۔ چلو معاملہ برابر۔ تم جاؤ اپنے راستے۔ مگر ہم پھر ملیں گے“

”ہاں۔ کیا پتا چرایسے مقامات ہو جائے جیسے آج ہوئی۔ دنیا پھولی سی جگہ ہے۔“ میں نے کہا ”خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی تکلیف مت کرنا۔ اپنی کلٹ مانتھنے کے لیے بھی نہیں۔ جنسی شرمگاہ تم کو آغا خان پری“ اس سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہاں تو دیکھنے والے تمہارے اپنے آؤں تھے یا ہجرا ایسے لوگ جن سے تمہارا واسطہ نہیں مگر اپنی ٹیکرٹ میں سیاست داں ہوں گے مگر کراہوں گے“ انہوں نے کہا۔“

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا مگر میں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شاہ عالم کی حیثیت سے پبلک لائف میں یہ میرا پہلا گداز تھا جو میں نے کامیابی سے نبھادیا۔ پریس کانفرنس ایک الگ چیز تھی۔ پریس ایک ٹیل کا کام کرتا ہے۔ عدلیہ، انتظامیہ اور سیاسی اداروں کو پبلک سے مربوط رکھنے کے لیے مگر پریس کو پبلک نہیں سمجھا جاسکتا۔ بڑے بڑے چنگا درسی سیاست داں بھی اخبار والوں کے سامنے حماقت کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ ان کی معمولی سی غلطی کو پریس ہی غیر معمولی بنا کے پبلک تک پہنچا دیتا ہے۔

زبان شاہ شاہد حقای سیاست میں داخل تھا۔ اس لیے میرا ساتھ دینے کا جھوٹا سچا اشارہ دے کر مجھے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر قتل کے معاملے میں پولیس کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ شاید میں بدنامی کے ذریعے مخالفت پر آمادہ ہو جاؤں گا مگر اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے چاہا تھا کہ ہم غیر شرط سیاسی سمجھوتہ کر لیں اور جو ہوا ہے اسے بھول جائیں۔

”ٹھیک ہے سائیں۔ مرضی تمہاری“ وہ فحشی سے بولا ”بھیر“

زمانہ شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والے بہت ہیں۔ تمہوشی کر کے دیکھ لو۔“

میں نے کہا: تم مجھے اپنا دوست سمجھو اور نہ دشمن۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا۔ تم نے غلطی کی اور نقصان اٹھایا۔ مجھے نہ سختی فرمت ہے اور نہ اس کی ضرورت مگر تم بدلے لینے کے لیے جگہ کو جاری رکھنا جو تب بھی میں تیار ہوں۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ نقصان ہے۔ موت کسی کے اختیار میں نہیں اور نقصان جگہ میں کسی ایک فرقہ کو نہیں ہوتا۔ چلو تھوڑا ہمارا مت وقت ضائع ہو گیا ہے یہاں۔“

اس نے اپنے زنا جو پر خسر آٹا را معلوم کا کچھ۔ شکیں
دیکھ رہا ہے انہیں کیا تیرا تپ اٹھانے کا۔ حرام کھا کھائے سوئوں
کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی اگر تیرے بھرتے ہیں۔ ہاتھ میں توپ
بھی دے دو تو..... بھی فرق نہیں پڑتا۔ چوہا بمار ہو کے شیر نہیں
بنتا۔“

”سائیں۔ یہ تو مر گیا ہے“ ذرا سو رنے ایک کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ساتھیں نے اس کے ایک لائٹ رسید کی "یہ اب بتا چلا ہے تجھے اور تو مجھے بتا رہا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ دوسرا خالقو سا نذکیوں ذمہ ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو بتا چلا ہے کون مرد ہے کون نامرد۔ بے غیبت۔ ایک چمکوری سے مار کھا گئے۔"

میں نے سر کو جھٹک کے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر لگا کے میں نے لمبی گہری سانسوں کے ساتھ ذہن سے اس ناخوشوار واقعے کی ساری عکاسی کر لی اور بد مرکزی خارج کر دی۔ پھر میں نے دس سیکنڈ تک اپنے راستے کا اور منزل کا تعین کیا اور اپنے خیال کو کنٹرول کیا۔ میرے دماغ کے کہیں نہ رنے کا پیغام دیا اور چل کر لیا۔ مجھے اب نو گھنٹے کی مسافت آٹھ گھنٹے میں طے کرنی ہوگی۔ مجھے ہوشیار چوکس اور مستعد رہنا ہوگا۔ میں نے دعا مانگی اور سورہ فاتحہ پڑھ کے اپنے دونوں طرف پھوٹک باری پھر میں نے گاڑی اشارت کی۔

چندا کے لیے اس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر محشی نے ایک منٹ کے اس عمل کو دلچسپی سے زیادہ حیرانی کے ساتھ دیکھا تھا۔
 ”خدا کا شکر ادا کر رہے ہو کہ مصیبت میں بڑنے سے بچ گئے۔“

میں نے کہا ”خدا کا شکر تو میں ویسے بھی ہر حال میں ادا کرتا ہوں۔ مصیبت سے بچانے والا وہی ہے لیکن مصیبت میں ڈالنے والا کون تھا۔“

”تسماری بس خان۔ بروس لی کا زمانہ ایٹیشن۔ میں نے سنا ہے کہ مارشل آرٹ جانے اور سکھانے والے اپنے فن کا مظاہرہ قتل عام کر کے نہیں کرتے یہ تو معمولی سی بات پر خفا ہو سکے۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اگر تمہارے پاس اپنے دفاع کے لیے اسلحہ ہو اور پھر زمانہ شاہ کے غلام

ایسے ہی تھیں انوار کے لے جا چاہیں تو تم کیا کر دی۔ خضر نہیں آئے گا تھیں۔ کوئی نہیں چلاؤ گی تم خود کو بجائے کے لیے سیلف کنٹرول ہوتا ہے جارحیت سے حتی الامکان بچنے کے لیے۔“

چند ایویں میں اسے جان سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ بس وہ مر گیا۔ قضا آئی ہو تو کسی اور کے لیے چلائی جانے والی کوئی بھی آپ کی جان لے سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”اس کے علاوہ یہ سب اس لیے ہوا مسز عالم کہ میں آپ کا حافظہ بن کے لینڈز ٹائلٹ دوم کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اگر میں چندا کے پاس موجود ہوتا تو جیسے تم خود عینیت کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ایسے ہی چندا کو بھی کچھ نہ کرنا پڑا۔ میں خود ٹیلٹ لیتا ہر زمان شاہ سے۔ پھر شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ وہ مجھے پچھتا رہا تھا۔“

رخشی نے برہمی سے کہا ”تم اس قتل کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہے ہو۔“

”تم نے چندا کو مورد الزام ٹھہرا لیا تھا۔“

”اور تم اس کا دفاع یوں کر رہے ہو کہ مجھ پر مارے ہو۔“

میں نے کہا ”تھیں سمجھنا چاہیے رشتہ بیکم کہ جب قضا آتی ہے تو آدمی پہلے وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں فرشتہ پہل بعد میں پہنچتا ہے۔ یہ بھی ملے ہے پہلے سے کہ کس کو کہاں اور کیسے مرنے ہو گا۔ ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم یہاں نہ رکھتے اور ہمارے بعد یہ لینڈ کروڈ زمین اسی جگہ نہ آتی۔ وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔“

”اسی کو قہر مہکتے ہیں۔ نامعلوم۔ جو ہم نہیں جانتے۔“ تیمور نے ایک فلسفیانہ بات کی۔

”شاید۔“ رخشی نے ایک گہری سانس لی ”میں UNKNOWN تھا جس نے شاہ عالم سے اس کا نام اس کی شناخت ’ماضی‘ حال اور مستقبل سب کچھ اچانک چھین لیا۔ وہ کچھ نہ کر سکا۔“

”اس نے مجھے اچانک نامرغیم سے شاہ عالم بنا دیا۔ میں بھی کچھ نہیں کر پاتا تھا“ میں نے کہا۔

”یہ آدمی کینہ پرور ہے۔ تمہارے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ تم نے اس کا ایک خاص آدمی مار دیا ہے“ تیمور بولا۔

”میں نے؟“ اوہ تو مسٹر تیمور۔“

”تم نے نہ سہی۔ کسی نے جو تمہارے ساتھ تھا۔ ظاہر ہے تم جس خان پر الزام نہیں آئے دو گے۔“

میں نے کہا ”جو وقت گزر گیا اسے بھول جاؤ۔ مجھے تو یاد نہیں پڑا کہ تمہارا دوسرے گھر بھی ہوا تھا اور ہم نے بھی پھر سائیں زمان شاہ کو یا اس کی سفید لینڈ کروڈ کو دیکھا تھا۔ مسز اور مسز شاہ عالم کرمل خان اور مس خان نے کراچی سے لاہور تک تیر کام میں سڑکیا۔ اسے ہی سپریم کے ایک کپار منٹ میں ان کے نام سے چار برحقوں کی ریویویشن تھی۔“

”تم ان سب کو جھٹلا دو گے۔ جنہوں نے ابھی تمہیں دیکھا تھا؟“ رخشی نے کہا ”ہر زمان شاہ نے بعد میں بچے کو اہوں کے ہاتھ سے لکھ لے لیا ہوں گے۔“

میں نے کہا ”پھر سائیں کو شاہ عالم نہیں پچھتا۔ شاہ عالم کو بہت لوگ پچھتاتے ہیں۔ مجھے کسی کو جھٹلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ خود تصویریں اور خبریں دیکھ لے گا۔“

”کیسی خبریں اور تصویریں؟“ تیمور بولا۔

میں نے کہا ”میرے نائب صدر یہ نہیں لیت نہ ہوتی تو صبح تو ساڑھے نو بجے لاہور پہنچے گی۔ میری پارٹی کے ورکرز سے کہہ دو کہ میرے شاہدار استقبال کے لیے موجود رہیں۔ ہماری تنظیم ’کالج عالم‘ کے جوان بھی ہوں تو مجھے کدھوں پر اٹھانے کے ذمہ دار کے تجربے لگانے والوں کا خاصا جوم ہو جائے گا۔ جب پریس فوٹو گرافرز تصویر بنائیں گے تو ریلوے پلیٹ فارم پر ہزاروں افراد کا مجمع نظر آئے گا۔ نہیں کے سارے مسافر اور ان کے استقبال کے لیے آنے والے بھی تصویریں ہوں گے تو ایسا ہی لگے گا رات!“

”وہ تو ٹھیک ہے تمہارے۔“

میں نے کہا ”یہ فون۔ ابھی رات کے بار بجے ہیں۔“

”بارہ بج کے ہیں منٹ آخری کاپاں جا چکی ہوں گی سب اخباروں کی“ تیمور نے کہا ”شاید نوزائیدہ بچہ نزل جائیں۔“

”شاید کوئی کالی لیت ہو۔ شاید کسی اخبار کی آخری کالی ایک گھنٹے بعد جائے تو وہ ایک چھوٹی سی خبر کے لیے مہجاش نکال گیس جو پہلے صفحے پر ہوگی۔“

”لیٹ نوزائیدہ صفحے پر ہی آسکتی ہے“ تیمور نے فون لے لیا۔

”اور پہلے صفحے کی خبر صبح تو ساڑھے نو بجے تک سب کو مل سکتی ہے۔ پارٹی ورکرز کو بھی۔ رپورٹز کو بھی میں نے کہا۔“

تیمور نے ایک نوٹ بک نکالی۔ ”یہ لائن آن کر دو۔“

میں نے سلیکٹ لائن آن کر دی ”ایک کال کرو کسی ایسے شخص کو۔ پارٹی کے کسی جو شیلے اور مجلس کارکن کو جو باقی کالیں لاہور میں بیٹھ کے کرے۔ یہاں سے تم کو بار بار ٹیک کال ملانے میں دیر لگے گی۔ اخبارات کے نمبر بڑی ملتے ہیں۔“

تیمور نے نوٹ بک بند کر دی۔ اس نے ایک نمبر ملایا اور کچھ دیر بعد بولا ”ہیلو۔ کن“ میں تیمور بول رہا ہوں۔ ہاں شاہ جی بی بی گھگے تم کو رپورٹ مل گئی ہوگی پریس کانفرنس کی۔ کیا وہ مکمل رہا؟ ہاں ’ماویسی‘ اور پریشانی تو ہوئی انہیں۔ خیر ابھی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ وہاں سے سنو۔ شاہ جی تیر کام سے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ نہیں میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں کراچی میں ہوں۔ انڈیپنڈنٹ سے بول رہا ہوں۔ نائٹ کوچ سے کوشش کر رہا ہوں۔ چائس سیٹ ہے ہو سکتا ہے صبح تک پہنچ پاؤں۔ سیٹ نہ ملی تو پھر مجھے دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم فوراً یہ خبر اخبارات کو دو۔ ہاں ہاں ’دیر ضرور ہو گئی ہے مگر زانی کرنے میں کیا حرج ہے۔ کسی ایک اخبار میں

بھی خبر لگ جائے تو کافی ہے۔ ورنہ تم صبح سات آٹھ بجے رپورٹرز کو کال کر سکتے ہو۔ دوسری بات۔ شاہ جی کا شاہدار استقبال کرنا ہے۔ ابھی آٹھ تو گھنٹے ہیں تمہارے پاس۔ جس سے بھی رابطہ ہو جائے اسے یاد دہانہ سے زیادہ کارکن ریلوے پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ سب کے پاس جھنڈے ہوں ہاں ہوں۔ تم سمجھتے ہو نا۔ ظاہر ہے اسے ہی سپر شاہ عالم کیا اکانوی کلاس میں سڑ کرے گا۔ اس کی بیوی بھی ساتھ ہے۔ میں تم کو پھر فون کروں گا۔ ایک گھنٹے بعد۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تم نے کیا کیا ہے۔ اس صورت میں کہ مجھے جنازہ سیٹ نہ ملی۔ سیٹ مل گئی تو پھر صبح لاہور سے بات ہوگی۔ لاہور انڈیپنڈنٹ سے میں تمیں بچے کے بعد فون کر سکتا ہوں گا۔ تم اب دیر مت کرو۔ ایکٹو ہو جاؤ۔ ممکن ہے خود شاہ جی تم سے بات کر لیں لیکن ان سے۔ ظاہر ہے چلتی نہیں سے تو تمہیں فون نہیں کر سکتے۔ بی ایکٹیو! تمہارا شو ہو گا۔ اس کا کریڈٹ تم لے سکتے ہو۔“

تیمور نے فون بند کر کے میری طرف تعریف طلب نظروں سے دیکھا۔ ”دیر کی گزرا! میں نے کہا۔“

”کیا دیر کی گزرا! رشتہ بولی تمہارے پاس کوئی جادو کی جہیز ہے جسے تمہارے سے تم نہیں میں بیچ جاؤ گے۔“

”اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا دیر رخشی۔ آئی ایم اے فون۔ جا رہا ہوں بائی روڈ اس۔ پیر دو میں۔ ہنگ اور پریس کو بلا لیا ریلوے اسٹیشن پر۔ اب کیا ہو گا تیمور۔ بس خان!“

رخشی نے فحش سے کہا ”انا کہ تم بہت جالاک ہو۔ تم نے کچھ سوچ کے ہی نہیں سے بھی ریویویشن کرائی تھی مگر مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟“

چند اے کے ”یہ نہیں رائے دے پھر تمہارے گی۔ چند منٹ کے لیے۔ وہاں سے ہم نہیں میں سوار ہوں گے تقریباً ایک گھنٹے بعد نہیں لاہور پہنچے گی۔“

”اس نہیں سے ہم تمیں برآمد ہوں گے۔ مسز اور مسز شاہ عالم۔ اور شاہ عالم کی بی سیکریٹری بس خان!“ میں نے کہا ”رائے دے دے سے تیمور کی گاڑی میں سوار ہوں گے کرمل خان اور تمہارے شوہر۔ میں نے بھی گولیاں نہیں کھلی ہیں۔ پیر سائیں زمان شاہ میرے لیے کیا مسائل پیدا کرے گا۔ جب وہ اخبار میں استقبال کی تصویریں دیکھے گا تو مسئلہ خود اس کے لیے پیدا ہو جائے گا۔ دو بج سامنے ہوں تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے کہ کس پر تعین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اس کی سارے کو اہوں کی ایسی تھمتی۔ کیا وہ میرے کارکنوں اور اخبار دانوں سے زیادہ معتبر اور مستند ہیں۔“

”تم۔ میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک آدمی ہو۔“

”جب واسطہ خطرناک لوگوں سے ہو اور ہر لمحہ خطرناک ہو تو پھر خطرناک آدمی ہی خطرناک حالات سے نمٹ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم زیادہ تینشن نہ لو۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے ٹک کے کہا ”جو کچھ میری نظروں کے سامنے“ خود میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔“

”تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً ان مسائل کے بارے میں جن کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں۔ تمہارا کردار بہت محدود ہے اس سارے ذرائع میں۔ تم نے اسکرپٹ کو بدل سکتی ہو اور نہ دوسرے کرداروں کو۔ اگر یہ سب کچھ برا لگتا ہے تمہیں تو چینی کماؤت کے مطابق برا مت دیکھو برا مت سنو برا مت بولو۔ تم نے ڈیکوریشن میں کی دکانوں پر بندوں کے تین تھمتے دیکھے ہوں گے۔ ایک آٹھ تھمتے بند کیے بیٹھے۔ دوسرا کانٹن میں انگلیاں ڈالے“ تیمور ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کر۔

”میں بند نہیں ہوں“ اور نہ بند کا جملہ بن سکتی ہوں۔ رخشی جھٹلا کر بولی ”چھوٹا ہوا اگر تم مجھے دو گولیاں مار دیتے۔ ایک دل میں ایک داغ میں۔ تمہاری بھی جان پھوٹ جاتی اور میری بھی۔“

میں نے کہا ”تم لکھ دو ایک خود کشی کا نوٹ اور اس پر دستخط کر کے کل کی آؤٹ ڈال دو۔ یہ کام بھی ہو جائے گا تمہاری خواہش کے مطابق۔“

اس نے فحش سے کہا ”نوٹ بھی خود ہی لکھ لیتا۔ تمہارا شاہ طائر ذہن سب کچھ کر سکتا ہے۔ کتنی آسانی سے تم نے ایک آدمی کو مار دیا اور الزام سے بھی بچ گئے۔ شاہ عالم تیر کام سے سڑ کر رہا تھا۔ دنیا نے اسے لاہور میں تیر کام سے اترنے دیکھا ہے۔ جو کہ وہ اس خبر کی پیر دو میں بائی روڈ لاہور جا رہا تھا وہ پاگل۔“

”یہ میں نے تمہارے شوہر سے ہی سیکھا ہے خاتون! جس نے ہانگ کالک میں موجود رہتے ہوئے لاہور میں ایک قتل کر دیا۔ دنیا نے اسے سگا پور کی فلائٹ سے آتے دیکھا۔ وہ جتنا برا مداری ہے اتنی ہی اس کا جانشین بھی ہے۔ شاید اس سے بھی برا ہے۔ لو یہ دو گولیاں کھاؤ اور سکون سے سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

اس نے گولیاں لے لیں ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شاہ عالم کو چھوڑ دوں۔“

میں نے اور مجھ سے زیادہ چندا لے چوک کے اسے دیکھا ”بہت جلدی کر لیا تم نے یہ فیصلہ؟“ چندا بولی۔

میں نے کہا ”وہی طرز پر تم بہت پہلے سے تیار تھیں۔ تمہیں بس ایک ہمان یا شاید موقع کی تلاش تھی۔“

تیمور نے رخ تجلیو میں کہا ”مجھے تو ہے۔ جب تقدیر ساتھ چھوڑے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تقدیر شاہ عالم کے ساتھ تھی تو زنا اس کے ساتھ تھا“ میں بھی تھا بیوی بھی تھی۔“

”میں اس کی بیوی ضرور تھی“ رخشی نے تیر لیے میں کہا ”مگر کیا وہ میرا شوہر تھا؟“

میں نے کہا ”کالج نائے کی رو سے یقیناً وہ تمہارا قانونی شوہر

تھا اکوٹا شوہر۔

”تکاح نامہ“ کیا حیثیت ہے اس کی نظر میں نکاح نامے کی؟
کانڈ کے ایک پڑے جیسی۔ اس سے زیادہ تو کانڈ کے ان پڑوں
کی قیمت تھی جو وہ ہر رات لٹاتا تھا۔ لندن اور ٹوکیو جیسے
ہائیک لائٹ جو تہذیب ہیں۔ اسے یہاں کیا کی تھی۔ کراچی سے لاہور
اور پشاور تک ہر جگہ کوئی بیوی اس کے ساتھ ہوتی۔ پھر میں کیسے
اکوٹا بیوی ہو گئی۔ ایسا ہونا تو پھر گھری کی تھا۔ وہاں اس کی سرشت
میں نہ تھی۔ نہ اس نے کی اور نہ مجھے سکھائی لیکن اسے اپنا حق
سمجھا کہ میں اس سے محبت کروں۔ اپنے اکوٹے شوہر کو اپنا مجازی
خدا سمجھوں۔“

”اس معاملے میں مجھے تم سے اتفاق ہے۔ یہاں وفاداری کے
سارے تصورات ایک طرف ہیں۔ صرف عورت کے لیے ہیں
ساری اخلاقی پابندیاں“ چندا نے کہا۔

”ہاں۔ جب شادی ہو تو اس کا کنوارا ہونا ضروری ہے۔ مرد
شادی سے پہلے غیر مشروط اور مستعد کنوارا ہوتا ہے۔ اس کی ہر
رات باہر گزرتے اس کو فرق نہیں پڑتا۔ عورت کو ڈاکو اٹھالے
جائیں۔ وہ مادے کا شکار ہو کے کسی اسپتال میں یا کسی گھر میں پڑی
رہے۔ جھوٹے الزام میں ایک رات تھانے میں بند رہے تو اس کا
مستقبل مشکوک اور نامیدک ہو جاتا ہے۔ وہ لاکھ کنوارے کا
میں نیکل سرٹیفکیٹ لے آئے۔ اسے یوگسٹی قرار دیا جائے گا پھر
بھی۔ میں نے ایسے شوہر بھی دیکھے ہیں“ ان میں سے اکثر ازدواجی
زندگی کو ایک اخلاقی دسے داری سمجھتے ہیں۔“

میں نے کہا ”تم یہ دلائل کسے دے رہی ہو؟ مجھے قائل کرنے
کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاس صرف قانونی نہیں اخلاقی جواز
بھی ہے۔ کوئی بھی بیوی شاہ عالم جیسے شوہر کا ساتھ دینے کی پابند
نہیں۔ وہ قانونی اور شرعی طریقے سے اپنی زندگی کا راستہ الگ
کرتی ہے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ غیر اخلاقی بیعت یا انتہائی
بدعمل کے طور پر خود بھی بُرائی کے راستے پر چل پڑے۔ اور جواز
یہ رکھے کہ مجھے کو قیسا۔ بُرائی کے جواب میں بُرائی کرنے کا حق کسی
کو کسی شرع، کسی معاشرے اور قانون میں حاصل نہیں۔۔۔“

”تم طلاق کا مطالبہ کرو گی اس سے؟“ چندا نے کہا۔

”ہاں۔ اب وقت گھٹا ہے۔“

”اس سے پہلے تم نے ایسا کیوں نہیں سوچا تھا؟“
”سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ سوچا تو میں نے یہ بھی تھا کہ خود
میراؤں یا اسے مار دوں۔ مگر یہ سوچ بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔
جب میں محسوس کرنے لگی تھی کہ میرے لیے نجات کا کوئی اور
راستہ نہیں ہے۔ شاہ عالم مجھے دو ٹوک لے بیٹھیں کہ چکا تھا۔ میں نے
بتایا بھی تھا نہیں۔۔۔ کہ وہ طلاق کے ایکشنل کا نقصان نہیں
اٹھائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی نجی زندگی کے معاملات کو
زور صحافت کے طبع وار موضوع بنائیں اور پھر جو چاہے لکھتے

رہیں۔ آدمی کس کس کی تردید کرے۔ کس کس کو چنگ عزت کا
فوتن دے۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ صرف موت ہی مجھے اس سے
جد کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں موت کے بارے میں ہی سوچتی تھی۔
اپنی یا اس کی۔ طلاق کا خیال شادی کے ابتدائی دنوں میں آیا تھا۔
جب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے شوہر کا ایک پبلک ایجنٹ بھی
ہے۔ اور وہ ایجنٹ میری زندگی سے زیادہ اہم ہے۔“

تیمور نے طعنے لگا ”اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ثابت
ہو گیا۔“
”تیمور صاحب۔ یہ ظلم اور جبر کرنے والے کو پہلے سوچنا
چاہیے کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ میں نے تجویز کی
قدیم میں چھ سال گزار دیے۔ آج وہ مجبور ہے اور میں آزادی حاصل
کر سکتی ہوں تو تم مجھے طعنہ دے رہے ہو۔ تم اس کے پڑنے سا تھی
اور دست راست تھے۔ پہلے دوست بھی تھے۔ کبھی تم نے اسے کوئی
نیک مشورہ بھی دیا؟ کبھی اسے کسی غلط کام سے روکا۔ کسی بُرائی پر
ٹوکا نہیں“ اس کی بد اعمالی کے شریک تم بھی تھے۔ تم نے اسے ش
دی۔ اس کی طرف کی اور اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔ تم وہاں واہ کرنے
والے تھے“ حسی حضور اور خوشامدی تھے۔ تم اس کی تپائی کے ذمے دار
ہو۔ دوست نہیں تم دشمن تھے اس کے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا۔ دیکھ
لو تم کس کے ساتھ ہو آج؟“

چلائے چلائے دھڑ دھڑ پھوٹ کر رونے لگی اور سیٹ پر
گرہی۔ تیمور کو شاید ایسے بد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے
خاموش رہ کے ہنسنے کی۔ رشتی کے ہنسنا کے جواب میں وہ بھی
مشتعل ہو جاتا تو زیادہ خرابی ہوئی۔ رشتی نے بچ بچا ہوا تھا اور اس کی
کر دہانت میں ڈیر تھا۔ تیمور کو یہ زہر کا گھونٹ پینا پڑا۔
پچھل سیٹ پر لیت کر اپنی قدر پر آسوہا جاتے رہتے رشتی
بلا آخر سو گئی۔ تیمور سب سے پیچھے ہم دروازہ کھلی آنکھوں سے ماضی
اور مستقبل کے ڈروانے خواب دیکھتا رہا۔ وقت جو گزر گیا تھا اس
کا آسیب بن گیا تھا جس سے وہ پیچھے چھڑا جاتا تھا مگر اس کی
ذہنی مضبوط تھی۔ فلاوی ڈنچھوں کو کاٹا جاسکتا ہے۔ خیال کی
نظر نہ آنے والی ڈنچھوں کاٹ سکتا ہے۔

شاید وہ سوچ رہا تھا کہ رشتی اس کے مقابلے میں کتنی خوش
قسمت ہے کہ طلاق لے کر آزاد ہو جائے گی“ اس نے صرف چھ
سال گوائے اور بلا آخر وقت بدلا تو اس کی قدر بھی بدل گئی مگر خود
تیمور کے لیے کل بھی اتنا اداری تھی۔ کل بھی مصلحت اندیشی کے
طریق تھے۔ کل بھی رشتوں کے تحت کا باڈر گراں تھا۔ کل بھی مفادات
کے حقدار تھے۔ کل بھی غلامی تھی اور آج جب آقا اور مالک کے نام کا
لیل کسی اور نے اپنے ماتھے پر لگایا ہے تو اس کے لیے سب کچھ
وہی ہے کہ جو تھا۔ اس پر محبت اور منافقت، خوشامد و بدعتی اور
خود غرضانہ بدعتی کا الزام لگانے والے کیوں نہیں سمجھتے کہ ٹال کا
کیزا گندگی میں کیوں رہتا ہے؟ کیونکہ یہ اس کا مقصد ہے“ اس کا

انتخاب نہیں۔ کلی گریل درخشندہ عرف رشتی، جاؤ آزادی کو انجوائے
کرد۔ بیش کو کیونکہ ابھی تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ تم بھی وہ
سب کر سکتی ہو جو شاہ عالم کرتا رہا۔ تم اتنی حسین اور پُر شباب ہو اور
دولت مند بھی ہو۔ سارے پنڈم جرم خور ہیرو اور سب مفلس
مثالی جو تمہارے سب آستان پر بچہ روز دیں گے اور تمہارے د
کے کتنے ہیں کہ تم ہلانے کا اعزاز حاصل کرنے کو خوش ہستی
جائیں گے۔

چندا خاموش تھی۔ اس بے سبب ممبرک آزادی کے بعد جس
میں اس کے ہاتھوں ایک مصلحت مارا گیا تھا وہ احساس جرم وندامت
سے بچھا چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر ناکام تھی۔ اس
کے وجود میں جاری خاموش جنگ، ذہنی خللش اور جذباتی انتشار کی
کیفیت اس کے اعصاب پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ
وہ بالآخر اس حد و حد میں کامیاب ہو جائے گی۔ طوفان جتنا بڑا ہو
اس سے بہتر آزما ہونے میں اتنی ہی توانائی بھی زیادہ صرف ہوتی
ہے۔ چھوٹے سونے لہروں کے توجہ سے مضبوط سینے کا اثر نہیں
ہو سکتا۔ چندا کی حریت خان اعظم نے کی تھی۔ جسم کو ذہن کنٹرول
کرتا ہے۔ جسم کے مربوط اعصابی نظام کا کنٹرول دماغ میں
ہے۔ دماغ کو کنٹرول کرنا خیال کو کنٹرول کرنا پھر تمہارا اہم تمہارے
تایخ ہو گا۔

رات کے دو بجے میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی جس کے
دوشن حروف ڈیٹس بورڈ کے ایک خانے میں جلی بچھ رہے تھے۔ پھر
میں نے رفتار دیکھی۔ ایک سو چالیس کلومیٹر۔ کسی اچھی سڑک پر
اتنی بڑی گاڑی کے لیے یہ رفتار بہت زیادہ نہیں تھی مگر یہاں
خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ مجھے بابا بار زکوں اور بھوں کو
اور ٹیک کرنا پڑا تھا۔ سڑک کی چوڑائی کم تھی اور بیشتر زکوں پر
گھنٹا گھنٹے سے زیادہ سامان لوڈ کیا گیا تھا۔ وہ بعض اوقات دائیں
جانب جھکے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور ان کے پاس سے گزرتے
ہوئے لگتا تھا کہ گاڑی پُر اٹل جائیں گے یا ڈرا بے قابو ہوئے تو
میں تصادم سے نہیں بچ سکوں گا۔ اس سے زیادہ خطرناک سامنے
سے آنے والی ٹیک تھی۔ ڈرائیور فیل پیم پر لائٹ مارے تھے اور
ڈپ کرنے کے اشارے کو قطعی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بھوسے کے
ڑک دائیں بائیں ہل رہے تھے۔ بھوسے کے پھلنے کے لیے پوری سڑک
بلاک کر دیتے تھے اور وہ اپنے پیچھے آنے والی تیز رفتار ٹیک کو دیکھ
بھی نہیں سکتے تھے۔ دن کے مقابلے میں رات کو۔۔۔۔۔۔ گاڑی
چلائی ایک جان لیوا تجربہ ثابت ہو سکتا تھا میرے ذہن پر وقت کی
گی کا احساس غالب تھا۔

چندا نے کہا ”کافی بڑے؟“

”تم بلاؤ گی تو کہنے کا سوچ بھی شریعت روح افزا سمجھ کے
ہوں گا۔ وہ زہر بھی پی لیں گا جو سقراط نے پیا تھا۔ کیسا ڈائیلاگ
ہے؟“

”ہڑا۔“ وہ بولی ”میں کافی بناؤں گی، پلاؤں گی نہیں۔ کیا صبح
ہے اگر گاڑی دس منٹ کے لیے کبیں روک لو۔“

”دس منٹ ایک نہ دو“ اکتھے دس منٹ۔ نو میڈم! نام
نہیں ہے اپنے پاس۔ لیٹ ہو گئے تو سارا پروگرام چھوٹ۔
”تم لیٹ نہیں ہو سکتے“ ٹرین پیٹا لیٹ ہوگی، شرط لگا کر۔“
میں نے کہا ”اگر تم ہار گئیں تو وہ لے گا۔ لالی پاپ؟“

وہ سمجھ گئی کہ میں نے لالی پاپ سے کس چیز کو تشبیہ دی ہے۔
بامر کا لگی نے چائے کے لیے کہا تھا۔ ایک دو تیرہ کے لیوں کی
طرح۔ اس میں گری بھی ہے، مٹھاس بھی ہے۔

”چلو نہیں تو نہ سہی“ چندا نے کہا ”میں نے تو سوچا تھا کہ تم
مسلل ڈرائیو تک کر رہے ہو“ ٹھکن دور ہو جائے گی۔“

”دوبارہ غور فرماتے، پر ہم تمہاری درخواست کو شرف قبولت
بخشتے ہیں۔ کسی حسین لڑکی کا دل توڑنا ویسے بھی گناہ ہے۔ ابھی کوئی
مناسب جگہ دیکھ کے گاڑی روکنا ہوں۔“

”اس سڑک پر مناسب اور مناسب جگہ کیسی؟“

”کیا پتا اچانک کوئی جھیل آجائے جس کے خلاف پانی میں
کوئی ناؤک اندام بیٹھیں لہروں کے دوش پر تیر رہی ہو۔ درخت کی
شاخوں میں چاند لگھا ہو۔ ایک طرف کوئل کوک رہی ہو لی
کمان۔ دوسری طرف آؤ بول رہا ہو“ میں یہاں۔ اور جھیل کے
کنارے بڑے کے قالین پر بیٹھ کے اور تمہاری آنکھوں میں
آنکھیں داخل فرما سکے۔ میرا مطلب ہے ڈال کے۔ اور تمہارا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام کے تمہاری نبض دیکھوں اور پوچھوں
”حال کیا ہے جناب کا۔ اور جواب میں تم گائے کو کیا خیال ہے
آپ کا؟“

وہ ہنس پڑی ”ہمارے تم بالکل پریشان نہیں ہوئے؟“
”ہوتا ہوں۔ جب بھی یہ اندھا تک خیال آتا ہے کہ کیسے
تمہارا بداعیتی قسم کا ظالم دارا تمہارا ہاتھ کسی ٹیرمزٹ یا سوداگر
جسم کے ہاتھوں میں دینے کا فیصلہ کر لے۔“ میں نے گاڑی کو ایک
نبٹا کشا اور ہموار جگہ پر روک لیا ”ویسے تو تم اسی لائق“
قسمت ابھی تھی کہ میں لی گیا۔“

”پھر باز۔ کتنا اچھا ہوا اگر تم واقعی کسی لائق ہوئے“ چندا
نے نیچے اترتے ہوئے کہا ”تم صرف میرا بھیری کر سکتے ہو یا پھر
فضول باتیں۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”تمہاری طرفی دال برابر۔ کسی
دن میں بیچ بیچ وزیر اعظم بن گیا تب بھی تم کوئی کہ انسان کے بچے
بن کر دکھاؤ“ پھر ناؤں کی۔“

”یہ تو ہے۔“ وہ بولی ”وہ بہت مشکل ہے تمہارے لیے۔“

میں نے کہا ”چندا۔ تم بہت پریشان نہیں ٹامیں دیکھ رہا تھا۔“
اس نے قہر میں کو بیٹھ پر رکھا پھر روک رکھے اور ان میں
گرم پانی اڑنے لگی۔ ”تم ہی دیتے دار ہو ساری پریشانی کے۔“

ظاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا تسلم سے ایک خوبصورت ناول

اندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاہ
ایک نندہ ٹرنکے والا ایڈیو جو جس
میں آپ بہتے پھلے جائیں گے۔
قیمت :
جلد اول : ۱۵۰ روپے
جلد دوم : ۱۵۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریب بکسٹال سے طلبہ فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ :

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۳۰ عزیز ماریٹ اردو بازار لاہور۔ فون: ۳۳۳۸۵۳

اشاکٹ، علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور۔ فون: ۳۳۳۸۵۳

خانم میں جا کے بیٹھے ہو جانا قبول نہیں کر سکتے تھے۔ آنے والا وقت
کیا ہو گا۔ اس کا انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے خواجہ باہم
الدین اور مولوی تیز الدین جیسے لوگ سیاست سے کنارہ کش ہو کے
کوشش گتائی میں بیٹھ گئے تھے۔ اور بھی تھے۔۔۔ چوہدری محمد علی فیروز
خان نون چند دیگر۔ انہوں نے اپنی عزت ہی نہیں جان بھی بچا لی۔
آج سینچائیس سال کی آجڑے کے ہمارے سامنے۔ تم پھر بھی مجھ
سے پوچھ رہی ہو۔ میری تو بہ میرے باپ کی تو بہ۔۔۔

”پھر کیا کوئے تم ہلا کر۔۔۔“ اس نے عرصہ اور کافی کے خالی
تک دلچسپ بیگ میں ڈالے۔
”تم نے شادی۔“ میں نے کہا۔

”پانچ سو روپے۔۔۔ میں کسی مداری سے شادی نہیں کر سکتی۔“
”کیا تم مداری نہیں ہو؟ ایسا جاو کیا ہے مجھ پر کہ جس کا توڑ
نہیں۔ مت مداری ہے میری۔ اچھے بھلے انسان کو میں نہیں کرتے
والا طوطا بنا کے اپنے عشق کے بگڑے میں قید کر دیا ہے جو ہر وقت
میں بولتا رہتا ہے۔۔۔ چننا۔۔۔ میں تمہارا غلام چننا۔۔۔ آئی یو۔“

”آگے نہ اٹھنا قلمی باتوں پر“ اس نے عقلی سے کہا ”موقع سے
فائدہ اٹھا رہے ہو۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں سب کے
سامنے بھی تمہارا داغ درست کر سکتی ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”بہت مشکل ہے۔ یہ داغ اب اتنا
خراب ہو چکا ہے کہ درست نہیں ہو سکتا۔ اس خرابی کا ایک ہی
طالع ہے۔“

”تمہارے کیا علاج ہے؟“
”میرا کوئی؟“ میں نے کہا ”کچھ۔“

پھر میں دوڑ کے گاڑی میں جا بیٹھا پھر چندا کا موڑ صبح تک ٹھیک
کرنے میں لگا رہا۔ چندا کے ساتھ میرا جذباتی تعلق ایسا ہی تھا جیسے
زمین سے آسمان کا رشتہ کہ ہر جگہ ہر وقت ازل سے ہے اور آباد
ہے یا خوشبو سے احساس کا رشتہ کہ ایک کا وجود دوسرے سے
شروط ہے اور مرنے ساڑ کا رشتہ جو قید زمان و مکان سے آزاد ہے
لیکن یہ بات میں اس سے کہتا تھا تو وہ خفا ہو جاتی تھی کہ یہ قلمی
نکالے ہیں۔ گھٹیا ڈائلاگ بازی ہے۔ ڈراما ہے۔ شاید اس لیے کہ
حقیقت کسی چیز یا اظہار کی محتاج نہیں ہوتی۔ کسی کو ثابت کرنے
کی کیا ضرورت ہے کہ سون میں روشنی ہے اور یہ بتانا قلمی غیر
ضروری ہے کہ جناب آج میں زندہ ہوں۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ خیر کام کا رائے وزیر کوئی اسٹاپ ہے یا
نہیں اور زمین وہاں کتنے بچے بچتی ہے۔ وقت تو خیر معلوم کیا جا سکتا
تھا کہ زمین کو نہیں روکا جا سکتا تھا۔ عام طور پر ایک پیرس ٹرین رائے
دینا یا کوٹ ملکیت میں سے کسی ایک جگہ رکھتی تھی ورنہ لاہور سے
بچھ پٹیلے کینٹ اسٹیشن پر ہر ٹرین پانچ دس منٹ گھبر کے لاہور
اسٹیشن جاتی تھی۔ کسی غیر فنی صورت حال سے بچنے کے لیے میں
نے سید حالہ ہور کینٹ اسٹیشن پہنچ کے رُکنے کا فیصلہ کیا۔

”کالیا تھا۔۔۔“
”صاف پوچھو کہ تم آج بھی وہی بیٹے ہو جو کہتا تھا کہ میں
وزیر اعظم ہوں گا۔ حالانکہ اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وزیر اعظم
کیا ہوتا ہے۔“

”مسترا کی“ اب تم بیٹے نہیں رہے۔ اور یہ بھی جانتے ہو کہ
وزیر اعظم کیا ہوتا ہے۔“

”سیاست ایک دلدل ہے چندا۔ مجھے اس دلدل میں ٹھیک
لایا گیا ہے۔ خود میں نے اس ملک میں سیاست کا جو چلن دیکھا ہے
اس کے بعد کیا میں یا کوئی بھی ہوش مند آدمی اپنی عزت کو داؤ پر
لگا سکتا ہے۔ سیاست بُری نہیں ہوتی لیکن یہاں سیاست دان اسے
بدنام ہو گئے ہیں کہ اب یہی سب سے بُرا اور قابلِ نفرت چیز بن گیا
ہے۔“

”خواب دوہاں پا نہ میں۔ تم وزیر اعظم بننا پسند کرو گے؟ اگر
جسیں تقدیر سے یہ موقع ملے؟“

”نہیں، کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ میں نے کہا ”اول تو یہ
ناممکن ہے اس چیلنج میں بس وہی رہ گئے ہیں جن کا بعد کی پیشی شوق
ہے سیاست۔ وہ ملک کی خدمت کے لیے نہیں اپنی تنہا بن اور
شان قائم رکھنے کے لیے اسٹیبل میں پہنچتے ہیں کہ وہاں خراج کر کے
اور پھر ادوں کا کہ اپنے سوردی اقتدار پر قابض رہتے ہیں۔ جو
نوراد ہیں انہوں نے منشیات یا اسلحے کی تجارت یا غیر فنی شے سے
اتنی دولت اکٹھی کر لی ہے کہ اب انہیں اپنے اور اس دولت کے
تحفظ کے لیے اقتدار کی کرسی پر بیٹھنا چاہیے نہیں۔ نہ ہو مگر اس کا
پایہ قیام رہتا ان کی ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ میں پہلی
کلاس میں ہوں اور نہ دوسری میں۔“

”پھر کون سی کلاس میں ہو؟ پرائمری یا سیکنڈری؟“
میں نے مسکرائے ”میل یا پاس تم لو کی۔ پڑھتا ہوں کتب
غیر دل میں سبق پڑھ۔“

”فرض کہ میں کہوں کہ مسترا مر عظیم وزیر اعظم بن جاؤ۔“
میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”تم کو کہ مرنا ہی جاؤ تو میں
مرنا ہی سکتا ہوں“ وزیر اعظم کیا چیز ہے لیکن کوئی اور۔۔۔ سارے
سیاست دان ہر کان اسٹیبل اور صدر کمانڈر ایچیف وغیرہ سب
دست بستہ حاضر ہو کے مجھ سے درخواست کریں کہ چلے وزیر اعظم
کے محلے کا اٹھانے کے لیے تو میں کہوں گا کہ سوری۔۔۔“

وہ ہنسنے لگی ”فوبہ کیا پروانہ تخیل ہے“ گھبراہٹ میں بھی ممکن
ہے؟“

”نہیں۔ بات مفروضے کی تھی۔ سیاست کے میدان میں سب
کو شکست دے کر وزیر اعظم پاؤں تک پہنچنا بھی اعجاز ناممکن ہے۔
ایک دہانے کے خواب کی بات ہی کیا۔ مگر آج اگر عید ملت
لیاقت علی خان بھی ہوتے تو صاف انکار کر دیتے کہ مجھے نہیں بننا
اس قوم کا وزیر اعظم۔ وہ شریف اور وضع دار لوگ آج انھوں کے

”نہیں۔ تم اس معاملے کی وجہ سے پریشان نہیں“ میں نے کہا
”بھول جاؤ اسے۔“

”کیسے بھول جاؤں۔ اس کا کوئی گھر بھی ہو گا۔ یہی بیٹے اور
ماں باپ سب ہوں گے“ وہ بولی ”کیا کر رہے گی ان پر؟“

میں نے کہا ”صاف مجھ کو مار رہے ہوئے ترس کھانا کڑوری
اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔ اگر وہ اپنے شیطانی عزائم میں کامیاب
ہو جاتا تو سوچ تمہارا کیا مشر ہو گا۔ وہ ایک بھیڑیا تھا۔ اسے مار کے
تم نے کیا غلط کیا؟ اور یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے۔ کبھی والدین کے اعمال
کی سزا بچوں کو ملتی ہے۔ کبھی بچوں کے گناہوں کا کفارہ ماں باپ ادا
کرتے ہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ تم
سے پہلے نہ جانے اس نے کتنی کڑور اور معصوم لڑکیوں کو ایسے
اٹھالیا ہو گا جیسے پولیٹیکل فارم کا حساب بگڑنے میں سے ایک مرنے کو
دوبلہ لیتا ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے یہ تم جانتی ہو۔ مگر قدرت کا بھی
ایک نظام انصاف ہے۔ نہ جانے تم نے کسی کس کی بے ادبی کا
آج انتقام لے لیا۔ خدا نے جسیں صرف وسیلہ بنایا اور جسیں یہ
تسلیم دی۔ مرنے وقت اسے خیال ضرور آیا ہو گا کہ حساب کہاں
آکے برابر ہو اور کس کے ہاتھوں۔ اگر ڈاکوؤں یا پولیس سے
مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا مگر قاتل ہو کے چلائی چڑھ جاتا یا کوئی
غیرت مند باپ، بھائی یا شوہر کھانڈی کے وار سے اس کا سر تن سے
جدا کر دیتا تو کوئی غلط توقع بات نہ ہوتی لیکن اب ایک ساڑھے
پانچ فٹ اور ایک سو سین باؤنڈ کی گل اندام چاند چوستاہ آنکھوں
والی لڑکی نے۔ بھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے میرے کا بکر۔ یہ علامہ
اقبال نے کہا تھا مگر کبھی شاید کسی نے نہ ہو گا۔ پر سائیں زبان شاہ
اور اس کے دو ساتھی جو ذمہ داری مجھے یہ درس عبرت یاد رکھیں گے
بہ شکہ مدد کریں گے نہیں۔“

”توے کا آدا گزارا ہوا ہے سیاست میں۔ اور تم اسے
مدد عارنا چاہتے ہو۔ میں کہتی ہوں اب بھی وقت ہے۔“

میں نے کہا ”خدا کے لیے چندا۔ دوبارہ یہ بحث مت چھیڑو۔
اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم گھبرا گئی ہو ابھی سے تو الگ ہو جاؤ اس
کھیل سے جو ابھی شروع ہوا ہے۔ تم اپنی کتابوں کی اور موسیقی کی
دنیا میں لوٹ جاؤ۔“

اس نے ایک گہری سانس لی ”ضرور لوٹ جاتی۔ اگر یہ ممکن
ہو؟“ میرے اختیار کی بات ہوتی۔

”میرے لیے بھی یہی مجبوری ہے۔ ورنہ میں اپنی دنیا میں
تھمے اور خان غنی کے، قرار و رفتی کے ساتھ بہت پرسکون اور
خوش تھا۔ اب تو بچنے کی یہی ایک صورت اور شرط ہے کہ ہم اپنے
دشمنوں کے خلاف ایک دائمی جنگ مل کے لڑیں اور ان کے عزائم
کو خاک میں ملا دیں۔“

”ہمارے کیا واقعی سیاسی شہرت میں جسیں کشش محسوس ہوتی
ہے۔ شہرت قبول کرتے رہنا تمہاری فطرت ہے۔ پیہ تم نے بہت

درمیان میں ایک بار چندا نے کہا تھا کہ میں ڈرائیو تک اسے دے دوں اور خود آرام کروں مگر میں نے گاڑی نہیں روکی۔ میں تم ایسے ہی بیٹھی رہو۔ تم میرے ساتھ ہو تو تھکن کا کیا سوال۔ میں تان اسٹاپ دنیا کے گرد چکر لگا سکتا ہوں۔ غلطی تیار سے کی طرح ایک سی مار پر۔“

”پیٹرول تو ڈالو گے گاڑی میں؟“ وہ بولی۔
”نہیں۔ گاڑی بھی قوتِ ارادی پر چلے گی۔ اپنے شاعر مشرق کا شعر ہے۔ نہ انجی نہ ٹائر نہ ڈیزل نہ۔ میٹری۔ چلا جا رہا ہوں خدا کے سارے۔“
”کچھ خدا کا خوف کرو“ وہ ہنسنے لگی۔ ”کیوں دکھ پہنچا رہے ہو مرحوم کی مدح کو۔“

میں نے تو بھر کے کہا ”آج مشرق میں اور خاص طور پر پاکستان میں جس کا خواب انہوں نے دیکھا جو کچھ ہو رہا ہے اس پر کم دیکھی ہوگی ان کی مدح۔ میں نے تو مذاق کیا ہے۔ لوگ بڑی تنبیہ کی سے حکیم الامت کے پیغام کا مطلب اپنی اپنی ضرورت کے مطابق بدل رہے ہیں۔“

”ہستہ آہستہ اچھلا پھلا۔ چندا بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ گاؤں جاگے پھر کھیت کھلیاں اور جنگل جاگے کھیں کہیں کسان مل چلائے یا کھیتوں کو پانی لگاتے دکھائی دیتے تھے جنگلوں میں موٹی چرنے لگے جھوٹے بچے ہاتھوں میں تختیاں لیے بٹے لگائے اسکول کی جانب رواں نظر آئے۔ ایک سنگ میل نے مجھے بتایا کہ لاہور ایک سو ستر کلو۔“ ”ہر گز۔ کم سے کم دو گھنٹے کی مسافت باقی تھی۔ چندا نے تھرمس میں سے ہونے پانی سے مجھے کافی کا آخری گک بتا کے دیا۔ کافی بہت زیادہ گرم نہیں تھی۔“

میں نے چندا کو ڈانٹا ”پھر لڑائی ٹھنڈی کافی پلا دی۔“
”میرا انا ر دیکھو ایک کپ میں خود بھی پی سکتی تھی۔“
”خالص مشرقی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں لیکن شادی کے بعد کبھی میری بیوی نے بیڈنی مجھے ایسے پیش کی تھی ٹھنڈی اور بے مزہ۔ تو معلوم ہے میں کیا کروں گا؟“ میں نے غرا کے کہا۔
”مجھے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا ”میں خاموشی سے لی لوں گا اور پھر مسکرا کے کہوں گا۔ تھینک یو۔ بڑی گرم اور مزے دار کافی تھی۔“
”ہونا سائق۔۔۔ فطرت تو نہیں بدلے گی۔“

میں نے کہا ”معاف کرنا کی مسافت والا مدتیہ پسند کرتی ہیں بیویاں۔ ایک اچھا شوہر کھانا کے لیے مسلسل جھوٹ بولتے رہتا اور نہ چاہے رہتا ضروری ہے۔ جس نے بچ بولا وہ مارا گیا۔ دنیا بھی خراب اور آخرت بھی۔“

”بات تو ایسے کر رہے ہو جیسے برا تجربہ ہے۔“
”مشاہدہ خاتون!۔ اور معاملہ۔ ہر شخص ایک چلتی پھرتی کتاب ہے۔ میں نے چاند پر قدم رنج نہیں فرمایا مگر میں نہیں

بتا سکتا ہوں کہ اس میں تمہارے چہرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت فضول جگہ ہے۔ دھول مٹی گڑھے اور کھائیاں۔“ اجازت اور دیران جیسے اپنے تھکا علاقہ۔“
”اوکاڑہ!۔ چندا نے کہا۔“

”لا حول ولا قوت۔ میں اوکاڑہ کی نہیں چاند کی بات کر رہا تھا۔“
”اچھا! کب؟“ وہ بولی ”میں تو کہہ رہی تھی کہ اوکاڑہ“
”آگیا۔ اب لاہور کتنی دور ہو گا تقریباً۔۔۔ سو کلو میٹر۔ اب تم ایڑی ہو جاؤ۔ بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ تم نے بہت تیز گاڑی چلائی ہے رات کو۔“

”اب ہم تیز کام سے پہلے لاہور پہنچ جائیں گے۔ بلکہ آج وقت ہے ہمارے پاس کہ ہم اوکاڑہ میں کہیں ٹرک کے اچھا سا نشانہ کر لیں۔“

”تیور اور تمہاری بیگم صاحبہ تو رات بھر سو رہے۔“
میں نے کہا ”اب میں بچ بولوں کہ میں اور میری بیگم صاحبہ رات بھر جاگتے رہے تو تم خفا ہو جاؤ گی۔ کیا تم اپنی آنکھوں میں۔۔۔ سو رہی! نیم باز آنکھوں میں دیکھ سکتی ہو کہ۔۔۔ ساری سستی شراب کی سی ہے۔ لیکن یہ اثر ہے رات بھر جانے کا۔ ذرا مجھ سے تیناں ملاؤ۔۔۔ اور بتا دیا کہ میری آنکھوں میں؟“
وہ مسکراتے لگی ”کسی نئی اسپیشلسٹ کو دکھانا آئیں۔ مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”میرے جذبات بھی نہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی ”رات کو بھی میں نے تمہارے ڈر سے اپنے جذبات کا خون کیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا۔۔۔“

”جیسے تمہاں دیے تمہارا دل پاگل۔“
”یہ طلعت محمود کا گانا ہے جو میں گائے سنا تا ہوں۔ فلم مدہوش“ ”موتی تار مدن موہن۔ میں پاگل میرا سنا پاگل“ ”پاگل میری بہت رہے۔“

رخشی نے پیچھے سے کہا ”بڑا درد ہے تمہاری آواز میں۔ بچہ کہتے ہیں لوگ“ ”محبت سے پیدا ہوتا ہے یہ سوز۔“
میں نے کہا ”آپ چلی قدر شناس لی ہیں۔ ورنہ ایسے بد فتن بھی ہیں جو درد خواست دینا چاہتے ہیں کہ شور سے ماحولیاتی آلودگی پیدا ہوئی ہے چنانچہ مجھے گانے سے روکا جائے۔“
”وجہ یہ ہے سرکہ سوزی سوز ہے آپ کے گلے میں۔ شر نہیں ہیں۔“ چندا نے کہا۔

اوکاڑہ میں پہلے پیٹرول پمپ کے ساتھ مجھے ”پهلوان ہو گی اینڈ ریٹورنٹ“ نظر آیا۔ گاڑی کچھ منگ کر رہی تھی۔ میں نے اسے پیٹرول پمپ کے ایک نو عمر لڑکے کے حوالے کر دیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ چھوٹا نہیں بلکہ نقل استاد ہے۔ پھر مجھے گرم گرم پوریوں چھو لے اور طوطے کا خالص لاہوری ناشتا کیا۔
چائے پیچے ہوئے میری نظر گڑی پر تھی ”اگر میں کہیں خون

ہو تو ہم اوکاڑہ کے ریلوے اسٹیشن سے تیز کام کی خیریت معلوم کر سکتے تھے۔ ہماری گاڑی دور گھڑی ہے۔“
”تیسروں نے کہا“ ”نہلی فون کا رتو ہے“ فون نظر نہیں آتا۔“
”اتل اس نے کہیں چھپا رکھا ہو گا“ چندا نے کہا۔

اس کا خیال درست تھا۔ پر پورا سٹرنے سائن بورڈ پر اپنا نام لکھا تھا۔ ”مرستم پسر پهلوان محمد رفیق سیالکوٹی عرف نیکی مندری والا۔“ مندری اس کے کان میں اب بھی تھی مگر باقی سب یادِ ایام عشرت فانی والا معاملہ تھا۔ وہ لٹکے گوشت اور پوچلے منہ والا بوزخا تھا جس کا کام اب صرف دانی سے کشتی لڑنا رہ گیا تھا۔

میرے سوال پر اس نے سیٹ کے نیچے سے فون برآمد کیا ”ایک نہیں بادشاہو۔ دس کلاں کرو سو کو“ ”ہم آپ کے تو فون آپ کا۔“

میں نے کہا ”مہربانی۔ اسے غائب کیوں کر رکھا تھا؟“
”ادنی کیا کریں“ ”آجائے ہیں ابویں منہ ماری کرنے ایسے ایسے بندہ جن کو پتا نہیں ہو کہ فون کو کدھر سے پکڑنا چاہیے۔“
ابھی تک ریسیور میں نے بھی اٹلا پکڑ رکھا تھا ”پهلوان جی۔ پتا کرنا تھا تیز کام کا۔ خبر معلوم ہے آپ کو ریلوے انکوارڈری؟“

”سوئی“ ”میر تو یہ لکھا ہوا ہے اپنے پاس“ اس نے دیوار پر پتل سے لکھے ہوئے نمبروں کی نظر میں ایک جگہ انگلی رکھ دی ”پر جناب عالی! پتا کرنے سے کیا ہو گا۔ لونی میں بتا رہا ہوں کہ گڈی ہو گی دو گھنٹے لیٹ۔ اتنی مر ہو گئی ہے اپنی“ ”آج تک تو گڈی نیم پر دیکھی نہیں۔ اور انکوارڈری والے؟“ ”توبہ کروئی“ ”میر گھماتے رہو کل تک ضرور۔ کوئی اٹھا لے گا۔“

مگر آدمی فیہ کا حال نہیں جان سکتا۔ چچا نے انسوئی بھی ہوتی ہو جاتی ہے۔ ریلوے انکوارڈری سے خبر ملاتے ہی کسی نے کہا ”تیز کام ٹھیک نام پر آ رہی ہے۔“ ”مگر میں نے پهلوان کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے ریسیور رکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی ”بچ فرمایا آپ نے۔ پورے دو گھنٹے لیٹ ہے گاڑی۔“

وہ پوچلے منہ سے ہنسا ”اک گل تے دوسو میٹرو۔ جناب عالی! آپ دی ہونا شاہ عالم! اپنے انصاف تے آزادی والے۔“
میں نے بھونچکا ہونے سے گریز کیا۔ اب شاید یہی ہو گا۔ سیاسی لیڈر کو کہیں نہ کہیں کوئی ضرور پہچان لیتا ہے۔ اگرچہ میری صورت پہلے بھی شاہ عالم سے ملتی تھی مگر مشابہت کی تھوڑی بہت کی کو میں نے اپنا ایذا سناں بدل کے پور کیا تھا۔

”آپ نے ٹھیک پہچانا“ ”پهلوان جی!“
”او جناب عالی! ہم تو آپ کے ہی بندے ہیں۔ تقریر دادا کرتے ہو آپ۔ میری تو گھر والی سے بات چیت بند ہے۔ میں کتا ہوں کہ بھٹی لو کے“ ”یہ بتتے پرانے پانی ہیں نا“ انہوں نے تو بچ کے کہا جانا ہے پاکستان کو۔ انہوں نے نہیں سدھرا۔ انہیں تو بھر کے لے جانا چاہیے جہاز میں اور جہاز کو غرق کر دینا چاہیے بچے سمندر

میں۔ اللہ اللہ تے خیر صلا۔ حادثہ ہو گیا تے گل ہی کی گئی۔ خیر جناب“ ”نویں گور بندے آپ جیسے ہوں تو سب صحیح ہو جائے گا۔ لونی عورت ذات کو کیا پتا سیاست کا۔ سالا میرا کتا ہے نواز شریف آوے ہی آوے اور میری بیوی کا پکا دوٹ ہے بے نظیر کا۔ صرف اس لیے کہ وہ بھی عورت ہے۔“

میں نے کہا ”پهلوان جی۔ سیاست نے تمہارے گھر میں بھی انتشار پیدا کر دیا۔ آپس میں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“
”مگر میں کس کے جھگڑا نہیں ہوتا۔“ ”وہ بولا ”مگر آپ کا آپس میں کیا جھگڑا ہے؟“ ”وہ بھی آپ کا ہی بندہ تھا نا۔ خدا بخشے کیا نام تھا اس کا۔“ ”مرد راز اصل معاملہ تو اٹھ جاتا ہے جی لیکن۔“ ”چکر کیا ہے آخر۔ کچھ لوگ کہتے ہیں آپ نے اسے زہر دے کے مار دیا ہے خور۔ آپ کہتے ہو میں اور مر رہا ہی نہیں“ ”باہر تھا۔“

میں نے کہا ”یہ ٹھیک ہے۔ میں ہانگ کاک میں تھا۔ کل سٹاک پور کے راستے کراچی پہنچا ہوں۔“
”آپ کے بیان سے گریز ہوتی ہے جی۔ وہ کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔“
میں نے کہا ”جو ساری دنیا نے دیکھا ہے وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بات آپ کی سولہ آنے کی۔ مگر جو ہنگامہ کر رہے ہیں شہر میں کیا ان کو کدھر لے والا کوئی نہیں؟“

میں نے کہا ”ہنگامہ۔۔۔ اہں تو مزاحمت ہوا تھا پہلے۔۔۔“
”پہلے۔۔۔ لونی“ ”کل مرد راز کا گھر اور آفس جلا دیا۔ انہوں نے آپ کی پانی کے دو بندے مار دیے جب آفس پر حملہ کیا تھا۔ رات کو پتر میرا آیا کہ جراثیم والے سے۔ وہ بتا رہا تھا کہ قبرستان میں بھی ڈانگ سوٹا ہوا۔ قبر کی بے حرمتی ہوئی۔ اب یہ تو بڑی غلط بات ہے جی۔ جو بھی کر رہا ہے۔“

اگر میں ان تمام واقعات سے لاعلمی کا اظہار کرتا تو بہت عجیب بات ہوتی مگر ان اطلاعات نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے ناشتے کے پیچھے دیپے اور لوٹ کے آیا تو چندا نے میری صورت دیکھ کے کہا ”کیا گاڑی بہت لیٹ ہے۔ اگر ہے تو آتا بدحواس ہوئے کی کیا ضرورت ہے؟“

میں نے کہا ”گاڑی وقت پر آ رہی ہے۔ ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔“

گاڑی بالکل تیار تھی۔ ڈرائیو تک سیٹ پر تیور خود ہی بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھ کر روانہ بند کر لیا ”تیور۔ تم نے کل رات کے فون کیا تھا۔ اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟“ ”شر کے بارے میں؟“

”نہیں“ ”شر میں کیا ہے؟“
میں نے کہا ”مرد راز کے قتل کا مسئلہ زیادہ علین ہو گیا ہے۔ شر میں ہنگامہ ہو رہے ہیں کل کی پریس کانفرنس کے بعد۔“

تیمور نے تشویش سے کہا ”وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہوگا۔ ریلوے اسٹیشن پر ہوگا۔ استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگا۔“
”اور کس سے بات ہو سکتی ہے اس وقت؟“ میں نے کہا
”ہمارے دو عدد نائب صدور ہیں۔ ایک سیکریٹری جنرل ہے۔ کیا وہ پارٹی آفس میں نہیں ملیں گے؟“

پارٹی سیکریٹریٹ میں پانچ لائٹوں کا ایکس پیجنگ تھا مگر ہر لائٹ بڑی غمی میں کوشش کرتا رہا مگر ہر بار لائٹ کی ٹون سن کے مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی ”یاد تیمور“ ڈائریکٹ نہیں ہے کسی کا؟“

تیمور نے مجھے ایک نمبر بتایا ”یہ اشرف علی کا نمبر ہے۔ سیکریٹری جنرل کا۔ زانی کرلو۔“

چند اے کے ”ہنگاموں کی خبر اخبارات کے دفتر سے بھی مل جائے گی۔“

”صحیح صبح اخباروں کے دفتر میں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ملتا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اشرف علی کا نمبر ملایا اور اس نے پہلی ہی لمبھی پر ریسپورڈ اٹھایا۔ پس سفر میں مجھے خاصا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا ”ہیلو اشرف۔ کیا حال ہے۔ میں عالم بول رہا ہوں۔“

”آپ شاہ جی! السلام علیکم سر!“ وہ شاید میٹ پر کھڑا بھی ہو گیا ہو۔

میں نے کہا ”اشرف یہ کیا ہو رہا ہے آخر شرمیں؟“
”شاہ جی میں نے تو بڑی کوشش کی آپ سے رابطہ کی۔ اپنے وکیل کرشنی اور محس الزماں صاحب بھی فون کرتے رہے مگر آپ پریس کانفرنس کے بعد فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔ ہم نے پی آئی اے سے معلوم کیا۔“

”سیکرٹری کے خیال سے میں نے اپنی اہم مناسب نہیں سمجھا۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے شاہ جی۔ بڑی عمدی کا ثبوت دیا۔ مجھے رات کو معلوم ہوا کہ آپ تیز کام سے پیچ رہے ہیں۔ ترین تو پہنچنے والی ہوگی۔ آپ کہاں سے فون کر رہے ہیں؟“
میں نے کہا ”راے وغیرہ اسٹیشن سے۔“

”اچھا اچھا! آپ فکر مت کریں سر۔ ہم نے پکا انتظام کیا ہے ریلوے اسٹیشن پر۔“ ذہنی آئی جی صاحب سے بھی میری بات ہو گئی تھی۔ سادہ کپڑوں میں پولیس بھی ہوگی۔ اپنے لڑکے صبح چار بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ استقبال شاندار ہو گا شاہ جی مگر آپ کوشش کریں کہ فوراً نکل آئیں۔ ہم نے اخبار والوں سے کہا ہے کہ آپ وی آئی پی لائن میں ان سے بات کریں گے لیکن یہ صرف آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ذہنی آئی جی صاحب کے مشورے پر۔“

”اس مشورے کو میں قبول نہ کروں پھر؟“
”سری۔ یہ ضروری ہے۔ خدا نخواستہ وہاں کوئی دشمن ہوا تو

اجی بھڑ میں پتا نہیں چلے گا۔ ایف اے ایف کے لڑکے آپ کو گھیرے میں لے لیں گے ٹرین سے باہر آتے ہی۔ باقی سب ہمارے جانے پہچانے کا رکن ہوں گے ان کے ساتھ سادہ کپڑوں والے پولیس کے آدمی ہوں گے اور مسلح پولیس بھی ہوگی۔ وہاں کسی کو آپ پر نفاذ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”مجھ پر۔۔۔ فائرنگ۔۔۔ کون کرے گا؟“
”ذہنی شاہ جی۔ جو مرد راز کے قتل کو EXPLOIT کر رہے ہیں اور کون۔ آپ کے یہاں نہ ہونے سے بہت گریز پھیل رہی ہے۔“

”کون پھیلا رہا ہے گریز؟ مرحوم مرد راز کے گھر اور آفس پر حملہ کر کے اس کو آگ لگانے والے کون لوگ تھے؟“

”یہ۔۔۔ میں کیا بتاؤں سر۔۔۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے قتل کا الزام آپ پر لگایا تھا۔ آپ کی پریس کانفرنس نے مرد راز کے ساتھیوں کو بہت مشتعل کیا۔ کچھ ایس بھی ہوئے۔ اس جھوٹ کا پردہ چاک ہو جانے کے بعد ان کی سیاسی سماج قوری نہیں رہا خیال ہے کہ آگ لگانے والے ان کے اپنے آدمی تھے۔ اس طرح وہ رائے عامہ کو ہمارے خلاف کرنا چاہتے تھے۔ مرد راز کے ایک ساتھی نے کہا کہ آگ ہمارے کارکنوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر لگائی ہے کیونکہ کارکن اپنے جیسر میں پر قتل کے جھوٹے الزام سے مشتعل ہیں۔“

”آگ لگانے والے پکڑے نہیں گئے؟“

”میں تو خرابی ہے شاہ جی۔ پکڑے جانے والوں میں ایک شخص خود کو ہمارا کارکن کہتا ہے اس کے پاس سے ایف اے ایف کانفرنس عالم فورس کا شناختی کارڈ اور بیج بھی برآمد ہوا ہے۔“

”شناختی کارڈ جعلی ہے؟“

”نہیں سر۔ اصلی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اسے شناختی کارڈ کس نے دیا کیونکہ وہ ایف اے ایف کا رکن نہیں ہے۔ نہ بھی تھا۔ یہ نیا کارڈ ہے سیریل نمبر کے اعتبار سے۔“

”پارٹی کی طرف سے کوئی وضاحت نہیں کی گئی؟“

”ہم نے فوراً تردید کردی تھی اور یہ بھی کہ دیا تھا کہ شناختی کارڈ جعلی ہے مگر اس پر فورس کمانڈر کے دستخط ہیں۔“

”میر تیمور کے؟“

”جی۔ کل مرد راز کا سوئم تھا۔ تدفین کے بعد شام تک فاتحہ خوانی ہوئی۔ پولیس کی کافی نفری تھی شرمیں مگر ہمدردات کے وقت کسی نے مرد راز کی قبر کے سرہانے لگا ہوا کتبہ لگا دیا۔ یعنی پیچھے والا حصہ سامنے آگیا۔ اس پر کالے رنگ سے لکھ دیا ”خدا را در روز قیامت زبان دراز۔ مگر یہاں مردود فاتحہ نہ درود“ اور بھی بہت سی اشتعال انگیز باتیں تھیں۔“

”یہ تو بہت بڑا ہوا۔“
”کل جب سوئم کی فاتحہ خوانی کے لیے لوگ پہنچے تو انیس قبر

بھی خراب حالت میں ملی۔ یوں جیسے کوئی اس کو دوندتا رہا ہے۔ اس سے ہمارے دوسرے دشمنوں کو بھی نفس کا موقع مل گیا۔ قبرستان سے ایک جلوس احتجاج کے لیے نکلا۔ پولیس ساتھ تھی۔ انہوں نے جلوس کو روکا اور قبرستان میں ہی لائچی جانچ کر دیا۔ اس سے کچھ لوگ زخمی ہوئے۔“

”تسمارہا مطلب ہے پولیس نے آگ بھڑکائی؟“
”بالکل شاہ جی۔ انہیں سمجھایا گیا تھا۔ وہ چیف مشنر اس جاکے تحقیقات کا مطالبہ کرنا چاہتے تھے۔ تحقیقات تو ہو رہی ہیں۔ ریپول کے قیام کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ پارٹی کورٹ کے ایک بیج کو جیسر میں نامزد کر دیا گیا ہے۔ پولیس کو بالکل ضرورت نہیں تھی اس انتقامی اقدام کی مگر مجھے شبہ ہے سرکہ پولیس کو بھی استعمال کیا گیا۔ قبرستان سے منتشر ہونے والے سڑکوں پر پھیل گئے۔ اوپر ہمارے پارٹی سیکریٹریٹ پر سے پولیس کا پیرا پٹا لگ گیا۔ یہ کہا گیا کہ نفری کم ہے۔ شرمیں ہنگاموں کو روکنے کے لیے ایک جلوس نے پارٹی سیکریٹریٹ پر حملہ کیا اور بہت توڑ پھوڑ کی۔ ایف اے ایف کے لوگوں نے فائرنگ کی۔۔۔“

”کس کے حکم سے؟“

”محس صاحب کے حکم سے۔ تیمور صاحب کی عدم موجودگی میں دی کمانڈر بنے ہوئے تھے۔ اس سے بیج تو منتشر ہو گیا مگر وہ بندے مارے گئے۔ دونوں راہ گیر تھے مگر ایک کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ پولیس کا آدمی تھا سادہ کپڑوں میں۔“

”تسمارہا مطلب ہے وہ اسی ہجوم میں شامل تھے؟“

”نہیں سر۔ ایک دو کس نے پچان لیا تھا۔ میں سیکریٹریٹ کی چھت پر چڑھ گیا تھا جان بچانے کے لیے۔ اور سر۔ ایک بات ہے۔“

میں نے کہا ”کیا بات ہے بھائی۔“

”شاہ جی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں الزام لگا رہا ہوں دشمنی میں مگر میری محس صاحب سے کوئی ذاتی دشمنی یا رنجش نہیں۔ میں نے انہیں دیکھا پتا نہیں وہ کیا اشارے کر رہے تھے پولیس والوں کو۔ انہوں نے ہاتھ ہلاکے محس صاحب کو جواب بھی دیا۔ آپ تو جانتے ہیں محس صاحب کی فطرت کو۔ ان کے خلاف پارٹی ڈپلن کی خلاف ورزی کا الزام بھی ثابت نہیں ہوا مگر وہ چھپ چھپ کے تلے تھے مرد راز سے۔ جنہوں نے دیکھا وہ جوئے بنے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔“

”تھینک یو اشرف۔ تم نے اچھا کیا مجھے بتادیا۔“

”لیکن سر یہ بات آپ اپنے تک رکھیں۔ تو نمائی۔“

”فکر مت کرو“ میں نے کہا ”کسی کو کچھ نہیں معلوم ہوگا۔“

”اور شاہ جی۔ ریلوے اسٹیشن پر اپنا خیال رکھیں۔ وی آئی پی لائن کی طرف ہرگز مت جائیں۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو

کارکن عام مسافروں والے گیٹ سے باہر لے جائیں گے۔ شرمیں سخت کشیدگی ہے۔ اچھا ہے اگر کوئی آپ کو نہ دیکھے۔ آپ کی پریم والی گاڑی وہیں کھڑی رہے گی۔ آپ کو دوسری گاڑی نکال لے جائے گی۔ بڑ سیٹ والی ایک پک اپ ہے۔ اس میں ایف اے ایف کے چار جوان ہوں گے آپ کے ساتھ۔ سادہ لباس میں۔ عام سائڈ ہو گا ان کا۔“

”اوکے اگر تسمارہا خیال ہے کہ اس طرح میں محفوظ رہوں گا تو میں انکار نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ تیمور صاحب بھی ہیں۔ میری وائف اور سیکریٹری بس خان۔“

”کیا مسز تیمور کو ریسو کرنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ میرا مطلب تھا ان کے فیملی ممبرز میں سے کوئی؟“

”تیمور صاحب نے اپنی فیملی کو حفاظت کے خیال سے کہیں بھیج دیا ہے۔“ میں نے کہا ”غیر محفوظ تو وہ خود بھی ہوں گے تیمور صاحب بھی۔“

”انہیں محس صاحب کے ساتھ نہیں جانا چاہیے شاہ جی۔ انہیں محس صاحب اپنی گاڑی میں لے جانے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ بہت اکیلو ہیں آج کل۔ بہت بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ مجھے رپورٹیں مل رہی ہیں۔“

میں نے کہا ”پلو تیمور صاحب کو جانے دو محس صاحب کے ساتھ۔ میری وائف اور سیکریٹری کو گھر لے جانے کے لیے کون سی گاڑی ہوگی؟“

”وہ سب ہو جائے گا سر۔ میں اب اسٹیشن پر ملوں گا آپ کو تو بتا دوں گا۔ یہ ٹرین رائے وغیرہ کیوں ٹکی ہوئی ہے؟“

”پتا نہیں۔ تو تسمارہا سے کہتی ہی منتقل ہو گیا۔ خدا حافظ۔“

فون بند کرنے کے بعد میں نے تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ میری گفتگو کے ہر لفظ سے صورت حال کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”تم نے دیکھا شاہ جی عالم بننے کا انجام!“

”انجام؟ تم آواز کو انجام کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ میں نے پہلے کبھی سیاست نہیں کی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس سے میری نااہلی ثابت ہوتی ہے۔ تم نے بھی جب تک شادی نہیں کی تھی تمہیں کیا معلوم تھا کہ بیوی کیا ہوتی ہے اور ازدواجی زندگی کے مسائل کیا ہوتے ہیں لیکن تم نے زندگی گزارا۔ تمہارے بچے بھی ہوئے اوسے۔ تم اچھے شوہر ثابت۔“

”تم محس کو نہیں جانتے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی

”وہ بہت خطرناک سازشی ذہن کا مالک ہے۔ خود جیسر میں بننے کے لیے وہ جیسر اور مجھے ایک ساتھ راستے سے ہٹا سکتا ہے۔ وہ ایک دہشت گرد ہے۔“

”تو نہیں تیمور اڈر کے جینے والے کو سوت بھی مشکل سے

آتی ہے۔ اپنا دل اور عقیدہ مضبوط رکھو کہ جب تک زندگی ہے

ایک کیا دس ٹکس مل کے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ورنہ یہ سارے خاتمی انتظامات دھڑے رہ جاتے ہیں۔ امریکی صدر کینیڈی سے زیادہ کسی کی حفاظت کی جاتی تھی۔ صرف ایک آدمی کی ایک گولی نے اس کی جان لے لی۔ وہ آدمی ایک عمارت کی چھت پر تھا اور کینیڈی گاڑی میں گاڑی چل رہی تھی مگر نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ وہ گولی جس پر کینیڈی کا نام بہت پہلے دست اہل نے تحریر کیا تھا گاڑی کی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئی اور کینیڈی کوئی گولی لگی۔ گاڑی میں اس کی بیوی تھی، محافظ اور سیکورٹی کے دیگر ارکان بھی ہوں گے مگر انہیں خراش تک نہیں آئی اور گولی بازو یا شانے پر یا کسی ایسی جگہ نہیں لگی جہاں وہ صرف زخم پیدا کرتی۔ نہیں گولی ٹھیک اسی جگہ لگی جہاں موت نے نشان لگا دیا تھا۔

”شرف بہت ذہین آدمی ہے اور بہت بھروسے کا۔ اس کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔“ تیمور بولا ”ٹکس ایسا ہی آدمی ہے۔ وہ پہلے بھی ہمارے خلاف سیاسی محاذ بنانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف رہا ہے لیکن کبھی کبھار ثابت نہیں ہوا۔“

”اور ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کیا؟“

”کیا کر سکتے تھے ہم۔ اس کے ساتھ کم سے کم دس ممبر ہیں۔ ٹکس کو نکالیں گے تو وہ فوراً اپنے حامیوں کے ساتھ کوئی فائدہ گرہ بن جائے گا۔ اس کو شہر دینے والے بھی ہیں۔ وہ سب جن سے ہمارا نظریاتی اختلاف ہے۔ دوسری جماعتوں کے کچھ ارکان اس سے مل جائیں گے۔ دوچار لوگ بے جماعت میں ہوتے ہیں۔ آزاد ارکان کے علاوہ اس وقت ڈی آئی جی صوبہ سرحد کی ایک مضبوط سیاسی شخصیت کا بہنوئی ہے۔ وہ اچھے بھل چیف سیکریٹری کا سلا بھی ہے۔ ٹکس گزشتہ مہینے دوئی گیا تھا مگر اطلاع یہ ہے کہ وہ کراچی سے اندرون سندھ ہوتا تھا اور ایک پیر صاحب کی آغوشِ رواد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ ان پیر صاحب کے ولی عہد ہمارے کے ہمراہ وہ سرحد گیا اور ڈی آئی جی کے سالے سے ملا۔ غالباً اس نے وعدہ کیا کہ ضرورت پڑنے پر اس کے بہنوئی کی لاہور پولیس ٹکس کی مدد کرے گی۔“

”اور یہ ضرورت اب پڑی ٹکس کو؟“

”شرف کی بات سے تو کیا پتا چلتا ہے کہ پولیس نے ہمارے خلاف ہنگامہ کرنے والوں کو نہیں پکڑا۔ ان کی مدد کی ہنگامہ آرائی کے اسباب پیدا کیے، ہمیں تحفظ فراہم کرنے والی پولیس گارڈ بنائی گئی۔ پھر انہی لوگوں نے بلوائیوں میں شامل ہو کے حالات کو خراب کیا۔“

”میں نے کہا کیا کہتے ہیں وہ سچوں کھراڑ کعبہ ریخیز کیا ماند مسلمان۔“

”یار یہ قاری مت بولا کہ میرے سامنے۔“

”میں نے کہا کھراڑ کہیے سے اٹھے تو اسلام کہاں رہے گا۔ خود پولیس والے اگر دہشت گردی کرنے لگیں تو دشمن وہاں کیسے

رہ سکتا ہے۔ وہ مسلح تربیت یافتہ اور منظم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارے مجرم اور ہتھیار تیار کرنے والی فوج بھی ہوتی ہے۔ خراب ہم پہنچ جائیں گے تو ٹکس صاحب کے غبارے کی ہوا بھی نکال دیں گے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”غبارہ بہت اونچا اڑ رہا ہے اور اس کو اڑانے والے ہاتھ کسی اور کے ہیں۔“

”یہ ٹکس سے ڈرنے اور اس کے خلاف فیصلہ کن سخت قدم نہ اٹھانے کا نتیجہ ہے کہ آج وہ خود کو طاقتور سمجھنے لگا ہے۔ یہ تکلیف کے ڈرے آپریشن ملتوی کرنے کے مترادف ہے۔ میں پارٹی میں دو غلطی متاخی اور بے خبر لوگوں کو نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں سب کو نکال باہر کروں گا وہ بائیں اپنا فائدہ گروہ۔“

”تم نے اس پاگل کا لطیفہ سنا ہے جس سے کسی نے کہا تھا کہ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ تم کہتے ہو دنیا پاگل ہے۔ دنیا تم کو پاگل کہتی ہے۔ آخر کون ہے پاگل؟ اس نے جواب دیا کہ بھائی۔ دنیا والے اکثریت میں ہیں اس لیے دی سچے۔ تم نے سب کو نکال دیا تو باقی میں اکیلے تم ہی رہ جاؤ گے لاوارث۔“

”اور نکالے جانے والے نیا چیزیں منتخب کر لیں گے اور وہی لپا ہے ایف۔ پی۔ پارٹی کے ٹکس کے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم کو سیاست سے کام لینا ہو گا شاہ عالم گز سے مرنے والے کو زہر دینا ہے۔ قوتی ہے۔ ٹکس چھری سے زنجیروں کو دوست نما دشمنوں کو۔ جو بھل میں چھری لیے بھرتے ہیں ان سے بھل میں پتول لے کے ملو اور پتول ایک گولی سے تین شکار کرو۔ ایک تیر سے دو شکار کا زمانہ گیا۔ گولی جس پر چلاؤ دوست بن کے چلاؤ ایسے کہ وہ مرنے دم تک تمہاری دوستی کے قریب کا شکار رہے۔ پھر اس کے قتل کو اپنے کسی دشمن کے کھاتے میں ڈال دو۔ قاتل جب تم سے اپنی خدمت کا معاوضہ اور انعام وصول کرنے آئے تو اسے خاموشی سے ٹھکانے لگا دو۔ لیاقت علی خان کی شہادت سے عمرواڑ کی موت تک اسی فارمولے پر عمل ہو رہا ہے۔ خوش قسمتی کا پانسہ تمہارے حق میں پلٹ گیا ورنہ ناصر عظیم مارا جاتا۔ اب شاہ عالم مارا گیا۔ سیاست میں تقدیر کا دھول سب سے اہم ہے۔“

رخشداد چلائی ”دعا باز۔ تم آج اسے پی پڑھا رہے ہو۔ کل تک تم میرے شوہر سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ وہ اعتبار کرتا تھا تم پر۔“

”تیار۔ وفاداری، اصول اور ضمیر۔ سچ اور ایمان داری۔ یہ الفاظ دنیا کی کسی سیاسی و کشمیری میں نہیں ہوتے خاتون! تیمور بولا۔“

”بھئی میں نے نہیں شاہ عالم نے کی تھی۔ تقدیر پر ہر گھوسا کر کے۔“

”میں نے کہا اور تقدیر کسی کے تابع نہیں ہوتی۔“

لاہور بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ اب ہم نرے کتابے والی سڑک پر جا رہے تھے۔ بائیں جانب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں خاموشی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ آج جمعہ ہے۔ اسی وجہ سے ٹریفک بھی

جام تھی۔ اپنا مال سے ہم فور ٹریس اسٹیشن کی طرف مڑ گئے۔ آگے چلے گا جس کے پیچے ٹریس کی لائنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کینٹ اسٹیشن سے چل کے لاہور کے اسٹیشن جانے والی ہر گاڑی اس پل کے پیچے سے گزرتی تھی۔ پل کے ختم ہوتے ہی تیمور نے گاڑی کو بائیں جانب گھوم کر جانے والی پہلی سڑک پر موڑ لیا۔ اس موڑ پر مال کے بائیں طرف فور ٹریس اسٹیشن کا سرخ قلعہ نما احاطہ تھا۔ یہاں دائیں طرف مڑتے ہی سابق چیف جسٹس انوار الحق صاحب کی کوٹھی ”الرحمت“ ہوا کرتی تھی۔ کینٹ اسٹیشن کا یہاں سے قلعہ ایک فریاد ہو گیا یا اس سے کہ ریلوے اسٹیشن کے مقابل کچھ سرکاری دفاتر تھے۔ پچھلی طرف ریلوے لائنوں کو عبور کرتے ہی گھبر کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

کینٹ اسٹیشن پر اب بھی بہت کم مسافر اتر رہے تھے چنانچہ باہر ایک دو گاڑیوں کے ساتھ دو چار آگے ضرور نظر آتے تھے۔ گروہ گھبراہٹ میں روٹی اور اچھل مٹھو تھی جو لاہور کے پر شکوہ وسیع و عریض اور خوبصورت ریلوے اسٹیشن پر نظر آتی ہے۔ میں نے گاڑی کو سب سے الگ کرنا کرتے ہوئے اس کا رخ سڑک کی جانب رکھا اور انجن بند کر کے سکون کا سانس لیا۔ اٹھارہ گھنٹے کا ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے والا سفر آٹھ ختم ہوا۔

رخش اور تیمور نے سکون اور گولیاں کھا کے سر کا کچھ حصہ سوئے ہوئے گزار دیا تھا۔ وہ جسمانی صحت سے زیادہ اعمالِ دباؤ کا شکار تھے۔ چندا میرے ساتھ جا رہی تھی۔ یہ بچہ کی مشغول اور خانِ اعظم کی روحانی تربیت کا نتیجہ تھا کہ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں ہم اپنے ذہن اور جسم کی توانائی کو ذہن کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر تھے۔ ایک اچھا جہل دشمن کی طاقت اور اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ اور موازنہ کرنے کے بعد ملے شدہ حکمت عملی کے مطابق جنگ لڑنا ہے۔ وہ سراسر دشمن کو دیکھتے ہی جوش اور دوسلے کے ساتھ اپنی ساری طاقت کسی پلان کے بغیر محاذ پر لگاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی قوت کا زیادہ حصہ بے نتیجہ جدوجہد میں ضائع ہو جاتا ہے اور جوش کے بعد ہوش آتا ہے تو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

خان اعظم نے ہمیں سکھایا تھا کہ جب مشکل کا سامنا ہو تو دماغ کو اتار پھونک کر دیکھو کہ وہ صحیح کام کر سکے۔ صحیح فیصلے پر مطمئن ہو تو کسی تذبذب کے بغیر یقین کامل کے ساتھ عمل کا آغاز کرو۔ یکسوئی کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے دل میں نہ بے سبب خوف ہو اور نہ بے وجہ امید۔ وہ نفسیاتی عوامل جو حکمت کا سبب بنتے ہیں دامن گیر نہ ہوں تو آدمی غلطی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

میں گیت کھل کے پیچے اترنے ہی والا تھا کہ چندا نے مجھے روک دیا۔ ”میں معلوم کر کے آئی ہوں ٹریس کے بارے میں۔ تم کو کل از وقت کسی کی نظر میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟“

میں نے گھڑی دیکھی ”ابھی کم سے کم دس منٹ باقی ہیں۔ کسی

قلی سے معلوم کر لینا کہ یوگی کہاں رکے گی۔“

”میں وہیں انتظار کروں گی۔ تم اس وقت آنا جب خان جی تمہارے پاس پہنچ جائیں۔“ وہ بولی اور گاڑی سے اتر گئی۔

اس کے ساتھ ہی میں اترنا۔ ”چند۔ خان جی کے ساتھ شہر عالم بھی ہو گا اسے دیکھ کے رخشی کے جذبات بے قابو نہ ہو جائیں۔ تم ان سے کتنا کہ ٹریس سے اتر کے دیشنگ دوم میں چلے جائیں پھر ہمیں اشارہ کرنا۔ میں چائیاں گاڑی میں ہی چھوڑ دوں گا اور ہم سب ٹریس میں سوار ہو جائیں گے۔ پانچ منٹ بعد خان جی گاڑی میں آجائیں اور شاہ عالم کو جہاں لے جانا ہو لے جائیں۔“

”میں ان سے کہوں گی کہ تمہارا دل رکھنے کے لیے تھوڑی سی تعریف کریں۔ تم سے ناانستہ ایک ٹھنڈی سرزد ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا ”مصلحت مند کھانے کے لیے مجھے تمہارے راز داران کے سرینلیٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں احساس اب ہوا ہے کہ میرے بات میرے ذہن میں تھی۔“

”بھلا کون سی بات؟“

”میں کہ میرے پلان کی تبدیلی سے خود کرخی صاحب کو ایک براہم نہیں رہی۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان کے لیے شاہ عالم کو باہر لے جانا زیادہ مشکل ہو گا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ٹریس اندر کے کسی ہیڈ بیٹ قائم پر رکھی اور انہیں باہر آنے کے لیے دو بیڑیاں چڑھ کے پل کر اس کرنے پڑے۔ کون مدد کرنے آتا ان کی۔ اسٹریٹ کہاں سے لائے؟ شاہ عالم کو خود کندھے پر ڈال کے لے جاتے؟“

چندا نے سر ہلایا ”تم تو بیچ محل مند ہو۔ بلکہ اچھا کہ ہو گئے ہو۔“

میں نے کہا ”جاؤ ٹریس آگئی ہے۔“

ٹریس پانچ منٹ پہلے ہی آگئی تھی۔ ریلوے کے قواعد و ضوابط میں ٹریس کے لیٹ ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ ایک شخص ٹریس کو میں وقت پر آنا دیکھ کے سخت حیران ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں نے اپنی زندگی میں ایک بار تو یہ دیکھا کہ ٹریس ٹیکنڈ کے حساب سے ٹائم پر آئی ہے تو ریلوے کے ایک ایڈوائس سے مطلع کیا تھا کہ جناب ٹریس ٹھیک چوبیس گھنٹے لیٹ ہے۔ مگر ٹریس کا وقت سے پہلے پچھتا جرم کرانا جاتا ہے۔ یہ فرق میری گھڑی کا تھا جو پاکستان کا معیار وقت بتا رہی تھی۔ ریلوے والوں کی گھڑی شاید پانچ منٹ آگے تھی۔ میں نے ہائی ہانڈ کے کوٹ بھی پہن لیا۔

یہ میرے پکا مشن کا دوسرا مرحلہ تھا جو کامیابی سے عمل ہونے والا تھا۔ پہلا مرحلہ تھا کراچی پہنچ کے شاہ عالم کو نمودار ہونے سے پہلے غائب کرنا اور خود اس کی جگہ نمودار ہونا۔ مداری نے اپنا پہلا کرب ایسے دکھایا تھا کہ دیکھنے والوں کو ہاتھ کی مٹائی کا بالکل پتا نہیں چلا تھا اور بدھ بدل گیا تھا۔ یہ دوسرا مرحلہ تھا جب دی کھیل لاہور کے ناظرین کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ شاہ

عالم لاہور اسٹیشن پر نمودار ہونے سے پہلے ہی غائب اور لاہور اسٹیشن پر سیکڑا پائی دو رکڑ پر پریس روپرز اور فوٹو گرافرز کے سامنے بندہ حاضر۔ چنگی بجائی اصل غائب چنگی بجائی نقل حاضر۔ اسے ہے کوئی ایسا آنکھوں والا ہے کوئی عقل کا پورا ہے کوئی مائی کا لال جو اصل کو نقل ثابت کرے؟ شاہ عالم آپ کے سامنے ہے حضرات دیکھئے نمودار سے دیکھئے آنکھیں چاڑھاڑ کے دیکھئے۔ چھو کر دیکھئے شوک بجائے دیکھئے یہ کون ہے؟ ناصر عظیم یا شاہ عالم؟ شاہ عالم ہے تو ناصر عظیم کدھر گیا؟ ناصر عظیم ہے تو ناصر شاہ عالم کہاں ہے؟ دیکھو کھیل مادی کا اور بجائے مادی اور ہاتھ ڈالو جیسے میں۔ مکی کام ہے تمہارا۔ مائی بجائے اور جیب خالی کرو۔ کھیل ختم پیسہ ہضم ہر مادی مال سینے کا اور چلا جائے گا۔

نہیں کے آنے پر معمولی سی لپٹل پید ہوئی ہر ایک ایک کر کے مسافر نکلے گئے۔ قلمی سامان سروس پر اٹھائے کسی دشواری کے بغیر باہر آ گئے۔ یہاں نہ رش تھا نہ کوئی پلی مور کرنے کا مسئلہ۔ نہیں بالکل سامنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس کا کچھ حصہ سڑک کے ساتھ آگیا تھا۔ یہاں سے لوگ ریل سے لائی کو بروقت عبور کرتے رہتے تھے۔

چند اکوئیں نے بیک دوہر میں دیکھا جس کو میں نے تمہارے باہر آنے والے راستے پر انٹرنیٹ کر لیا تھا۔ میں نے سر نکال کے اپنی بندھنوں کے ساتھ آنکھ کھڑا کیا جس کا مطلب قاسب ٹھیک ہے اور پیچھے والا گیت کھول دیا۔ رشتی کے چہرے پر رخت تازہ تھا۔ میں نے کہا "مجھے امید ہے۔"

"کیا ہو گا اگر میں نے تمہاری امید کے خلاف کچھ کیا؟" وہ جیسے لیے میں ہولی "میں نے شر پھارنا پھر؟"

میں نے کہا "پھر ایک حقیقی اور با اختیار شوہر کی طرح مجھے جھانپڑ مار کے جس میں خاموش کرنے میں عار نہیں ہوگی۔ میرے جھانپڑ کا مزہ ایک بار تم نے چکھا تھا تم آنا۔ جلدی کرو۔" وہ میرے ساتھ چلتے گئی "میری دلی خواہش ہے کہ تم پہن جاؤ کیس "میری وجہ سے نہ سہی۔"

"اس سے جس میں کیا فرق پڑے گا۔ ویسے تم بدعا دیتی رہو خدا بھی دعا ضرور سنتا ہے۔ بدعا تمہیں سنتا ہوگا۔" "نہیں۔ کسی کے دل سے آہ نکلے تو کیا خدا انصاف نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ خدا کے انصاف کا نمونہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

تیمور بہت متھل اور مایوس تھا۔ اس کا اپنی جیلی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اپنی طرف سے تیمور نے انہیں سیاسی اشتعال کے دعوے سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹھیک قدم اٹھایا تھا لیکن اب وہ میری تحویل میں تھے اور شاید زیادہ محفوظ تھے لیکن ان کی اسیری نے تیمور کو پریشان بنا دیا تھا۔ اس سے مجھے کسی بھی احمقانہ جذباتی

بغاوت کی امید نہیں تھی۔

چند اکوئیں اور ہمارے درمیان دو بوجیوں کا فاصلہ تھا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا کچھ خان اعظم کی پرچائیں تک کسی خلائی پروف دواڑے کے پیچھے نظر نہیں آئی۔ چند اگلے دواڑے جیسی سے لپٹ کر دیکھا۔ غالباً اسے ہماری ست دی پر کوفت ہو رہی تھی۔ گاڑی یہاں صرف پانچ منٹ ٹھہری تھی۔ گنگل گرین تھا اور انجن کسی بھی وقت دواڑے کی اطلاع کی دے سکتا تھا۔

چند اکوئیں بوجی کے دواڑے میں غائب ہو گئی۔ درمیان میں ایک سی بوجی رہ گئی تھی کہ دوسل ہو گئی۔ میں نے رشتی کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور تقریباً اٹھارے اندر کردیا۔ تیمور چا تو زین حرکت میں آئی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہی اندر پہنچ گیا۔ ٹھک کارڈر کے دوسرے گیت سے چند اگلے میں دیکھا۔

"ختم کامل اور پستی چیز دو تم ہو گی۔" وہ بولی۔ "جلدی کا کام شیطان کا" میں نے کہا "کون سی نرین مس ہو گئی ہے مس کہ آپ ڈانٹ رہی ہیں معصوم بچوں کو؟"

"معصوم بچے منہ دھو جلدی سے۔" علیہ ٹھیک کرلو۔ بال ایسے ہو رہے ہیں جیسے جمنو نوتا ہو دشت نور دی کر کے اور مائی کہاں جا رہی ہے۔"

"جلدی میں باندھی تھی۔" "جلدی کا کام شیطان کا" اس نے میری مائی ٹھیک کی اور مجھے اپنا برش تھما دیا۔ پھر ٹیک میں سے نم آؤد نشو پھر نکال کے دوا اور میرے سامنے ایک اپ کٹ کا چھوٹا سا آئینہ کردیا "اس میں دیکھو اپنی شکل۔"

میں نے آہستہ سے کہا "میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔" خیر کیا ہوا ہے کل کو؟ اور جیل پوئی ہے۔ جیسے خدا نے دی تھی۔ یہ جو تم لوگ حسن میں کی کو بورا کر رہی ہو۔ ایک آپ سے "اس کی ہم مردوں کو ضرورت نہیں پڑتی۔ سُرنی پاؤڈر آئی شینڈ اور کیا کیا لگا تا پڑا ہے جس میں۔ پھر بھی ہم سے کیا مقابلہ۔"

میں ٹھیکے ہوئے نشو سے چوم صاف کر کے پالی سیٹ کرتا رہا اور باتیں کرتے ہوئے مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ رشتی ہمیں کتنی دلچسپی رکھتے اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ چند اس وقت ایک مائل سیکرٹری اور مٹائی ہوئی کاؤپر اکوئیں خود امدادی کے ساتھ ہمارے تھیں۔

"تم نے تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی تیار کی تھی" میں نے کہا "شروع کیا تھا دواڑے سے سولہ گھنٹہ بعد تو ہو گئے۔"

"ہاں۔ بس ایک رہ گیا۔ یہ کپڑے بدل لوں۔ ابھی دس منٹ تو اور گئیں گے نرین کے پلیٹ فارم پر رُکنے میں" اس نے ایک ہنڈل دکھایا جو وہ اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔

"بھئی۔ یہ لباس ٹھیک نہیں ہے" میں نے کہا۔

"میرے لیے تو ٹھیک ہے" وہ ہنسی "مگر تم جیسے سیاست دان کی ٹیکرٹری کے لیے ٹھیک نہیں کیا کیس کے دیکھنے والے۔"

"ہاں۔ اب مجھ سے زیادہ دو لوگ نہیں دیکھیں گے جو میرے استقبال کے لیے آئیں گے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ ہاتھ دوم میں غائب ہو گئی تو رشتی نے کہا "ہمت اچھا ہوتا اگر تم اس لڑکی سے شادی کر کے کچھ عین کی زندگی گزارتے۔ سب کچھ تو تھا تمہارے پاس۔ تم کیوں اس پکڑ میں پڑ گئے۔"

"مجھ پر سب کرائی ہے۔ میری مجبوری کا نام ہے تیمور" میں نے کہا "جیسے خوار کے ساتھ آدم جنت میں خوش تھے ایسے ہی ہم اپنے خوابوں کی جنت ارضی میں بڑی غایت کے ساتھ جی رہے تھے جب شیطان کی طرح تیمور نے رخت اندازی کی اور تم سمیت تمام آفات کو مجھ پر مسلط کردیا۔ اپنی جنت میں وہاں ہی وہ معتقد ہے جس کے لیے میری یہ سب جدوجہد ہے۔ مگر یہ جدوجہد شرط ہے زندگی سے۔"

"پھر بھی۔ خوش قسمت ہو تم کہ ایک گمشدہ جنت کی ترنا رکھتے ہو" اسے داییں حاصل کرنا بھی چاہیے ہو اور تم اکیلے نہیں ہو۔"

میں نے ہانکے کے لیے کہا "تمہارا بھی شوہر ہے۔"

"ہاں۔ ایک قانونی شوہر ہے مگر وہ میرے خوابوں کے سفر میں شریک نہیں ہے اور نہ اس کے لیے میں کسی جنت کے خواب کا حصہ ہوں۔ اس کے پاس خواب ہی کہاں ہیں۔ خواب وہ دیکھتے ہیں جن کے پاس دولت عزت اور شہرت کمانے کی مصوفیت میں تھوڑا سا وقت ملے اور کے لیے بھی ہو۔"

"خود اپنے لیے بھی نہیں؟"

"نہیں۔ جو وقت وہ نکال پاتا ہے اس کو مجھ سے ہتھیانے والی بہت ہیں۔ اور مجھے وہ وقت دے سکتا تھا دے چکا۔"

چند ہاتھ دوم... سے نکلے "میں بہت اچھی لگ رہی ہوں" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"بھئی تم کیسے لگ سکتی ہو مگر معاف کرنا۔ اس لباس سے تمہارا چہرہ بڑھ چکا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ میری ٹیکرٹری اپنے کپڑے دواڑہ دوم میں نہیں کسی کپڑے میں رکھی ہے اور اس میں سے نکال کے استری کے بغیر پہن گئی ہے۔"

"کس کی ٹیکرٹری سفر میں دواڑہ دوم ساتھ لے کر چلتی ہے جی! اور نرین میں استری ہو سکتی ہے کیا؟ اس نے سیلے کپڑوں کا ہنڈل ایک سوٹ کیس میں غولس دیا جو خان جی چھوڑ گئے تھے۔"

برلہ نرین کی رفتار کم ہوئی جاری تھی۔ فلوادی پئے مسلسل پڑی بدلی رہے تھے اور بریک گئے سے مرکز کی جگہ جیسی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بوجی کے قریب سے آؤر کیبن گزرتا تھا میں نے ایک نظر اپنے سر پر ڈالی اور شاہ عالم کی حیثیت سے پبلک میں اپنی پہلی پر قارنس کے لیے تیار ہو گیا۔

"ہم سب کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور مشکلات ہیں لیکن ان کا حل ایک ہی ہے۔ جو حل شاہ عالم کے پاس ہے اور شاہ عالم میں ہوں۔ اگر کوئی اس حقیقت سے سمجھوتا نہیں کرے گا تو وہ صرف اپنی مشکلات میں اضافہ کرے گا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس بارے میں دواڑے نہیں ہو سکتیں۔ ہم سب کی کوشش بہتری کے لیے ہونی چاہیے۔ یہ میں آخری بار دواڑہ کر رہا ہوں۔ اسے میری خواہش سمجھا جائے گزارش عزم یا دھمکی" میں نے کہا اور تیمور نے سر ہلایا اور رشتی نے بھی۔

پلیٹ فارم شروع ہو گیا تھا۔ آریک شیشوں میں سے سامنے کی طرح کوفت ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ سب سے آگے قلمی صف بست تھے جن کے پیچھے پڑا شیشاں چپوں کے ساتھ نرین کی کسی کھڑکی میں یا دواڑے میں کوئی آشنا صورت تلاش کرنے والی آنکھیں ہاتھ ہلا کے آگے لپکے والے لوگ جو کسی کو لینے کے لیے چہم پڑا تھے۔

میں نے دواڑہ کھولا اور اچانک باہر کے روشن دن کے بحرور آجائے لے اور شور نے میرا استقبال کیا۔ میں نے سرے ٹٹے یہ سب پڑا نے فرے تھے جو میرے کان "ناصر عظیم کے کان" بھین سے سنتے چلے آ رہے تھے شاہ عالم زندہ باد کے فرے لگائے والے پلیٹ فارم کے ایک حصے میں جمع تھے سو سوا چھوٹے بڑے جھنڈے لہرائے والے پی بے ایف کے کارکن اپنے جینز میں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دھم بھل کر رہے تھے انہیں ایف اے ایف جی قاع عالم فورس کے نوجوان کنٹرول کر رہے تھے۔ ان نوجوانوں نے جینز کی نیلی پتلونوں کے ساتھ ہنر شریں پہن رکھی تھیں۔ شرٹ کی جیب سفید تھی اور ان پر سونوگرام کی طرح ہائی کلائن اس کی فائنڈ نظر آ رہی تھی۔

نرین اب ریک رہی تھی۔ ہلا خرا یک آخری بنگی جیسے جھکے کے ساتھ بوجی میں اس جگہ ٹھہری جہاں ہاتھوں کی ڈنچہ کے ہٹنے میں نہیں افراد ہالے کھڑے تھے۔

تیمور نے میرے پیچھے سے کہا "یہ کوئی منول سی چیز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہانس جیسا ریکل قریبی "تیمور اشرف علی ہے۔"

میں نے ان گت سیاہی لیڈروں کو نرین سے اترتے ہوئے ہماڑ کے دواڑے میں "اسٹیج پر کھڑے ہو گئے اور جلوس کی کسی گاڑی میں ہاتھ ہلاتے دیکھا تھا عمران لوگوں کے جذبات کی کیفیت اور شدت کو محسوس کرنے کا یہ پلا تجرہ تھا۔ یہ سب مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا اور اچانک برلٹ اور برست بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ جب میں نے استقبال کرنے والوں کے نعروں کا جواب دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور اپنے چہرے پر خوشی اور فکھر سے بحرور اپنے کارکنوں اور ساتھیوں کو امید اور ایک روشن مستقبل کی نوید دینی سکراہٹ مسلط کی تو مجھے ایسا نہیں لگا جیسے میں منافقت کر رہا ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ جی ایسا ہی ہے۔ یہی میرے دلی جذبات

ہیں۔ اور اس وقت بکھٹ صرف ایک لمحے کے لیے وقت کی اس تصویر کے قریب میں جو میرے سامنے تھی مٹ کر رہ گئے۔ وقت کی ایک بہت پرانی چھوٹی سی تصویر ابھرتی تھی۔ جیسے ہم یانی دی ڈارے کے سین میں کسی خیال کو سہرا پھونکا جاتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ میں نے بیس سال پہلے کی صدا سے بازگشت سنی جو ابھی تک زمان و مکان کی قید میں سرگرداں تھی۔ ایک بچے کے سوچ کے کہا "میں تو ذرا فطیم بنوں گا" اور پھر میں منظر میں بہت سے پرتشخص معلوم اور بے خبر چلتے ہوئے۔

مجھے یاد ہے کہ اس ایک لمحے نے مجھے حال سے بے خبر کر دیا تھا۔ میں ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا چنانچہ میں نے وہ ہاتھ نہیں دیکھا جو مجھے ہار پستانے کے لیے یا اعتبار محبت اور عقیدت کا نذرانہ دینے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔

چند اے جی کر کہا "سرا" اور اس کے ساتھ ہی میں ایک دھکے سے سیدھا حائل کے بل باہر گیا۔ پلٹ فارم کے تخت فرش کی طرف۔ شمس اور وکیل قریبی کے ہاتھ میرے گلے میں ہار ڈالنے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ میں سینٹ کے فرش پر گرنا تو شاید میرے دانت ٹوٹ جاتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہاتھ کس کے تھے جنہوں نے مجھے چند اچانچ اور ہیروک لیا۔ میرے کانوں میں سینیاں ہی بج رہی تھیں اور میں ہسرا ہو گیا تھا۔

چند اے جی کے ساتھ ہی وہ دوہکا ہوا تھا جس نے میرے دماغ کو بھی باؤف کر دیا تھا۔ میرے اعصاب مفلوج ہو گئے تھے اور جسم بے جان تھا۔ یہ ایک لمحہ تھا شاید اس سے بھی کم۔ ایک لمحے کا کوئی چھوٹا سا پرت عذاب حصہ۔ شاید ویسا ہی جو نزع کے کرب میں زندگی سے موت کی سرحد عبور کرانے کے لیے آتا ہو گا اور گزر جانے والے کے ساتھ ہی گزر جاتا ہو گا۔

زندگی کا یقین لوٹانے والا اس سے اگلا لمحہ تھا جب سب کچھ بحال ہو گیا۔ جیسے کبھی کے ایک سینڈ کے لیے جاکے آتے ہی بلب پھر روشن ہو جاتے۔ فی دی یا ریڈیو پھرولنے لگتے۔ چھپے کی گھول گھول۔ کوئی ٹوٹا ہوا لفظ۔ کوئی ادھورا جملہ۔ پانی کی سوزنا فریج اور اسے سی کی سرسراہٹ۔ سب پہلے کی طرح ہو جاتے۔

میں نے گھول کے ساتھ شور مچا اور پک چمکنے سے پہلے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ تیور مجھ پر گرا تھا۔ اسے اپنی انھوں نے تمام لیا تھا اور وہ جب میرے گرد طعنے دو رہے ہوئے چب رہے تھے۔ تیور کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے سینے کے ایک سوراخ سے خون اُبل رہا تھا۔ گرم سرخ لہو جو صرف ایک لمحہ پہلے رگوں میں دوڑ رہا تھا اور دل سے شراونوں میں پہنچنے کے زندگی کے تشنیل کا خاسن تھا۔ اب میرے سوٹ پر اور سینٹ کے پختہ پلٹ فارم پر گر رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس گولی پر دست اہل نے تیور کا نام لکھ رکھا تھا جو کسی قاتل نے مجھ

پر چلائی تھی۔ چند لوگ تیور کو اٹھا کر لے گئے۔

"وہ پکڑا گیا؟" کسی نے چلا کے سوال کیا۔

"نہیں" کہے جیسے جاسکتا تھا؟" جواب میں کسی نے گلی دے کے کہا۔

نہ جانے کتنے لوگ ایک ساتھ چب رہے تھے۔ اور... اور... اور گالیاں بک رہے تھے۔ میں نے نہیں کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں مجھے پیچھے سے چند اے دھکاکے کر پلٹ فارم پر گرا دیا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھی۔ میرے آس پاس نہیں بھی نہیں تھی۔

پانچ فٹ پانچ انچ قد اور استہی فقر کا ہیٹ رکھنے والے شمس صاحب نے اپنی نیم مہران، نیم زنانہ آواز میں منٹا کے کہا "شاہ جی۔ آپ ٹھیک ہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا شمس صاحب۔ تھیک ہے۔"

وکیل قریبی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے آسمان کی طرف دیکھا "لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ کا جس نے آپ کی جان بچائی۔"

میں نے کہا "مجھے چھوڑیے۔ تیور صاحب کی فکر کیجئے۔"

"فکر کرنے سے کیا ہو گا شاہ جی۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

وکیل قریبی نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا "ہاں۔ مدلی لاکھ بڑا چاہے تو کیا ہوتا ہے؟"

میں نے اسے گھور کے دیکھا "مجھے بتائیے یہاں کوئی ڈاکٹر ہے۔ کسی نے ایمرولینس منگوائی ہے؟"

"ایمرولینس آنے ہی والی ہوگی۔ مگر کیا ہو گا اس سے بھی؟"

شمس نے بائیں اور آداس لیے میں کہا "میں ڈیڈ باڈی لے جائے گی۔"

"ڈیڈ باڈی؟" میں نے چلا کے کہا "ازی ڈیڈ؟"

شمس نے غصی سا لہجے میں گولی دل میں لگی تھی "آپ نے تو دیکھا ہو گا۔"

میں نے کہا "کہاں ہیں تیور صاحب۔ میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شمس نے میرا ہاتھ تمام لیا "آپ میرے ساتھ آئیں شاہ جی۔"

وکیل قریبی فوراً دوسری طرف گیا "جس بات کا خلصہ تھا ہو گی۔"

میں ان کے ساتھ پہلے لگا سیرے ساتھ سیری واکف اور سیکرٹری مس خان تھیں۔"

اشرف علی نے پیچھے سے کہا "وہ محفوظ ہیں سر۔ انہیں واپس اندر بھیج دیا گیا تھا۔ ایف اے ایف کے جوان بوکی میں چڑھ گئے تھے۔"

میں نے سہلایا "گولی چلانے والا کون تھا؟"

"وہ کون ہو سکتا ہے شاہ جی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" شمس نے منٹا ہونے کہا۔

"پوچھنے والی بات نہ ہوتی تو میں آپ سے پوچھتا؟" میں نے بڑے کسے کہا "آپ بتائیے اگر آپ کو معلوم ہے؟ کیا نام تھا اس کا؟"

"سیرا مطلب تھا شاہ جی۔ وہ دھنوں کا بندہ تھا۔ نام سب معلوم ہو جائے گا۔" شمس نے وکیل قریبی کو مستی خیز نظروں سے دیکھا۔

"کیا وہ پکڑا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

اشرف علی نے کہا "میں معلوم کر کے آتا ہوں سر۔ آپ ابھی اندر ہی رہیں۔ جب تک میں نہ آ جاؤں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آہستہ سے آنکھ پاری۔ میں نے سہلایا اور اس کرے میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر انتظار گاہ برائے مسافران درجہ اول کی قیمتی جھول رہی تھی۔ دروازے کے باہر ایک جھوم تھا۔ ایف اے ایف کے دو ٹوکوں نے بڑی وحشیانہ قوت کے ساتھ لوگوں کو ایک طرف دھکیل کر میرے لیے راستہ بنایا۔

میرے پیچھے پولیس جتنی تھی۔ ایک سب انسپکٹر دھکے سے مجھ پر گرا۔ اس نے چلا کے کہا "دے دے دے کون سب کو ادھر سے۔ کوئی تاشاگاہ ہوا ہے یہاں۔ ان کی بال کا بھرا ہوا ہے؟"

اس کے حکم پر دروازہ اور اشارہ ایڈ کے غلاب۔ گلے سے سوز کا اور سوز سے مرضی کا اندازہ کرنے والے ایک دم پہلے اور ڈھکے لے کر پکچ پر ٹوٹ پڑے۔ شمس کی بد قسمتی تھی کہ وہ کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک ڈھکڑا اس کے بھی لگا۔ میں نے اسے چلائے سنا۔ وہ سب کی جتنی اتارنے کی دھمکی دے رہا تھا اور پولیس کے پورے گلے کو بند کرانے کی دھمکی دے رہا تھا۔

میں دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ گوروں کے وقت کی نی ہوئی عمارت تھی۔ انتظار گاہ مسافران درجہ اول بھی ایک نظر میں کسی تھانے کا کراہی تھی جس میں قدیم وضع کا کھرا فریج بھر دیا گیا ہو۔ اس کی سال خوردہ دیواروں پر نصف صدی سے پہلے پانی جیسا زرد رنگ بچھرنے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو گا تو رنگ کرنے کا ٹیکا لینے والے کو کیا ٹیکا دینے والے افسر نماز کو۔ ان کا بیک بٹلین ایسے ہی ٹیکوں سے بھرا ہوا ہو گا۔

بلند چھت سے بگا ہوا ایک چمکا بالکل سرکاری ملازم کے انداز میں مجبوراً ہوا دینے کی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا اور ایسے چل رہا تھا کہ اس کا ہر چکر الگ نظر آتا تھا۔ دوسرا رٹاڑ ہو کے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ ان پر کبھی سفید رنگ ہو گا مگر اس پر کھپوں کے بیٹھے سے کالے رنگ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ چار میں سے ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دوسری چراغ عری کی طرح بج رہی تھی۔ باقی دو ریڈیو نور کی طرح بند تھیں۔

تیور ایک صوفے جیسے بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی

آنکھیں بند تھیں اور اس کے چادوں طرف کھڑے ہوئے لوگ اسے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ میں گھنٹوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے سینے کے زخم سے بہنے والے خون نے قمیص کے اوپر والے حصے کو رنگ دیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ ہاتھ گرم تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض چل رہی تھی پھر میں نے اس کے سانس کو دیکھا۔ سانس چل رہا تھا۔

"شمس" میں نے کہا "تیور زندہ ہے۔ پوائیٹ، تم نے کیسے کہہ دیا تھا کہ ایمرولینس ڈیڈ باڈی لے جائے گی۔"

شمس نے ہلکا کے کہا "وہ شاہ جی حالت دیکھیں ان کی؟"

"شٹ آپ۔ تیور کو کچھ نہیں ہو گا۔ اشرف۔ اشرف۔"

اشرف نے پیچھے سے کہا "میں سر۔"

"معلوم کرو ایمرولینس ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ ستنی دور ہے یہاں سے ریلوے اسپتال۔ انہوں نے ڈاکٹر آن ڈیوٹی۔ میری بات میڈیکل پریزنڈنٹ سے کراؤ۔"

"میں نے بات کر لی ہے۔ ایمرولینس پہنچنے والی ہے سر۔"

"تیور کو مرنا نہیں چاہیے۔ شمس صاحب! میں نے اس کا کندھا پکڑ لیا۔"

وہ زور سے ہو گیا "شمس۔ سر۔ یہ میرے اختیار کی بات ہے۔ کیا؟"

میں نے کہا "وکیل قریبی۔ کیا یہ انتظام پہلے سے نہیں ہوا چاہیے تھا؟ یہاں ایک ایمرولینس اور ڈاکٹر کیوں موجود نہیں تھے؟"

"میں اندازہ تھا کہ شمس کس قسم کی گزند چل رہی ہے۔ ہمارے مخالفین کیا کر چکے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے سر۔" وکیل قریبی ہلایا۔

"مجھ پر قاتلانہ حملہ متوقع تھا۔ قاتلا نہیں؟ پھر تم لوگوں نے کیا بندوبست کیا تھا۔ اگر گولی مجھے لگ جاتی تو میں بھی اسی طرح یہاں پڑا ہوتا۔ ریلوے کے واشنگ روم میں۔ اور تم محض انتظار کرتے رہے کہ کون پہلے آتا ہے۔ ڈاکٹر یا فریڈ! جمل۔ ٹلاکٹ اور ٹالٹ لوگ ہو تو کیا خفاقی اقدامات کیے تھے تم نے؟"

"بہت جاؤ۔ سب ایک طرف ہو جائیں۔ راستہ چھوڑ دیں۔"

ایک دہلے پہلے ٹیک اور سفید بالوں والے شخص نے اندر آتے ہی چلا شروع کیا "ایسا یہ واقعی ہے، بھیرنگار کھی ہے۔"

اسٹریچر والے اس کے بالکل پیچھے تھے۔ انہوں نے بڑی چھٹی سے تیور کو اٹھالیا۔ ڈاکٹر نے قمیص کو سامنے سے پھاڑ کے تیور کے سینے پر زخم کو دیکھا اور سہلایا "بھینکس گاؤا!"

میں نے کہا "ایسا یہ زندہ رہے گا ڈاکٹر!"

ڈاکٹر مجھے کوئی سخت جواب دینے کے لیے چلا تا مگر پھر اس نے مجھے پھان لیا "شاہ عالم صاحب۔ میرا خیال ہے کہ گولی نے دل کو مس کر دیا ہے۔ بس ایک دو بج کے مار جسے۔ ان دھنٹ کھیں۔"

”سے زندہ رہنا چاہیے ڈاکٹر صاحب!“

اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ دعا کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ جو ہے خدا کے ہاتھ میں ہے۔“ اسٹریجٹ اٹھانے والے باہر نکل گئے تھے وہ ان کے پیچھے لپکا۔ ”تم آن۔ تم بھی اسپتال جاؤ گے“ میں نے کہا۔ اشرف علی نے میرا راستہ روک لیا ”تو سر۔ آپ کا اسپتال میں کوئی کام نہیں۔ میں نے آپ کی وائف اور سیکریٹری کو روانہ کر دیا ہے۔“

”کس کے ساتھ؟ اور کہاں؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہماری سیکریٹری کے دو جوان اس گاڑی میں ان کے ساتھ ہیں۔ ایک پولیس کار پیچھے ہے۔ وہ مگر جائیں گے اور وہاں پہلے ہی بہت سخت حفاظتی انتظامات کر دیے گئے ہیں۔“ اشرف علی نے کہا ”آپ کو یہاں سے سیدھے پارٹی سیکرٹریٹ جانا چاہیے۔“

”کس نے کہا؟“ اور اخبار والوں سے کون بات کرے گا؟“

میں نے کہا ”میں فی الحال کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اخبار والوں کو قاتلانہ حملے کی ایک سنسنی خیز شرفی مل گئی۔ انہوں نے تصویریں بھی بنائی ہوں گی۔ پارٹی کی طرف سے بیان شام کو جاری کیا جائے گا۔ شمس صاحب! آپ انہیں بریف کر دیں۔ یہ کہہ دیں کہ تیور صاحب زخمی ہیں مگر ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں لیکن جیسٹیشن صاحب شک کی کیفیت میں ہیں۔ بس ٹال دیں انہیں کسی بھی طرح۔“

شمس نے امداد طلب نظروں سے دیکھ کر قہقہہ ”تم بھی آؤ گے۔“

میں نے دیکھ کر قہقہہ سے کہا ”آپ اسپتال جائیں۔ اور مجھے ہر دس منٹ بعد فون پر بتاتے رہیں کہ تیور صاحب کی حالت کیا ہے۔ کوئی بھی NEOLIGENCE ہوئی تو میں سب کو برطرف کرادوں گا۔ کیس کروں گا ان پر۔“

اشرف علی نے کہا ”سر! آپ برا نہ مائیں تو میرا مشورہ ہے کہ باہر بچے اخبار والوں کو سیکرٹریٹ میں بلا لیں۔ ابھی ساڑھے دس بجے ہیں۔ ایک گھنٹے میں ہم صورت حال کی بارے میں پالیسی بیان تیار کر سکتے ہیں۔“

”اوکے“ شمس صاحب آپ انہیں بلا لیں باہر بچے اور دیکھ کر قہقہہ صاحب آپ اسپتال کے انتظامات دیکھ کے اور آواز ترین رپورٹ کے ساتھ آفس بھیج جائیں۔“

دونوں نائب صدر چلے گئے تو میں نے اشرف علی سے پوچھا ”کچھ پتا چلا کہ قاتلانہ حملہ کرنے والا؟“

”نہیں سر۔ وہ پکڑ لیا گیا تھا مگر اس کی شناخت ممکن نہیں۔ وہ بولا۔“

”میں لایا وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا!“

”سنئے مجمع میں سے بھاگ کے وہ کہاں جا سکتا تھا۔ دو سرائے کھانے سے پہلے ہی اسے پکڑ لیا گیا تھا۔ پکڑنے والے وہی لوگ تھے جو اس کے آس پاس تھے۔“

”پھر کیا اسے پولیس لے گئی ہے؟“ میں نے کہا۔

اس نے سر ہکا لیا۔ ”نہیں سر۔ اسے پکڑنے والوں نے ہی مار دیا۔“

”مار دیا؟“ میں نے چلا کے کہا ”کیسے مار دیا؟“

”اشرف علی کی کیفیت میں“ اشرف بولا ”جیسے لیاقت علی خان کے قاتل کو مار دیا گیا تھا سر۔“

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کرائے کا قاتل تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والوں نے اسے تعین دلایا ہو گا کہ آس پاس اپنے ہی لوگ ہوں گے جو اسے فراہم ہونے میں مدد دیں گے۔ اس کا راستہ نکالا چھوڑ دیں گے اور وہ آسانی سے باہر نکل جائے گا جہاں اس کی موٹر سائیکل یا گاڑی تیار ہوگی۔ شاید آدھا معاوضہ ملے گا لاکھ روپے اس کو پیشگی دے دیا گیا ہو گا۔ باقی آدھا کام ہو جانے کے بعد لیکن آدھا معاوضہ ادا کرنے والوں نے خود ہی اسے گھیر کر اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ وہ زندہ سلامت پولیس کی تحویل میں پہنچ جائے یا پارٹی کے وفادار کارکن اسے بجائیں اور وہ تعینش میں سب اگلے دے کہ اس نے کتنا معاوضہ لیا تھا، کس نے لیا تھا اور کب لیا تھا؟

”اسے مارنے والے کون تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ معلوم نہیں سر۔ یہی لوگ تھے جو اسپتال کے لیے جمع ہوئے تھے۔ دیسے تو یہ پورا پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے سب اسپتال کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے علاوہ ساہو کاروں میں پولیس والے تھے۔“

”گلاش اس وقت کہاں سے قاتل کی؟“

”وہیں پڑی ہے سر۔“ وہ بولا۔

میں نے دوواڑے کا رخ کیا ”میں اسے دیکھوں گا۔“

اشرف علی میری طرف لپکا۔ ”نہیں سر۔ آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ جائیں۔“

میں اسے ایک طرف دھکیل کر باہر گیا۔ پلیٹ فارم پر مجمع جھٹ چکا تھا۔ تیز کام سڑک کے اگلے سرے میں مارا لپڈی کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ دھشت گردوں کے ایک دو گتے نے رعبو کرنے اور ہی آف کرنے کے لیے آئے والوں کو جلداز جلد جانے واردات سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا کہیں ان کا نام گواہی میں نہ آجائے۔ قتل اور اسٹیشن پر ہر وقت موجود رہنے والے افراد بھی غائب ہو گئے تھے یا پیچھے بہت سے بہت دور چلے گئے تھے۔ پارٹی کے کارکنوں کو پولیس نے باہر نکال دیا تھا لیکن کچھ اب بھی گروہ کی صورت میں دو سرے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ اب وہ

زندہ باد کے ساتھ ٹرودہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے شہید تیور زندہ باد۔ امن کے دشمن ٹرودہ باد۔ انصاف کے دشمن ٹرودہ باد۔ آزادی کے دشمن ٹرودہ باد۔

ان کے لیے تیور امن انصاف اور آزادی کے منشور پر یقین رکھنے والی پارٹی کے لیے جان دینے والا شہید بن گیا تھا۔ پلی بے ایف کو بھی ایک شہید مل گیا تھا۔ اب وہ انصاف کا جواب انصاف سے دینے کی پوزیشن میں تھے۔ دیواری محلوں میں پوسٹرز اور پینرز میں جہاں بھی ٹرودہ باد کا نام تھا وہاں تیور کا نام لکھا جا سکتا تھا۔ ان کے لیے اطمینان کی بات تھی کہ حساب بہت جلد برابر ہو گا۔

نہ جانے تیور کی موت کی خبر کس نے پہنچا دی تھی۔ شمس نے توحقیقت جاننے بغیر ہی ایسی پولیس کے ڈپٹی بازی لے جانے کی بات ایسے کر دی تھی جیسے وہ خود تیور کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔ یہ شاید ایک لا شعوری خواہش تھی جو قتل اور وقت الفاظ کے زبان پر آگئی تھی۔ تیور سینئر نائب صدر تھا اور اس کے مرے سے پہلے کوئی نائب صدر اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ اب تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شمس کی پوزیشن زیادہ مضبوط تھی۔ اس کا ذہن سازش تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پارٹی کارکنوں میں مزید اشتعال پھیلانے، تصادم کے لیے اور بنگالوں کی آگ کو بوا دینے کے لیے اس نے تیور کی موت کی جھوٹی افواہ پھیلا دی ہو۔

پلیٹ فارم پر چار سے ڈھکی ہوئی ایک ٹھکری سی پڑی تھی۔ اس چادر پر خون کے دھبے تھے۔ خون ٹھکری کے آس پاس بھی پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پولیس نے اس کو گھیرے میں لے رکھا تھا مگر مجھے دیکھ کے انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے جبکہ کر چادر کا ایک کونہ اٹھا دیا اور لاٹش کو دیکھا۔

حملہ آور نوجوان لڑکا تھا۔ شاید میں بائیس سال کا۔ اسے مارنے والوں نے اس کی صورت کو مسخ کر دیا تھا۔ قاتل پشور ونگ تھے جو اپنا کام صحیح طریقے سے کرنا جانتے تھے۔ اس کے جسم پر نظر آنے والے زخم اس کی گواہی دیتے تھے کہ اسے عام لوگوں نے انہوں سے کمزور اور لا اقل سے نہیں مارا تھا۔ اس پر ڈنڈے مارے اور زنجیریں ماری گئی تھیں۔

پہلا قاتل ہونے کے بعد جب قاتل کی خدمات حاصل کرنے والوں نے دیکھا ہو گا کہ میں صاف فٹ کیا ہوں اور گولی کا نشانہ تیور جانے تو انہوں نے اسے ناکامی پر سزائے موت دینے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ پہلے دو چار افراد نے اسے مارنا شروع کیا ہو گا۔ پھر ہلک بھی اس کا زخم نہیں شریک ہو گئی ہوگی۔ جہم کو، سہرا میں جلا کر اور پھر ان کے تحریری جذبات کو ہوا نہایت آسان ہوتا ہے۔ شمس میں اندھے ہو جانے والے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ مارنے والوں میں کتنے ہاتھ ان کے ہیں اور کتنے پشور و قاتلوں کے ہاتھ ان کا کام دکھاتے ہی غائب ہو گئے ہوں گے۔

میر صورت حال کی سختی کا اندازہ ہوتے ہی جو شیعہ لوگ اور

چشم دید گواہ بھی ایسے غائب ہوئے ہوں گے کہ ان کے لیے گھر سے کے سر سے بیگ غائب ہونے کی مثال ناکافی تھی۔ اب جانے واردات پر کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا۔ میں نے سب سے پوچھا۔ ایک دو قتل و پینڈر، سافرا پارٹی کارکن اور ایف اے ایف کے جوان۔ پولیس میں۔ ان سب کے پاس وہاں اپنی غیر موجودگی کا کوئی نہ کوئی عذر تھا۔

میں تو جناب عالی ادھر آیا ہی نہیں۔ میں دو سرے پلیٹ فارم پر تھا۔ میں تو ابھی آیا ہوں ہی اسٹیشن پر۔ میں بس دور تھا اس جگہ سے۔ میں اندر تھا جی، گت گلکڑ آفس شپ میری ڈپٹی یہاں نہیں تھی۔ میں سوہا عاشر بن کے آٹھا۔ پارٹی والے بہت ہڑ کر رہے تھے مجھے کچھ معلوم نہیں۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لمو تلاش کوں تمام شمر نے چنے ہوئے ہیں دستاں سازش تیور کے خلاف نہیں میرے خلاف تھی مگر نشانہ وہ بن گیا۔ مجھے اس کا سخت مددہ تھا۔ وہ مر سیدہ توی تھا۔ بلڈ پریشر اور عارضہ قلب میں مبتلا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اس کی زندگی کے لیے میں نے صدقہ دل کے ساتھ دعا کی۔

تیور وہ شخص تھا جس نے ایک دن اچانک میرا راستہ روک کے کہا تھا کہ سہرا سر عظیم، تنج کے بعد تم شاہ عالم ہو اور یہ چو افس کا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے اپنی بد قسمتی سمجھو یا خوش قسمتی کہ جب تمہاری اور اس کی صورت میں اس درجہ مشابہت ہوئی تو پھر یہ تمہارا مقصود ہوا اور اب تم مجبور ہو کہ شاہ عالم بن کے اس راستے پر چلو جس کی نشاندہی میں کرتا ہوں۔ تم انکار نہیں کر سکتے کیونکہ۔ پھر اس نے میرے لیے ایک سو ایک وجوہات پیدا کر دی تھیں۔

میں نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ میں اس کے خط کشیدہ راستے پر چل پڑا۔ اس لیے کہ وہ سرائے کوئی راستہ نہیں تھا مگر چلتے چلتے میں نے یوں کیا کہ مجبوری کی ڈھچکے دوئوں برے الگ کر دیے۔ ایک وہ جس نے مجھے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ سرائے تیور نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے زنجیر اپنے ہاتھوں میں تمام کی اور دو سرے سرے سے تیور کو ہاتھ کے اسے مجبور کر دیا کہ اب وہ میرے پیچھے چلے ہم اسی راستے پر آگے پیچھے کے بجائے پیچھے آگے ہو کے چلنے لگے تھے۔ تیور نے اس مجبوری کو بھی اسی طرح تسلیم کر لیا تھا۔ جیسے اس نے اپنی زندگی کے لیے دو سروں کے فیصلوں کو کسی مزاحمت کے بغیر قبول کر لیا تھا۔ یہ فیصلے پہلے ایک شاہ عالم کرتا تھا، پھر دو سر شاہ عالم کہنے لگا تو اس نے اعتراض نہیں کیا اور سر تسلیم خم کر دیا۔ اس نے کہا نہیں سر۔ وہیں سر کھٹے کا ٹوکرا تھا۔ اسے وہ انا کا مسئلہ نہیں بنا تھا اور اپنی ہار نہیں سمجھتا تھا۔ یہ منافع کے ساتھ جینے کا محفوظ راستہ تھا۔ اگر تیسرا اور پھر چہ شاہ عالم اس کی زندگی کی

کان اپنے ہاتھ میں لے لیتا تب بھی وہ کتا لیس سر۔
ایک انٹیکسٹ میری تفتیش کے طریقے سے خاصا ناخوش نظر آتا تھا۔ جب میں نے اس کے ایک مانت سے سوال کیا تو وہ برداشت نہ کر سکا "آپ یہ کام ہم پر چھوڑ دیں سہی۔"

میں اس پر ہنس رہا تھا "سب کام تم پر ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیا نتیجہ نکلا اس کا۔ تم یہاں سیکورٹی ڈیوٹی پر تھے یا ٹریننگ کنٹرول کرنے آئے تھے؟ کیا سیکورٹی فراہم کی تھی؟ کسے بچایا؟ صرف انہیں؟ قاتل کے قاتلوں کو؟ کیا کام کرتے ہو تم لوگ؟"

اشرف علی نے مجھے سمجھ لیا "سر۔ کوئی فائدہ نہیں ان کے منہ لگنے کا۔ آپ اب پلیس یہاں سے ہلیز"۔

میں اس کے ساتھ چل پڑا "شرف۔ کیا میری وائف اور سیکورٹی گھر پہنچ گئی ہیں؟"

اس نے فیر لاک کے فون مجھے تھمادیا "آپ بات کر لیں۔"

تھمکی پانچ بج رہی تھی۔ فون اٹھایا "ہیلو۔"

میں نے کہا "رفش۔ آج اس کے سب خیریت ہے!"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ مگر تم غالباً یہ سوال مجھ سے نہیں؟" جس خان سے کرنا چاہتے تھے۔ لوہات کو اس سے تاکہ اس کے دل کو بھی قرار آجائے۔

دوسرے لمحے چندا نے کہا "تم ٹھیک ہو نا!"

میں نے کہا "بس خان۔ کرسی صاحب کے پہنچنے تک جہیں صورت حال کو خودی سنبھالنا ہو گا۔"

"معلوم نہیں انہیں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے سے یہاں موجود ہوں گے یا ان کا فون آجائے گا۔"

"آجائے گا۔ ان کے اپنے مسائل ہیں۔"

"آپ کب تک آئیں گے سر؟ وہ بولی۔"

میں نے کہا "ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہاں اس حملہ آور کو مار دیا گیا جس نے تیور پر گولی چلائی تھی۔"

"مار دیا گیا کیسے؟"

میں نے اشرف علی کی بات برداری "جیسے لیاقت علی خان کے قاتل کو مار دیا گیا تھا۔ مارنے والا ایک پولیس افسر تھا۔ بعد میں اسے ترقی دے دی گئی تھی۔ میں اب پائلٹی سیکورٹیٹ چاہ رہا ہوں۔ وہاں بارہ بجے پولیس بریکنگ ہے۔ ابھی تو اخبار والوں کو موقع نہیں ملا۔ انہیں پولیس نے دور ہٹا دیا تھا۔ وہ باہر انتظار کر رہے ہیں میرا پریشان مت ہونا۔"

"پریشانی کیسی سر۔ پریشان ہوں ہمارے دشمن۔"

"آئیں" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں باہر نکل چکا تھا جب کسی نے آواز دے کے مجھے متوجہ کیا۔ اس آواز کو میں پہچانتا تھا۔

میرا خون خشک ہو گیا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پلٹ کے دوڑا۔

☆

میرا خون خشک ہو گیا تھا مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے لپٹ کے دیکھا تو شاید سگ سر سے تراشے ہوئے جینے کی طرح کھٹی تھی۔ دہشت اس کے ایک شانے سے دھلک کر چلے اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا تھا۔

"شادی۔ مجھے نہیں معلوم مجھ سے کیا غلطی ہو گئی۔ مگر مجھے معاف کر دو ورنہ۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ورنہ۔ ورنہ کیا؟" وہ پلک جھپکاتے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

"میں مر جائی گا۔" پتا نہیں کیسے یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے۔

"جھوٹ بولا ہے تو؟" اس نے پلک جھپکاتے دیکھے ہوئے لہجے میں کہا "یہاں تو کیا ہو گیا۔ تو مر گیا ہو نا۔ دو دنوں میں۔ کیا یہ دو دن بعد چھپا ہن کے مجھے اپنی شان دکھانے کا ریس تھا یا یہ شہزادہ۔ میرا شرع ادا کرے۔"

میں نے پھر اس کی طرف قدم بڑھایا "میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مجبور تھا۔"

مجھے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی "ابھی سے تیرا راستہ مجبوریاں دے کر لگی ہیں۔"

میں نے اس کے قدموں میں پھولوں کے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے سرسراہٹے ریشم کے گلاب دوپٹے کو اٹھایا اور اس کے شانے پر ڈال دیا۔ گردہ پھر پھل کے اس کے بازو پر ٹک گیا۔ "میں بالکل ٹھیک نہیں تھا۔۔۔ اگر تو مجھے نہ بچاتی تو وہ مار ڈالتے مجھے؟ مجھے کیا معلوم۔ کتنا مارا انہوں نے مجھے۔ چنانچہ مجھے سیدھا کھڑا ہونا پڑا تھا۔ ہڈیاں سوج گئی تھیں میری۔ منہ سے خون آتا تھا فہرہ پشاپ سے۔ آم۔"

میری آواز میں رقت آگئی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا "کیا ہوا؟ کھڑا کیوں ہے؟" میں نے کہا "آؤ۔ یہاں ہاتھ مت رکھ۔ درد ہوتا ہے۔"

میری جذباتی اداکاری نے اسے زلزلہ دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی مگر میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنے آپ سے کہا "ایک ٹک نہ کرنا تو کیا کرتا۔۔۔ وہ شرافت سے بات سننے پر راضی نہیں تھی۔"

"بڑے ظالم ہوتے ہیں پولیس والے۔ مجھے دکھا کہاں چٹ آئی ہے؟" اس نے دوپٹے کے کونے سے آسپو پچھ ڈالے۔

"چھوڑو شادی۔ کیا کرو گی دیکھ کے۔"

"میں دو لادوں گی۔ ماش اور سکاٹی کروں گی۔" وہ ہلکا "ابھی ٹھیک ہو جائے گا تو سارے درد ختم ہو جائے گا۔"

میں کتنا چاہتا تھا کہ درد تو ڈاکٹر صاحب کی دوا سے کم ہو گیا۔ اور ختم بھی ہو جائے گا مگر نہ جانے کیوں میں نے فی شرٹ اٹا دیا۔

میری کمر تھک کے ڈھم بھر گئے تھے اور نشانات دم دم پڑ جانے کے باوجود نظر آتے تھے۔ اس نے ایک انگلی سے میرے بازو اور پھر میرے شانوں کو چھوا۔ پھر گھوم کے پیچھے میری کمر کو دیکھنے لگی۔ اس کی انگلی میری کمر پر ایسے سرسراہٹے لگی جیسے کسی پندے کا پر۔ وہ پوچھتی رہی "یہاں۔ ایسے درد ہوتا ہے۔ دکھا ہے؟" اور میں آہستہ آہستہ سی سی کی آوازیں نکالتا رہا اور کراہتا رہا۔ میرے لیوں پر لذت و لذت کا دلدار مسکراہٹ تھی اور میری آنکھیں سرشاری سے بند ہوئے لگی تھیں۔ یہ بڑا عجیب احساس تھا جس کا نشہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔

"پہلی قریب جاسوئے بہ۔ سیدھا نہیں اٹا۔" اس نے مجھے بازو پکڑ کے کھمارا۔ اس کے نرم ہاتھوں کے لمس سے میرے بازو میں گود گدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ بہت چھوٹے اور بہت نازک ہیں۔ وہ میرے بازوؤں کی گولائی کو گرفت میں نہیں لے سکتے۔

اس نے کسی الماری میں سے کوئی شیشی نکالی۔ اس میں سے کوئی دو انچ ایک پتیلی پر اڑھیلی اور اس کی ایک پتلی سی دھار میری ریزہ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ کرائی گئی۔ میرے جسم میں لٹک لٹک اترنے لگی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں اور گلاب جیسے نرم ہاتھ میری پشت پر رکھے اور اوپر سے نیچے تک میری ہڈیوں کو لٹکے لگی۔ نرمی سے اور محبت سے۔ سکون اور سرور کے ساتھ میرے وجود کا سارا درد سوچنے کے ایک ریشمی لمس میں سمٹ گیا لیکن پھر مجھے کسیں اندر سے وہ چٹنی چھوٹی محسوس ہوئی جو خوابیدہ آتش فشاں کی گھرائی میں کوٹ لینے والے لاوے کی آتش سیال کی طرح تھی۔ میرا چوتھے کانچے کا اور میرے اعصاب میں بے چینی آگئی۔

میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور میں نے اپنی شرٹ جس لی جس شاد۔ میں ٹھیک ہو گیا۔ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی "اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گیا؟"

"جس ہو گیا۔ تم نے کرایا" میں نے کہا "مجھے پاس لگی ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ دیکھے "فرخ میں سے پی لے بول۔ میں یہ ہاتھ دھو لوں ذرا" اس نے چہرے کے سامنے آجائے والے بالوں کو سر جھٹک کے پیچھے کیا اور مسکرائی۔ رنگ بھرے بادل جیسا دہشتہ آواز اور پھر لڑکے قریب پر کھڑکی۔

میں نے فرخ میں سے بوش نکالی۔ دانوں سے اس کا ذہن کھولا اور اسے منہ سے لگایا۔ سنسنائی گیس کے ساتھ سیدھ آپ کا ترش لیوں جیسا لٹکا زانہ میرے خشک حلق سے آڑا تو میں نے خود کو پھر سکون محسوس کیا اور پوری بوش ایک سانس میں خالی کر کے فرخ کے اوپر رکھ دی۔

شاد نے ہاتھ دم سے لٹکے ہوئے دیکھا "کیا ہو گیا ہے تجھے۔"

اتنی ہی پاس۔ لٹکا ہر سوں کا پیرا سا ہے۔

میں نے ایک گرمی سانس لی "ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

شادی تم نے کیوں کیا یہ سب میرے لیے؟

تو نے اس سے بھی یہ کہا تھا۔ وہ جو اخبار والی ہے۔ اس کے لیے میں مجھے کھڑا کھڑے زیادہ پابندی کی محسوس ہوگی۔

"ہاں۔ کہاں تو تھا۔"

"کیوں کہا تھا۔ کیا گنتی ہے وہ تیری؟ ابھی گنتی ہے وہ تجھے؟"

میں بھونچکا رہ گیا "شادی۔ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ وہ کچھ نہیں گنتی میری اور ابھی گنتے کا کیا سوال۔ تم سے اچھا کون ہے میرے لیے۔"

"میں ابھی گنتی ہوں تجھے۔؟" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے کھڑی ہو گئی۔

"ہاں۔ بہت ابھی گنتی ہو تم۔ اتنی ابھی کس۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالکل نہیں رہ سکتا" میں نے اس کا ہاتھ قلم لیا۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا "سچ کہتا ہے؟"

"آزما کے دیکھ لو۔" میں نے کہا "میں پیار کرنے لگا ہوں تم سے۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" میں نے ایک سانس میں کہا۔

وہ اُس بڑی "تو بالکل تو نہیں ہو گیا ہے۔"

"ہاں میں بالکل ہو گیا ہوں۔ تمہارے لیے اور تم نے مجھے ٹھیکرا تو میں سر جھپکوں گا شاد۔"

"آؤ ایکلک مت مار۔ یہ تمہیں دیکھنے کا نتیجہ ہے۔" وہ میرے سامنے بیٹھ کے بولی۔ اب اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر شوق کی مسکراہٹ تھی "تو مجھ سے کیسے شادی کر سکتا ہے۔ ابھی تیری عمر یہ کیا ہے اور پتا ہے میں کتنی بڑی ہوں تجھ سے؟"

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اسے اپنی بانوں میں بھر کے جکڑ لیا۔ وہ بڑی طرح کسمپاسی۔ عقاب کے بچوں میں گرفتار چڑیا کی طرح پھر پھرانی "پاکل۔ چھوڑ مجھے میرا سانس رک رہا ہے۔"

میں نے کہا "تو بہت بڑی ہے نا۔ اور میں بچہ ہوں۔ اب چھڑالے خود کو تو میں ڈالوں۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ میرا دم نکل جائے گا کیسے۔ بالکل ہو گیا ہے۔ چھوڑ مجھے! چھڑا با تو بڑا میں چھوٹی۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہنسنے لگا کہ ہانپنے لگی اور مجھے شعلہ بار نظروں سے دیکھتی رہی۔

"آئی ایم سوری شاد۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔"

"اس کے علاوہ کچھ بھی کچھ کر سکتا ہے تو میرے لیے؟" وہ بولی۔

"سب کچھ کر سکتا ہوں تم بتاؤ۔"

اس نے پریشان بال سمیٹے۔ وہ نہ فرش سے اٹھایا اور سیدھی ہو کے بیٹھ گئی "بتاتی ہوں" آرام سے بیٹھ جا پہلے۔

میں صوفے پر بیٹھ کے صورت نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”خوبی اچھا لگتا ہے مجھے۔“ وہ بولی حکومتِ ذہن ہے۔ برادر
 ہے اور بڑا ہے۔ بہت حوصلہ مند ہے اور تیرے ارادے بہت بلند
 ہیں۔ بڑی خوبیاں ہیں تجھ میں ناصر۔ تیرے دوست نے بہت کچھ
 بتایا تھا تیرے بارے میں۔ اور پھر میں نے بھی دیکھ لیا۔ صورت بھی
 بُری نہیں تھی۔ اور اب مجھے کپڑے پہن کے توجہ کا بیہودہ لگتا ہے۔
 میں مانتی ہوں۔ تم کہ۔“

محبت ہے تجھے مجھ سے۔ یہ تجھے ثابت کرنا ہوگا۔ صرف باتوں سے
 نہیں۔ اپنے عمل سے میں دیکھوں گی کہ تو کیا کر سکتا ہے میرے
 لیے۔ کس حد تک قربانی دے سکتا ہے؟“

”اگر میں نے یہ ثابت کر دیا تو تم شادی کر لو گی مجھ سے؟“

وہ ہنس پڑی۔ ”شادی بھی کروں گی۔ پہلے اس قابل تو ہو جا۔
 اس کے لیے انتظار کرنا۔ کچھ عرصہ تو فکّر کرنا۔“

وہ مسکرائی، "تو متفکری سمجھتا ہے تو متفکری ہی سہی۔"
 "چار سال بعد تم شادی کر لو گی مجھ سے؟"
 "نہیں ہے وقوف اور پاکل کی کون ہو گی؟" وہ بڑی
 مجھے ایک شاہک لگا "کیا.....؟"

”میری قسم کھا کے وعدہ کر۔“
 ”میں تمہاری قسم کھاتا ہوں شادو۔“
 ”پھر آجا میرے ساتھ۔“

شاہو کا سبک اٹھیں والا کلا سا زردی مائل سانولا اور گنرور سا ہاتھ پورے بازو کی دلداز لبائی کے ساتھ میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اس کا بدن شباب کے گلستان میں خبرباد کی طرح تھا جس کی یہ لچک دار اور نازک شاخ مجھ تک پہنچ رہی تھی اور اس میں وہ بھدڑی اور بد صورت انگرہی آرزو کی صبح کے پہلے پھول کی طرح مسکرا رہی تھی۔

”کیسا کیا ہے؟“ آتارے اپنی انگوٹھی۔ ”اس کی تو از میں نہ خضہ تھا اور نہ تھی۔ بس ایک انجانی سی باپسی کا لال تھا“ غلطی یہی تھی کہ میں نے سمجھا تو موہے دیکھنے میں تو موی ہے۔ لیکن توچہ ہے اسی۔“

میں نے اسے اپنے قریب کیا تو وہ میرے پیچھے سر رکھ کے روئے گئی۔ اس کے آنسو میری قمیص کو گیلیا کر لے گئے۔

”شادی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نکالوں گا جسیں یہاں سے۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ تم یہ کام پہنچو۔۔۔ کیوں کرتی ہو تم یہ سب کچھ آخر کیا ضرورت ہے تمہیں۔“

”ضرورت نہیں، مجبوری ہے میری“ وہ سسکی لے کر بولی۔

”کیا مجبوری ہے کہ وہ اپنے باپ سے تم ہٹیکے گا، تاکہ تمہیں چاہئیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں نہیں کہہ سکتی۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”کیا وہ پاگل ہے؟ وہ ہمیں اتنے عیش و آرام کے ساتھ رکھتا ہے۔ بالکل شہزادوں کی طرح۔ اور ہمیں بیکہ مانگتے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ کتنا کما کے دینی ہو آخر تم اسے؟“ میں نے برہمی سے کہا۔

”مسئلہ ہے اس کی جانچنی کا۔ اس کے کاویار کو سمجھانے اور چلانے کا۔ اس کا کوئی بیٹا ہو تو یہی اس کا وارث بننا لیکن میری ہمتی کہ میرے سوا اور کوئی نہیں جو اس دھندے کو چلا سکے۔“

”لا حول ولاقوت۔ یہ بھی کوئی دھندا ہے۔ اتنا ضروری ہے اس کاویار کو چلانا“ میں نے کہا۔

میں نے افسوس سے سہلایا۔ ”تاکہ کماے کے بعد بھی نہیں چھوڑ سکے۔“

”کمانی جتنی بھی ہو، کم ہوتی ہے۔“ اس نے کسی غلطی کی طرح کہا۔

”مکرم شاعری۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ صبح سے شام تک بھیک مانگنا اور بھیک مانگنے والوں کی کھالوں میں سے حصہ پانا۔ بد معاشی اور دوا گیری۔“

ماغی پھر رہی ہے، صبح سے شام تک۔

کہ کون کیا کر رہا ہے۔ ہمیں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ سب
 کو رو یا ر ٹھیک جا رہا ہے۔ کوئی گزیر ہوا تو سب اس فون پر اپنے باپ
 کو مطلع کرتی ہیں۔ وہ آکے سب سنبھال لیتا ہے۔ وہ خود بھی سارا
 دن بیکر کرتا ہے۔ پچیس سے بھی رابطہ رکھتا ہے اور یہ محاشوں سے
 اپنے کامیابی کی عمرانی تو سب کرتے ہیں۔ جن کے کارخانے
 اور فیکٹریاں ہوں وہ بھی۔“

یہ جو بڑے بڑے سیٹھ ہیں، لاکھوں کی گاڑیوں میں کھنسنے والے اور کروڑوں کے محل میں رہنے والے یہ بھی ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ قرضوں کے لیے رمنٹ اور لائنسز کے لیے اور

ہوئے ہیں اور وہ کس سے انکس رہے ہیں؟ کشتاوالے سے لے کر
 کے مالک تک۔ استغلاور ڈاکو تک سب سے۔ کیا ان کی
 عنوان بنیاں نہیں ہوتیں۔ انہیں غیرت نہیں آتی جو عورتوں کی
 لالہ کرتے ہیں۔ انکس لاتے ہیں انہیں۔ طوائفوں کو۔

”تاگل“ ہے وقوف میں اسی دنیا میں رہتی ہوں۔ سارا دن جس دنیا کو دیکھتی ہوں اس دنیا کی سب باتیں سنتی ہوں۔ مگر کے اندر بند رہنے والی لڑکی بھی آج کل سب جانتی ہے۔“

اس کے بعد کیا کرے گا؟ شادی کرے گا تھوڑی۔
 "نہیں۔ میں تا نہیں سکتی تا مگر کہ کیا کر سکتا ہے اور مجھے
 اندازہ بھی کر سکتا ہے" اپنا جی بھی۔ ابھی وہ غلیظہ ہے "اسے بعد مجھے
 غلیظہ دیکھنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ امید بڑی نہ ہوئی تو وہ میری حیرت
 ناک سزا دے گا۔ تو نہیں جانتا اسے کیا تجھ میں اتنی حسرت ہے؟
 اس سے بچا سکتا ہے تو مجھے؟"

”کریا مکمل کیا۔ تو تیرا انجام کیا ہو گا؟“ یہ بھی سوچ لے۔
 ”سب سوچ لیا ہے میں نے۔ ہم موقع ملتے ہی یہاں سے نکل
 جائیں گے اور پھر چار سال بعد شادی کریں گے“ میں نے کسی
 جوان مرد کی طرح یقین اور احمق کے ساتھ کہا۔
 ”لیکن تو بابا تھا، مجھے چھوڑ گئے۔“

نہ سکرائی "پھر قلمی ڈائیلاگ۔ مجھے ساتھ لے جانا ہے تو میرے
میرے ساتھ رہنے کے لیے آجا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا ۱۳ ویسے میں ناصر پہلے میں دیکھ
لوں کہ تو واقعی چاہتا ہے مجھے کتنا چاہتا ہے کیا کر سکتا ہے میرے
لیے تو اسے اپنی آزمائش سمجھ لے اگر تو میرے لیے مشکل
خفا کے قیصر بننے کا حوصلہ میں رکھتا تو میری کیسے مان لوں کہ تو دنیا
کو چھوڑ سکتا ہے اور جان دے سکتا ہے میرے لیے۔ تو میرے
پاس رہے گا تو میں دیکھ لوں گی کہ تو کتنا مستقل مزاج ہے۔ کتنا
مخلص ہے۔ قابل ہے۔ میں بہت کچھ ماناں گی تجھے اور ہم دونوں مل
کے سب ملے کریں گے۔ کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے اور کب
سوج سمجھ کے قدم اٹھاؤ تاہم ارے جا نہیں گئے ناصر۔ میں ناکامی
نہیں چاہتی۔ میں تجھے کوئی نا بھی نہیں چاہتی۔ واپس آنا بھی نہیں

کا ہوا، مزاحیہ نہیں جانتی۔

اس وقت تک شادی کے قرب نے مجھے مدوش اور مسرور کر دیا تھا۔ میری سب مزاحمت اور سوچنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ میرے لیے زندگی کا مقصد اور خواہشات کا معاملہ۔ میری سوچ کا مرکز اور خدایوں کی تعبیر صرف ایک لڑکی ہو گئی تھی۔ جس کے چہرہ شادابی کی روشنی پیش اور مسکاتی نری میرے وجود میں ایسے خصلت ہو رہی تھی جیسے تامل سے نکلی کار کی بنیاد میں بھرتی جاتی ہے۔

ہم مرکزی دروازے کے سامنے والے پورچ کی ایک دیوار کے پیچھے تھے۔ باہر سے کوئی آواز ہم اسے دیکھ سکتے تھے مگر تاریکی میں ہمارا سایہ بھی کسی کو حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شادی کی شروعات مجھے وقتی طور پر کچھ پریشان کیا تھا مگر اس نے آواز کی بات کی تو مجھے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔

”ٹھیک ہے شادی۔ تم دیکھ لو گی کہ تمہارے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔“

اس نے خوش ہو کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ”جہاں بھر رہی مت کہ میں نے کہا شادی۔ ایک دن کی صحت دو گئے۔“

”نہیں نامر۔ آج اور ابھی ورنہ بھی نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تو کھر جاکے رات بسر سوچے گا۔ سوچ چاہیے پڑ گیا تو تیری عقل کے کی کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ میرے یہ جذبات نہیں رہیں گے۔ صبح تک میرے خیالات بدل جائیں گے اور تو سوچے گا کہ ایک معمولی بیک مانگنے والی لڑکی کے لیے اپنی زندگی کا مقصد اور راستہ بدل دینا پائل ہیں۔ لیکن بیک مانگنے والی ہو یا کوئی بھی رہنے والی۔ ہر لڑکی صرف لڑکی ہوتی ہے نامر۔“

میں نے کہا ”شادی۔ مجھے غلامت سمجھو۔ میں نے فیصلہ کر لیا تو کر لیا۔ ایک دن کی صحت میں اس لیے مانگ رہا ہوں کہ مجھے اپنے کچھ معاملات طے کرنے ہیں۔ مجھے ان سے اجازت بھی لینی چاہیے جن کے ساتھ میں رہتا ہوں۔ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ یہ گاڑی بھی تو ان کی ہے۔“

”اور اگر انہوں نے پوچھا کہ تم کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”میں کروڑوں گاؤں کی مانتہ۔“

”پھر بھی اجازت نہ دی انہوں نے پھر؟“ وہ شکر ہو گئی تھی۔

”میں ان کی اجازت کا محتاج نہیں ہوں شادی۔ مجھے ان کو اطلاع دینی ہے کہ میں جا رہا ہوں۔“

”میرے بارے میں کچھ مت بتانا انہیں۔“ وہ بولی ”اس کا چہرہ مدہنی میں ہوتا تو شاید مجھے اس کے گالوں پر حیا کی لالی بھی نظر آجاتی۔“

میں نے شرارت سے کہا ”میں تو ناؤں۔ اس میں کون سی شرم کی یاد رکھ بات ہے میرے لیے۔“

”میرے لیے تو ہے نا“ وہ بولی ”تجھے میری شرم“

”چھو! نہیں بتاؤں گا“ میں نے کہا ”میں کوئی ایسا جھوٹا بول رہا ہوں کہ بھر کوئی کچھ نہ بول سکے۔ ٹھیک“ اس کے بعد میں اچانک سلمان اٹھاؤں گا۔“

”سلمان کیا۔ یہاں کسی سلمان کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ میں مل جائے گا تجھے۔“ وہ بولی ”پہننے کے لیے کپڑے“ اس کے لیے جگہ اور بستر۔“

”کیا مطلب۔ میری ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ جو“ کپڑے ہیں اور میری کتابیں ہیں۔ میرا جوتہ ہے ڈاکٹر صاحب کے اکاؤنٹ میں۔“

”کتابیں ہے؟“

”ہو گا میرے دلا لاکھ کے قریب“ میں نے کہا۔

”پہلے دلا لاکھ اتنا زیادتی کر رہا ہے۔“

میں نے فوراً آہستہ سکر ایٹ کے ساتھ کہا ”شادی۔ کیا تمہاری قسم کھاؤں پھر اعتبار آئے گا تمہیں۔“

وہ ہکا بکا کھڑی مجھے دیکھتی رہی ”کمال سے آتا آتا پھر چھوے پاس؟“

”یہ ابھی کیسے بتاؤں بڑی لمبی بات ہے۔“

”مگر وہ پھر چیک میں ہے تو چار روپے دے چیک میں۔ کیا وہ دس ہزار کافی نہیں۔ اور پھر تو ہاتھ کا میل ہے یہاں۔ دوڑ آئے گا۔ زیادہ کی ضرورت ہی نہیں اور ضرورت پڑے تو مجھے بتا دینا۔ جتنا میرے پاس ہے“ اس سے دکان میرے پاس بھی ہے۔“

”یعنی ساڑھے تین لاکھ۔“

”چار لاکھ دس ہزار۔“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”کمال ہے۔ تم بھر بھی ڈرتی ہو“ اس کے باوجود بیک مانگتی ہو۔“

”بائل“ ہے وقف، سستی بار سمجھاؤں کہ بیک میں پیسے کمانے کے لیے نہیں مانگتی۔“

میں نے کہا ”بائل“ تم کہہ سکتی ہو مجھے کیونکہ تم نے ہی بائل کیا ہے لیکن یہ وقف نہیں ہوں میں۔“

”پھر بے وقوفی کی بات کیوں کرتا ہے۔ کیا چار لاکھ دو روپے کسی چیک میں پڑے ہوں“ میری جیسی کسی لڑکی کا سارا بن سکتے ہیں؟ ساری زندگی کے لیے اور حفاظت کر سکتے ہیں میری دنیا میں ہر قدم پر بھوکے بھجڑوں جیسے انسان ہوتے ہیں۔ میں کسی کو حفاظت رکھ لوں۔ تو کیا کارکنی ہے کہ وہی لیرا اجابت نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا ”پلو ابھی میں اپنا چہرہ نہیں نکلتا مگر بعد میں تمہارا اور میرا پھر ایک ہی جگہ رہنا چاہیے۔“

”وہ جگہ رکھنے میں کون سا نقصان ہے ہمارا۔ میں اپنی چیک بک کے ہر چیک پر اپنے دستخط کر کے تجھے دے دیتی ہوں۔“ وہ

نہی۔

میں نے کہا ”مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟ مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

”یہ بات نہیں۔ دراصل ابھی احمد سال کا نہیں ہوا میں۔ میرا اپنا اکاؤنٹ ضرور ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی گمرانی میں ہے۔ مجھے رقم نکالنی پڑے تو ان سے دھکا کرائے پڑتے ہیں۔ اسی لیے کہ ہاتھ کا سب تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے تو اچھا ہے۔

وہ بات تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ ابھی کمال ضرورت ہو گی مجھے اتنے پیسے کی۔ اچھا ہے اسی زمانے ڈاکٹر صاحب سے قرض رہے گا میں نے کہا۔“

”میں اس قرض کو اپنی رکھنا چاہتا ہے تو“ وہ توجہ بدل کے بولی

”اگر ایک لاکھ مانگتی رہے۔ کیا گتے ہیں آخر وہ میرے؟“

”کچھ۔ کچھ نہیں۔“ مگر وہ حسن ہیں میرے۔ انہوں نے مجھے اپنے کمر میں رکھا اور میرا مت خیال رکھا۔ قرض کسی سے بھی ہو کسی وجہ کے بغیر ختم کرنا کون سی ابھی بات ہے۔“

”نہیں“ اس تو اپنی ساری رقم لاکھ میرے خزانے کو دے دیں رکھوں گی اپنے اکاؤنٹ میں۔“ اس نے مجھے حکم دیا۔

”ٹھیک ہے شادی۔ اور کیا حکم ہے میرے لیے؟“

”حکم کوئی نہیں۔ کل سے تو یہاں رہے گا۔ ان سب کی طرح جو یہاں رہتے ہیں۔ مگر تو کسی پر اپنے اور میرے۔ قرض کو ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے یہ میں وقت آنے پر بتاؤں گی۔“

میں نے ابھی سے کہا ”حکم تو مجھے اپنے پاس بلا کے دور کر رہی ہو۔“

”بائل“ ہے وقف۔ میں بھاری ہوں اپنے پاس تاکہ جب وقت ملے میں تجھے مل سکوں۔ مجھے تیرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ تجھے کسی کے در پہ بٹکانا نہ پڑے، ہم خاموشی سے اپنی تیار کریں اور سورج نکلنے سے گل جائیں گے۔ اگر کسی کے کان میں بیک پڑتی تو ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ کسی کو ذرا بھی شک ہو تو میری اور تیری شامت آجائے گی۔ شادی کے کان بھی مت چھوڑیں اور اس کی آنکھیں اندر تک دیکھ لیتی ہیں۔ اس کے خیر اور خیر بھی مت ہیں جو میرا تو کچھ نہیں پکاؤں گے مگر میرے دشمن ہو جائیں گے تو یہنا بھال کر دیں گے۔ تو سب کے درمیان رہے گا۔ انہی جیسا میں کے تیری زبان پر غلطی سے بھی میرا نام نہیں آتا چاہیے۔ نہ تو کسی مجھے ایسے دیکھے گا۔ جیسے اس وقت دیکھ رہا ہے۔“ وہ اس پڑی ”ب“ تو جا۔ مگر کل کی وقت آئے گا میں؟“

میں نے کہا ”یہ وقت۔“

”جو جس ڈاکٹر کے کمر میں رہتا ہے کیا نام ہے اس کا؟“

میں نے کہا ”ڈاکٹر مشہور اعظم۔“

”مشہور کالی ہے۔“ وہ بولی ”میں توں نہیں کیا ہے ان کا؟“

میں نے کہا ”خدا کے لیے مجھے وہاں فون مت کرنا۔“

”فون نہرہتا مجھے ۳۳ نے کہا۔“

میں نے اسے فون نہرہتا ”میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا۔“

”میں کل رات تک انتظار کروں گی حیرا۔ پرسوں میں خود تجھے اپنے آجائوں گی۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا ”شادی۔ خدا کے لیے وہاں مت آنا۔“

وہ بھی ۳۳ چھا نہیں آؤں گی۔ چوہن کھنے کی گارنٹی۔ اس کے بعد میں چھ اٹھاؤں گی۔“

”میرا اٹھاؤں گے دکھاؤں گے اٹھاؤں گی مجھے؟“ میں نے کہا۔

”جیسے پولیس اٹھاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”میں کیا اٹھاؤں گا رانی ہو؟“ میں نے کہا۔

”تھانے دار کیا تجھ ہے؟“ میں بد معاش ہوں۔ آئی بات کچھ میں!

”آئی۔ تم لا سکتی ہو مجھے چار کی زنجیر سے ہاتھ کے مشق کی ہتھکڑی لگا کے مگر کیا ضرورت ہے اتنی زحمت اٹھانے کی۔ ظم خود حاضر ہو جائے گا۔ کچھ دھاکے سے بندھا چلا آئے گا۔ کیا اب اجازت ہے مجھے؟“

وہ سکرال ۳۳ جانتا ہے۔ مگر کچھ نامر۔ یہ مت سمجھاؤں کہ میں کوئی ایسی دیکھی لڑکی ہوں۔ میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے تجھے آؤ بھاری ہوں۔ اپنا اسیوہا کرنے کے لیے اور تجھے پھانسنے کے لیے تجھ پر زور ڈال رہی ہوں۔“

”تمہیں ایسی دیکھی لڑکی کھنے کی غلطی کرنا تو لوٹ کے تمہارے پاس نہ آتا۔ لیکن شادی ایک خیال ضرور آتا ہے دل میں۔ آخر تم نے کیا دیکھا مجھ میں؟“

”میں نے۔ میں نے تیرا حوصلہ اور تیری ذہانت دیکھی۔ تیری مستقل مزاجی کی طاقت تیری محنت اور بے غلطی دیکھی۔ میرے خیالات کی پختگی نے مجھے حائر کیا اور میرے اونچے ارادوں نے حائر کیا۔ میں نے میرے امور کے غلطی اور بے اور رقم دل انسان کو دیکھا جو ایک دوست کی موت پر دھکی تھا اور انصافی کے خلاف اکیلا مقابلے پر آتا تھا۔ اور یہاں سے یہ سب میں نے تجھے دیکھنے سے پہلے دیکھا تھا۔“

”مجھے دیکھنے سے پہلے دیکھے؟“

”تیرا دوست نہیں ہے نا۔ وہ سب بتاتا تھا مجھے۔ اس کے لیے تو کسی جیو سے تم نہیں تھا۔ تیری طرف سے تم نے ی کا تھا کہ اچھا کسی دن اسے لانا میرے پاس۔“

”اور جب تم نے مجھے دیکھا تو تمہیں کیا لگا؟“

”مجھے ابھی نہیں ہوئی۔ تو واقعی خدی اور سر بھرا تھا۔ ابھی تک میرے دماغ سے نامر کے اقام کا بھوت آتا نہیں ہے۔ میں نے جو بتایا تھا تو اس سے زیادہ ہی تھا۔ ارادے کا پکا کرا

اور غرہ۔

”پھر ہمیں محبت ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔

”محبت۔ نہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ تو اچھا لگا ہے مجھے۔ بہت اچھا لگا ہے۔ تجھے پسند بھی کرتی ہوں میں۔ لیکن جس محبت کی تو بات کر رہا ہے، وہ مدت دور کی بات ہے ابھی۔ تو نے تو کہہ دیا جو کہنا تھا سوچے کچھ بغیر جذبات کی دوش برہ کے۔“

”ایسا مت کہو شادی۔“

”حقیقت یہی ہے صبر۔ محبت کوئی وارث انکے نہیں ہے۔ یہ تو ایسا مرض ہے جیسے ٹی بی۔ آہستہ آہستہ۔ اندری اندر اس کے جراثیم پھیلتے جاتے ہیں۔ جیسے پردے کی چڑیاں فٹن میں پھینکی

ہیں۔ محبت ایسے ہی دل میں جگہ بناتی ہے اور پھر خون کے سرخ اور سفید ذرات میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں رہتا سوائے محبت کے۔ ابھی تو نے محبت کا بیج بویا ہے۔ مبر کے ساتھ اور پوری گلن سے اس کی آبیاری کہ ابھی سے پھل مت مانگ۔ کیا پتا یہ بیج نہ پھلنے یا تو نہ محبت کچھ دبا ہے۔ وہ ہوس ہو۔ صرف ہوس جو حرف آگ ہوئی ہے۔ جلتی ہے، جلاتی ہے اور کچھ جاتی ہے تو دھواں د جاتا ہے یا راکھ رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ نہ وقت دیکھتی ہے نہ مصلحت نہ عریا رنگ دھپ اور نہ امیری غریبی یا نسل اور ذات کا فرق۔ جس دن مجھے تعین آگیا اور تجھے بھی کہ ہمیں واقعی ایک دوسرے سے محبت ہوگئی ہے۔ اس دن کچھ کہنے کی کچھ پوچھنے کی ضرورت کہاں رہے گی۔ ہم ایک ہو چکے ہوں گے۔“

میں احتیاط کی طرح نہ کھانے اور نہ دیکھا دیا۔ ”شادی۔ یہ تو بڑی کٹالی ہاتھ ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مدت پڑے کھسے انسانہ نگار اور شاعر ایسی باتیں لکھتے ہیں۔“

وہ ہنسی ”پاکل“ بے وقوف۔ شاعر یا انسانہ نگار ہونے کے لیے ڈگری کہیں سے نہیں ملتی۔ وہ تو بس خدا انہیں ایسا ہی بنا رہا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بھی ایسی باتیں کتابوں میں پڑھی ہیں۔ کتابوں سے سیکھی ہیں۔ اور انہی کتابوں نے مجھے بولنا سکھایا، سوچنا سکھایا تھا۔ سمجھنا سکھایا تھا۔ میری تربیت نہ میں باپ نے کی نہ کسی اسکول میں ہوئی۔ انہی کتابوں نے مجھے وہ بنا دیا جو میں آج ہوں۔“

”یعنی شادی۔ فقیروں کے ایک خلیفہ شادی کی بنی۔“

”نہیں۔ وہ مجھے نصیب سے ملا۔“

میں نے کہا ”مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا باپ تعلیم کے خلاف تھا۔“

”ہاں۔ میں نے پانچویں تک پرائمری اسکول میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد میں چھپ چھپ کے پڑھتی رہی۔ کتابیں خریدتی رہی اور کوئی امتحان دینے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ ساتویں کے بعد انھوں نے۔ پھر نویں دسویں کی۔ حساب مجھے بس اتنا ہی آتا ہے جتنا پانچویں تک پڑھا تھا۔ ساتویں کا بھی کچھ پتا نہیں مگر انگریزی

اور۔ اسلامیات اور معاشری علوم تاریخ اور شریعت۔ یہ سب کتابیں پڑھنے کے لیے مجھے کسی استاد کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ کیا رہیں اور بارہویں جماعت کی کتابیں میں نے پچھلے سال ختم کر لی تھیں۔“

”کیا رہیں بارہویں کی؟“ میں سخت مرعوب ہو گیا۔

”ہاں۔ انگریزی اور کاکوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شریعت بھی ملتی ہیں بازار میں۔ میں نے تاریخ اسلام پڑھی اور سوکس۔ انڈیا اور پاکستان کی تاریخ مجھے پڑی دلچسپ لگی۔ معاشیات کی کتاب تو لاگتی تھی میں گروہ مجھے شگ اور رور لگی۔ میری کچھ میں ہی نہیں آتی۔ امتحان تو نہیں دے سکتی تھی۔ نہ میٹرک کا اور نہ انٹر کا۔ مگر کچھ

سب پڑھا سکتی ہوں جو میں نے پڑھا ہے۔“

”تم نے۔۔۔ یہ سب کیسے کیا۔ میرا مطلب ہے، شادی سے چھپ کے اسی گھر میں رہے ہوئے؟“

”مجھے شام سے رات تک وقت ملا تھا۔ آپا کو فلک اس وقت ہوتا جب میں امتحان کے لیے فخر کرتی۔ کتابوں کا اسے کیسے پتا چل سکتا تھا۔ وہ بھی میری الماری کی یا میرے سامان کی حفاظت نہیں لیتا۔ بارہویں مجھے وقت مل جاتا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ میں بائل انسانے مدت پڑھنے لگی تھی۔ آپا کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔ اسے کیا پتا کہ میں بائل پڑھ رہی ہوں یا سوکس۔ فٹ پاتھ سے رسالے اور کتابیں سب کرائے پر بھی مل جاتے تھے جو میں پڑھتی تھی اور بارہویں دیکھ کر جیتی تھی۔“

”ہر روز فقیروں کے محلے میں سارا دن بارہ گزارتا۔ چھپ چھپ کے کتابیں پڑھتا۔ فقیروں کی گھرائی کرتا۔ بیک انکٹا۔ یہ سب تم کیسے کرتی ہو شادی۔“

وہ ہنسی ”میں ہر روز کہاں جاتی ہوں۔ ہنسنے میں دوبار نکلتی ہوں۔“

”اور ہمیں ڈر بھی نہیں لگا؟“

”ڈر کس بات کا؟“

”کیا فقیروں میں پچھتے نہیں ہوں گے اور فقیروں کو شریف

لوگ نہیں ہوتے۔ وہ بد فہمی نہیں کرتے؟“

”ان کی کھال کھینچ سکتی ہوں میں خود۔ وہ بولی۔“

”اور بھی مدت لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ کہ فقیروں کے بیٹوں

میں یہ پڑی ہے۔ فرض کرو کوئی اٹھالے فقیروں زہد تھی۔“

”زہد تھی۔ میرے ساتھ۔“ وہ بولی ”بھرا ہوا ریلوور رکھتی

ہوں میں اپنے پاس اور اپنے کہہ دیا ہے کہ کبھی کوئی بد نہیں سے

نہی طرف ہاتھ بڑھائے تو ڈرے یا شور کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسے آرام سے گولی مارنا۔ پانی سب میں منبھال لیا گا۔ تھالے

دالوں کو تیار کیا کہ تو شادی کی بنی ہے۔“

میں نے گہری دیکھ کے کہا ”کیا بات ہے۔ آج تیرا آپا نہیں تھا

ابھی تک؟“

۳۰ سے بھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔ کیا نام ہو گیا؟
 ”دس بجے والے ہیں۔ میں نے کلائی کو روشنی کے سُرُج کے دیکھا۔“
 ”تس آئی ہو گا نہ۔“
 ایک گھنٹے سے تو کھڑا ہوں۔“ میں نے کہا ”آج بہت ڈانٹ پڑے گی ڈاکٹر صاحب۔“
 ”ایسا نہ ہو اب اور دوا سے پری مل جائے۔ وہ آجائے پھر نکل جاتا۔“
 میں نے کہا ”جیسے ڈر نہیں لگتا اکیلے میں۔ اتنا بڑا گھر ہے۔“
 ”ہے تو پتا کھر۔ اور اکیلی میں شام سے رات تک ہوتی ہوں۔ دن میں بہت روشنی رہتی ہے۔“
 ”کیسی روشنی؟“
 ”جب تو آنے کا تو دیکھ لے گا۔“ وہ بولی۔
 ”شادی۔ ایک بات پوچھوں؟ میرے یہاں سامان لے کر آنے میں کیا خرچ ہے۔ اگر سبز میرا اپنا ہو میں دن بھر قہقہوں کے پٹے پڑانے لے آؤں گے۔ کپڑے پن کے پھول مکررات کو پھر اپنے صاف ستھرے کپڑے پن لوں۔ آخر تم بھی تو کسی کڑی ہو؟“
 اس نے سوچ کے کہا ”چھوٹا ٹھیک ہے۔ لے آؤں توڑے مت کپڑے اور بستر۔“
 ”جس ایک سوٹ کپس ہو گا میرے ساتھ۔“
 ”سوٹ کپس۔ نہیں۔ جو لانا ہے ایک ٹھنڈی میں باندھ لانا۔ اور میرے خالے کرتے۔ میں رکھ لوں گی اپنے پاس۔ مگر تجھے موقع کمان لے گا اچھے کپڑے پن کر کپس جانے کا۔ تو سب کی طرح دس بجے کے بعد آنے کا سارا دن کا تھا ہوا۔ پھر حساب دے گا۔“
 ”حساب کسے دوں گا اور کیوں؟“
 ”پاکل“ بے وقوف۔ سارا دن کمانی کرے گا تو کیا جیب میں رکھے گا۔ سب جو کاتے ہیں شادی کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پھر وہ اس میں سے جو بھی دیں دوپٹے نہیں جھٹے ہوتے ہیں۔ ایک پائیس کا وہ سراسامی کا اور تیرا کاکر لائے والے کا۔“
 میں نے کہا ”تو تو ہی نہ دیتی ہے بلکہ بد معاشی ہے۔“
 وہ بولی ”بد معاشی کا وعدہ ہے سب“ ہر جگہ ایسے ہی ہیں۔
 ”ہے۔“
 اسی وقت باہر سے کاری کی تیز روشنی محویم کے اندر آئی۔ میں تھوڑا سا پیچھے کی طرف دیکھ گیا۔ یہ وہی کاریگر تھا جس نے شادی کے ساتھ مجھے یہاں ملائی تھی۔
 ”میں جاتی ہوں اب۔“ وہ سرکشی میں بولی ”شادی اور چلے جائیں تو آرام سے نکل جانا تو کسی“ پھر اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دھالا اور میرے سامنے اپنے ٹپٹے لگی جیسے بہت دیر سے محو خرام ہے۔
 شادی نے کار سے باہر آ کے اسے دیکھا ”شادی جانا۔ کیا بات

۳۱ ہے۔“
 ”تجھے نہیں پتا؟“ وہ مطمئن لہجے میں بولی اور باپ کی طرف بڑھی۔
 ”جس آج دیر ہو گئی تھی۔ راستہ دیکھ رہی تھی تمہارا۔“
 شادی نے مسکرا کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ”دیر تو ہو جاتی ہے۔ جانا۔ تو یہاں مت ہو کہ کمانا کمانا تو لے؟“
 ”نہیں آپ۔ تمہارے ساتھ کمانا کی“ وہ بولی۔
 ”چھوٹا چھوٹا۔ چل پھر پھلے کمانا کمانا۔“ شادی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ گاڑی میں سے ڈرائیور نے دو ہاتھ بائیں ٹھکانے پھر دوڑنے اور پوچھوں کا ایک کرکٹ۔ یہ سب دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے اس نے کار کے پیچھے دو دروازے کو لٹ مار کے بند کیا اور اندر تاقب ہو گیا۔
 میں اپنی کپس گاہ سے نکلی تاکہ چھ سات قہقہوں کا ایک غول اندر آ گیا۔ وہ سب زور زور سے ہنس رہے تھے بائیں کرکٹ تھے اور سرکشی پائی رہے تھے۔ وہ سب مختلف محویم کے قہقہے تھے۔ دس سال سے میں پینتیس سال کے سب سے چھوٹا نظر آنے والا بچہ دیکھ رہے تھے۔ بندے ہوئے ایک تھکے کو کھینچ کر لانا تھا۔ تھوڑے وقت چڑا اور شادی دھماکی فٹ لہا ہو گا۔ اس کے پیچھے لوہے کے دو لڑچھے پٹے لگے ہوئے تھے۔ بہت کے فرش پر ان کی رگوں سے پڑی تو ازبہ ابوری قحی میں پھر چھپے ہو گیا۔
 ”ستارہ“ روز کتا ہوں کر کپس ڈال دو یہوں میں۔“ لڑکے نے پیچھے لپٹ کے دیکھی عموالے شخص سے کہا ”سارا دن تمہاری لاش کھینچ کے کھٹک جاتا ہوں۔“
 ”بے گریس خود نہیں ڈال سکتا۔ حرام خور ہوتا جا رہا ہے۔“
 ”مت کم گاڑی کھینچا ہے ویسے بھی آج کل۔“ وہ سرکٹ کا لہا لٹھ لے کر بولا۔
 ”چھوٹا ستارہ“۔ تجھے لے ہاتھ بوسا کے سرکٹ ملا گی۔
 ”عمو!۔“ شادی نے دیکھ لیا تا تو دونوں کی چوڑی آنکھیں گم۔ اس نے سرکٹ کے ٹوٹنے کو یہوں سے مسل لٹا۔ پھر وہ برقی طرح کمانے لگا۔
 ”شادی دن بھر وہ اپناچ اور صندوق جھانچے پڑھتا رہتا تھا چار دہا تھا اور پچھ اسے کھینچ پھرتا تھا۔ وہی صندوق اس وقت ہٹا کتا ہوا آوی نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سب ایسے ہی لوگ ہوں گے۔ کھو قہقہ کی آواز کمانی سے لوگوں کے دلوں میں رچم اور ترس کے جذبات اٹھانے والے اور پھر ان سے خیرات وصول کرنے والے خیرات، جس کا ایک تھالی پولیس کی رشتہ تھی۔ ایک تھالی جیسے دار شادی کا بھتا تھا اور صرف ایک تھالی ہاتھ پھیلائے والے کا حصہ تھا۔ مگر یہ ایک تھالی بھی شادی کم نہیں تھا۔ وہ تھالی آدمی اپنے سے زیادہ طاقتور اور دلوں کی نذر کرنا ایک دستور تھا۔ معمول تھا یا مجھوتی قحی مگر انہوں نے LION'S SHARE کو قیل کر لیا تھا اور اب اس کلام میں ان کے لیے اچھا بڑائی کچھ

نہیں تھی۔ وہ اس کلام کے ایسے ہی عادی ہو گئے تھے جیسے ٹال کا کپڑا تار کی اور قحی میں سانس لینے اور زور دینے کا عادی ہو جانا ہے۔
 ”تجھے نے پتلی ہوئی پیکر اور بنیان پن رکھی قحی۔ اس کے غلیظ بال بڑھ کر کلاں سے بچے تک آ رہے تھے اور بچے ترتیب تھے لیکن اس کی صحت اچھی تھی اور رنگ بھی صاف تھا۔ یہی بچہ نادر حو کے اچھے کپڑوں میں ہوتا تو کسی کمانے پتے کمانے کا لگتا۔ یہ وہ استاد کتا تھا وہ تیس سال سے زیادہ کا تھو حال شخص تھا۔ آسترا میرے ہوئے سر اور پچھلی داڑھی کے ساتھ اس کا دھنسی ہوئی آنکھوں والا سیاہ چوڑکچ کے کراہیت محویم ہوئی تھی۔ وہ ضرور نئے کا عادی تھا یا پھر اسے کھینچا سرکشی میں پھونکے سے لٹی ہوئی قحی۔ اس نے اور کچھ نہیں پن رکھا تھا۔ سوائے تھوڑیوں کی ایک ملا کے اس کے شانوں کی آکھری ہوئی ہڈیوں اور کمال منڈے جسم میں کپس جانے والی پٹیلیوں سے بھی کپس ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر چار خانے والی لٹی لپیٹ رکھی تھی جس پر لال پیلے اور سیاہ داغ تھے۔ ایسے ہی داغ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ خود کو اپناچ اور ہنار دکھانے کے لیے جسم پر مختلف جیس خوبصورت کپس تھے۔
 اس غول میں شامل سب قہقہوں کا ٹکڑا ایک ساغریت انگیز تھا۔ جب وہ کمانے کمانے قحی کمانی کرتے اور دھواں چھوڑتے تھے سے چھ فٹ کے فاصلے سے گزرتے تو مجھے ان کے سانسوں اور جھوسوں سے خارج ہونے والی دوا کے جھونکے سے حکمی سی محویم ہوئی۔ شاید گندے دھ کے وہ زیادہ قابلِ رحم نظر آتے تھے۔ کا دھاری ضرورت اب ان کی عادت اور عادت خود بخود حضرت میں تھی۔ اب وہ منہ دھونے کا نمائے، ناخن کانٹے اور بال کٹوانے کی ضرورت بھی محویم نہیں کرتے ہوں گے۔ شاید ان کے سروں میں جو نہیں لٹی ہوں گی اور ان کو جلدی امراض لاحق ہوں گے۔ مٹی دھول اور دھویم میں کچھ پاؤں کچھ بدن پھرنے والوں کے جسم تھوڑی امراض کے جراثیم سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اور پھر جو حکان صحت کے اصولوں سے ہی واقف ہوں اور صاف بھی نہ رہتے ہوں۔
 اس خیال سے میرا دل جھپٹے گا کہ کل سے مجھے انہی لوگوں کے درمیان ایسی ہی زندگی اختیار کر کے نہ جانے کب تک رہنا پڑے گا۔ صرف ایک لڑکی شادی کے لیے جو اس کو محبت کی آواز قحی قرار دینے پر جھوڑتی۔ اچھی آواز قحی ہے۔ یہ آواز قحی کے نام پر عاشقی کی نافرمانی میں بڑا ظلم اور استحصال ہوا ہے۔ کسی کی محبوبہ بنے کہہ دیا کہ جاؤ کہہ دیا کی خبر لاؤ۔ کسی نے فرما دیا کہ پاؤں کات کے دودھ کی نسر نکالو۔ خیرہ زنا بھی اور تھا۔ آج کل اچھے اور بچے جانے والے خالص شدہ اور دھکی قحی سے زیادہ کیا اب ہیں تو خواہ مخواہ اسے مشکل میں ڈال کے رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔ شرط

لگادی کہ چاند کا چھراؤ پیلے قحی قحی کا بھوں بھی لکھ کو چھوڑ کے بھاگ جائے گا اور شادی کر لے گا کسی گرین کارڈ ہولڈر سے۔
 اگلے آدھے گھنٹے تک میں ہر لڑکائی اور طے کے قہقہوں کو دیکھتا رہا جو ایک سے بڑھ کر ایک بد صورتی، بد نظمی اور بد معاشی کا شکار تھے۔ وہ سب وہاں دن بھر کی کمانی کا حساب کرنے اسی طرح آ رہے تھے جیسے شہر بھر کے بچوں کے لماندے کے لیے کپس کمانے اسی طرح بیٹھ ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر میرے دل میں شادی کے عشق کا بلب جو پہلے ہزار دہائی کی روشنی دے رہا تھا اور جس نے میری نگاہوں کو خیرہ کھنچا تھا اب جذبات کے دھنچ میں کسی سے سو دھائی کے اور پھر ساتھ دھنچ کے بلب کی طرح بد صورت ہو گیا تھا۔
 اس سے پہلے کہ بلب بجو نہ ہونے سے دھانے محبت میں اندھیرا پھیل جاتا تھے وہاں سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ میں اپنی کار میں بیٹھ کے وہاں سے ایسے گزارا ہوا جیسے ان سارے ٹک وڈرنگ غلیظ اور بدو دار قحی اور بد معاش قحی حرکات کرنے والے قہقہوں کا شیطانی ٹولہ میرے قہقہ میں ہو۔ وہ جھپٹے چلتے تھے پکڑنے کے لیے دوڑ رہے ہیں اگر میرے جسم پر سے لباس کا تار تار قحی لیں اور مجھے اپنے جیسا یادیں۔ ٹھہرا دھو کے بازو تنیم خانے کی خیرات پر لپٹے والے۔ بڑا چھلپا پن کے آ رہا تھا۔ میرے یہ جو تے کپڑے سب خیرات کے ہیں۔ ہم جانتے ہیں تو ہم میں سے ہے۔ ہمارے جیسا ہے۔ شادی کو بھگنے لے جانا چاہتا ہے۔ تیرے قحی قحی کے گھوڑے کی دم میں خدا۔
 میں نے گاڑی کو پوسج سے گزار کے کیراج میں روکا تو میری سانس پھولی ہوئی قحی مگر اندر تحریف لے جانے سے پہلے میں نے خود کو سنبھالا اور چہرے پر ایک قحیات آہستہ آہستہ مسکراہٹ مسلط کی۔ اچھی مجھے کمانے سے پہلے جھاڑ کمانی تھی۔
 ڈاکٹر صاحب لٹی دوی پر کرکٹ کچھ کی جھلکیاں دیکھ رہے تھے۔ یہ بڑی خوش آنکھ بات تھی۔ دونوں بچے پور اور بائیں سوکے سونے کے لیے اپنے بچے دوام میں چلے گئے تھے جہاں سے ان کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر کرکٹ کچھ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اور کچھ دیکھنا یا سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ تنیم صاحب نے آٹھ کے اشارے سے مجھے شکل دیا کہ سب ٹھیک ہے اور پھر چھا کر میں کمان قحی میں سے بھی اشدال میں واضح کیا کہ سب خیریت ہے۔
 ”ڈاکٹر صاحب! ایئرٹ“ ڈاکٹر صاحب نے اچھا کچھ چلا کے کہا۔
 میں اچھل پڑا۔ کمانی۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔
 انہوں نے سر کھانے کے لیے دیکھا کہ میں لی ڈیلیوں کیسے ہو گیا۔
 اتنی باہر جاتی ہوئی بال تھی۔ اور جب اس نے فاروڈ کھلا ہے۔
 بال کمان لگی ہے۔ مگر کم پٹے آئے؟“
 ”کی۔ بس اچھی۔ دراصل گاڑی بند ہو گئی تھی۔“
 مگر وہ پھر کھیل کی طرف حرج ہو گئے تھے۔ ”واہ! بالکل

نیکو! ایسے ہی کہتا جا رہا ہے اسی ہال کو۔“
 بیگم صاحبہ نے مجھے کمانے کی سڑکی طرف بلایا۔ ”ابھی وقت
 پر کیا تو! ابھی کچھ روپے ملتے تھے کہ جب میں نے منع کیا تھا
 تو یہ باہر کیوں گیا اور کڑی لے کر۔ کس نے اجازت دی اسے
 آج۔“

صاحبہ کہ کوئی ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھے۔
 ”خیر یہ بات مت کہو۔ دیکھتی تو مت ہوں گی نہیں۔“ چا
 نہیں کیوں توج انہوں نے یہی بات پکڑ لی تھی۔
 ”دیکھ تو میں بھی ہوں۔ خدا نے آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی

خبردار جو آئندہ ایسی بات کی ضرورت سمجھتا ہے۔ دیکھو یہ بھی تو اس کی
مجبوری ہو سکتی ہے۔ ایسی بات کہنا۔ جیسے کوئی بھوکے آدمی کے
سامنے کھانا رکھے تو وہ اس پر ٹوٹ کے نہیں گرے گا۔ ادب تو آپ
تیز تندہی اور اخلاقی باتوں کا ذخیرہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے کھل
سے کام لے، انکار کرے مگر زیادہ اصرار ہو تو پھر انکار ختم ہو جاتا
ہے۔ تم کو حوصلہ نہیں دانا چاہیے۔“

ضمیمہ ہے جس میں یہاں اس دنیا کو چھوڑو اس ملک کی آدمی آبادی کو اپنے کا پانی تک نہیں ملتا۔ تین چھالی سے زیادہ آبادی کو سرے چھانے کے لیے کی ہمت کا سایہ نصیب نہیں۔" انہوں نے حسب معمول فریجی اور ایمری کے فرق کو راجح کرنے کے لیے ایروڈیٹار کا سارا راپا اور حالانکہ یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی مگر انہوں نے بیگم صاحبہ کی خوش قسمتی کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔

☆ 15 دوسرا حصہ

☆ مداری

اس کی حسرت ہی ہے۔ ثبوت والا ہی نہیں قسمت والا بھی جاکہ میں نے قہر پر مجبورے کا اظہار کر دیا اور دوا آگے بڑھ گیا کہ قہر نے مجھ سے مجھے مانگ لیا۔ کمر میں سو سو بجے بغیر اپنے آپ کو مجھ سے حوالے کیسے کر دیا؟ محبت کا دعویٰ ہے تو ثابت کر دے کہ یہ ہوس نہیں ہے۔ اگر مجھ سے لے کر کوئی خلیفہ افسانہ سچو نہیں "انتظار نہیں کر سکتا اور اتنی محبت ہے اپنی عزت تو بکھو خوش رہا بی بی صاحبہ۔"

پھر کیا ایک لڑکی کے لئے میں یہ فراموش کروں گا۔ میں اس انکرڈنٹریٹ چلے دوں " اس آراستہ آرام دہ اور بے غلظت کو "خوشی" آرام اور آسائش کی اس باغزت زمینی کو دیکھ دو آواز تھکرا کے وقت اور رموائی کی اس غلاب ناک حالت کو قبول کریں گا جس کا جبرت ناک نکلا ہمیں نے صرف ایک بار کیا تھا دیکھنے کی انگلی دم توڑنے لگی تھی اور زمینی کی حضور کا ایسا بھیاک دھپ دیکھنے

میں نے کہا "آپ نے خالی ہینڈ اس پر بھی کھائی ہوگی۔ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہونے کے باوجود آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ لفظی میری حتیٰ قاعدہ کٹی آپ کر رہی ہیں۔"

"تمہاری کیا لفظی حتیٰ نامر۔ وہ بات تو فہم ہوگئی حتیٰ مگر ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے لڑنے کا ہمانہ چاہیے۔ میرے لیے اور بچوں کے لیے جو تھوڑا بہت وقت ہوتا ہے وہ کرکٹ کی نذر ہو جاتا ہے ورنہ رسالے اخبار ہیں۔ دوستوں کے فون آتے رہتے ہیں اور نہ جانے کون ہیں جن سے اتنی دیر تک فون انس کے باغی کستے رہتے ہیں۔ اتنی دیر بھی مجھ سے اس کربات نہیں کی۔ کان پک گئے ہیں میرے یہ بات سننے سننے کے بھی ڈاکٹر کرکڑ اور ایکٹر کے پاس۔ خدا کا دیا سب کچھ ہوتا ہے سوائے وقت کے سب کے لیے وقت ہے سوائے بیوی کے "ان کی آواز گھر گھر ہو گئی۔

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا "پتلے چھوڑ دیتے۔ اب تک آپ کو عادی ہو جانا چاہیے ایسی باتوں کا۔"

"جیسے عادی ہو جاؤں نامر۔ میں بھی انسان ہوں آخر۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ میں کوئی گھر میں رکھا ہوا ڈیکوریشن نہیں ہوں۔ کیا میں دھپتے کے فرق کو بھی محسوس نہ کروں۔ میں نے دیکھا ہے وہ کیسے بات کرتے ہیں پرانی دوستوں سے نہ جانے کہاں کہاں سے نکل آتی ہیں پرانی کلاس فیلوز۔ رشتے کی کزن اور ان سے شغافائے مرید ہو جانے والیاں "ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میرا مت ماننے کا میری بات کا بیگم صاحب۔ ایک حد تک ڈاکٹر صاحب سے مشتاق ہوں میں۔ ڈاکٹر کرکڑ اور ایکٹر۔ ان سے شادی کرنے والی لڑکی کو یہ پتلے ہی سمجھ لینا چاہیے کہ بعد میں بھی ان کا معمول وہی رہے گا۔ ان کی مصروفیت اور ان کے دماغ کم نہیں ہو سکتے۔"

"مگر یہ غلط بات ہے نامر۔ اے خیال ہے اپنی مصروفیات کا اور اپنے چاہنے والوں کا تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وقت نہیں ہے بیوی بچوں کے لیے تو یہ ذمہ داری قبول کر کے کیوں اپنے آپ کو بھی مشکل میں ڈالتے ہیں اور کسی کی قسمت چھوڑتے ہیں۔"

میں نے انہیں پہلے بھی لڑائی کے بعد اسی سوز میں دیکھا تھا کہ غم گسار کے دل میں ان کے سامنے آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بیگم صاحب کو بھی کسی نے بھی سر رکھ کے روکنے کے لیے اپنا کندھا پیش نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی ہی رودھ کے چپ ہو جاتی تھیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب انہیں مالتیے تھے اور زندگی کی ہر ایک پیرس جو کسی فضول سی وجہ کے سبب چھوڑنے سے انہیں پرک جاتی تھی پھر جلی پڑتی تھی مگر میری ہمدردی نے ان کو دل کی ہراس ٹھالنے کا موقع ایسے وقت پر فراہم کیا تھا جب ان کے دل میں غبار پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

میں بڑی مشکل میں بھنس گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے میں آگاہ قریب پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ میں ان کے سیزا پر سے کی بریلوم اور پوڈی ٹائلٹ کی خوشبو کے زرنے میں اٹھتا تھا جو وہ اپنے غسل کے پانی میں ڈالتی تھیں۔ اب یہ نامکن تھا کہ میں ان کو دھکیل کر دودھوں اور کھڑا ہو جاؤں۔ میرا دایاں ہاتھ ان کے جسم کے نرم حصوں میں دھنسی گیا تھا اور میں مجبور ہو گیا تھا کہ بائیں ہاتھ سے ان کے چہرے پر آجائے والے ہال بتاؤں اور پھر ان کے رخساروں پر بہنے والے آنسو بھی صاف کروں۔

مجھ پر اس خیال سے گہرا ہت طاری تھی کہ یہ مہر کسی نوکر یا نوکرانی نے دیکھ لیا تو انہیں خاصا مددبانگ نظر آئے گا۔ بعض اوقات برائی کا دودھ کہیں نہیں ہوتا۔ سوائے شک کی نظر سے دیکھنے والے کی نگاہ کے گراہی سی بات حسن کے بارے میں سنا کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

وہ پندرہ منٹ تک میں انہیں سمجھاتا رہا کہ انہیں اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لیے اور بچوں کی خاطر اس زندگی کے ساتھ سمجھ کر اٹھنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب بھی مجبور ہیں۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اپنی نیکی کے لیے ہی کرتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک کی بات ہی نہیں کہ وہ انتہائی خوش قسمت ہیں و فیو وغیرہ غسل کی منتقلی بات کو تسلیم کرتے ہوئے بریکنگ انڈاز فکر اختیار کر لیتا تو ممکن نہیں تھا۔ بالآخر ان کے آنسو ختم ہو گئے تو انہوں نے میرے کندھے پر سے سر ہٹا کے مجھے شکر گزاری سے زیادہ تخت آئیز مکرابٹ کے ساتھ دیکھا۔ سو میں نے تم سے ناشتے کے لیے کھاؤ اور خود چھین جانے نہیں دیا۔"

میں نے انہیں ہاتھ پکڑ کے کھڑا کیا "میں جانا بھی کیسے آپ کے بغیر۔"

میرے اس پہلے کے جواب میں انہوں نے باقاعدہ شرا کے کہا "تمہاری باتوں سے میرا دل بڑا ہلکا ہو گیا نامر۔"

ناشتے کی میز پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ کیا شادو سے کئے ہوئے دھڑکے کے مطابق آج میں اس گھر کو پیش کے لیے خیرباد کہہ سکتا ہوں۔ رات کے مقابلے میں اب مجھے یہ بات زیادہ مشکل لگی۔ میں نے ابھی تک ڈاکٹر صاحب سے بھی نہیں کہا تھا کہ میری رقم بینک سے نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ وہ چینیہ پوچھتے کہ کیا ضرورت پڑ گئی ہے ایسی۔ کرکڑت رات تو یہ بات کرنا ہی ممکن نہ تھا۔ صبح کو میرے باگنے سے بہت پہلے چلے گئے تھے اور ایک گھنٹے میں بینک کے اوقات کا رخم ہونے والے تھے۔ شام کو ان سے بات کرنے کے بعد میں کہہ سکتا تھا کہ میں بینک میں کیش رکھنا نہیں چاہتا۔ میں پرانے بڑے پھانسیا ہوا یا این ڈی ایف سی کے سرٹیفیکٹ۔ وہ انکار نہ کرتے مگر بے دولا لاکھ کا بینک بھی نہ کاغذ نہ کتے کہ اچھا میں آج سٹکھالوں گا۔ اور رکھواؤں گا لاکر میں۔ میں ان سے کسی سودے کی ادائیگی کے لیے رقم نہیں

مانگ سکتا تھا۔ نہ کسی کا ادھار چکانے کی بات کر سکتا تھا۔ وہ کہتے کہ کیش دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چیک دے دو مگر اس سے پہلے وہ پوچھتے کہ آخر میں نے کیا سودا کیا ہے اور کس سے قرض لیا تھا۔ اپنا پیسہ وصول کر کے شادو کے حوالے کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں ان سے صاف کہہ دوں کہ میں کیسے جا رہا ہوں۔ اس گھر سے بیش کے لیے رخصت ہوں اور پھر بیچ چلا جاؤں۔ ان کو کچھ نہ بتاؤں کہ میں نے اچانک جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ میں کہاں جا رہا ہوں اور آئندہ یہ پیسہ میں اپنے پاس کیسے رکھوں گا۔ میرے بینک اکاؤنٹ کو آخر کون آہٹ کرے گا۔ یہ سب مجھے مشکل ہی نہیں نامکن نظر آتا تھا۔ وہ صرف اور نیک دل لوگ میرا خیال رکھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک میں ابھی بچہ تھا۔ ان کی مہمانیوں اور حسن سلوک کے جواب میں یہ کہنا کہ جناب آپ بحث مت کریں۔ میرا پیسہ شرافت سے میرے حوالے کر دیں۔ میں اپنا بڑا بھلا سمجھتا ہوں۔ میں اسے اپنی جیب میں ڈال کے بھلوں زمین میں گاڑ دے رکھوں کسی اور کے حوالے کر دوں "اس کی فکر آپ کو کیوں؟

ڈاکٹر صاحب ہنستے کے تیز تھے۔ وہ میرے بھائی بھی رسید کر سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اچھا جاؤ جہاں جانا ہے۔ سامان اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ پیسہ میں نہیں دے رہا۔ چاہو تو پولیس کے پاس جا کے رپورٹ کھو الیا کیس کر دو مجھ پر عدالت میں۔

شادو کی یہ بات بھی مجھے اس وقت نہایت غلا گئی کہ میں اپنی ساری رقم اس کے اکاؤنٹ میں ڈال دوں۔ پیسہ بینک میں پڑا ہے تو پڑا رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھی محفوظ ہے۔ پھر باوجود ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر کرنے کا فائدہ؟ وہ تو چاہتی ہے کہ میں آئندہ ڈاکٹر صاحب کی جیلی سے تعلق بھی نہ رکھوں۔ محبت کا کیا یہ مطلب ہے کہ باقی دنیا سے قطع تعلق۔ ساری دنیا کو چھوڑ دینے کی بات ایک کھلی استغناء ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تارک اندیش ہو کے شادو شادو کی ہالا پیچھے بیٹھ جاؤں۔

ناشتے کے بعد میں نے پڑھنے کی کوشش کی۔ میزک کے سالانہ امتحانات میں اب صرف دو مہینے بچے تھے۔ ابھی تک میں نے بہت کم پڑھائی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آخری دو مہینے میں کورس مکمل کر لیتا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہو گا مگر اچانک میری توجہ اور یکسوئی ختم ہو گئی تھی۔ میں... حالات میں دو ٹوٹا ہونے والی تبدیلی سے ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔

اپنی انتہائی کوشش کے باوجود بھی میں شادو کی صورت کے نقش کو نہ مٹا سکا جو کتاب کے ہر صفحے پر ایسے ابھرتا تھا جیسے سینما کے پردے پر تصویر۔ میں اس سے نظر نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے ایک ہی سوال کرتی تھیں۔ تو آج سب کچھ چھوڑ کے شادو کے پاس آئے گا؟ اس طرح گفٹ ہو جاتی تھیں اور اچانک مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں پڑھ رہا ہوں۔ میں تو اپنے ہی سوالات اور جوابات کے الجھاؤ میں پھنسا ہوا ہوں۔ جذبات کی

شوریہ سری اور حسی کی مصلحت اندیشی کے دلائل من رہا ہوں اور دل و دماغ کی رسائی دیکھ رہا ہوں۔

یہ تم نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا شادو۔ اگر میں اس آزمائش میں پورا نہ اُترتا تو میرا کیا ہوگا؟ تمہارا کیا ہوگا؟ تم پر کیا گزرے گی اور مجھ پر کیا بیٹے گی۔ میں کیا کہوں گا اور جو تم کو کی وہ کیسے سنوں گا؟

میں سر قہاے بیٹھا تھا کہ بیگم صاحب کی آواز آئی "نامر۔ تمہارے لیے فون ہے۔"

میں ایسے اچھل پڑا جیسے میری خاموشی کے سارے خیالات کو انہوں نے چھپ کر سن لیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ خاموشی کی زبان مجھے پتہ چاہتی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟ کس سوچ میں اسنے گم کرے ڈوبے ہوئے تھے؟" انہوں نے سکرکا کہا۔

"ہمیں۔ کچھ نہیں۔ ذرا امتحان کے خیال سے پریشان تھا۔ ابھی تک پڑھائی نہیں ہوئی ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں کا فون ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب کا؟" انہوں نے سپاٹ لیے میں کہا۔

میں نے حیران ہو کر رہیہ رائیلاں اور کہا "میں سرا"

"بھئی نامر۔ وہ دراصل صبح تو تم خواب خرگوش میں گھوڑے

بچ کے سورہے تھے جب میں گھر سے نکلا۔ ایک تو یہ کہ کل رات کچھ زیادتی ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا "سر لفظی میری تھی۔ آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔"

"دوسری بات یہ کہ۔ کہ تمہاری آغوش سے کچھ بھی پناہ چوں ڈم ہو گئی۔ ہو جاتی ہے "اکثر باتوں باتوں میں۔ تم تو جانتے ہو۔ جب تم شادی کرو گے اور تمہیں واقعی محبت ہوگی اپنی بیوی سے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے اس کے کہا "میں پناہ چوں ڈم "اور بیگم صاحب نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔

"ہاں۔ نہ ہو مرنے کو جینے کا سونہ کیا۔ لڑائی کے بغیر محبت ایسی رہتی ہے جیسے سالے کے بغیر جہاں۔ تو اب مسئلہ یہ ہے بر خودار کہ آج شام ہمیں جانا تھا ایک شادی میں اور تمہاری آغوش کو کچھ شایگہ کرنی تھی۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو گے۔ ان کا موڈ ہے احتجاجی بائیکاٹ کرنے کا۔ کیونکہ شادی ہے ان کے سسرال میں۔ کل صبح میں نے کہا تھا کہ میں ساتھ چلوں گا مگر شام کو وہ ہو گئی۔"

"میں پناہ چوں ڈم۔" میں نے کہا اور بیگم نے خاصا بڑا سہہ بنایا۔

"وی۔ اب تم یوں کہو کہ انہیں کسی طرح شایگہ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ بچہ تو ابھی اسکول سے آئے نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے کہنے سے وہاں جائیں۔"

میں نے کہا "مرد ویسے یہ کام آپ کا ہے۔"
 "ہاں بھائی میرا ہے۔ میں ہی کرتا آیا ہوں اب تک لیکن آج
 تمہیں یاد آئے گا ابلی دے رہا ہوں۔ میں آٹھ بجے سے پہلے کسی
 صورت نہیں آسکتا۔ ایک وزیر کے پیچھے سالے کی آنکھ ٹھیک کرنی
 ہے۔ وہ تو کا کادوے کا گھٹے اگر میں نے آج بھی آپریشن ملتی کیا۔
 آئی تمہک کے لیے کین ڈرائٹ۔ دل ہے؟"
 "شیور سر۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" شاہد اللہ گاڑی اب تم کو لے کر چلا لیتے ہو تو
 ڈرائیو تک بھی خود کرتا۔ اپنی کیس کی بات ہے۔ رائٹ؟ انہوں
 نے فون بند کیا۔
 "بڑی بے تعلقی ہو گئی آج اچانک ڈاکٹر صاحب سے۔" بیگم
 صاحبہ نے کہا۔

"یہ تو ان کی مہمانی ہے۔ اور آپ کی محبت ہے۔" میں نے جملے
 کا دوسرا نصف حصہ بولتے ہوئے اپنے پرہیزگارہ اور آگے جھکا۔
 "ایکڑا جیسے ہو تب سیدھی طرح تاڑ دیا کہ رہے تھے ڈاکٹر
 صاحب!"

میں نے کہا "کہنا کیا تھا۔ زائد قطار دور ہے۔ بھلی بندھ گئی
 تھی۔ دوبار پانی پیا۔ ایک بار زس سے کھڑے کھڑے بھی سو گھا۔
 بس اب آپ ان کو معاف کر دیں۔ وہ پھر بھی ہمیں پانچ چوں ڈم
 نہیں کریں گے۔"
 وہ کھٹکلا کر ہنس پڑیں "اچھا وکیل کیا ہے انہوں نے۔ مگر
 یہ معافی کا معاملہ ان کے اور میرے درمیان ہے۔ وہ خود معافی نہیں
 مانگ سکتے؟"

"وکیل نے عیوری معافی نامہ داخل کیا ہے۔ میرے منہ کی
 اپنی اولین فرصت میں بیگم خود آپ سے دست بستہ معافی مانگ لیں
 گے۔ پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق آج رات آٹھ بج کر ساٹھ
 منٹ پر یعنی ٹھیک نو بجے۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ حالاک آدمی نے تم سے کہہ دیا کہ بیگم
 صاحبہ کو نو بجے سے پہلے بتا دے کہ وہ۔"
 میں نے کہا "بالکل غلط۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو
 شاہک کے لیے خود ڈرائیو کر کے لے جاؤں۔"
 انہوں نے منہ جھکا کر کہا "مجھے شاہک کے لیے لے جانا ہے اور
 نہ شادی میں۔"

میں نے ان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "ڈاکٹر صاحب
 نے کہا ہے کہ ایسا نہ ہوا تو آٹھ بج کر ساٹھ منٹ پر وہ مجھے شوٹ
 کر دیں گے۔ اگر آپ ایسے نہ مانتیں تو میں دیسے روئے لوں گا جیسے
 کچھ دیر پہلے آپ دوری تھیں۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ اس بار
 کندھا آپ کا ہو گا۔ اور آپ تو ہندہ منٹ میں چپ ہو گئی تھیں۔
 میں دیکھنے دوں گا۔"
 خوب روئے کے بعد وہ خوب ہنستا چاہتی تھیں۔ سامنے کا

ایک ٹکڑے ہے کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ شاہک کے دوران بھی
 وہ ہنسی رہیں۔ ان باتوں پر بھی جن پر وہ برا بھلا بھی مانتی تھیں۔ میں
 نے بھی انہیں ہنسانے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ
 بار بار مجھے شرعاً بد معاش اور بخور جیسے پارہے خطاب سے
 نوازتے ہوئے اپنا پتیت کا اعتراف بھی کرتی ہیں اور میری حوصلہ
 افزائی بھی۔ ہم دونوں کو اس میں مزہ آتا تھا۔ چنانچہ ہم اس مکمل
 میں برابر کے شریک تھے۔

ان کی شاہک غیر ضروری طور پر دھکے جاری رہی۔ مجھے ان
 کی پسند کا کوئی اعوانہ نہیں تھا اس کے باوجود وہ میری رائے پر ہمتی
 رہیں کہ یہ ذرا مہینے خیر خیال میں کیا ہے۔ یہ رنگ اچھا لگے
 گا مجھ پر اور میں انہیں اپنی پسند تاتا رہا۔ ہر بار انہوں نے میرا
 مشورہ قبول کیا اور کئی بار دہرایا کہ میری اور ان کی پسند کس حد تک
 ایک ہے۔

دوسرے مرحلے میں انہوں نے میرے لیے انکار اور احتجاج
 کے باوجود کپڑے خریدے حالانکہ ابھی وہ سب کپڑے میں نے
 نہیں پہنے تھے جو انہوں نے گزشتہ بار ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر
 دلوائے تھے۔ فقیر میرے خلاف سازش کرنے پر تلی ہوئی تھی۔
 میرے لیے آزمائش کے مرحلے سخت سے سخت تر ہوتے جا رہے
 تھے۔ اچانک مجھے ڈاکٹر صاحب کی جلی کے ایک فرد کی حیثیت
 حاصل ہو گئی تھی اور مجھے ان کی STATUS پر مرتبہ مل گیا تھا۔
 ڈاکٹر صاحب کی اپنا پتیت کے انداز میں شفقت تھی تو بیگم صاحبہ کے
 انداز پر برائی میں وہ جاہت جو بیک وقت مثبت اور منفی جذبات کی
 حامل تھی اور یہی بات خطرناک تھی۔

ایک طرف ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر اعتماد کا اعتراف کیا تھا۔ چنانچہ
 وہ میری عقل اور جذبات پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ امید رکھتے تھے کہ
 میں ان کے خالص نجی معاملے میں غلوں نیت کے ساتھ چھوٹے
 بھائی جیسا کردار ادا کرنے کا اہل ہوں۔ میں ان کی ایک معمولی سی
 پریشانی شیز کر سکتا تھا۔ وہ معصوم تھے چنانچہ انہوں نے یہ ذمے
 داری مجھے سونپ دی کہ جو کشیدگی میری وجہ سے پیدا ہو گئی تھی
 اسے میں دور کر دوں۔ اگرچہ انہوں نے براہ راست مجھے اس کا
 الزام نہیں دیا تھا۔ جیسے برا بھالی اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ دیتا
 ہے کہ "یار! تمہاری وجہ سے بھالی ناراض ہے۔ جاؤ اسے مٹاؤ۔"
 ایسے ہی انہوں نے مجھے فون کر کے پہلی بار اپنی اپنا پتیت کا مظاہرہ کیا
 تھا۔

دوسری طرف بیگم صاحبہ کی ثابت اور ان کا لطف و کرم
 میرے جیسے ظالم کو اوردہ کے لئے دانہ درام بن گیا تھا اور ایسی ہی
 کشش نے میری طاقت پرواز کو مفلوج کر دیا تھا۔ ان کا رویہ مجھے
 غلامی میں مبتلا کر رہا تھا لیکن مجھے یہ سب بھی خواب جیسا لگ رہا
 تھا۔ یہ بیگم خانے میں پرورش پانے والے ایک لاوارث بچے کا
 خواب تھا جو حقیقت بن گیا تھا۔ ایک کوٹھی "کار" میں قیامت نشین

ابیل کپڑے۔ بیگم صاحبہ جیسی حسین عورت کے ساتھ شاہک۔
 ان ڈیپارٹمنٹل اور سپراسٹورز سے جن میں قدم رکھنے کا میں تصور
 بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد بیگم صاحبہ نے کہا "بہن! میں تم تک گئی ہوں نامر۔
 بلا کہیں بیٹھ کے کچھ کھا لیں۔"
 میں نے کہا "مگر کچھ نہیں۔ بیٹے بھی آگئے ہوں گے۔"
 انہوں نے گڑھی دیکھی "وہ تو کھانا کھا کے سو چکے ہوں گے۔ بچ
 کا وقت بھی کل چکا ہے۔ کچھ لائٹ سا ریفریشر منٹ لوں گی میں تو۔
 تم چاہو تو کچھ کر لو۔"

ایک اعلیٰ درجے کے ایگزیکٹو ریٹائرمنٹ کی دھمکی روشنی
 والے مرسکون انڈیورس میں ایک نیکل پر بیٹھ کے میں نے سوچا کہ
 یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اور کیا مجھے یہی کرنا چاہیے۔

بیگم صاحبہ کا مسئلہ صرف اتنا تھا کہ انہیں ایک رفیقہ تعالیٰ
 ایک دوست اور غم گسار کی ضرورت تھی۔ کسی نوجوان عاشق کی
 نہیں لیکن میرے جیسا کوئی بھی شخص ان کی جذباتی کیفیت کا
 احتمال کرتے ہوئے اپنی خدمات کے معاوضے میں کچھ بھی طلب
 کر سکتا تھا اور حاصل کر سکتا تھا۔ بیگم صاحبہ کے فیملی بیک گراؤ
 کا مجھے علم نہیں تھا مگر میں نے ان کے کسی بھائی بن یا رشتے دار کو
 گھر آتے نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایسے آدمی نہیں تھے کہ
 انہوں نے ملنے والوں پر پابندی لگا رکھی ہو۔ شاید ان کا کوئی قہاسی
 نہیں یا قہاسی خاندانی یا سماجی اختلافت کی خلیج نے انہیں دور کر دیا
 تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا سوشل سرکل بہت وسیع تھا مگر اس کے برعکس
 بیگم صاحبہ کا حلقہ شناسائی محدود تھا۔ جس علاقے میں وہ رہتے تھے
 وہاں پردس اور ہمسائیگی کے مروجہ تصورات اور اخلاقی اقدار غیر
 اہم تھے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے سے ذاتی ضرورت اور غرض
 کے بغیر نہیں ملتے تھے کیونکہ وہ غلوں محبت اور دوستی کے جذباتی
 ساروں کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کر سکتے تھے۔

بیگم صاحبہ کی کوئی ایسی بے تکلف سہیلی یا راز دار دوست
 نہیں تھی جس کے ساتھ وہ اپنی ذات کے دکھ پائنت کر ہی بٹا
 کر کشیں ورنہ اپنے آپ کو دور کرنے کے لیے ان کو میرے
 جیسے نوجوان کا سہارا لینے کی اتنی اشد ضرورت آتا مجبور نہ کرتی۔
 ان کے پاس وقت گزرا رہی تھی کہ کوئی دلچسپ مشغلہ ہو آتا اور کچھ
 نہ ہوتا تو گھر کا کام ہی ہوتا۔ تو ان پر یہ ذہنی بیزاری اور ہمسائی بے
 کاری سے پیدا ہونے والا ڈیپریشن طاری ہی نہ ہوتا۔

ان کی تنہائی اور ان کیسے بن کے احساس کا واحد سبب ڈاکٹر
 صاحب کی معصومیت ہی نہیں تھی، ہر بڑا ڈاکٹر ایسے ہی معصوم ہوتا
 ہے اور اس کی معصومیت کے شریک ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔
 ان میں خوب صورت مریض لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی ہوتی
 ہیں۔ نرسیں بھی اور لڈی ڈاکٹر بھی جو ہر وقت اس کے ساتھ
 رہتی ہیں۔ خالی داغ شیطان کا گھر۔ اکیلی اور بالکل فاسق بیوی اگر

وہم اور شک کے مرض کا شکار ہو جائے کہ ڈاکٹر صاحب کی غیر پیشہ
 ورانہ معصومیت ہی معصومیت کا واحد سبب ہیں تو اس کا علاج شوہر
 کے پاس کیا ہونا چاہیے کہ بیوی کا بھی معصومیت فراہم کر دے۔ مگر
 ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ان کا ریکٹس کرنا بھی بالکل غیر ضروری
 تھا۔ بیگم صاحبہ کا خیال اور سوشل بیک گراؤ انہیں گھبرائے ہوئے کوئی
 مسئلہ نہ تھا۔ دوست احباب عزیز اور رشتے دار انہیں باتوں میں
 قربات میں ہلکے اور کپ شپ کے لیے ساتھ لے جاتے تھے مگر اچھا
 نہیں تھا۔ خدا نے بیگم صاحبہ کو حسن و شباب کی دلکشی عطا کرنے
 میں جتنی سخاوت دکھائی تھی ذہنی اور فکری اعتبار سے ان کی
 شخصیت کو اتنی ہی کمزور رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی ہی تھیں کہ انہیں ڈاکٹر
 صاحب کے لیے بطور مثال بیوی پسند کر لیا گیا کیونکہ وہ خوب
 صورت، سلیقہ شعار اور متوسط طبقے کے شریف خاندان کی لڑکی
 تھیں۔ جذباتی سطح پر وہ عام لڑکی تھیں جس نے زنانہ باتوں اور
 رسالوں کے دنیائی جاہلیت ہیرو کے ساتھ خیالی محبت کی دنیا میں
 اپنے خوابوں کے سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ اسے ایک پسندیدہ تہی
 سے گئے ہوئے والے اور کسی حد تک بد صورت مگر انتخابی دولت
 مند اور نامور ڈاکٹر نے خرید کر اپنے گھر میں سما دیا یا اڑا لیا۔ بات
 ایک ہی ہے۔ اس لڑکی کے سارے خواب بہ حال ادھورے ہ
 گئے۔ ڈگری لینے کے باوجود وہ ڈاکٹر بنی۔ چاکلیٹیں بیروٹے سے
 پہلے ہی چھڑ گیا۔ اس کی محبت کی طلسماتی دنیا ایک ٹم گشتہ جنت
 ہو گئی۔

یہ سوچ سو فیصد حقیقت پسندانہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب
 شریف آدمی اور اچھے شوہر تھے اور اگر گھر سے باہر ان کی
 معصومیت میں غیر پیشہ ورانہ دلچسپیاں شامل تھیں تو اس کا نہ کوئی
 ثبوت تھا اور نہ اس کا ان کے گھر پر کوئی اثر پڑتا تھا۔ اور نہ اس
 سے بیوی بچوں کے ساتھ دیکھنے میں فرق آتا تھا۔ اصولاً بیگم صاحبہ
 کو نہ تقدیر سے گلہ ہونا چاہیے تھا نہ زمانے سے۔ ان کے خوابوں
 کا شکارہ کوئی ٹھکر ہوا تو کسی ذریعہ کر کے کے مکان میں بیٹھ کے
 ان سے بیاہ رہے تھے مگر کالہ ہی نہ بولتا رہتا۔ عقلی میں ان کا یہ
 حسن و شباب ایسے مرمعہ کے ساری دلکشی کو ہٹا دیتے تھے۔ یاد موسم گلوں
 سے رنگ اور خوشبو چھین لیتی ہے۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ
 میں اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لوں اور ایک بہت بڑا ڈاکٹر بننے کی
 خواہش کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لوں۔

بیگم صاحبہ چاہتی تھیں کہ وہ زنانہ طالب علمی اور شادی سے
 پہلے والی لڑکی بن کے مجھے اپنے خوابوں کے شکارہ کے کی جگہ دیں
 اور میں ان کے ساتھ خود فریبی کا یہ مکمل مکملوں۔

شاد چاہتی تھی کہ میں اس کے لیے سب کچھ قربان کر دوں
 اور کاتہ کدائی ان کے فقیر ہو جاؤں۔ عرش سے فرش پر آؤں۔
 چنانچہ مشکل میرے لیے تھی کیونکہ میں ڈاکٹر صاحب کے

احقاد پر پورا اُترتا چاہتا تھا۔ میں اس گھر سے تعلق کو استوار رکھنا چاہتا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اس بے سارے خود بھی خوش رہنا چاہتا تھا۔ میں اپنی اس اہمیت کو اور اپنے اسٹیشن کو اپنائے رکھنا چاہتا تھا۔ اور میں شادو کو بھی چاہتا تھا۔

شادو کو چاہنے کی شرط پوری کرنا اب مجھے مشکل ہی نہیں نامکن نظر آنے لگا تھا۔ یہ کہنے ممکن ہے کہ اچانک میں ڈاکٹر صاحبہ سے کون کہ جناب مجھے نہیں بننا ڈاکٹر۔ میں تو وزیراعظم بننا چاہتا تھا۔ مجھے آپ کے گھر اور آپ کی شفقت و حمایت کی ذخیرہ پہنچنا قبول نہیں۔ میں بیگم صاحبہ سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کو تاہ اندیش عورت۔ جذبات میں اندھی ہو کے اپنا گھر خراب مت کر۔ اپنے شوہر اور بچوں کی طرف دیکھ۔ رسوائی کے کھیل میں نہ سکون ملے گا نہ تسکین کا سامان۔ میں کوئی PLAYBOY نہیں ہوں جسے تو اچھے کپڑے پہنانے کے اچھے ہوٹلوں میں لئے لئے پھرے۔ میں شادو سے بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں ہے اگر شرط وصل ملے۔ تو اسٹیشن مرا باحسرت واپس۔ میں باز آیا محبت سے اٹھا پانداں اپنا۔ میں شادو سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

میرا وجود مخالف سمتوں میں کھینچنے والی متضاد قوتوں کے برابر ہونے سے ظاہر کسی سیارے کی طرح مطلق تھا جس پر ہر سمت سے کشش ثقل اثر انداز ہوتی ہے تو وہ حرکت میں ہونے کے باوجود ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔

بیگم صاحبہ کے ساتھ میں نے بھی کافی پی اور چار میں سے تین سینڈویچ کھائے۔ ایک سینڈویچ پر اکتفا کرنے کا سبب انہوں نے یوں بیان کیا کہ "تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے کچھ REDUCE نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لینے سے گریز کیا۔ اپنے اس خیال کا اظہار میں ان سے بہت پہلے فرما چکا تھا اور یہ بھی کہ وہ اپنا وزن تھوڑا سا کم کر لیں تو یہ ادا کا ریمان کے آگے کیا چیز ہیں۔ عورت کو غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا کرنا کتنا آسان ہے۔

"اے۔ کس سوچ میں کم ہو تم اتنی دیر سے!" انہوں نے ہیز کے نیچے سے میری ہانک پر ٹھوکر ماری۔

میں نے چونک کے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"پھر میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا پوچھا تھا میں نے؟" وہ مسکرائیں۔

میں نے کہا "دینیے تو ماشاء اللہ آپ ٹھیک ہی ہیں۔ کچھ اور اسارت بننا چاہتی ہیں تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحبہ کو ہر حال میں ابھی لکھیں گی۔"

"میں کسی عورت میں اچھی لگتی ہیں۔ جیسی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ سو کئی چھوڑا رہیں۔" انہوں نے اچانک سوال کھڑا کیا "تو ابھی اور نہیں ہے۔ تمہارے دائیں جانب۔ آلو بخارے جیسی۔"

مجھے اس سوال سے ہی پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے گہرا کے دائیں

طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف۔ بیگم صاحبہ کی تشبیہ بالکل ٹھیک تھی مگر میں انکو بخارے اور چھوڑے میں سے کسی کو اپنا انتخاب قرار دیتا تو ان کے جذبات یقیناً مجروح ہوتے اور وہ غالباً مجھ سے یہی جواب دیتا کہ میں نے انکو بخارا اور نہ چھوڑا۔ مجھے تو آپ پسند ہیں مگر نہ مجھ میں ہے جواب عرض کرنے کی ہمت تھی اور نہ میں اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ شادو کی دی ہوئی مصلحت تمام ہونے میں چند گھنٹہ ہی باقی رہ گئے تھے اور مجھ پر گہرا ہت سوار ہونے لگی تھی۔

میں نے بیک انہا کے انہیں تھمادیا "چلے بہت دیر ہو گئی۔" شادو میرا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ ہنس پڑیں "تم تو شرابے ہو لڑکیوں کی طرح۔"

ہمارے گھر پہنچنے سے پہلے ہی بچے سو کے اٹھ گئے تھے اور گھر میں دھماچہ لڑی چارے تھے۔ ہر غیر متوقع آوازی کی خوشی وہ ایسے ہی مانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ انہاں ان پر چٹنی چٹائی کڈوانے پہنچے ہوئے کہا "سر! آپ کا فون آیا تھا۔"

میں نے کہا "بہن! میں نے تو کسی کو فون نہیں کیا یہاں۔" رانی نے ٹھہرے ہال سینے "سر! کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔" "ہاں۔ کسی لڑکی نے" کڈوانے وضاحت کی "پوچھ رہی تھی کہ نام عظیم صاحبہ یہاں رہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں۔"

"پھر؟" میں نے پوری کو بخشش کی کہ میری صورت سے صرف حیرت عیاں ہوں پریشانی نہیں۔

"پھر کچھ نہیں سرب۔ اس نے فون بند کر دیا۔" رانی بولی "نام نہیں پوچھا اس نے وقف لے۔"

"بے وقوف تھ نام پوچھنے سے پہلے اس نے ربیور رکھ دیا تھا کڈو بولا۔"

"تم اس کے ربیور رکھنے سے پہلے نام نہیں پوچھ سکتے تھے؟" "چلو لڈو نہیں۔" میں نے کہا "جو بھی ہوگی پھر فون کرے گی اگر اسے ضرورت پڑی۔" بچے باہر بھاگ گئے۔

بیگم صاحبہ نے کہا "مگر یہ وی ہے۔۔۔ تو ضرورت پڑے گی جناب۔"

"یہ وی کون ہے؟" میں نے انہاں بننے کی کوشش کی۔ "کل ٹشو پیپر سے تم نے ایک گال کو صاف کیا تھا؟" وہ ہنس پڑیں "اب کہتے ہو جو بھی ہے۔"

"نہیں بیگم صاحبہ! شفقت سے میرا چہرہ پگھلا گیا؟" آپ ایسے ہی لک کر رہی ہیں۔

"کل۔ اور پھر آج اس کی تصدیق ہو گئی ہے پھر بھی شک کتنے ہو اسے۔"

"راک کال ہوئی کسی کی۔"

وہ میرے بیڑے پر دروازے کے مجھے دیکھتی رہیں "راک کال کا نمبر بھی ٹھیک نام بھی ٹھیک۔ نامہ کون ہے مجھے تو بتا دو۔"

فون شادو کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے

اپنی دل میں ایک گالی دی۔ انوکھی جگہ کیا ضرورت تھی مجھے فون کرنے کی۔ ابھی تو تین چار گھنٹے باقی ہیں۔ کیا چاہتی تھی وہ آخر؟ مجھے اپنا وعدہ یاد دلانا تھا۔ اب یہ بات مجھے نہیں رہ سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے پیارے سے بھی ذکر کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحبہ کی مجھے فکر نہیں تھی۔ وہ ایسے ہی راجسی دیپتھی لیتے اور پھر کہنے کہ اچھا بھی مت بتاؤ۔ بیواے کڈو نام لیکن دیکھو۔۔۔ تمہارے فوجے سے زیادہ کوئی لڑکی اہم نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی مت بھولنا۔

بیگم صاحبہ کا مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ اب یہ مذاق کی بات نہیں رہی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس شک کے حقیقت میں بدل جانے سے ان کو مایوسی ہوئی ہے۔ ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کسی بہت حسین خواب عکری لذت میں ڈوبے ہوئے شخص جیسی تھی جسے اللہ کی کثرت آواز حقائق کی دنیا میں گھسٹ لائے۔ ان کو مطمئن کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے مجھے جھوٹ بولنے میں اپنی مہارت کا استعمال ذہانت کے ساتھ کرنا تھا۔

میں نے کہا "جب میں اسپتال میں تھا تو ایک نرس تھی۔" انہوں نے پاؤں جھٹک کے جوئے آمادہ لیے "کیا نام تھا اس کا؟"

"نام تو مجھے نہیں معلوم وہ دن میں دو تین بار آکے ہاتھیں کرتے بیٹھا جاتی تھی۔ ایک بار رات کو آگئی۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی اس لیے پوچھا نام نہیں پتہ نہیں رہی تھی۔ میرے لئے سوپ لائی تھی۔ برا میک اپ کر کے آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں ڈاکٹر صاحبہ کا کوئی قریبی عزیز ہوں۔ سب جانتے تھے یہ بات میرا نام اس نے چارٹ پر دیکھ لیا ہوگا۔ اکثر آجاتی تھی رات کو۔"

بیگم صاحبہ کے ہاتھ پر تردد اور تپندگی کی ہر شکن مہرے ہو گئی "کمال ہے تم نے پھر مجھ پر اس سے نام نہیں پوچھا۔ کون تھی وہ؟ کیا باتیں کرتی تھی تم سے؟"

"بہن! وہ چارٹر کر رہی تھی کہ رسی تھی کہ کیا تم بھی ڈاکٹر بنو گے۔ مجھے اپنے ساتھ نرس رکھ لینا۔ نرس کا نام کون پوچھتا ہے۔"

"خواف؟" بیگم صاحبہ نے نکلے سے کہا جیسے میں اس کا نام تھا۔

میں نے کہا "بہن! میں نے تم سے کیا نام اس سے لئے تھے؟"

"نہیں بیگم صاحبہ۔ وہ اس قابل تھی بھی نہیں۔ کالی سوکھی سی۔ چھوٹے سے قد کی۔ بال کٹے ہوئے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئیں "میں کون تھی۔ خیر ڈاکٹر صاحبہ کو معلوم ہوگا۔ کیا پہلے بھی فون کیا اس نے مجھے؟"

"بہن! نہیں۔ اسی پر شک ہے مجھے" میں نے کہا "خود میں نے آج تک اپنے کسی دوست کو بھی گھر کا فون نمبر نہیں دیا۔ آپ جانتی ہیں۔"

"تم دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے نا؟" ڈاکٹر صاحبہ اس کے سر سے حلق کا بھوت آمادہ ہیں گئے۔

"حلق۔ لالو ولا قوت۔ آپ چھوڑیں اس کی فکر۔ میں ان پکڑوں میں پڑنے والا نہیں ہوں" میں نے کہا۔

انہیں کچھ اطمینان ہوا "مجاہد کڈو اس کیسے کہ مجھے وہ شرت اور پیٹ پٹ پن کے دکھاؤ جو ابھی لی ہے۔"

میں نے مجبوراً ان کی خواہش پوری کی ورنہ اس وقت میں یکسوئی کے ساتھ شادو کے مسئلے کا کوئی فیصلہ کن حل نکالنا چاہتا تھا۔ میں سوچنے کے لیے تھائی کا آرزو مند تھا۔ بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ آجانا کوئی خاص بات نہیں تھی مگر ان کا میرے بیڑے پر لیٹ جانا خلاف توقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اپنی ہند کے کپڑوں میں دیکھ کے اور خوش ہو کے وہ اندھ جانمیں کی گھر میں لباس بدل کے آیا تو وہ سوچیں گیں۔ انہیں وہاں میں سونے کی عادت تھی اور آج وہ صحن کا شکار بھی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ کے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ اس گھر کی مالک تھیں۔ میں جگہ کے انہیں اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ حکم کیا میں ان سے درخواست تک نہیں کر سکتا تھا کہ سونا ہے تو اپنے کمرے میں جا کے اپنے بیڈ پر استراحت فرمائیں۔ مجھ میں ان کو نیند سے جگانے کی ہمت نہیں تھی۔ اچانک مجھے ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی ایک آواز مجھے خبردار کر رہی تھی کہ بیٹے ہمارے خیریت چاہے ہو تو اس عورت کی پیش قدمی روک دو اور خود بھی پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تم اناڑی ہو۔ اس ترچا چلنے کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ کسی دن یہ رات کو دروازہ کھول کے تمہارے کمرے میں آجائے گی اور تمہیں ایسے ہڑپ کر جائے گی جیسے چھیل پڑا ہوا پر بیٹھنے والے کیزے کو روٹی کے کھا جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ جہاں دیدہ آؤ گی ہیں۔ ان کو یمن ان کی ناک کے نیچے ہونے والا ڈرا باک تک نکل نظر نہ آئے گا۔ مرنو خود کو کبھی قصور وار نہیں سمجھتا۔ دوسروں کی ازدواجی زندگی میں ناگاہی کے نفسیاتی عوامل سمجھنے اور سمجھانے والا خدائی مصلحتی میں کوئی دلیل دینا ضروری نہیں سمجھتا اور بیوی کی کسی دلیل کو قبول نہیں کرتا۔ بے وفائی کی مجرم یک طرفہ طور پر بیوی رہتی ہے اور اس کے جرم کی عینگی کسی کتابی جواز سے کم نہیں ہوتی۔

میں پریشان ہونے کا ہر نکل آیا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں بیگم صاحبہ کی اس ذہنی اور جذباتی "بہارت" کے نتیجے میں صورت حالات کتنی بگڑ سکتی ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحبہ جوئے مار کے گھر سے نکال کتے تھے مگر اس سے احتیاط کے پیشے میں پڑ جانے والی دراز غم نہیں ہو سکتی تھی۔ جونوٹ کیا سوئوٹ کیا۔ شیشوں کا سیجا کوئی نہیں۔ ان کی بقیہ زندگی سب کے لیے جینے کی سزا ہو سکتی تھی۔ یہ راز کی بات ہو تو ان تک آجاتی تو دوا دلوں کے کان بھی سن لیتے اور دوا دلوں سے نکل جاتی تو اس

☆ 163 ☆ دوسرا حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مداری ☆ 162 ☆ دوسرا حصہ

کی بازگشت ہر لب پر سنائی دیتی۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ ان کی بیوی کے لیے اور بالآخر بچوں کے لیے ایک عمن کش کی دی ہوئی رُسوائی اس معاشرے میں لعنت کا وہ طوق بن جاتی جہاں ہر شخص دوسرے کی آنکھ میں تنکا تلاش کر کے اپنی آنکھ کا شہر چھپانا چاہتا ہے۔

لان میں بچے دوڑ رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاؤں مگر میں نے انہیں ڈانٹ کے بھاگایا اور خود کرسی پر اکیلا اپنے منہس خیالوں کی امصا ب یلغار کا مقابلہ کرتا رہا۔ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اس خطرناک کھیل سے بچنے بہت جانا چاہیے۔ سوال یہ تھا کہ کیسے؟ اسی گھر میں رہتے ہوئے عجم صاحب کے انکشاف کا جواب سر تسلیم خم کر کے اپنا مشکل تھا تو اسے ٹھکرا کر باک۔ نیاز مند اگر بے نیاز ہو جائے، پہلے جذبات کی چنگاری کو ہوا دے اور پھر اپنا دامن ہلکے سے بچانے کے لیے ہڈی کا مظاہرہ کرے۔ انکشت نمائی کرنے والوں کے گرد وہیں پہلا چتر اٹھانے والا ہاتھ اسی کا نظر آئے تو عورت کا زخمی ناخن کی طرح انتقام لہتا بھی جائز اور ناگزیر۔ وہ اپنی توہین اور انا کی شکست کے ذمے دار کو بدلے کی آگ میں جلا کے راکھ کر دے تو عین تقاضائے فطرت۔

لازم نے میرے سامنے چائے لاکے رکھی تو میں نے گھڑی دیکھی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ عجم صاحب اندر سے خواب آلود آنکھوں اور زلف پریشان پردوش نمودار ہوئیں اور میرے سامنے والی کرسی پر بڑی نزاکت سے بیٹھ گئیں۔

”مجھے نیند آگئی“ انہوں نے ہانک کر اٹھیں سے سنوار کے کہا ”اور تم کپڑے بدل کے خاموشی سے باہر آگئے جگاوتے تھے۔“

”جی۔ آپ بہت گرمی نیند میں تھیں“ میں نے کہا ”پہانے بناؤں آپ کے لیے؟“

”ہاں۔ ابھی تک انہی کپڑوں میں بیٹھے ہو تم۔“

میں نے کہا ”مجھے جانا تھا ایک کام سے۔“

”کہاں جانا تھا۔ تم کیسے نہیں جا رہے ہو۔ ہمارے ساتھ چلو گے شادی میں۔“

”آپ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جائیں۔“

”تمہارے کہنے سے میں نے اتنی تیزی کی۔ ڈاکٹر صاحب تو چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاؤں کے۔ تم نہیں جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔“

میں نے یہ حلقہ خاصی شائستگی سے قائم کر دیا ”دیکھئے عجم صاحب۔ میں کیا ہوں؟ یہ سب ہی جانتے ہیں۔ آپ کی ٹیلی کے فکشن میں میرا کیا کام؟ آپ کی بات اور ہے۔ آپ میری عمن کش ہیں اور آپ نے اپنے خوشی سلوک سے بھی مجھے اپنا بنایا ہے مگر دوسرے سب لوگ مجھے جن نگہوں سے دیکھیں گے ان سے مجھے تکلیف ہوگی اور آپ کی پوزیشن بھی EMBARASSING

ہوگی۔“

”کیوں۔ میری پوزیشن کیسے خراب ہوگی؟“

میں نے کہا ”تھک دل اور تنگ نظر لوگ کسی پر محتاطات کی انتہا کو بھی غلط فہموں سے دیکھتے ہیں اور اچھائی میں بُرائی کا پسلو تلاش کرتے تو ہمارا قوی مشغلہ ہے۔ خواہیں تو ماہر ہوئی ہیں رانی کا پھاڑ پھانے اور دال میں کالا تلاش کرنے میں۔ مجھے تو آپ صاف ہی کریں۔“

انہوں نے مسکرا کے سہلایا ”کیسے اسی نرس کے خون کا انتظار تو نہیں کرتا ہے مگر بڑے۔“

میں نے کہا ”میں اسی سے ملنے جاؤں گا۔“

میری سنجیدگی دیکھ کے انہوں نے کہا ”تمہ۔ سرس ہو؟“

”مذاق کی اس میں کیا بات ہے۔ میں بلاوجہ کی بدنامی منول نہیں لے سکتا۔ آخر وہ کیوں میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے ڈر کی وجہ سے آپ کو نہیں بتایا تھا۔ دوبارہ بھی مجھے فون کر سکتی ہے وہ اور ڈاکٹر صاحب نے ریسپر ڈھال دیا تو تیری شامت آجائے گی۔ میں اس کو سختی سے منع کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے ملاقات کرنا ضروری ہے؟ جسیں معلوم ہے اس کا گھر؟“

”اس بیٹے میں ہائٹ شفٹ رہے وہ۔ میں ہسپتال جا کے ملوں گا۔“

”بلیر۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے کچھ نہ کہیں اور بچوں کو بھی منع کر دیں۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”یو وکیلنگ پیڈنم“ انہوں نے میرے لباس پر نظر ڈال کے کہا۔

میں نے تھیکس کہا اور باہر چلایا۔ عجم صاحب کھلتی چادری جس اور اب یہ مجھ پر سو قوف تھا کہ میں گرین سٹیل پر آگے کب پڑتا ہوں۔ ان کی نگاہ نے کب مجھے انتخاب کیا اور انہیں گرین سٹیل دینے کا فیصلہ دینے میں کتنے دن لگے۔ اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب اچانک آتا تھا ہوا۔ اب میرے لیے عافیت اسی میں تھی کہ میں یہاں سے فود نہ کیا ہو جاؤں

ورنہ جیسے خدا نے آدم کو عرش سے فرش پر پھکوا دیا تھا ایسے ہی ڈاکٹر صاحب مجھے گھر سے بڑے گھر بچا دیں گے۔

اس گھر کو چھوڑ دینے کا ایک سبب شادی نے پیدا کر دیا تھا۔

ری سٹی کریم صاحب کے دودھ نے دو سرا سبب پیدا کر کے پوری کر دی۔ اب میرا یہاں ٹھہرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے باضابطہ طور پر اجازت لے کر رخصت ہونے کی راہ میں سب سے زیادہ مزاحمت خود عجم صاحب کی طرف سے ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کو مطمئن کرنا بھی آسان نہیں ہو گا مگر یہ فیصلہ کر لینے کے بعد مجھے کچھ سکون حاصل ہو گیا۔ اب صرف یہ طے کرنا باقی تھا کہ میں کب جاتا ہوں اور کیسے جاتا ہوں۔ اس کے بعد سوال پیدا ہو گا کہ کہاں جاؤں۔

تھوڑا سا تلاش کرنے کے بعد مجھے رہنمائی ملی۔ وہ ایک راز پر اجازت کے بیچ میں ہونے والی سرخوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔

بازئی تمام ہونے کے بعد پھیل چھٹی تو اس کی آواز نے مجھے متوجہ کر لیا۔ ایک سونے نازے شخص نے اس کا گریبان تمام رکھا تھا۔

”کھال بچاس دوپے ورنہ مار کے کھٹا کرے تیرے تینس دانٹ نکالنا ہوں۔“

”تمہ نے کھلی بے ایمانی کی ہے۔“ رہنمائی نے اچھل کے اور شور مچا کے کہا۔

”بے ایمانی دے پتہ۔“ سونے نے اپنا گریز جیسا ہاتھ چھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ پیچھے سے تمام لیا ”پتلوان۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”رہنمائی کا چودہ شرمندگی کے باوجود کھل اٹھا“ یار ناصر عمران خان کو شراب پلا دی تھی انہوں نے ورنہ گوا سکر کی تھی۔“

پتلوان نے رہنمائی کو چھوڑ دیا ”بازئی۔ بکواس کرتا ہے وارنے کے بعد۔ جب جیت کے جاتا ہے تو یوں نہیں چپ کر کے ٹھک جاتا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ پتلوان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور میری شخصیت سے زیادہ میرا لباس دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا ”چل رہنمائی۔ بچاس دوپے دے اور میرے ساتھ چل“ میں نے کہا۔

پتلوان کی ہنسی نظر آنے لگی ”بھرو ہوئی ناگل۔“ اور بچاس دوپے کی حق بات کے کان پر اڑاں لی۔

”یہ کبھی بھی کرتا ہے تو شرم آتی چاہیے تھیں۔“ میں نے کہا۔

”کیوں۔ وہ جو دس میں کھوٹے دوڑاتے ہیں وہ بڑے معزز کھلاتے ہیں۔ ہم سرخوں پر شرم لگائیں تو یہ شرم کی بات ہوگی۔ سچ ہے یار، سالی غرت ہی اصل میں شرم کی بات ہے۔ وہ نسل بھی کرتے ہیں تو خرچ نہیں ہوتا۔ ہم تو بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔“ اس نے آہ بھر کے کہا۔

مجھے ہنسی آگئی ”اے خرچ نہیں چرچا۔“

”تجھے کیسے یاد آگئی ہماری شرافت۔“ بڑا پھیل جھیلوٹا محسوس رہا ہے سالے۔ ایک دن تو لال پری کے سبک اڑا جا رہا تھا۔

شخص نے پچھلایا ورنہ تو نے تو سر نہیں چھوڑی تھی سچ مرگ پر چپا کر کے کی۔“

”کیا ایک ماہ ہے لیون لال پری؟“

”جس گاڑی میں تو ہوا کے کھوٹے پر سوار تھا۔ ہم سالے جو تیاں پٹکتے پھرتے تھے۔ تیری نظر کیسے پرکھتی تھی۔“

میں نے کہا ”جھا۔ تو گاڑی کی بات کر رہا ہے۔ لال پری نہیں وہ شرم شیراز تھی۔ تو بھی کیسے کیسے نام رکھا ہے۔ یہ عمران خان مرتا ہے؟“

”اور کیا اپنا دھڑکپ والا عمران خان لڑ رہا تھا یہاں؟“ وہ ہنس پڑا ”سالہ لٹے میں دھت تھا۔ ٹوٹنے کے بجائے چو پھیل لڑا رہا

تھا۔ گوا سکر کی جگہ اسے سری دیوی نظر آ رہی ہوگی۔“

”تیرا انصاف ہو گیا آج۔ دودھ ہوتا ہے یہ تمہارا؟“

”نہیں یار۔ چھتے میں ایک بار۔ بے ہوشے بازوں کا خزانہ ہیں سب ورنہ گوا سکر کا پاپ بھی نہیں جیت سکتا تھا۔ ایک کے دس کا بھاڑ چل رہا تھا۔ یار یہ کپڑے تو بہت فیشن ہیں۔ کہاں سے لیے پڑا مال خرچ کیا ہو گا۔ کس کا مال تھا؟“ اس نے مجھے آنکھ ماری۔

”جس پر سمجھ لے کہ اپنا نہیں تھا۔ گوا سکر میں بڑے پکرمیں پڑ گیا ہوں۔ تو نے دو لٹا میں مرئی حرام ہونے کا عاودہ تو سنا ہو گا۔

یہاں دو مرغیوں میں کما حرام ہو رہا ہے۔ مجھے بتائیں کیا کروں؟“

”یعنی ملا ہے تو مرغیاں کون ہیں؟“ رہنمائی نے گلے کے لال ردال کو ٹھک کیا اور پھر جب میں سے ایک سرکٹ نکال کے سیدھی کر کے لگا۔

”ان میں سے ایک کا نام ہے شاد۔“ میں نے کہا۔

”حسب توقع رہنمائی کا نہ کھلا نہ گیا۔ وہ سگریٹ جلاتا بھی بھول گیا۔“

میں نے کہا ”چل کیسے بیٹے کے بات کرتے ہیں۔ آج تو تیری ڈیوٹی نہیں ہے شاد کو لے جانے کی۔ دن میں فون پر باتو گوا س

نے مجھے۔“

”تجھے۔ اس نے۔۔۔ آپہنی نے فون کیا تھا۔۔۔ ختم اللہ پاک کی!“

”اے ہاں۔۔۔ میں نے اسے سمجھ لیا۔“ کرتی رہتی ہے وہ فون۔ میرے تو گلے پر گئی ہے وہ یار۔ شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے۔“

مدد سے رہنمائی اپنی جگہ پر جام ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں ”تو نے میں ہے۔ پائل ہو گیا ہے یا مذاق کر رہا ہے مجھ سے۔“

مجھے ایک کیسٹی کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بصوت نہیں بولا تھا مگر آج کے سچ میں کل کے امکانات کی طاقت بھی کروی تھی۔ رہنمائی جیسے محسوس دنا دار شادی کی محبت کا دم بھرنے والے

بے وقت عاشق کے مقابلے میں میری کامیابی یقیناً قابل فخر اور قابل دھک ضرور تھی مگر یہ کم غلی کی بات تھی کہ میں رہنمائی کو ہم ہم راز بھی سمجھوں ”اس کے جذبات کی تحلیل بھی کروں اور اس کی شکست پر اپنی حق کا ڈنکا بھی اسی کے سامنے زیادہ زور سے بجاؤں۔“

میں نے کہا ”اپنا لگتا ہے تیری حالت ہے کہ تجھے بہت مدد ہو رہی ہے جان کے۔ تو خود میں جھلا ہو گیا ہے۔“

اس نے ایک لمبی سانس لی ”جی بات یہ ہے یار کہ مدد تو ہوا مگر تجھ سے کیا مدد۔ سب اپنے اپنے فیصلے کی بات ہے۔

تم تو بھائی پلے ہی ناز گئے تھے کہ تجھ پر دل آ گیا ہے اس کا۔ اور دل سلا سب کا ایسے ہی کرتا ہے۔ اس چیز کے لیے چل جاتا ہے جو

میں نے کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ اس سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب

”میں چاہتا ہوں کہ شادی مجھ پر مجبور نہ کرے۔ کوئی شرط نہ لگائے۔ میں آج بھی اس کا ہوں، کل بھی رہوں گا۔ شادی کروں گا تو اسی سے۔ کیا شامپ کھو اے اگر وہ چاہے تو۔“

تھانے دار مرثیت تھی۔ قیم خانے کے فیجری۔ اس کا ذکر ناصر کے ساتھ آیا تو میرے دل میں سوئے ہوئے درد کی جنگاری پھر سے

زمانے کی کھوکھلی کھال، ہر دور سے نئے کی طرح دھتکارے جانے اور نئے سے بدتر زندگی گزارنے والے سے مجھے اس حق گوئی، بے مایگی اور شدت احساس کے ایسے رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ ایک دم اٹھا اور باہر چلا گیا۔ میں پیچھے دیکھتا ہوں اس کے پیچھے نہیں دوڑ سکتا تھا۔ جتنی دیر میں کاؤنٹر پر براہیان پر دوڑا کرتے تھے وہ میرے بل کی رقم دریافت کی تھی۔ مجھے سے ساڑھے سات روپے وصول کیے اور میں ڈھائی روپے جیب میں ڈال کے باہر چلا گیا۔ بہت دور چلا گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے توازدی اور اس نے ایک بار پلٹ کے بھی دیکھا۔ اس کی نظریں میرے لیے کوئی عزت بائی نہیں رہی تھی۔ وہ سامنے جانے والی ایک چلتی بس میں سوار ہو گیا۔ بس کے پائیدار سے ٹک کے اس نے میری طرف دیکھا اور سڑک پر تھوک دیا۔ میں سڑک پر بے عزت کھڑا گیا۔ میں بہت ذہین تھا۔ (آئی کیو ایک سو تیس) میں نے بہت کتابیں پڑھی تھیں۔ میں ایک کوٹھی میں رہتا تھا۔ جتنی کپڑے پن کے گاڑی میں گھوستا تھا۔ بڑا منظم بیرو تھا۔ بڑا بہت والا تھا۔ بہت بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ جس پر شاد مٹی تھی اور جو ایک لیلڈی ڈاکٹر بیگ صاحب کا منظر نظر ہو گیا۔ وہاں کسی ننگے کوڑھی فقیر کی طرح خود اپنی زلت کا نشانہ بن گیا۔

مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں نے نہیں کے سامنے بہت شان بگھاری تھی۔ بڑی بگھاری تھی۔ میں اسے احساس کسری میں جلا کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شاد پر مرنا ہے اسے شاد کے ذکر سے جلائے 'خدا' میں جلا کرنے اور خود اپنی نظریں سے گرانے کی پوری کوشش کی تھی۔ یہ اس کی فراخ دلی تھی کہ اس نے رفاقت میں کینہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ حشر اور دوستی جذبات کے کھیل ہیں۔ نفع نقصان کے سودے نہیں۔ اور پھر میرے جھوٹے غور اور لامحالہ احساس برتری کے خناس پر لعنت بھیج کے چلا گیا تھا۔

میں بہت دیر تک سوچوں پر بے متغیر چڑھا رہا۔ میں شاد کے خیال سے دامن چھڑا چاہتا تھا مگر اس کا تصور ہر قدم پر ہم رکاب تھا۔ ایک تصویر خیالی تھی جو رات کے اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح کبھی میرے آگے چلے لگتی تھی تو کبھی میرے تعاقب میں۔ اس کا ہر انداز میری نگاہوں کے سامنے ایک جھلک دکھانے کا تھوڑا سا تھا۔ وہ مجھے ہنسی ہوئی، مسکراتی ہوئی، آنسو بہاتی ہوئی، خیالوں میں گھومتی ہوئی، مجھے پراسید نظروں سے دیکھتی ہوئی، بے یقینی کے مظاہر تھی ہوئی، 'حیران دل' زدہ خواب دیکھتی، سارے کے لیے ہاتھ پھیلاتے، میرے شانے پر سر رکھ کے روٹی خوشبو پھیلاتی، زلفوں کو جھلکتی، سبک انگلی میں انگریزی پن کے دکھائی اور پاپوس چہرے کے ساتھ دایمیں کرتی، ہر پردہ میں جلوہ نما نظر آتی۔

میری بی بی بڑی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ چار سال تو بہت دور کی بات ہے۔ چار منٹ میں حقیقت سامنے آگئی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا 'میری دنیا کوئی بھی کسی کے لیے نہیں چھوڑا۔ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ

بہت میں ہے تمہیں۔"

مجھے اپنی بددلی پر شرم آنے لگی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھ پر اس سے دوری کا ہر لمحہ زیادہ خت اور بے رحم ہوتا گیا۔ "دیکھنے میں تو محو ہو گا لیکن تو چہ ہے ابھی۔ غلطی میری تھی کہ میں نے سمجھا تو محو ہے۔ ایسے ہوتے ہیں مرد، موزن پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ نظروں کے جذباتی ڈائلاگ بولنے والے نوحے سے بات کیا جائیں۔"

شادی کی توازدی مجھے کچھ کے لگا رہی تھی۔ اس کی ہر بات مجھے اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر شرمسار کر رہی تھی۔ مراگھی کے سارے دعووں پر شکست کی فضا میں دو چار کر رہی تھی۔ حالات کے ساتھ میرے قدم بھی ہلکے رہے تھے۔ اچانک میں نے شاد کے گھر کا راستہ پکڑ لیا تھا۔ پھر میری نظریں فقیروں کا گھر آجایا تھا۔ پیٹے ہوئے میل بھرے کپڑوں، کندہ اور پڑھنا پڑھنا دیے جانے والے جسموں اور بھڑا جھکاڑ بالوں والے میرے کان ان کی غرت اٹھیز اور غلیظ باتوں سے پھٹنے لگے تھے اور اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سب ل کر مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ اپنے پیٹے پلٹا دانتوں کی نمائش کر رہے ہیں۔ جس والی سگریٹوں کا دھواں مجھ پر چھوڑ رہے ہیں اور اپنے گالے پیٹے ہاتھ بدھانے میرے جسم سے کپڑوں کو نچوڑتے ہوئے چلا رہے ہیں۔ انہی ایک اور۔ آندو اس کے یہ شزاروں والے کپڑے پھاڑو، تار تار کردو اس کی شرافت کا یہ لباس جس پر اسے بڑا غور تھا۔ نگاہوں سے اور بھروسے دو فقیروں کی خلعت کاغذ، تھوڑا سا سنگول اور رکھ دو اس کے سر گردانی کا آج۔ بابا۔ وزیر اعظم صاحب 'بولو اللہ کے نام پر گندم کا سوال ہے۔ خلی دانا' ہاتھ پھیلا کے کو غریب محتاج کو ایک ارب ڈالر کی بھیک دے۔ اللہ تیری بارشاہت قائم رکھے۔ امریکا بھادر، ہمارے قرضوں کا سود معاف کر دے۔ سود خرام ہے بابا۔ اسی لئے تو ہم نے ہرنوٹ پر لکھ دیا ہے کہ رزق حلال کا حصول عین عبادت ہے۔ ہم حرام کی کمانی نہیں کھاتے۔ حرام کی کمانی سے حلال چیزیں خرید کے کھاتے ہیں۔

میں گھبرا کے راست بدل لیتا تھا۔ نہیں میں فقیر نہیں بن سکتا۔ میں شاد کو سمجھا سکتا ہوں۔ اسے قائل کر سکتا ہوں کہ میں سچا ہوں۔ میرا حشر سچا ہے۔ وہ جیسے چاہے جب تک چاہے آزمائے مگر یہ عزت کس کا خون کرنے والی شرد عاکنہ کرے۔ مجھے بے غیرت بننے پر مجبور نہ کرے۔

رات کے دس بجے میں شکست خوردہ اور تھکا ہارا لوٹ کے پھر وہیں گیا جہاں سے میں بڑے بائیں کے ساتھ راوڈو پر سرفرازا گیا تھا۔ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی جیلی کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان کے دو مئی رات سے پہلے لوٹ کر آئے کا امکان نہیں تھا۔ ملازم نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا اور خاموشی

سے اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گیا۔

میری آنکھوں میں نیند نہیں شاد کا خیال تھا۔ اس نے بڑی بے چینی سے میرا انتظار کیا ہوگا۔ بڑے اہتمام سے وہ مل کا دروازہ کھول کے کچھ میز پر بیٹھ کر بیٹھ رہی ہوگی۔ اس کو میرے عہد و پار ایمان اور یقین کی شکست کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ اس کے دل میں ایک خواب کی تعبیر کے خیال سے نکلنے والی وہ خوشی ہوگی جو اطمینان اور اطمینان ہے۔ بھروسے کے ہر لمحہ گزراں کے ساتھ اشتباہ کا آئینہ چھٹنے لگا ہوگا اور اس کا انتظار رفتہ رفتہ اضطراب میں اور بھراؤ میں ڈھل گیا ہوگا۔

ایک آواز جیسے میرے احساس پر آواز بن گئی۔ یہ آواز اندر سے آ رہی تھی۔

ڈھل گئی رات بھر نے لگا تاروں کا غبار سو گئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر ٹوکڑاٹے لگے اپناؤں میں خوابیدہ چراغ گل کرو تھیں بھڑا دے دینا دیا پانچ اپنے بے خواب کواڑوں کو منتقل کرلو اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا میں تڑپ کے اٹھا اور تڑپ کے بولا "بند کرو اسے۔ یہ کیا لگائے بیٹھے ہو۔ تمارا داغ تو خراب نہیں ہے۔"

ملازم نے لی ڈی بند نہیں کیا۔ "ماستر صاحب۔ ایسے تو ہم سے ڈاکٹر صاحب بھی بات نہیں کرتے۔ مالک نے اجازت دے رکھی ہے ہم کو تو آپ کا کہہ کو چلاتے ہو۔"

میں نے دھڑلے بند کیا اور پھر بیٹھ کر لیٹ گیا۔ داغ میرا خراب ہو رہا تھا۔ مجھے ملازم کے گستاخ کیلئے پر غصہ کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ اس نے بالواسطہ طور پر مجھے یاد دلایا تھا کہ میں مالک نہیں ہوں۔ کیا ہے میری حیثیت اس گھر میں آخر؟ یہاں بھی تو میں خیرات کے گھر سے توڑنا ہوں۔ رہیں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ کون سا تیرے باپ کا گھر ہے۔ یہاں کے پیش و آرام کو اپنا حق سمجھ کے مت اترا۔

خیرات تو خیرات ہی ہوتی ہے۔ عزت سے بن مانگے لے لیا ہاتھ پھیلاتے۔ ڈاکٹر صاحب جو کچھ میرے لیے کر رہے تھے اس میں زخم کا جذبہ شامل ہے۔ وہ ایک غریب لاوارث پر ترس کما کے ٹنگی کا ثواب کمار ہے ہیں۔ ہر دولت مند اسی طرح دل کا اطمینان خریدتا ہے۔ اس احساس کی گمانیت خریدتا ہے کہ دنیا کے ساتھ اس نے عاقبت کے لیے بھی کچھ کیا۔ وہ نماز میں پڑھتے "اللہ میاں بالکل ہی ناراض نہ ہو جائیں اس خیال سے زکوٰۃ نکال کے ایک نیم کی پودش کر رہے ہیں۔ شیم کے ساتھ حسن سلوک کا پورا کر ڈیٹ بونس میں مل رہا ہے۔ جج نہیں کیا مگر دوبار نیم صاحب کے ساتھ دو مئی اور شاد کے گھر کے دینے بھی ہو آئے۔ عرصے کی سعادت ایک تقریبی دورے کا بونس۔ ایسی فزنی شاپنگ + عرصے کا

ثواب۔ ایک گھنٹ میں دو مڑے۔

فیصلہ تو میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ صورت حالات کے نقل و نشان ہونے سے پہلے ہی مجھے اپنی عزت کی تحریک باندھ کے اس گھر سے کوچ کرنا چاہیے۔ رہیں کے غصوں کی عقل نے اس پر شرم تصدیق ثبت کر دی۔ اس خوش فہمی کے جنجال میں پھنس کر میں اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ میرا گھر وہی ہو گا جو میں بناؤں گا۔ جس کے دروازے پر بھی ہوئی نیم پلٹ پر میرا مل لکھا ہوگا۔ اور جس میں بیگم صاحبہ ہوگی شاد۔

اس فیصلے نے دو سوالات پیدا کیے۔ ایک یہ کہ اس گھر سے پورا بستری گول کرنے کے بعد میرا اٹکا چڑاؤ کہاں ہوگا؟ اگر میں فقیروں کے زیرے پر فقیر بن کے نہیں رہتا تو کیا شاد کا گھر پر اعتبار باقی رہے گا اگر کھلی لے جھوں کے دلائل سے متاثر ہو کے اپنی اس شرط سے دستبردار ہو کر قبول نہ کیا تو مجھوں ہو گیا دھلی کا کتا؟ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ عورت کی خند کے آگے الاطون بھی کیا کر سکتا ہے۔ جتنے منظم ارادے کے ساتھ میں اس گھر سے تعلق کو قطع کر سکتا ہوں کیا اتنی ہی آسانی سے شاد کو بھول جانا میرے اعتبار کی بات ہوگی؟ کیا شاد کو بھی میں اسی طرح اپنی زندگی سے خارج کر سکتا ہوں جیسے میں نے گزشتہ ہوئے وقت کی ہر دل آزار یاد کو طاق نبیاب پر رکھ دیا ہے۔

اگر خواب ہے نہیں تو پھر مسٹر راجم شمسو؟ جو ایسے سو جوتے اور سو بیاڑنوش فرما میں گئے آپ؟

لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی صبح سے رات تک بجتی رہی تھی مگر اس سے میرا کوئی تعلق آج سے پہلے نہیں تھا۔ آج پہلی بار کسی نے پوچھا تھا کیا ناصر عظیم صاحب یہاں رہتے ہیں۔ جی رہتے تھے کل تک۔ بس اچانک انتقال کر گئے۔ وجہ کچھ نہیں کہاں منتقل ہوئے ہیں، کچھ پانچ نہیں۔ دردناک برکدن راوی۔ بیگم صاحبہ نے ایک بار منتقل پر گاڑی مدد کی تو وہ کھڑا ہاتھ میں لے بے خیالی میں کڑی کے پاس نمودار ہوئے تھے۔ دیکھے بغیر فرمایا "مائی اللہ تیرا ساگ سلامت رکھے۔ اندر سے محتاج کو کچھ دے جا۔ آواز پہچان کے بیگم صاحبہ کو ٹک ہوا تھا لیکن منتقل کر بن ہو گیا اور وہ فقیر خود نور گیارہ لکھ دس تین تیرہ ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خیال الملب ہے کہ نیچے صرف لنگڑی اور اوپر ایک رتھیں منکوں کی ملا اپنے سنگول والے وہ مجذوب خود ناصر عظیم تھے۔ ہمارے مستقبل کے وزیر اعظم، اکیسویں صدی میں بڑا انقلاب آچکا ہوگا۔ عام وزیر شاید صرف ایک منکوں کی ملا ہی زیب تن کر سکے گا۔ ممکن ہے صدر کو تباہ بن جائے۔

خادم نے اچانک دروازہ کھول کے کہا "ماسٹر جی۔ فون۔"

اور غائب ہو گیا۔

میں بڑبڑا کے دروازے کی طرف دوڑا "بہن! کس کا فون ہے؟"

کشیہ تعلقات کے باعث ملازم نے منہ بگاڑ کے کہا "میرا ہوتا تو آپ کو کیوں ملا؟"

"آخر کون ہے نام پوچھا؟"

"میں کسی لڑکی سے نام کیوں پوچھوں آپ کو توچا ہو گا۔"

میں نے ملازم کے منہ نہ لگتا ہر سمجھا اور اپنی خودی بلند رکھتے ہوئے رہیہ راغیاں "ہیلو۔"

"نام صرف تو شادو کو جانتا ہے؟ تو نے ایک وعدہ کیا تھا اس سے۔"

میری شئی تم ہو گئی "وہ دراصل۔۔۔ سخت بخار تھا مجھے۔"

"جھوٹ مجھ سے؟" اس نے پڑا ملت لیے میں کہا "میں بتاؤں تجھے کہ تو نے آج کیا کپڑے پہنے تھے اور تو کس وقت کہاں تھا؟"

میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کو سا جب میں نے اسے اپنا فون نمبر دینے کی غلطی کی تھی۔ ملازم ایک ہاتھ کمر پر رکھے پرے سے خیر انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں نے رہیہ پر ہاتھ رکھ کے کہا "کیا میں رہے ہو اتنی تیز نہیں ہے جس میں کہ فون پر کوئی بات کر رہا ہو تو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔"

"اچھا جی!؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا "ہم نے تو کچھ بھی نہیں سنا ماسٹر صاحب۔ کام کر رہے ہیں ہم تو اپنا "وہ بھانڈا اٹھا کے صوفے صاف کرنے لگا۔"

میں نے دباؤ کے کہا "رفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں ماردار کے تمہاری ہڈیاں تو زردوں گا۔ اس خیال میں مت رہتا کہ مالک یا مالکن تمہاری سٹیں گے میں خود تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔"

وہ ایک دم ڈر گیا۔ میرے مقابلے میں وہ دھلا پٹلا اور کمزور بھی تھا اور شاید وہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ وہ خاموش۔۔۔ تنک گھاتا میں نے کہا "معاف کرنا شادو کی۔"

"کس پر چلا رہا تھا تو؟"

"ایک نوکر ہے حرامی" میں نے کہا "کیا تم نے دن میں بھی فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ بس میرا جی چاہتا تھا سے بات کرنے کو۔" اس نے بڑی بے باکی سے کہا "سوچا ہوا تھا بیگم صاحب کے ساتھ شاپنگ کرنے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"تمہی بھانجی نے "وہ بولی "بیگم صاحب کی بیٹی نے۔"

میں نے جڑبڑ ہو کے کہا "بالغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا۔"

"یہ بتا آج کیا کیوں نہیں؟"

"شادو کی۔ ایک تو مجھے موقع نہیں ملا تھا بات کرنے کا۔ ڈاکٹر

صاحب صبح میرے گھٹنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ اس کے علاوہ۔"

"اس کے علاوہ کیا۔۔۔ جب تو نے سوچا تو وہی ہونا جو میں نے کہا تھا۔ تیرے دماغ نے دل سے کہا کہ یہ پاگل ہیں۔"

میں نے بہت سے کام لیا "ہاں۔ وہ بھی ایک وجہ ہے۔ شادو جی 'ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ کسی کے اعتبار کو آنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ میں تمہارے لیے یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ جس میں میری مدد کی ضرورت ہے تو جان حاضر ہے۔ قلمی ڈائلاگ مت سمجھا اسے۔ تم جو کوئی میں کہوں گا کہ۔۔۔ ہیلو۔ شادو کی۔۔۔ ہیلو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رہیہ پر رکھ دیا۔ وہ نہ جانے کب فون بند کر چکی تھی۔ اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کچھ سمجھتا نہیں چاہتی تھی۔ میں ذہنی طور پر اپنا پریشان تھا کہ مجھے گھر والوں کے آنے کی خبری نہیں ہوئی۔ میں پلٹا تو بیگم صاحب کو دیکھ کے میری وہی حالت ہو گئی جو تجوری سے مال صاف کرنے والے چور کی گھر کے مالک کو اپنی راہ میں مائل دیکھ کے ہوتی ہے۔

"آپ۔۔۔ آپ کب آئیں؟" میں نے بوکھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے مسکراتے کی کوشش کی۔

"یہ شادو کون ہے؟" بیگم صاحب نے کہا "وہی نرس ا"

"جی۔ جی۔ جی۔۔۔ پیچھے پڑتی ہے میرے خواہ خواہ۔" میں نے کہا۔

"تم اسے سمجھانے گئے تھے یا خود اسے سمجھنے۔"

"بہت سمجھایا تھا میں نے۔۔۔"

انہوں نے میری بات کاٹ دی "کل ڈاکٹر صاحب تمہارے ساتھ جا کے اپنی زبان میں سمجھائیں گے شادو یا شاید ہو گا اس کا پورا نام "تم گھر مت کرنا۔"

میں اپنے کمرے میں آکر بند پر گر گیا۔ جھوٹ بول کر میں نے خود اپنے پاؤں پر کھلاڑی مائل تھی۔ میں کہہ سکتا کہ وہ مجھے نہیں ہے۔ اس نے اپنا چارے غلط بتایا تھا۔ اب میں ڈاکٹر صاحب کو کیا بتاؤں گا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ بیگم صاحب تو ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کریں گی کہ وہ صبح اسپتال جائے ی اس نرس کو توپ سے آزادیں۔ وہ بڑے توپ قسم کے ڈاکٹر تھے۔ ان کے مقابلے میں ایک نرس کی کیا مجال اور اوقات۔

صبح کے قریب مجھے نیند آئی تھی۔ شاید میں بھر دوپہر تک سو رہا لیکن بیگم صاحب نو بجے تشریف لے آئیں۔ انہوں نے پیام سے کان سمجھ کے مجھے دکھایا۔

"صبح اٹھنے سے آوی عقل مند، دولت مند اور صحت مند ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں بے وقوف، غریب اور بیمار رہتا ہوں کہ بیگم صاحب۔"

کا۔ جیسا کہ میں ہوں۔"

"بے وقوف تو تم ہرگز نہیں ہو۔۔۔ سروں کو بے وقوف بنانے

کیا ہے پناہ صلاحیت رکھتے ہو۔ غریب بھی نہیں رہو گے کیونکہ آئی کیو ایک سو تیس ہے تمہارا۔ بیماری بتا دیا ہے۔ آخر میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ پریکٹس نہیں کرتی تو کیا ہو؟ انہوں نے میرا ہاتھ دیکھا پھر نبض دیکھنے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لیا جو تو کیا مسئلہ ہے؟

اس سے پہلے کہ وہ میرے دل کی دھڑکن سننے کے لیے اپنا سر میرے سینے پر رکھنے کی کوشش کرتی تھی میں ہاتھ چمڑا کے اٹھ کھڑا ہوا "لوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں۔ ایک مسئلہ آپ خود ہیں۔"

انہوں نے تبسم فرمایا "یہ مسئلہ تم حل کر سکتے ہو۔ دوسرا مسئلہ ہے وہ نظامہ شادو۔ میں نے کہہ دیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ آج اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ ابھی چھٹی ہو جائے گی اس کی اسپتال سے۔ تم کیا فصل کرو گے اچھے نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔ جلدی سے آجاؤ۔"

ناتے ہوئے میں نے خدا سے دعا کی "ایا میرے سولہ۔ مجھے اس مشکل سے نکال۔ کیس شادو نام کی کوئی نرس ملا دو نہ برطرف کر دی جائے خواہ کچھ اس کو بد چلی پر مودہ لازم قرار دے دیا جائے۔ اور میرے اعصاب پر شادو کی باراش کا خیال سوار تھا تو اور تبسم صاحبہ اپنے اور میرے درمیان قاضی کو تیزی سے کم کرنے پر کمر بستہ تھیں اور شاید مجھ سے امید رکھتی تھیں کہ سکتل گرین ہے تو میں آگے بڑھوں۔ جب کہ میں سکتل پر اس انٹری ڈرائیور کی طرح رکا ہوا تھا جس کی گاڑی بند ہونے کے بعد اشارت ہونے کا نام نہ لیتی ہو۔

آگے کتواں پیچھے خندق۔ اس دہری مشکل سے بچنے کا مجھے ایک راستہ یہ نظر آتا تھا کہ میں دائیں یا بائیں نکل جاؤں۔ پہلے تو کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر اس گھر سے غائب ہو جاؤں۔ بتائے جانے کی صورت میں تبسم صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کے اُن محنت سوالات کا تسلی بخش جواب دینا مجھے ناممکن محسوس ہوتا تھا۔ اگر میں سامان سیمینا تو کپڑے جو تے اور ذاتی استعمال کی سب ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں ساجتا میں مگر شادو نے کہا تھا کہ سوٹ کیس مت لانا۔ کپڑے جو تے اور کتابیں چادر کی گھڑی ہانکے باندھ لانا۔ گھڑی اٹھا کے لکھنا بھی آسان نہ ہوتا۔ سوٹ کیس بھی اچھا خاصا بڑا تھا۔ تن کے کپڑوں میں لکھنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مزید کپڑوں کی ضرورت محسوس ہونے پر میں شادو سے پیسے لے سکتا تھا۔ اس نے میرے دیے ہوئے دس ہزار قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ رقم ایک طرح سے اس کے پاس میری امانت تھی۔

یہ حل مجھے قابل عمل لگا۔ میں غائب ہونے کا پتہ نہ تھا۔ توجہ شام شادو سے ملاقات کروں اور اسے قائل کرنے کی کوشش کروں کہ وہ بہت سے کام لے اور میرے ساتھ چلے اگر وہ مان جاتی ہے تو درباروں میں کوئی مقتول ساجتا کر کے میں ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں گا کہ میں اس گھر سے جاؤں پر مجبور ہوں۔ مجھے کراچی میں کسی رشتے کے چاچے سے ملنا چاہیے اور وہ جاتا ہے کہ میں اس کے

ساتھ رہوں۔ یا یہ کہ کسی دوست کے باپ نے مجھے اپنی جیلی کے ساتھ دوئی لے جانے پر آمادگی ظاہر کی ہے اور میں یہ موقع گواہ نہیں جاتا۔

اگر شادو اپنی ضد پر اڑی رہتی ہے کہ نہیں۔ پہلے تم یہاں آؤ اور اس گھر میں دیے دی رہو جیسے میں چاہتی ہوں۔ تو میں درباروں دل پر پھر کہہ کے قید با مشقت کاٹ سکتا ہوں اور یہ مجھے کرسکتا ہوں کہ شادو کی محبت کی انتہا کیا ہے۔ میں اس کے لیے کہاں تک جاسکتا ہوں اور پھر وہ میری قربانی اور آزمائش میں کامیابی سے متاثر ہو کے کیا کرتی ہے۔ شاید مجھے عذاب میں جلا دیکھ کے اس کا دل بچ جائے۔

یہ ایک قابل عمل طریقہ تھا۔ جو رقم بینک میں محفوظ تھی وہ میں بعد میں کسی بھی وقت شادو کے اکاؤنٹ میں ڈرافٹ کر سکتا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے صرف ایک کراس چیک لیتا جس پر میرے بینک کی مجموعی رقم درج ہوتی اور چیک پر شادو کا نام لکھا ہوتا۔ میرے اچانک غائب ہوجانے سے ڈاکٹر صاحب کو پریشانی نہ ہو۔ اس کے لیے میں کہیں سے انہیں فون کر سکتا تھا یا گھر پر ایک رتھ چھوڑ کے جاسکتا تھا کہ مجھے ایک ضروری کام سے اچانک کراچی جانا پڑا ہے۔ دو چار دن میں لوٹ آؤں گا۔ نہیں گھر سے نکلنے کے بعد میں انہیں یہ رتھ ارسال کر سکتا تھا کہ انہیں شک نہ ہو اور شکایت نہ ہو کہ میں نے ان کو اپنے عزائم سے بے خبر رکھا۔ ظاہر یہ ہو گا کہ باہر جانے کے بعد کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو گی کہ میں گھر آئے انہیں کچھ نہ بتا سکا۔ فون کرنے میں پھر وہی مسئلہ ہو گا۔ مجھے ضروری کام کی نوعیت کے بارے میں بے شمار سوالات کیے جاتے۔

یہ ٹھیک ہے، میں نے سوچا۔ اگر مجھے لوٹ کے آنا پڑا تو میں کہہ دوں گا کہ کراچی میں جس عزیز کی سوجوگی کا پتہ چلا تھا وہ بات غلط تھی۔ یا یہ کہ میرا ان کے ساتھ گزارا مشکل تھا اس لیے میں لوٹ آیا۔ جس جیلی کے ساتھ مجھے دوئی جانا تھا وہ کچھ مشکلات کے باعث ایسا نہ کر سکی۔ کچھ دستاویزات کا مسئلہ تھا وغیرہ وغیرہ۔

فصل کے بعد کپڑے بدل کے میں ناشتے کے لیے پہنچا تو اسی ضیعت ملازم نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا "امی ماسٹر صاحبہ یہاں کہاں؟ آپ کا تو بابر لانا پر انتظار ہو رہا ہے۔"

"تبسم صاحبہ لان پر بیٹھی ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں پر تو نہیں گری پر بیٹھی ہیں؟" وہ بولا "آپ کی وجہ سے ابھی تک انہوں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔"

اس کے لیے اور انداز سے مجھے خطرے کی گھنٹی صاف سنائی دی۔ ایک ملازم اس سے زیادہ کل کے اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ گھر میں رہ کے اس نے بیٹھائے مشق کے منہ کی خوشبو سو گھ لی تھی۔ نازنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بہت کم وقت گھر میں گزرتا تھا لیکن ایک یہ بد تمیز اور منہ

چڑھا کر اور دوسری وہ بوڑھی ملازمہ جو اس کی ماں تھی۔ کسی معاملے سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی نگاہیں ہر وقت سب کچھ دیکھتی رہتی تھیں۔

تبسم صاحبہ واقعی سربا انتظار تھیں۔ خطرے کی گھنٹی اب بجنے کی طرح گونجنے لگی کیونکہ تبسم صاحبہ کا اہتمام بھی قابلِ دید تھا۔ وہ ساری اور پڑکاری بے خودی وہو شکاری کا قابلِ اعتراض نمونہ بنی بیٹھی تھیں مگر اعتراض کون کر سکتا تھا۔ وہ گھر کی مالک تھیں اور گھر کے اندر انہوں نے آسانی کی خاطر شوق میں اپنے شوہر نامہ دار کی مردانہ کارروائی قیاس پسندی اور اس کے ساتھ جینز کی چلون تو ان کی مرضی اور خوشی۔ خود ڈاکٹر صاحب انہیں اس طے میں دیکھتے تو ریشہ تعلیمی ہو جاتے۔ جینز وہ پستی تھیں مگر خاص مواقع پر شٹا ایک بار سب ہلکے پر گئے تھے۔ دوسری بار وہ سری کاغان کے در سے پر گئے تھے تو سب جینز میں لبس تھے۔

پریشانی یہ تھی کہ تبسم صاحبہ کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کی قیاس پسندی ضرور زیادہ تھی مگر جو ذاتی کم تھی چنانچہ قیاس تبسم صاحبہ کو اوپر سے بھی جانت تھی اور نیچے لوگوں کے پاس سے بھی۔ مزید یہ کہ اس عقلی کے نتیجے میں سیاہ قیاس کا اوپر والا ایک فٹن کھانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود تبسم صاحبہ کی جوانی کا سبیل بے مثال ہو کے نہ گزرتا تھا اور آثار بتاتے تھے کہ دوسرا جنن خود اپنی شکست تسلیم کر لے گا۔

میری گھبراہٹ کا اندازہ انہوں نے ایک نظریں کر لیا ہو گا اور اس سے پچھتا نہیں اپنی قوت تفسیری سحر آفرینی اور اپنے شاہد کی ہلاکت فیزیکی دیکھ کے خوشی حاصل ہوئی ہو گی۔

ناشتا ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ بلائے نامانی بن کے شادو نازل ہوئی۔ اس نے ایک بد صورت بوڑھی نفیسی کا ہمیں بدل رکھا تھا اور ایک لادھکی کو سارے کے لیے تمام رکھا تھا۔ گیٹ پر اسے چوکیدار نے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے چوکیدار کو دھکے کر کے ایک طرف کر دیا "جیل بہت نفیسیوں کے راستے سے نامراد" اور اس کے سنبھلنے سے پہلے لادھکی زور زور سے سینٹ کے فرش پر مارتی ہوئی لان تک پہنچی تھی۔ چوکیدار پھر اس کی طرف لپکا۔

"رک جا۔ وہیں رک جا بد بخت۔ کیوں دھکی کر رہا ہے اپنے آپ سے اور گھروالوں سے؟" اس نے کڑک کے کہا۔ چوکیدار رک گیا۔

"کیا ہے مائی؟ تبسم صاحبہ نے بد مزگی سے کہا؟" ایسے اندر کیوں تھکی چلی آ رہی ہو؟

چوکیدار تبسم صاحبہ کی بات سن کے پھر آگے بڑھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی شادو نے لان پر ڈرا جھلیا۔ میرا خون تو اسے دیکھتے ہی خشک ہو گیا تھا۔ مجھ میں بہت نہ تھی کہ اس سے نظر بھی ملا سکتا مگر اندری اندر مجھے اس کی بد معاشی پر سخت پیش آیا تھا۔ وہ مجھے بلک سہل کرنے پر آمادہ معلوم ہوتی تھی۔

"اللہ تعالیٰ جوڑی سلامت رکھے شزاری۔ خیرات دینے سے خیر برکت ہوتی ہے۔ لا اپنا ہاتھ اور ہلا" اس نے بہترین اداکاری اور صداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پوچھتے ہیں کہ میرے نصیب میں کیا ہے؟ پوچھ؟"

تبسم صاحبہ نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا "ماسٹر کیا خیال ہے؟"

میں نے بڑی مشکل سے توازن نکالی "جی۔ میں کیا کہوں۔ میں تو یقین نہیں رکھتا ایسی باتوں پر۔"

"محنت مجھ نے پر خدا کی لعنت دعا دینے والے پر سوار لعنت۔" اس نے جلال لہجے میں مجھ پر نظر جمائے کہا "فقیر سب جانتے ہیں کس کے دل میں کیا ہے۔ اگلا پچھتا سب بتا سکتے ہیں۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "تبسم صاحبہ۔ یہ سب دھوکے ہیں لوگوں کو بے وقوف بنانے کے۔"

"حق اللہ" شادو نے ایک ٹھوک لگا "حق کا بول بالا۔ اور ہلا اپنا ہاتھ شزاری۔ آؤا کے دیکھ مجھ سے اور بچے کو۔ چہرہ ہاتھ کا میل ہے۔ دل چاہے دے دل چاہے سنبھال کے رکھ۔ فقیر کی دعا کی کوئی قیمت نہیں۔ سارا کھیل نصیب کا ہے۔ حق اللہ اللہ برحق۔"

تبسم صاحبہ اس کی باتوں سے متاثر نظر آنے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "سو دیکھو پہلے میرا ہاتھ۔"

اب شادو نے انجان بن کے وہ سب بتانا شروع کیا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ تبسم صاحبہ اپنے لاس "انداز و اطوار اور میک اپ سے کسی شزاری سے زیادہ ماہر لگتی تھیں۔ ظلموں، ٹکلی وڈن کے ذرائع اور قصے کہانیوں نے شزاری کا جو اثر قائم کر رکھا ہے تبسم صاحبہ اس کے بالکل برعکس تھیں مگر انہیں ایسا ہی شزاری کھانا اچھا لگا رہا تھا اور اس خوشگوار نفسیاتی رد عمل سے شادو نے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ باتوں سے بے وقوف بنانے کے فن میں طاق تھی اور بلاشبہ بہترین ایکٹریس تھی۔

"فقیر کی بات دھیان سے سن۔ بڑا اچھا نصیب لائی تھی تو اپنے ساتھ۔ جگ جگ کی شزاری تھی۔ تجھ سے رشک اور حسد کرنے والے بہت تھے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" تبسم صاحبہ نے منہ کے کہا۔

"سن" آگے سن۔ تو نے سب پایا۔ علم کے سارے خزانے سمیٹ لیے۔ لکھنے لکھنے جیسے خاصا علم دیا۔ مجھے دیکھنے دے۔ ہاں شزاری "جب تو چھوٹی تھی۔ تب بھی اپنی معصوم شرارتوں سے اور پاری پاری باتوں سے لوگوں کو ہنسائی تھی۔ دھکی دل شاد ہوتے تھے تو میں چاہتی تھی۔ لوگوں کے دکھ ہانٹا۔ لوگ مٹاؤ درو سے نجات دلاتا۔"

"کمال ہے۔ اسے کیسے معلوم ہو گیا؟"

"جج میں مت بول۔" اس نے تبسم صاحبہ کو ڈانٹ دیا "کیا یہ

وزیر اعظم بن سکا ہوں میں نے معنوی فتح لگای۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی سی بات کہہ کے شاید مجھ سے اب کوئی بات نہ کرے گی وہ بیکر صاحب کو پھر کسی ہمارے اندر بھیج دے گی کہ جیلا کاغذ اور لال پوشاکی لالہ کالی مرئی کا پرلا۔ اور کاغذ پر کچھ نقش بنائے تھوڑے دے دے گی کہ نماز فجر پڑھ کے سورج کی سنہری کرنوں والے پانی میں گھول اور پانی سے چائے بنائے اپنے محبوب کو پلا دے مگر جیواں۔ وہ لال لال گائے کا ہو۔ تھوڑے گھنٹے کے لئے والے ایسے ہی ذرا سے کرتے ہیں اور کرتے ہیں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اپنے افسوس ناک حد تک بد وضع کپڑوں کے اندر کی کسی جیب سے اس نے ایک تھوڑی سی برآمد کر لیا جو چمڑے میں رولا ہوا تھا اور بیکر صاحب کو دے دیا۔ یہ ہے جس رات پورا چاند ہو۔ اسے چپکے سے اس کے گلے میں پار کی طرح بٹا دے۔ وہ میرے گلے کا پار ہو جائے گا۔

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا مگر بیکر صاحب نے تھوڑے ہی بعد اجازت کے ساتھ ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور چہ۔ شاد نے ہزار روپے اسی جیب میں ڈالے اور لاٹھی کے سارے کٹری ہو گئی۔ بیکر صاحب اسے دو دانے تک چھوڑنے لگیں۔ مجھے ان کی ذہنی حالت اور ایمان کی کمزوری پر افسوس ہوا۔ آخر لوگ خدا سے کیوں نہیں مانگتے جو سب کے دلوں کا حال جانتا ہے اور سب کی مرادیں پوری کرتا ہے اگر طلب میں دیا اور ہوس کو مدخل نہ ہو۔ ہاں کل عورت پورے چاند کی رات کب ہے؟ شاید آج۔ کیا یہ واقعی اس تھوڑے کو میرے گلے میں پستانے کی کوشش کرے گی۔ اور وہ بھی چپکے سے۔ مجھے ہنسی آگئی۔

”یہ لوگوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ ہنس کیوں رہے ہو؟“ بیکر صاحب نے واہیں آکے کہا۔

”سننے کی قوت ہے۔ میں آپ کو تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھتا تھا۔ ایسے لوگ بھلا فحشہ تقدیر بدل سکتے ہیں؟“

انہوں نے ہجرا مان کے میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔ ”آخر تم اس کے سامنے ہاتھ کیوں جوڑ رہے تھے؟“

”وہ میرا ہاتھ دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو تقدیر میں جو ہے خودی سامنے آجائے گا۔“

”کوئی لو اس نے اشدوں اشدوں میں تم کو بھی خوش خبری سنائی کہ تم وزیر اعظم بنو گے۔ اور اس کے بعد تم جاؤ گے کسی بیرونی ملک کے آستانے پر۔“

”وہیے تو اب خان بھی ایک ہر صاحب کے بڑے مرید تھے۔ لیکن یہ اقتدار انہیں ہر صاحب کی دعا سے ملا تھا اور نہ بڑا وقت آنے پر ہر صاحب ان کی بادشاہت بچا سکے۔ میں نے کہا۔“

”گمانے کے بعد دوسرے شام تک میں پڑھنے کے بنائے کمرے سے نہیں نکلا۔ میں نے چار بجے سے چھ بجے تک بچوں کو چھی نہیں پڑھایا۔ مگر طبیعت کی خرابی کا باعث کر کے لیٹا میرے لیے

لڑا وہ پریشانی کا سبب بن گیا۔ بیکر صاحب نے ایک بار میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر ملے پھڑپھڑاتے آنکھیں۔ اسپرین بڑبڑاتی کھلانے کے بعد وہ میرا سر اپنی گود میں رکھ کے دبانے پر آمادہ تھیں اور میں محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑے ہی اندر دکھانے لگا ہے۔ ان کے جذبات کا خاموش سمندر حلاطم ہو رہا تھا۔ آج چودھویں کی رات تھی اور غالبانہ لے کر گئی تھیں کہ جیسے بھی ہو وہ تھوڑے ہی گھنٹے میں ڈال کے رہیں گی۔ حالات کی سازش یا شامت اعمال مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں جلد از جلد اس گھر سے فرار ہو جاؤں۔ کوئی تاخیر ہاتھ مجھے شاد کی طرف دھکیل رہا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں آسمان سے گر کے مجبور میں انک جاؤں گا۔ میں آسمان سے کوڑے کے لیے تیار تھا۔ شاید اسی کا نام حبت ہے شیفت۔ اور بھول غالب۔ کہتے ہیں جس کو شعلہ ظل ہے داغ کا۔ دنیوہ دنیوہ۔ شام ساڑھے چھ بجے ایک فون آیا۔ ہم اس وقت بچوں کے ساتھ لان پر بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ خادم نے کارڈ میں فون لاکے بیکر صاحب کو دیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا فون تھا۔ بیکر صاحب ”جی۔ اچھا۔ ہر روز اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ کہتی رہیں۔ میں ان کے چہرے پر سرت بھی مسکراہٹ کا اجالا دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کس بات پر اتنی خوش نظر آتے تھے۔

فون واپس ملازم کے حوالے کر کے انہوں نے بڑی سرت سے مجھے مطلع فرمایا جو بھی آج رات ڈاکٹر صاحب تو گھر آئیں گے نہیں۔

چنانچہ پورے پورے پھر نہ کتا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یہ سننا موقع تقدیر نے فراہم کر دیا ہے اور میری طرف سے تو اس میں پہلی حاصل ہے ہمیں۔ اب بھول شاعر۔ اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر آتا ہے پروان۔ دو دو اڑوں کے درمیان فاصلہ کیا جب دل سے دل مل چکے ہوں۔

میں نے حلق سے ایسی مڑوہ آواز نکالی جیسے مڑاے موت کے قیدی کو بلیک وارنٹ پڑھ کے تیار کیا ہو کہ آج اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ ”کیوں نہیں آئیں گے؟“

”وہ کل کسی وزیر کے سالے کی آنکھ کا آبرو بن گیا تھا انہوں نے اب چپ نہیں کیا خرابی ہو گئی ہے۔ اسے ایک آنکھ سے ایک کے دو کھال دے رہے ہیں۔“

”کیا پلٹا یا ترے؟“ میں نے کہا۔

بیکر صاحب ہنس پڑیں۔ ”یہ بیان بھی تو ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو وزیر صاحب نے یاد کیا ہے۔ یاد کرنے کا مطلب ہے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ان کے آوی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آگئے ہیں۔“

”لے جانا شرطانہ فعل ہے۔ وزیر قسم کے لوگ اٹھواتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہنس کی کچھ لو۔ انکار کر نہیں سکتے ڈاکٹر صاحب۔“

میں نے گھڑی دیکھ کے کہا ”مجھے بھی ایک کام سے جانا ہے۔“ ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی جو تم بھی بھاگ لے۔“

نیت اور لیے سے اس مجھے کا مطلب یہ کہ اس کا تھاکہ ایک شو گر کیا ہو گا۔ ”تم مقام شو گر بھی کیا۔“

میں نے کہا ”میں آج صبح کا تھوڑی دیر میں۔“

”ہاں۔ آج رات تک“ انہوں نے تھوڑے کما ”خبردار جو کما کما کے آئے باہر کس۔“ لت پڑ جانے کی باہر نہ مارنے کی تو گھر میں بڑی بھڑکی بچھی رہے گی۔“

باہر آکے میں نے سکون کا سانس لیا اور پلٹ کے اس گھر کی طرف دیکھا جہاں شاید مجھے پھر لوٹ کے نہیں آنا تھا۔ لوہاں ناصر عظیم۔ دن دیکھنا بھی لکھا تھا تھوڑی قسمت میں۔ فریاد اور بچوں کے توفتے تھے۔ تم کو ایک معمولی لڑکی نے قہر پڑا۔ غالب کے شعر میں ترجمہ کے ساتھ۔ ”مجھے ہیں مددِ رخوں کے لیے ہم گداگری۔“

تقریب کچھ تو سہرا لگات چاہیے۔

○●○

تقریب سہرا لگات کے لیے ہی خیمہ نے معاف بھیجی تھی۔ اس کو خود سمانی برادری نے چھلار کا خطاب ایسے ہی نہیں دیا تھا۔ جہاں کسی کے خیال کی رسائی نہ ہو وہاں دونا ہونا اور جہاں دوسرے پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے گلے پر تاق۔ ”فرشتے یعنی پولیس“ وہاں سے سب کی نظروں کے سامنے خیمہ کی طرح غائب ہو جاتا اس کی بڑبڑ شرت تھی۔

پولیس نے ہر طرف سے غیر متعلقہ افراد کا اس پلیٹ فارم تک پہنچنا حال کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنے سمانی ریلوے اسٹیشن کی حدود سے باہر کھڑے انتظار میں سوکھ رہے تھے مگر وہ تک پہنچ گئی تھی۔

”میں خیمہ آپ؟“

”خیمہ کی کیا بات ہے؟“ وہ بولی ”میں خیمہ ہی ہوں“ اس نے میری طرف مٹا لے کے لے ہاتھ بڑھایا۔

ہمارے معاشرتی آداب اور سیاسی مصلحت کے تقاضے ایسے ہیں کہ مودہ عام کسی عام خواتین سے ہاتھ نہیں ملائے۔ خصوصاً اس وقت جب کسی کیمبرے کی نظر ان کی طرف ہو۔ سرراہان مملکت باہر فرشتوں کے دیکھ میں یا ملک گھڑستان میں بھی جتاؤ رہے ہیں کہ ISSUE بنانے والے انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا مطالبہ نہ کرنے لگیں۔ ورنہ سمانی تو خلوت سے جلوت تک سب جانتے ہیں۔ معلوم نہیں خیمہ نے ایسا کیوں کیا۔

میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو زیادہ دیر نظر انداز نہ کرتا تو یہ بد اخلاقی ہوتی اور خیمہ کی دل شکنی سے زیادہ بے عزتی۔ اُدھر اُدھر کوئی کیمرا نہیں تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملا لیا۔

”اب مجھے یقین آ گیا کہ آپ شاہ عالم ہی ہیں۔ اس کی روح نہیں“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”اگر یہ مذاق ہے تو میرے سر پر سے گزر گیا

خاتون۔ لیکن آپ ابھی کراچی میں تھیں اور اب لاہور بھی پہنچ گئیں۔ میرا تعاقب کر رہی ہیں آپ؟“

”کیا ایک شخص ایک وقت دو شہروں میں نہیں ہو سکتا۔ دو بار مت کما کر یہ مذاق میرے سر کے اوپر سے گزرا گیا۔“

میں نے کہا ”تم یہاں آئیں کیسے پولیس نے مدد کا نہیں؟“

”ہادی بارہا آجکل سے“ خیمہ بولی اور ایک آنکھ ٹرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے آخری ڈبے میں جو گاڑ صاحب ہیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔“

اشرف علی نے زار میں سے کہا ”دیکھا تھا میں نے آپ کو ٹرین رتنے سے پہلے ہی کوڑے ہوئے آپ کی ٹانگ ٹوٹ جاتی۔“

”مجھے ریلوے لائن عبور کرنے کے جرم میں پولیس پکڑ لی۔“

”مگر ڈاکٹر اشرف علی۔ کچھ بھی نہیں ہوا مجھے صرف ایک سوال۔“

”آپ باہر چلیں۔ یہاں شاہ عالم صاحب کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے“ اشرف علی نے اس کی بات کاٹ دی ”پلٹے سر۔“

”صرف ایک سوال۔“ وہ میرے پیچھے لگی۔

اشرف علی نے پلٹ کے اس کا راستہ روک دیا ”کیا میں پولیس انسپکٹر سے کہوں؟“

”انسپکٹر کا انسپکٹر جہل بھی مجھے ہاتھ لگے دکھائے لیڈی پولیس مجھے پکڑ سکتی ہے اور باہر بھی نکال سکتی ہے۔ تم بے وقوفی مت کرنا ورنہ بدنامی ہوگی لی بے ایف پامنی کے جیمز میں کی کہ اس کے سیکرٹری نے خاتون سمانی کے ساتھ دست دراز کی کی۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے۔“

اشرف علی زور کہا ”آپ سمانی نہیں بلک سار ہیں۔“

”ہاں۔ اس سے بھی زیادہ ہوں میں۔ مگر تم کیا ہو؟ یہ بھی سوچا کرو۔“

”آپ ایک سوال کریں اور جانیں“ اشرف علی نے کہا۔

”وہ پھر میرے پاس آگئی“ آپ سے ہاتھ ملانے کا قصد کیا تھا شاہ عالم صاحب کہ۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا اپنی آنکھوں پر۔“

میں نے کہا ”کس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا بس خیمہ؟“

”کیا کہہ؟ آپ بھی شاہ عالم ہیں“ اس نے ”میں“ پر زور دے کے کہا ”میں بھی آپ اس کی روح نہ ہوں کس۔“

”کیا روح کو جسم سے الگ دیکھ سکتی ہیں آپ؟“

”کیا تو پریشانی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک ریلوے کراسنگ پر عجیب واقعہ پیش آیا۔ عجیب ہی کتا پڑے گا ایسا ورنہ بے حد افسوس ناک اور دردناک واقعہ تھا۔ وہ جو آپ کے چیف سیکریٹری آفیسر ہیں کیا نام ہے ان کا؟“

”مگر علی خان“ میں نے شکر ہو کے کہا ”کیا ہوا انہیں؟“

”انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ فونی آئی ہیں اور کتا ورنہ کے بھی استا۔ وہ تیمور صاحب کی گاڑی میں آ رہے تھے کہیں سے۔“

غالباً کراچی سے۔ گاڑی کا نمبر۔“

میں نے کہا "میری ماہر خبر کو کیا ہوا ریلے کراٹک پر؟"
 "ایک ٹرین گزرنے والی تھی۔ ممکن ہے یہی ٹرین ہو جس میں
 آپ آئے تھے۔ چانک بند ہوا تو سب گاڑیاں رک گئیں۔ ایک
 احتجاجی جلوس کو بھی رکنا پڑا۔ جلوس کے شرکا سخت مشتعل تھے۔
 معلوم نہیں کس نے تیمور صاحب کی گاڑی کو پہچان لیا پھر کسی نے
 کہا کہ گاڑی میں شاہ عالم ہے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "شاہ عالم! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
 "میری تو وہ ایک سوال مجھے پوچھتا تھا آپ سے۔" وہ بولی "مگر
 آپ کی تو طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ اشرف علی پانی پلاؤ اپنے سر
 کو۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم بتاؤ کیا ہوا؟"
 "وہی جو ایسی صورت حال میں ہو سکتا تھا۔ لوگ ایک دم
 گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ڈیڑے سر پہ مار مار کے گاڑی کو
 تباہ کر دیا اور پھر آگ لگا دی۔ کرل خان تو نکل کے فرار ہو گئے
 لیکن۔"

"کیوں کیا۔؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔
 "ناقلین یقیناً ہی بات ہے۔ میں نے دیکھا تو نہیں مگر چشم دید
 گواہ بتاتے ہیں کہ لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے ایک شخص کو مار دیا
 جو گاڑی میں موجود تھا۔"

"مارا؟" میں نے چلائے کہا۔
 "ہاں۔ کون تھا؟ خود جس کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں؟"
 خیرم نے میری حالت کا دلچسپی سے مشاہدہ کیا "کہنے والے یہی کہہ
 رہے ہیں کہ وہ شاہ عالم تھا۔ کسی غلط فہمی کا سوال ہی نہیں۔ جرم
 میں پانے کا کرم بھی تھے جو پہلے شاہ عالم کے سامنے تھے۔ ان سے
 پہچان میں غلطی ہو، یا ممکن سی بات لگتی ہے مگر شاہ عالم کو میں اپنی
 آنکھوں سے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ یہ بات
 میری کیا کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ کیا آپ بتائیں گے۔"

میں نے کہا "دماغ خراب ہے تمہارا۔ اور تم میرا دماغ
 خراب کرنے آگئی ہو۔ اشرف! اس باکل عورت سے کہو کہ جائے
 اور یہ ایسے نہ مانے تو زبردستی روک لو اسے پولیس کو بلا لو۔"
 چشم دید کی کڑی مجھے گھورتی رہی "اس کی کوئی ضرورت نہیں
 مسٹر شاہ عالم! اپنے سوال کا جواب مجھے مل گیا ہے۔"
 اشرف نے کہا "میں پھر آپ جاؤں۔"

میں نے چشم کو پلٹ کر جاتے دیکھا اور چند سیکنڈ کی اس مہلت
 سے فائدہ اٹھایا جب اشرف میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں اپنے
 سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر گھس گیا۔ یہ تاب
 انشیں باہر کا کراہتا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ آئینہ خیل کے
 پیچھے والی کرسی پر کسی کا ٹوٹ لگا ہوا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی چیزوں
 سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں کوئی کام کرنے میں
 مصروف تھا۔ اس کے سامنے بید کی تین پرائی کرئیاں رکھی ہوئی

تھیں۔ آخری صفے میں دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ میں ایک
 دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک داڑھی والا
 چلوں کی زپ بند کرنا ہوا نمودار ہوا۔ وہ دروازہ ہاتھ دوام کا تھا۔

اس سے پہلے کہ داڑھی والا حیران ہو کے کچھ پوچھتا۔ میں
 اسے پھر حیل کے اندر لے گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر
 اس نے چلائے کے لیے منہ کھولایا تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے
 منہ پر رکھ دیا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اسے سوال جواب
 سے مطمئن کرنا مشکل تھا اور میرے پاس اتنی وقت بھی نہیں تھا۔
 میں نے اسے ٹانگ آؤٹ کر دیا اور وہ جہاں کھڑا تھا اسی دیوار کے
 ساتھ پھسل ہوا اچھے بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ میں اس کے کپڑے اُتار کے میں نے پٹن لیے۔ اس
 کی پانی قائم والی چلوں اور قمیص مجھے کچھ دیکھ لی۔ اس شریف
 آدمی کو وہاں بائیں قدرت میں چھوڑنا میری مجبوری بن گیا تھا کیونکہ
 میں اپنے کپڑے وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا ورنہ اپنی چلوں تو اسے
 ضرور ہستانا۔ باہر کوئی چلائے گا "باؤ صاحب! باؤ صاحب! وہ غالباً
 اسی داڑھی والے کو پکار رہا تھا۔"

میں نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر قہراً سادہ ازہ کھول کے
 باہر دیکھا۔ کمرہ بھر خالی تھا۔ میں نے ہاتھ دوام کا دروازہ بند کیا اور
 باہر آتے ہی کرسی کی پشت پر لوکا ہوا ٹوٹ بھی پہن لیا۔ ہائی کے
 ساتھ اب میں ریلے کے محلے کا ہی رکن لگتا تھا۔ خیل پر ایک بی
 کیپ بھی موجود تھی۔ اسے اپنے سر پر جاکے میں دروازے کی
 طرف بڑھا ہی تھا کہ خاکی دردی والا ایک دیلا پتلا شخص ٹوٹی بھل
 میں دباؤے اندر آیا اور مجھ سے ٹکرائے۔ ٹکرائے پتلا۔ اس کے
 باوجود بھل میں دبی ہوئی ٹوٹی کرسی "باؤ۔۔۔ کتھے چلے آؤ" اس نے
 جبکہ کر ٹوٹی اٹھاتے ہوئے کہا "عرض کرنی سی میں ایک۔۔۔"

میں نے کہا اس کے کہا "تم جینو دو منٹ میں ابھی آیا۔"
 اگر میری آواز اسے بدل ہوئی تھی ہوگی تو اس کا سبب وہ بگل
 کی خراش کو سمجھا ہو گا۔ میری صورت دیکھنے کا اسے موقع ہی نہیں
 ملا ورنہ میرے چہرے پر داڑھی کی غیر موجودگی پر وہ ضرور چوٹکا۔
 اس نے میری پشت دیکھی تھی۔

"آچھا جی" اس نے ٹوٹی جھانپتے ہوئے کہا۔
 میں نے اشرف کو دیکھا جو کچھ قائلے پر پولیس سے الجھ رہا تھا
 مجھے اس کی صورت پر حیاں پریشانی سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے
 پراسرار طور پر غائب ہوجانے سے اس کی عقل خبط ہو گئی ہے۔
 پولیس اسے کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ شاید اس پلیٹ فارم پر کوئی
 بھی اسے شاہ عالم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ سوائے ایک
 داڑھی والے شخص کے جو ہاتھ دوام میں لینا ہوا تھا۔ شاید آدھے
 گھنٹے سے پہلے نہ وہ خود باہر آسکتا تھا اور نہ کوئی اسے دریافت
 کر سکتا تھا۔

اشرف کی جگہ میں ہوتا تو اس صورت میں میری عقل بھی

پکرا جاتی۔ شاہ عالم ابھی کچھ دیر پہلے اپنی بیوی میکینری اور نائب
 مدد تیمور کے ساتھ ٹرین سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اس پر قاتلانہ حملہ
 ہوا مگر وہ بال بال بچ گیا اور گولی کا نشانہ تیمور بنا۔ تیمور اس وقت
 اسپتال میں بے ہوش لیٹا ہوا تھا اور کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ شاہ
 عالم کی میکینری اس کی بیوی کے ساتھ جا چکی تھی۔ قاتلانہ حملہ
 کرنے والے کو کس نے مارا؟ ابھی یہ سوال ہی جواب طلب تھا کہ
 خیرم نے ایک سوال کر کے اسٹی دھماکے سے بڑا دھماکا کر دیا۔ اس
 سے پہلے کہ اشرف علی کچھ سمجھ پاتا یا شاہ عالم سے اس پراسرار
 معاملے کو سمجھنے کے لیے کوئی سوال کرتا۔ خود شاہ عالم غائب ہو گیا۔
 چند سیکنڈ پہلے اشرف علی کے پیچھے موجود تھا۔ پھر اس نے پلیٹ
 کے دیکھا تو یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ شاہ عالم کو زمین نگل گئی یا
 آسمان کھایا۔ اب باہر صحابی سوالوں کی جھڑپ تیز کر رہے تھے اور
 ان کی یلغار کا مقابلہ شاہ عالم ہی کر سکتا تھا مگر شاہ عالم کھڑا تھا۔ کم
 ہو گیا تھا چھپ چھپ کا سام کچھ نہیں وہ کوئی پن تھا کہ پلیٹ فارم
 پر گر گیا تو ٹھہرے اور جھل ہو گیا یا کاغذ کا پرزہ تھا کہ ہوا سے اڑ کے نہ
 جائے کہ مر گیا۔

اشرف کا ماکس ہونا برحق تھا۔ وہ پولیس سے ہی نہیں پلیٹ
 فارم پر موجود ہر شخص سے یہی سوال کر رہا ہو گا۔ آپ نے شاہ عالم
 صاحب کو دیکھا؟ شاہ عالم چیز میں بی بی بیٹ۔ بی بی میکینری
 ہوں ان کا کمرے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا۔ خیرم نے
 اطلاع دی تھی کہ تیمور کی گاڑی میں سے نکال کے مشتعل جرم نے
 شاہ عالم کو مار دیا۔ یہاں شاہ عالم کو کسی نے مارا یا ہوا؟ وہ مرنا تو نہیں
 مگر جرم موت کی طرح غائب ہو گیا۔ خیرم نے غلط سوال نہیں کیا تھا
 کہ کہیں آپ شاہ عالم کی روح تو نہیں ہیں؟ وہ یقیناً مدح ہوگی۔
 جسم وہاں ریلے کراٹک پر اسی طرح پڑا ہو گا جیسے قاتلانہ حملہ
 کرنے والے کا جسم پلیٹ فارم پر پڑا ہوا تھا۔ روح یہاں پہنچ گئی یا
 میرے خدا!

میں ایک کمرے سے نکلے ہی دو سرے کمرے میں داخل ہو گیا
 ورنہ اشرف سے کچھ بعید نہ تھا کہ خود مجھ سے سوال کرنے آجائے۔
 دو سرے کمرے میں بہت سے ٹکٹ کلکٹر بیٹھے ہوئے گپ کا رہے
 تھے۔ ان میں سے ایک دو نے اپنے پاؤں میز پر پھیلا رکھے تھے۔
 چار چھ ایک میز کے گرد سر جھکا کے نہ جانے کس کام میں مصروف
 تھے۔ دو اپنی وردی اتار کے ٹانگ رہے تھے۔ کسی نے بھی میری
 طرف نظر اٹھا کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں پچھلی طرف کے دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک میں
 نے خود کو ایک ہال جیسے کمرے میں دیکھا جہاں بہت سے منہ بند خیلے
 ڈھیر پڑے تھے۔ اس ہال کے آخری حصے میں بھی ایک دروازہ تھا۔
 نیم تاریک ہال میں مجھے کچھ پوسٹ میں جیسے لوگ کالی سے حرکت
 کرتے دکھائی دیے۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں
 اور وہاں کیا کر رہا ہوں۔ فرض شناسی اور مستعدی کی یہ انفوس

تاک حالت ہر سرکاری جگہ کی عمومی صورت حال کی عکاسی کرتی
 تھی۔ ہر جگہ ہر شخص نہیں جاسکتا مگر وہی پسینے والے سب ایک
 سے لگتے ہیں اور سارا دن ہر آتے جاتے شخص کی صورت کوئی بھی
 غور سے نہیں دیکھتا۔ تیسرے درجے کے وینک دوام کی طرف سے
 باہر آئے میں نے سکون کا سانس لیا۔ صفائی مجھ سے بہت دور اگلے
 حصے میں جمع ہوں گے، لاہور کے ریلے اسٹیشن میں داخل ہونے کا
 جو مرکزی راست ہے۔ مجھے وہاں گاڑیوں کی قطاروں کے سامنے
 پولیس کی چند گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ سامنے وسیع چوک تھا اور ہر
 سمت سے آنے والی سرگرم پرنٹنگ کاٹل رداں معمول کے مطابق
 مسلسل شور کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ اس شور میں ببول ڈیگزٹوں
 کے ہارن سائیکلوں کی ٹھنکی۔ آگے والوں کی اور اس کے گھومتے
 پسوں میں چابک کی چھڑی کے ٹکرانے کی آوازیں۔ ٹرنک پولیس
 کے کچھ نہ کہنے مگر مصروف نظر آنے والے سپاہی کی کرفت سنی
 اور سیکڑوں ہزاروں دوڑتے بھاگتے چلتے چلائے انسانوں کی
 آوازیں شامل تھیں۔

میں آٹا اسٹینڈ والے حصے کی طرف سے باہر آیا تھا جہاں
 کھانے پینے کی تقریبا ہر سستی چیز خیلوں پر فروخت ہو رہی تھی۔ ان
 سے آگے درجنوں ٹانگے کھڑے تھے اور گھوڑے توڑے میں منہ
 والے کچھ کھانے یا کچھ خارج کرنے میں مصروف تھے۔ فضا میں
 سب چیزوں کی بے جا بو تھی۔ کوٹوں پر بھرتے جانے والے نئے
 کباب سے گھوڑے کی لید اور فٹ پاتھ کے قطر فروش کی خوشبو
 سے اگلے کمرے سیاہ پانی کی بو تک۔ آگے کھڑے ہوئے آنکھوں میں
 ایک ایک دو دو مسافر بٹھرتے تھے کہ آگے والے کی ترغیب پر مزید
 مسافر سوار ہوں تو ایک دوسرے پار کی گاڑی چلے۔

میں نے ایک تینتار سکون حصے میں رک کے اپنا فون نکالا اور
 رخصتی کا نمبر ملایا، غلاب تو رخصتی کے بجائے چندا نے بلو کا۔
 میں نے کہا "میکینری۔ میری وہ مجازی بیوی کہاں ہے جو مجھے
 اپنا مجازی خدا سمجھتی ہے؟"

وہ بولی "وہ ابھی ابھی واش دوام میں مٹی ہے۔ کوئی ضروری
 بات اس سے کہنی تھی؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بہت اچھا ہو کہ وہ موجود نہیں۔"
 "تم پریشان کیوں ہو آتے؟"

"چندا۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"
 چندا نے کہا "آخر تم ہو کہاں؟ پانی میکینریٹ میں؟"

"نہیں۔ میں ابھی تک ریلے اسٹیشن پر ہوں۔ یہ بتاؤ جیس
 خان بی کا کوئی پیغام ملا؟"

"نہیں۔ میں بھی انتظار کر رہی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں
 ہم سے پہلے پہنچ چکے ہوں گے۔"
 "دراصل۔۔۔ ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔"
 "کیسا حادثہ۔ جلدی بتاؤ انہیں کیا ہوا ہے؟ وہ ٹھیک تو

ہیں؟

میں نے کہا "خان جی بالکل خیریت سے ہیں۔ جین شاہ عالم کو لوگوں نے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟" چندا کے لیے میں بدحواسی مایاں تھی۔

میں نے کہا "رہوے کرا سنگ پر احتجاجی جلوس کے شرکاء نے تیمور کی گاڑی کو شیشہ کر لیا اور شاہ عالم کو گھونٹنے کے باہر نکال لیا۔ خان جی کو صاف قہقہے نکلے میں کا سباب ہو گئے مگر مختل جھوم نے شاہ عالم کو جان سے مار دیا۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں۔"

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

"اس لڑکی نے جو صفائی سے زیادہ چھلوا رہا ہے۔ جہنم نے۔"

"کیا اس نے خان جی کو دکھا تھا؟ خیریت سے نکلے ہوئے؟"

میں نے جھوٹ کا سارا لہجہ بڑھایا "ہاں۔ اور اس نے مجھ سے بھی پوچھا کہ تم شاہ عالم ہو تو وہ کون تھا جو مارا گیا؟"

"کچھ نہ یادداشت کی تم نے؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے کہا یہ بکواس ہے اور اشرف ابھی اس سے الجھ رہی ہے۔ خان جی کا قہقہہ میں غائب ہو گیا۔ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی ہے۔"

"کیا پتا یہ جھوٹ سی ہو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ جہنم ایسا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی جھوٹ کی۔ اب تم فوری طور پر سارے فون بند کر دو۔ اس سنگت کر دو۔ باہر کی دنیا سے تمہارا کوئی رابطہ نہ ہو ورنہ تمہارے لیے مصیبت ہو جائے گی۔ رشتی کو اور شاہ عالم کے والدین کو ابھی کچھ پتا نہ چلے۔ رشتی اگر بنگالہ کسے تو اسے خاموش رکھنے کے لیے جہیں سب کچھ کرنے کی اجازت ہے۔ سو بالکل فون اپنے قبضے میں رکھو مگر اسے صرف باہر فون کرنے کے لیے استعمال کرو۔ آنے والی کال کے لیے بند رکھو۔"

"مجھے کیوں ہدایات دے رہے ہو؟ کیا تم خود یہاں نہیں آؤ گے؟"

میں نے کہا "میں اپنا ہاتھ مار رہی ہوں۔ مجھے تیمور کو وہاں سے نکالنا ہو گا ورنہ وہ پولیس کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ اور اس کے بعد اخبار والوں کے۔ وہ کیا بتائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ شاہ عالم اور اس کی بیوی کے ساتھ ٹرین میں کراچی سے لاہور آیا تھا تو اس کی گاڑی میں کون تھا؟"

"اس میں بھی رسک ہے۔ اگر تم سے پہلے اخبار والے اسپتال پہنچ گئے پھر؟"

میں نے کہا "اس کا چانس کم ہے۔ لیکن میں یہ رسک لوں گا۔ اس کے بعد میں سیدھا وہیں آؤں گا۔ تمہارے پاس۔ تو مجھے یوں سمجھئے۔ مجھے امید ہے کہ اتنی دیر میں خان جی بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ پھر میں نے

خان جی کی آواز سنی۔ "ہیلو۔ شاہ عالم۔"

میں نے کہا "خان جی۔ آپ کہاں ہیں۔ میں اور چندا صفحہ پریشان تھے۔"

"پریشانی سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ یہ کلماڑی تم نے خود اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ مگر اب بچھٹانا لا حاصل ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہو گیا ہے؟"

"جی۔ اور میں نے چندا کو بھی سب بتا دیا ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ رہوے اسٹیشن پر؟"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کون تھا وہ؟"

"پتا نہیں۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر میں بچ گیا۔"

"اور چندا؟" خان جی نے تشریف سے کہا۔

"میرے پیچھے تیمور تھا۔ گولی اسے لگی۔ چندا کو کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا تیمور مر گیا؟"

"نہیں۔ وہ زخمی ہوا۔ اس وقت اسپتال میں ہے۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے کو وہیں مار دیا گیا۔ اس کی لاش پولیس نے لے لی۔"

میں نے کہا۔

"میرا سب پہلے سے پتہ تھا۔ شاید اس کی لاش بھی غائب کر دی جائے گی۔ تمہیں کس نے بتایا جو میرے ساتھ ہوا؟"

"جہنم نے۔ میں نے چندا کو رشتی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ پھر میں خود رہوے اسٹیشن سے فرار ہو گیا اور اب میں اسپتال سے تیمور کو نکالنا چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے۔"

"فیک ہے۔ میں بھی اسپتال پہنچتا ہوں۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

فیکس نے مجھے دو منٹ میں اسپتال پہنچا دیا۔ اگر میں پیدل جاتا تو شاید دس منٹ میں پہنچ جاتا۔ رہوے کا اسپتال بہت بڑا تھا۔ میں نے معلومات کے کاؤنٹر سے تیمور کے بارے میں پوچھا۔ ایک بددعا لڑکی نے مجھے رہوے اسٹاف سمجھتے ہوئے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ "کون تیمور؟ یہاں پتا نہیں کتنے تیمور داخل ہوں گے۔"

میں نے کہا "غائب صدر پانی ہے ایف۔ وہ زخمی حالت میں لائے گئے تھے۔"

وہ مستعد ہو گئی "وہ۔۔۔ آئی بی ٹی۔۔۔ اور پہلے جائیں۔"

میں پلٹا تو مجھے خان اعظم اپنے پیچھے نظر آئے۔ میرا بیونگارم دیکھ کے وہ حیران ہوئے "یہ مجس بدلتا ضروری تھا؟"

میں نے اپنے کپڑوں کا بڈل انہیں دکھایا "آپ فکر نہ کریں۔"

مجھے بھر شاہ عالم بننے میں دیر نہیں لگے گی۔"

خان اعظم نے کہا "اب بھی یہ کھیل ختم ہو سکتا ہے مگر۔"

میں ان کے ساتھ چلنے لگا "میں خان جی۔ کھیل تو اب شروع ہو گا۔"

انہوں نے کہا "ہم لوٹ کے گھر جا سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹانے کا قائل نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" انہوں نے کچھ دیکھی لیے میں کہا "تو بہت جلدی ہے۔ میں تجھے روک نہیں سکتا اس لیے تیرا ساتھ دوں گا۔"

"میں ضد ہی خدا کے بعد آپ کے مجھ سے پر کرتا ہوں۔"

اور دالے پر ایسٹ وڈ کے باغہ دوم میں گھس کے میں نے وردی کی آمدنی اور پھر شاہ عالم بن کے باہر نکلیا۔ خان جی میرے ساتھ چلے گئے۔ اب وہ میرے پیچھے سیکورٹی آفیسر کرل خان تھے۔ انہوں نے اپنا موبائل فون نکالا اور کوئی خبر ملایا۔

"ڈی آئی جی صاحب۔ کرل خان۔ بیڑ۔ چیف آف سیکورٹی۔"

لی جے ایف۔ جی "میں رہوے اسپتال سے بول رہا ہوں۔ کیا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ جیسا سیکورٹس آفیسر اس قسم کی بات پر یقین کر لیں جی نہیں؟ گاڑی کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ تیمور صاحب کی گاڑی میں کون تھا اور اسے کون چلا رہا تھا۔ میں شاہ عالم صاحب کے ساتھ تھا۔ آئی ایم سوری۔ ابھی میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتا سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ بہت جلد آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی میں ایک درخواست کرنا چاہتا تھا۔ شاہ عالم ہاؤس پر سیکورٹی سخت کر دی جائے۔ میری پرسل کلیرنس کے بغیر کوئی گاڑی اندر نہیں جائے گی۔ کسی کو بھی قریب نہ آنے دیا جائے۔"

میں نہیں جانتا کہ آپ کی سختی فورس شرکی صورت حال کو کنٹرول کر رہی ہے۔ میرا کام تھا آپ کو بتانا۔ آگے آپ کی مرضی۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو توڑتے دار آپ ہوں گے۔ آپ سے میری یہ سمجھو کہ آن دی ریکارڈ سے ڈی آئی جی صاحب۔ میرا نام ہے کرل خان۔ گند بانی۔"

ڈی آئی جی نے ٹوکے باہر کمرے ہوئے اے ایس آئی اور اس کے ماتحت کانسٹیبل نے سمجھو کا آخری حصہ سنا تھا۔ انہوں نے خان اعظم کو سلیوٹ کیا اور دو واؤڈ کھول دیا۔ اندر ایک ڈاکٹر چارٹ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ نرس اس کی ہدایات کی مٹھ رہی تھی۔ تیمور آئیں بند کیے خاموش لپٹا تھا۔

ڈاکٹر نے نظراٹھا کے ہماری طرف دیکھا "جیس اندر آنے کی اجازت کس لیے وقف نے دی۔"

"میرا نام ہے کرل خان۔ اور یہ لی جے ایف کے جیڑ میں شاہ عالم ہیں۔" خان جی نے اس کے سوال کا جواب دیا ضروری نہیں سمجھا "آواز مسٹر تیمور؟"

ڈاکٹر کا رویہ ایک دم بدل گیا "جی از قاتل سر۔"

میں نے کہا "مٹھوے کی کوئی بات تو نہیں؟"

"جو سب کھلی شائے پر لگی تھی۔ بڑی کو نقصان نہیں ہوا۔ زخم چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پھر یہ ہے ہوش کیوں ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ شاک کی کنڈیشن میں تھے۔ میں نے

TRANQUILISED دیا ہے۔ اسی کا اثر ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ان دسٹ کیس ان کو ڈیپاسٹ کر دو۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کا منہ حیرانی سے کھل گیا "جی۔"

"جلدی کرو۔" کرل خان نے کہا "میرے خیال میں تیمور صاحب یہاں بالکل محفوظ نہیں۔ خود شاہ عالم صاحب میری مرضی کے خلاف یہاں آگئے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں پانچ منٹ میں ایمرینس میں شفٹ کر دیا جائے۔"

"میں سر۔ میں کو شش کرتا ہوں۔ لیکن آپ ایم ایس سے بات کر لیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"م ایم ایس سے کو فوراً یہاں آئے۔" کرل خان نے دھاڑ کے کہا۔

ابھی تک شاہ عالم کے رہوے کرا سنگ پر مارے جانے کی خبر اسپتال تک نہیں پہنچی تھی۔ پولیس انسپکٹر رہوے اسٹیشن سے تیمور کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے یقیناً مجھے دکھا تھا اور اسے مجھ پر

علیم الحق حق کے قلم سے ایک اچھوت کہانی
اسے بلاتے بے دریاہ کے کہانی ہے جس کا
نام عالمی دہشتہ کے علامت ہے۔
انہی بھگے ہوئے کے داستان جو اپنے
ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریبی بک شال سے طلب فرمیں

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز فروغ
رقاعی پبلشرز لاہور
فون: ۳۷۳۷۳۷۳
عزیز زکریا، اردو بازار لاہور
نسبت روڈ، چوک میڈی سہیل، لاہور

میں نے کہا ”تمہارے اپنے ذہن میں کچھ خدشات۔ کچھ
فروضات اور امکانات ہوں گے تمہارا قیاس اور خیال کیا کرتا
ہے؟“

”وہ تم تھے۔“ جنھن نے میرے سینے پر انگلی رکھ دی ”ابھی“
میں مفلوم نہیں کر سکی کہ تسماری اصل کیا ہے۔ تم غم ہو،
مارا نام کیا تھا لیکن تم ایک کرائے کے آدمی ہو۔ تمہیں شاہ عالم
نے HIRE کیا تھا۔ اس نے بقیہ بہت بڑا معاوضہ دیا ہو گا جس سے
بہت وقف بنایا ہو گا یا بلکہ بینک سے تم پر دیاؤ ڈالا ہو گا کہ تم شاہ
عالم کیس کے لیے کام کرو۔ شاہ عالم بے وقوف یا پاگل نہیں ہے کہ اپنی
لگاں ایسے داد پر لگتا جس میں ہار چکی تھی۔ اس کا اندازہ خود ا
س نے سوچا ہو گا کہ مراد راز کے آفس سے تم زندہ
لوٹو گے اس کے منتقل کارکن جنہیں وہیں پلاک کر دیں
مگر مراد راز نے یہ نہ سمجھا کہ ان لوگوں کو

”تم جانتے ہو تم نے غلیٹ میں کیا رویہ اختیار کیا تھا۔“

[illegible]

"ہاں۔ یہ سب ہوگا۔ اگر واقعی شاہ عالم مارا گیا ہے تو اس کی موت کا دور مکمل ایسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد الزام تراشی کا لہا سلسلہ شروع ہوگا۔ اسے کس نے مروا دیا۔ حکومت نے؟ سرکاری ایجنسیوں نے؟ سیاسی خفیہ نے یا امریکانے؟ قاتل کون ہے۔ مارنے والے کون تھے۔ رائے ایجنٹ تھے یا یودی خفیہ تنظیم موساد کے۔ پھر تحقیقاتی کمیشن بنے گا۔ خوب لے دے ہوئی بریس میں۔ کئی ماہ سماعت چلے گی اور ٹیکڈ بیان آئیں گے سامنے مگر انجام کار کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ بات پرانی ہو جائے گی۔ لوگ سب بھول جائیں گے۔ شاہ عالم کا مزار مرجع خلائق ہو جائے گا اور اس کی پامالی کو نیا چیز نہیں سمجھا لے گا۔"

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوئی "میں جیسے یہ سب نہیں کہنے دوں گی" کہنے سے خیر قاتل۔ تو شاہ عالم بننا چاہتا ہے۔ جلی آدمی دھوکے باز۔"

میں نے اس کے منہ پر لٹے ہاتھ کا تھپڑ سید کیا۔ وہ پلٹ کے پیچھے گر گئی "میں سب کو بتا دوں گی" ساری دنیا کو "وہ فرش پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔"

"اور جب میں بتاؤں گا کہ مرے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ شاہ عالم میں ہوں پھر۔"

"کون مانے گا تمہاری بات؟" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھائیں۔

"وہ سب جنہوں نے مجھے منگوا کر سے آنے والی ملاٹ سے اُترنے دیکھا تھا۔ کراچی انٹروپورٹ پر۔"

"کسی نے تمہیں اُترنے نہیں دیکھا تھا۔ تم سب کے سامنے اندر سے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اصل شاہ عالم کو تم نے اور تمہارے سازشی نوٹے نے وہیں اغوا کر لیا ہوگا۔ انٹروپورٹ کے اندر ہی۔ تم تمہارا وہ چیف سیکورٹی آفیسر تمہاری سیکورٹی تیمور اور ریشی۔ تم سب جانتے تھے۔"

"لیکن یہ سب لوگ میرے ساتھ نہیں سے آئے تھے۔"

"نہیں سے آنے والوں میں تمہارا سیکورٹی آفیسر شامل نہیں۔ وہی چلا رہا تھا تیمور کی گاڑی" وہ دوتے ہوئے بولی۔

"یہ غلط ہے۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا مجھے ریسو کرنے کے لیے۔ وہ میرے ساتھ ریلوے اسپتال گیا۔ ہم وہاں سے تیمور کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ وہ ریلوے اسپتال کی ایمر لینس تھی۔ یہاں تک میں بھی اسی ایمر لینس میں آیا تھا پھر ایمر لینس مجھے انکار کے تیمور کو اس کے گھر لے گئی۔"

"تیمور کا گھر بند چڑا ہے۔ اس کے پوی بیٹے بھی غائب ہیں۔"

"وہ حفاظت کے خیال سے کہیں منتقل ہو گئے ہیں۔ نہیں مس جنم تمہاری اسٹوری نہیں چلے گی۔ جب خود شاہ عالم کی پوی سب کے سامنے آئے گی کہ میں ہی اس کا شر بہوں تو کیا جیسے باگل قرار نہیں دیا جائے گا۔"

"جس کا جوبل چاہے وہ کرے" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مگر وہ عورت اتنی بے حیا اور آبدیدہ ہے کہ اصل شوہر کی جگہ جیسے دے سکتی ہے تو اس کے لیے جھوٹا بونا کیا مشکل ہے۔ تیمور دھولی کا کہتا ہے نہ گھر کا نہ کھانا کا۔"

"شاہ عالم کے والدین بھی ہیں۔"

"ہاں۔ ایک ٹائٹا بوڑھی عورت جو جیسے دیکھ نہیں سکتی۔ ایک مفرد بوڑھا باب۔ کون پوچھے گا ان سے؟"

"کسی کو پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔"

اس نے غمی میں سر ہلایا "میرے ہوتے تم شاہ عالم نہیں بن سکتے۔"

"میں تمہارا پیچھے قبول کرتا ہوں" میں نے کہا "کیا ہوگا اگر دنیا نے مجھے شاہ عالم تسلیم کر لیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ مرے والا شاہ عالم نہیں تھا!"

"پھر میں خود جیسے گولی مار دوں گی۔"

میں نے اس کے کہا "گولی کا چڑ ہے تمہاری ہلاکت غریبی کے سامنے قدرت نے جیسے حسن کا بڑا ملک اسلحہ دیا ہے۔"

اس نے اچانک کہا "یہ شور کیا ہے؟"

اندر مکمل خاموشی تھی۔ چندا کے جانے کا طم مجھے ایمر لینس کے روانہ ہونے کی آواز سے ہو گیا تھا۔ ریشی پہلے ہی خواب آور گولیاں نکل کے سونگلی تھی چنانچہ میری اور جنم کی جھگڑا مٹنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے انٹر کام کاٹن دبا کے کہا "چوکیدار۔ یہ کیا شور ہے؟"

چوکیدار کی ڈری ہوئی آواز صاف سنائی دی "سر۔ جلوس ہے۔ بہت لوگ ہیں۔"

"کیا وہ رادھر آرہے ہیں؟"

"سر۔ بڑا درد بڑا روتی ہیں۔ اپنی پامالی کے۔"

"اپنی پامالی کے؟"

"وہ جنازہ لا رہے ہیں کسی کا" چوکیدار پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔

"پولیس کیا کر رہی ہے؟" میں نے پچھا کے کہا۔

"جلوس کے ساتھ شمس صاحبہ ہیں اور قریشی صاحب بات کر رہے ہیں ایس بی سے۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے آگے آنے کے۔"

جنم نے مجھے غرت سے دیکھا "اگیا شاہ عالم کا جنازہ اب تم کیا کرو گے شاہ عالم ثانی۔"

چوکیدار نے کہا "سر۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہ کچھ لوگ گیت پر کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں شاہ عالم صاحب شہید کر دیے گئے ہیں۔ انہی کی میت ہے۔ آپ بات کریں ان سے۔"

اس سے پہلے کہ میں چوکیدار سے کچھ کہتا جنم نے کہا "میں بات کرتی ہوں لوگوں سے" اور گولی کی طرح باہر نکل گئی۔ میں نے انٹر کام کا ریسوور لٹکا دیا۔ یہ سب میرے لیے اچانک اور غیر متوقع تھا کہ میری عقلی سے ہوا تھا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ شاہ عالم مارا گیا ہے تو اس کی میت گھر ہی لائی جائے گی۔ اب میرے پاس سوچنے کیجئے یا مشورے سے فیصلہ کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ جنم کے نکل جانے سے صورت حال سخت خراب ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً باہر جا کے سب کو جمع کرے گا کہ ایک نقلی شاہ عالم اندر موجود ہے جو اصل شاہ عالم بننا چاہتا ہے۔ میت لانے والوں کو پہلے ہی بھیجیں گے کہ شاہ عالم شہید ہو گیا۔ قریشی صاحب اور شمس اس کی بات کا یقین کریں گے۔ پولیس دھمائی ہوئی اندر آئے گی اور مجھے پکڑ لے گی۔ ایسی صورت حال میں خود خشنہ میرے خلاف گواہی دے گی۔

میں اندر کی طرف لپکا اور سامان میں سے صرف اپنا رپو اور اٹھالیا۔ پھر میں یکن کی طرف گیا اور جس راستے سے آیا تھا دھر سے ہی باہر نکل گیا۔ یکن میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ گلاب اور چٹیلی من گیت کی طرف ہی گئے ہوں گے جہاں اب بنگلہ بہت بڑھ گیا تھا۔

پچھلی طرف میرے سامنے فرار کا صرف ایک ہی راستہ نکلا ہوا تھا۔ میں نے درمیان دیوار کے اوپر سے ساتھ والی کوٹھی میں پھلانگ مار دی۔ گیلری میں ایک خادمہ کھڑے ہوئے پڑنے لگساری تھی۔ وہ مجھے پہچانتی ہوئی لیکن اس نے کبھی بھی اس طرح سے کود کر چوبوں کی طرح آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہی اور میں مسکراتا ہوا اسیدھا گزر کے سامنے والے صحن میں گیا۔

برآمدے میں کرسی وال کے کتے سے کھیلنے والی میری پردون بھی مجھے دیکھ کر دم بخود ہو گئی۔ اس کا شوہر رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کا افسر تھا۔ وہ شاہ عالم کے سیاسی اثر و رسوخ سے خود بھی فائدہ اٹھا رہا تھا اور شاہ عالم کو بھی فائدہ پہنچاتا تھا کہ یہ سب باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔

"شاہی" آپ رادھر سے خیر تو ہے؟

"ہاں۔ سیدھے گھر چلا ہوں سامنے سے آگے تھے۔ کیا آپ گاڑی میں گئے تھے پولیس اسٹیشن تک جانے کے لیے؟"

"خیر۔ مگر آپ فون کر دیتے۔"

"ان بدعاشوں نے باہر سے ٹیلی فون کے آواز سن لیے ہیں" میں نے کہا۔

"آپ یہاں سے فون کر لیں۔ موبائل کہاں گیا آپ کا؟"

"موبائل کمرے میں تھا۔ خیر آپ گاڑی میں دے دیا تھا میں تو دہی میں دوڑاؤں کی طرف بڑھا۔"

"یہ بات نہیں شادی۔" وہ سمجھ گئی کہ میں نے جرح کا پڑا ہوا ہے۔ "گاڑی کوئی آپ سے زیادہ ہے۔ یہ لیں چالی۔"

میں نے چالی کچ کی۔ مسکرا کے اس کا شہر یہ ادا کیا۔ خودی گیت کھولا اور گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا۔ اس وقت تک شاہ عالم شہید کی میت لانے والے گھر کے اندر آچکے تھے۔ میں گلاب اور چٹیلی کی چیخ نکار بھی سن سکتا تھا اور مشتعل لوگوں کی آوازیں بھی جو یقیناً جلی شاہ عالم کو تلاش کر رہے تھے۔

باہر نکلتے ہی میں نے گاڑی کو دوڑا دیا اور چند منٹ میں خطرے کی حدود سے نکل گیا۔ اب مجھے صورت حال کی گھنٹی کا اندازہ ہوا۔ ایک جنم ہی نہیں ریشی میری جھلساڑی کا سارا... کچا چٹھا چشم دید گواہ کی حیثیت سے بیان کر دے گی۔ اسے یہہ کرنے کی ذمہ داری براہ راست نہ سنی بلا واسطہ طور پر میری تھی۔ یہ کتنا مشکل تھا کہ وہ بحیثیت پوی کے زیادہ ناخوش تھی یا یہہ ہو کے زیادہ ناخوش ہو گی۔ یہ الفاظ دیکھ کر پوی بن کے خوش تھی یا یہہ ہو کے خوش ہو گی۔ افسوس مجھے شاہ عالم کے ضعیف اور عمر رسیدہ والدین کا تھا۔ میاں بی بی اور ماں بی کے لیے وہ بیٹا ہی تھا "ان کے لیے یہ مدد برداشت کرنا مشکل ہوگا۔"

گاڑی کو میں نے چاہیوں سمیت سڑک پر چھوڑ کے لاک کر دیا اور خود جیسی میں سیدھا ڈاکٹر کمال فادنی کے کلینک پہنچا۔ صبح ترقیع وہاں مریضوں کا رش تھا اور کمال بڑے کمال سے اپنے دست و پا "حسن سلوک اور دہلی سے ان کا منت معائنہ ہی نہیں کر رہا تھا ان میں ابھی خاصی مہنگی دوائیں بھی بلا معاوضہ تقسیم کر رہا تھا۔ اب اس کی ٹیک ہائی کی شہرت خاصی پھیل گئی تھی چنانچہ دوا ساز اداروں کے نمائندے اس کے پاس SAMPLES کے ڈیمر لگا جاتے تھے۔ کچھ دوا ساز کمپنیوں کی طرف سے بھی اسے عام پیاریوں کے علاج معالجے کے لیے DONATION کی آفر ہوئی تھی بشرطیکہ وہ کلینک میں اور باہر ان کے پوسٹ کلینک ز اور اشتہاری اسباب کی نمائش پر راضی ہو مگر کمال فادنی صاحب کو نہ کسی کی پہلی منگور تھی نہ یہ الزام قبول تھا کہ وہ کھن دوائیں لکھتے ہیں یا دیتے ہیں اور نہ یہ پسند تھا کہ کوئی انہیں مشروط ادوا کی پیشکش کرے۔ اس نے باپ کی کوڑوں کی جائداد کا زسٹ بنا کے اس کی آمدنی سے یہ فری کلینک شروع کیا تھا اور اسے وہ کسی فرد یا ادارے یا حکومت کا دست گھر بنا دیا نہیں چاہتا تھا۔ اب کچھ لوگ اسے سمجھ گئے تھے اور اس کو دواؤں کے کمنام باسل موصول ہونے لگے تھے۔ ان میں بی بی، امراض چشم، ذیابیس اور بلڈ پریشر بھی پیاریوں کی دوائیں زیادہ ہوتی تھیں یا پھر اشٹی بائیو ٹک گولیاں اور شہرت۔

کوئی بھی بہت معصوف تھی۔ مریض اندر سے پرچیاں لے کر آتے اور اسے کمرے کی کھڑکی سے تھما دیتے تھے۔ وہ اپنے پیچھے نین طرف دیوار سے پھٹ تک لگی ہوئی الماریوں میں سے کوئی دوا اٹھا کے مریض کو پکڑا دیتی تھی اور پری کو ایک آدھ میں پر دیتی تھی۔ اس کا کرا کسی یکسٹ کی دکان لگتا تھا۔ بچے سے اوپر تک

سارے شیف دو اونس سے بھرے رہتے تھے اس کرے کے پیچھے اسٹور تھا جہاں بڑے بڑے کارٹن اور باکس رکھے ہوئے تھے جو دراشت میں ختم ہو جاتی تھی وہ اسٹور سے نکال کے شیف میں رکھنا بھی کوئی کیڑے داری تھی۔ کسی بھی دوا کا اسٹاک ختم ہونے سے پہلے ڈاکٹر کمال کو بتانا کہ دوا کتنا باقی ہے یہ بھی کوئی کیڑے داری تھی۔ خالی ڈبے اور کارٹن بڑی دالے کوچ کر رہے ڈاکٹر کمال کے سامنے رکھنا بھی کوئی کیڑے داری تھی۔ ابھی تک اس نے اپنی مدد کے لیے کوئی اسٹینٹ رکھنے کی تجویز پیش مسترد کی تھی۔ اس دلیل سے کہ تنخواہ مفت میں جائے گی۔ اتنا کام نہیں ہے۔ میرے پاس کہ میں کر نہ سکوں۔ یہ بصورت تھا۔ ٹھیک میں صبح سے شام تک وہ تھک کے چر رہا ہوتا تھا۔ آسانی یہ تھی کہ اسے دواؤں کے خرچ کا کوئی حساب کسی کو نہیں دینا ہوتا تھا۔ چند کیسٹ خود ہی پوچھتے رہتے تھے کہ کسی دوا کی ضرورت تو نہیں اور ایک فون پر دواؤں کی منجی جاتی تھیں۔ چند کیسٹ انہیں ڈسکاؤنٹ بھی دیتے تھے۔

میں نے کھڑکی میں سروزال کے کہا "میں کوئی دماغ کی خرابی کے لیے کوئی گولی ہوگی آپ کے پاس؟"

وہ مسکرائی "کس کا دماغ خراب ہے؟"

"ناچیز کا۔ ناچیز سمجھتی ہو ناچیز تو انگریزی میں کہتے ہیں نیچر کو کر ناچیز ہوں میں۔" بائیں بوری گولی ہو یا بائیں بوری۔ چل جائے گی میرے ریوالتور میں۔

"دماغ میں خرابی کا علاج سر میں گولی مار کے کرو گے؟"

"تم دونوں بھی تو کسی کر رہے ہو یہاں۔ مریض کو ختم کر دو۔ مرض خود بخود ختم۔"

"فار گاڑ سیک سب ایسی باتیں مت کریں اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ جائیں اندر آجائیں۔"

ایک مریض نے برچی تھما کے دوا لی اور اسے اذیروں دعامیں دیر۔ ڈاکٹر کمال اور کوئی سارا دن اس سے کہیں زیادہ دعامیں سمیٹتے تھے جیسے روئے عام ڈاکٹر مریضوں سے وصول کرتے تھے۔

کوئی کو پیسے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ میں اس کی کرسی پر بیٹھ گیا "میں یہ بتانے آیا تھا ڈاکٹر کوئی کہ میں فوت ہو چکا ہوں۔"

"کوئی ابھی بات کرو۔"

"یہ سچی بات ہے۔ میرا دل پوٹ رہا ہے حد ضروری ہے ورنہ لوگ مجھے بھرا دیں گے جیسے آج صبح اڑھا۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا اس لیے سیدھا ادھر آ گیا۔ اور جانتی ہو میں یہاں کیسے پہنچا۔ آدھا راستہ میں نے ایک چوری کی گاڑی میں طے کیا وہ میں نے سڑک پر چھوڑ دی۔"

"تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔"

"پھر کیا میں ڈاکٹر صاحب کو اپنا دماغ اور اپنی شکل دکھا سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں۔ دس منٹ باقی ہیں۔" وہ بولی "جائے تنگواؤں تمہارے لیے یا کوئی ڈرک گیا ہو گے۔"

"یک گلاس پوٹا فیم سا نائینڈ نیلے تھوکتے کے ساتھ۔ یہ میرا پسندیدہ مشروب ہے۔ دراصل میں اس آلو کے ٹپے کی ہیکٹر کے ہاتھوں مرنے سے بچ رہا ہوں کہ تم مجھے اتنی سی محبت سے مسکرا کے زبردستی دو جتنی محبت سے مسکرا کے تم مریضوں کو دوا دیتی ہو۔ قمر کے ہاتھوں قتل ہوا میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہو گا کوئی۔"

وہ اپنے کام میں مصروف رہی "یا کیا جرم کیا ہے تم نے؟"

"میں اس کے لیے جا کھیت نہیں لایا۔ لایا تھا مگر بھول گیا۔ دراصل جب میرا جنازہ پہنچا تو مجھے سر پاؤں رکھ کر بھانکنا پڑا۔ ہزار دو ہزار افراد جنازے کے ساتھ تھے۔ وہ مار مار کے مجھے بازو مار رہے تھے کہ کیا ساتھ والی کوئی میں۔ پہلے خالد۔ کبھی میں اس کی خاطر کوا ہوں۔ پھر پروین کو بھی خوش تھی ہوئی۔ مجھے تو صرف گاڑی کی ضرورت تھی۔"

کوئی مجھے تشویش سے دیکھتی رہی۔ میں مذاق ضرور کرتا تھا مگر ایسی بے سروا باتیں میں نے پہلے بھی نہیں کی تھیں۔ "کیا ہو گیا ہے آخر تمہیں؟"

میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا "عشق۔ محبت۔"

پریم۔ پیار۔ سب ایک ہی لڑکی سے۔ میں بے حد نام ہوں میں کوئی کہ میرے پاس دو دل نہیں ورنہ نہ ہوں نہ ہوتا۔ چندا کو میں بعد میں دل دیتا۔ حالانکہ تم کو ایسا ہی کرتی ہو مگر اتفاقاً یاد قسمی سے میں پہلے چندا پر عاشق ہو گیا۔"

ایک بے ٹھیک کارواز بند کر دیا گیا۔ ڈیڑھ بجے تک دوسرے مریض بھی رخصت ہو گئے جو اندر تھے تو میں نے کمال کے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔

"میں تیری بکواس میں رہا تھا سڑک کے نیچے۔ کمال نے فنگلی سے کہا "میں آج آتا ہے تو ڈیڑھ بجے سے پہلے کوئی کو پریشان کرنا ہے۔"

میں نے روٹی شکل بنا کے کہا "کمال ہے یا کمال۔ میں آیا تھا اپنے انتقال پر ملال کی خبر پر۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "تو کچھ پریشان ہے؟"

"آلو کے ٹپے۔ جو آدی فوت کر دیا گیا ہو۔ وہ پریشان بھی نہ ہو۔ اب اس سے پہلے میرے قاتل مجھے تلاش کر لیں اور پھر ہلاک کر دیں۔ مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچاؤ۔"

"یہ کیا کہو اس سے؟"

"میں تجھے خبردار کرنے آیا تھا کہ کہیں..... میری وجہ سے وہ بد بخت مشکل میں نہ پڑ جائے۔ جسے بالآخر تیری شریک حیات بنا ہے۔ خواہ زندگی کے آخری ایام میں یہ واقعہ پیش آئے کیونکہ ابھی تو آپ کو فرصت ہی نہیں ہے۔"

"گلتا ہے تو مجھ سے بچ کر مصلاب کرے گا۔ جب ہیٹ خالی ہو تو داغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔"

"یہ ایک بین الاقوامی چالانی ہے سر۔" میں نے فون اٹھا کے کہا "میں نے آپ کا مشق جنت کے ٹپے سے ہو کیونکہ پسند بھی آپ نے ایک جیل کو فرمایا ہے مگر میرے جیسے فانی انسان کھائے پیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

دوسری طرف سے قمر نے کہا "ہیلو۔"

"ہیلو کیا۔ یہ یہود و کفار کا شعار ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا "ڈر خان اسلام پر السلام علیکم کہنا واجب ہے۔"

وہ ہنسی "بھائی۔ آپ آگے؟"

"میں کیا کہاں تھا کہ آتا۔ ہاں یہ ہے کہ بہت جلد میں سزا آخرت پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"ایسی باتیں مت کریں بھائی۔"

"مگر تم میرا چودہ کھانا چاہتی ہو تو فوراً..... بلکہ فوراً سے بھی پشتر چل کر وہیں پہنچاؤ دے دیتا دیا۔"

"کیا..... میں بھی نہیں! "

"مادان لڑکی! اپنا کارواز اسی وقت بند کر دو۔ اگر کا کب نہیں ہیں تو شکر اگر باہر فونس لگا دو۔"

"کیا ناس؟"

"کچھ بھی لکھ دو۔ بوجہ انتقال پر ملال پر اور عزیز شاہ عالم۔"

وہ چلائی "کیوں نگ کر رہے ہیں مجھے؟"

میں نے کہا "ڈیزیز قراٹا..... میں یہیں ہوں۔ جیسا میں کہ رہا ہوں دیا ہی کرو۔ چلو یہ لکھ دو کہ سالانہ اسٹاک کے لئے RENOVATION کی وجہ سے لی الحال پر ٹیک بند رہے گا اور نئی جائے ٹیکنگ چائیز ریٹورنٹ۔ تم نہیں آؤ گی تو ٹھیک چائیز منٹ بعد میں کرسی سے کروں گا اور قاتل سے ہلاک ہو جاؤں گا۔"

تو مجھے گھٹے بعد میں اور ڈاکٹر کمال فادنی ریٹورنٹ کے آخری تاریک گوشے میں بیٹھے قمر کا انتظار کر رہے تھے۔

کمال نے کہا "اسے یہاں کیوں بلایا۔ وہ کبھی کی میں نے کہا ہو گا۔"

"اور کس نے کہا تھا۔ میں قمر کو صاف بتا دوں گا کہ مجھے شادی سے پہلے تم دونوں کا پیسے ملنا قطعی نا پسند ہے۔"

"آخر کڑو کیا ہو گئی تیرے پلان میں۔ بتا کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "میں ایک سی باتاؤں کا تجربہ ہی آتا ہے۔"

قمر دس منٹ بعد خاصی بدحواس نظر آئی۔ میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا ورنہ ہر طرف دیکھتی رہتی۔ دن کے اگلے سے اچانک ریٹورنٹ کے نیم تاریک ماحول میں پہنچ کے اس کو کسی کی صورت صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔

ڈاکٹر کمال فادنی کو دیکھ کے وہ بھی اور پھر خاموشی سے بیک رکھ کے میرے پاس بیٹھ گئی "مجھے یہاں بلانا ضروری تھا بھائی؟"

"میری چھوٹی سی معصوم اور بے وقوف بہن۔ کیا تمہارے بیک میں کوئی ملک اٹھارہ ہے۔ ریوالتور یا انٹیم بہن ہے تو مجھے قتل کر دو۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہارے لیے جو جا کھیت لایا تھا وہ نہ گھٹے۔"

"فوفو! اس نے ایک گہری سانس لی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"نہیں کمال یہ صاحب کرتے ہیں" میں نے کہا "یہ بتاؤ تم میری ہدایات بلکہ احکامات کے مطابق کارواز بند کر کے آئی ہو۔ یعنی یہاں آنے سے پہلے ساری کشمکشیں جلا دی ہیں نا۔ تمہاری دواؤں کا کوئی امکان نہیں قراٹا۔"

"کیوں! ایسی کیا بات ہے؟" وہ بولی۔

"آلو کے ٹپے۔ تو کیا میں رہا ہے بہن بھائی کی باتیں۔ آؤ رور دے کھائے۔ پہلے تو ہاتھ پاؤں جوڑ رہا تھا کہ قمر کو بھلاؤ۔ تم جو کسے کروں گا۔ جہاں چاہو گے لے جاؤں گا۔ لایا ہے یہاں "خمس دل والے ہیکٹر اور کم عرف دوست۔"

"قمر یہ بصورت بول رہا ہے۔ میں نے بالکل یہ نہیں کہا تھا" تمہاری قسم۔"

قمر کا چوہ گھلا ہو گیا۔ "بھائی۔ مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ بتائے کیوں نہیں اصل بات۔"

میں نے انہیں اصل بات بتادی۔ اس سے ان کی بھوک اُڑ گئی اور ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے۔

"میں ختم ہو گیا ڈراما۔ شوق پورا ہو گیا شاہ عالم بننے کا۔ وزیر اعظم کے گھر ڈے۔ اب کیوں بھاگا پھر رہا ہے کمال نے برہمی سے کہا۔"

"ہاں بھائی۔ تمہاری جان تو واقعی خطرے میں ہے۔ تم کب تک دوپوش رہو گے آخر؟" قمر نے کہا۔

"ڈیکو۔ تم دونوں میری فکر مت کرو۔ سارے کارڈ ابھی میرے ہاتھ میں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ مجھے کون سا پتہ کب چلنا ہے۔ چندا اور خان اعظم میرے ساتھ ہیں۔ پریشانی مجھے صرف قمر کی طرف سے تھی۔ ڈاکٹر فادنی کو میری دوستی کی سزا شاید نہ ملے کیونکہ ہزاروں شہا پانے والے مریضوں کی لاکھوں دعامیں اس کی محافظ ہیں۔ اس کو نقصان پہنچانے کی ہمت کوئی نہیں کرے گا۔"

"آپ اپنے بارے میں فرمائیں کہ اب کیا ارادہ ہے؟"

فادنی نے کہا۔

میں نے کہا "میرے عزائم جو پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ مداری کا کھیل ختم نہیں ہوا۔ یہ سسپنس ہی تو کھیل کی جان ہے۔ کل از وقت کچھ بتانا مشکل ہے لیکن میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں جو بھی چال چلوں گا سوچ سمجھ کے چلوں گا۔ خان اعظم اور چندا اچھے مشیر میرے ساتھ ہیں۔"

"مارے جانتے کے مشیر بھی اس پکر میں۔"

”نہیں کمال صاحب۔ جو اس وقت مخالف نظر آرہے ہیں ایسے پلٹا کھائیں گے کہ بڑی بوڑھی ہونے کے بعد قمر چندا اپنے پوتوں نواسوں سے کہیں گی۔ جیسے اللہ نے ناصر عظیم عرف شاہ عالم کے دن پھیرے ایسے ہی سب کے پھیرے۔ بس قمر ڈاسا انتظار۔ ابھی خاموشی سے تماشا دیکھتے رہو ڈوٹ کے۔ کیا تجھے؟ قمر کا ان حالات میں اپنا بونٹیک چلانا قطعی غیر محفوظ ہے۔ میرے دشمن اور مخالف اس کے بونٹیک کی اینٹ سے اینٹ جھانکتے ہیں۔ اسی سے شیشے سب ٹوٹ جائیں گے اور شیشوں کا سمیا کوئی نہیں۔“

”یار بھئی تو میری ہو جایا کرو“ کمال نے کہا۔

”میں کیا مذاق کر رہا ہوں؟ قمر کو میں چندا کے ساتھ شفت کرویتا مگر چندا اور خان اعظم بھی مفرد اور مد پوش ہیں بی ان حالات میں ایک فیصلہ کیا ہے میں نے۔ جس کے خلاف اپیل نہیں کی جاسکتی۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”سنادوں؟“ میں نے قمر سے پوچھا ”ہوئی یا میرے فیصلے کو؟“

”نہ کرتے ہو بھائی۔“

”میں چاہتا ہوں۔ سوری۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسی پتے میں بلکہ دو چار دن میں تمہارے ہاتھ پیلے کر دوں۔ تمہیں ذلیل میں بٹھاکے باہل کے آئینے سے گیت آؤت کروں۔“

قمر کا رنگ لال ہو گیا ”بھائی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”چچا جلدی کا سوال کیا تم نے۔ سن۔ یہ ایسے ہو گا کہ ایک داڑھی والا شخص جسے قاضی کہتے ہیں تم سے ایک شرعی سوال کرے گا۔ تم بس ہاں کہہ دینا۔ سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ڈاکٹر صاحب سے کچھ پوچھنا ہے کار ہے۔ یہ ابھی قاضی کے گھر جا کے سوال سے پہلے جو آپ عرض کروں گے کہ میں نے قبول کیا۔ چنانچہ اب ہم چلتے ہیں تم دونوں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں بھائی؟“ قمر نے بڑی مشکل سے کہا۔

”جس ہمارا بیٹ بھر گیا۔ ہم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب تم سر جوڑ کے جھجھو اور سوچ کے عمل در آمد کیسے ہو گا۔ شام تک سارے معاملات طے کرنے کے بعد ہمیں بتانا۔ آج کیا تاریخ ہے۔“

”جس پوچھیں تاریخ کی شام پانچ بج کر اسیٹھ منٹ پر ڈاکٹر کمال جیسے اپنے گھر لے جائیں گے۔ لی امان اللہ۔ اور دیکھ بیل خود ادا کرنا تو کئے بیٹھے۔“

وہ بکا بکا۔۔۔ اور گھبرائے ”شرائے بیٹھے رہ گئے اور میں ان کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ ایک جیسی میں بیٹھ کے میں نے اپنا موبائل فون جیب سے نکالا اور تیمور کے خفیہ نمکائے کانبر ملایا۔ دوسری طرف سے رکشے نے چلا کے کہا ”بیلر۔“

میں نے کہا ”تم نہیں غیبت۔ اتنی اونچی آواز میں بات کرنی ہے تو پھر بیل فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”چچا پر اتم مشر صاحب۔ یار یہ کس مشکل میں ڈال دیا تو نے

مجھے؟“

میں نے کہا ”تم نے پیدا ہو کے ساری دنیا کو مشکل میں ڈال دیا تھا کیا ہوا؟“

”بے یار شرافت کی زبان کوئی سمجھتی نہیں۔ میں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ آرام سے رہو مگر میں۔ باہر کی دنیا کو ابھی پہلے جاؤ۔ کوئی ایک تو اس نظریے آہ کی کھلی جیسی تخت کھوایا۔ ہر وقت زلزلہ کرتی ہے۔ ہم کیا قیدی ہیں؟ تم قاتلے دار ہو گئے۔ خدا کی فوج دار۔ میں نے کہا دونوں فون کیوں بند ہے؟ ہاتھ میں توپ کیوں رکھتے ہو ہر وقت۔ خود کو بلا کو خان سمجھتے ہو؟ کیا ہم سب کو گولی مار دو گے؟ اب عورت ذات کے ساتھ ہم کیا زبان چلا رہے۔ ہم نے بس ایک گولی چلا دی۔ اس کے سر سے گزر گئی مگر وہ گولی پٹ سے اور نکل کر گئی۔ گئی جیسے بج کر گئی ہو۔ پوٹی بند ہو گئی۔ مانی کی۔ اور اس کی وہ لوترا پیکا کلیم خود کو دھوری ڈکٹ سے کم نہیں سمجھتی۔ ہم نے تو سمجھا دیا کہ دیکھو مانی۔ ہم یہاں تمہاری حفاظت کے لیے نہ آئے ہوتے تو ضرور تمہیں بھٹکالے جاتے مگر اب تم نے ہم پر میری نظر بھی ڈالی تو اچھا نہیں ہو گا۔ ہم ٹٹ مار بیٹ کر دیں گے۔“

”بس یار۔ باقی میں وہیں آکے ٹٹ لوں گا۔“ میں نے کہا۔

”چچا۔ تو آ رہا ہے فون سی گاڑی سے؟“

”یہ سوڈو ایف ایکس ہے۔ جیسی نمبر بھی بتاؤں؟“

وہ قہقہہ مار کے ہنسا ”چچا تو ادر شریف لاری سے سواری۔ وہ تیرا گریڈ سر بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچا ہے۔ اپنی ظالمی پٹی کے ساتھ۔ تم اللہ کی تیرا لفاظ ہے مجھے روزہ ہم بھی نہیں فیض ہیں۔“

”کیا ظلم کیا ہے اس نے تم پر؟“

”اے ہاتھ مارو قہ میرے کس کے۔ دو دن بان کھانا مشکل ہو گیا تھا اور کس بات پر؟ ہم نے بھائی جان کہہ دیا تھا غلطی سے۔ حالانکہ غلطی بھی کوئی ایسی نہیں۔ میں تو ایسے ہی ترک میں گاما تھا۔ یار بھائی، بھائی میں تو میری ماں ہے۔ وہ آئی پتا نہیں کہاں سے۔“

میں نے فون کے کہا ”چل جاتے دے یار۔ تو جانتا ہے ان لڑکیوں کی عادت۔ غلط فہمی بہت جلد ہو جاتی ہے انہیں۔“

”غلط فہمی کیا یار۔ بس خورہ ہے خواہ خواہ گا۔ سرخہ جاتی ہیں عاشق بن کے۔ ہم نے بھی معاف کر دیا تھا تیری وجہ سے۔“

میں نے کہا ”تیمور کے گھر میں ہی ہیں نا سب سب ٹھیک ہے نا؟“

”ایک دم رائٹ استاد۔ اے وہ آ رہا ہے ادر۔ کرل مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

میں نے کہا ”اس سے فون نہ ڈرا۔“

چند سیکنڈ بعد خان جی نے کہا ”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”ابھی یقیناً خود حاضر ہو کے عرض کرتا ہوں۔ یہ زرا نہیں کہ آپ نے تیمور کو کچھ بتایا ہے؟“

”ابھی تک تو اسے صرف اتنا یاد ہے کہ گولی تم پر چلائی گئی تھی مگر ننتان۔ وہ نہ گیا۔ اسے اسپتال جانے اور شاہ عالم کے گھر پہنچنے کا نظریہ خواب کی طرح یاد ہے۔ گھر پہنچنے کے خوش ہے۔ وہ۔ لیکن تم اتنی دیر سے کہاں تھے۔ شاہ عالم کے گھر فون ڈیڈ تھا اور موبائل تم خط بند کر رکھا تھا۔“

”بس میں پہنچ رہا ہوں تھوڑی دیر میں۔“

تیمور کا یہ گھر شہر کے مسافتات میں تھا اور خاصی محفوظ جگہ تھی مگر وہاں پہنچنے سے پہلے میں صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مصروف اور کا دھاری علاقوں میں ابھی تک شاہ عالم کی موت کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد مجھے پتہ چلے گا۔ زار میں آجائیں گے۔ شاہ عالم کی شہادت صاف اول کے سیاہی لیندوں جیسی نہیں تھی مگر اس کی اہمیت گزشتہ چند ماہ میں اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس کا روپ مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور حکومت کرنے والی ہائیڈیج سمجھتی تھی کہ اس نے اپنا سیاسی وزن حزب اختلاف کے پڑے میں ڈال دیا تو ان کا اقتدار خطرے میں پڑ جائے گا۔ حزب اختلاف بھی اس پتھر میں تھی کہ شاہ عالم کی پٹی ہے ایف کے ساتھ ایک اور دائیں بازو کی لوٹا مار کے جماعت کے چند اراکین کو اپنے ساتھ ملالے اور حکومت کے خلاف ایوان میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کرے۔

ان حالات میں یہ بات یقینی تھی کہ حکومت شاہ عالم کی ”شادت“ کا سوگ اپنے کب میں منانا چاہیے گی اور اس قتل کی ذمہ داری ظالمین پر ڈالنے کی تو حزب اختلاف اسے ریاستی دہشت گردی قرار دے گی۔ مجھے دیکھنا تھا کہ اوٹ کس کوٹ بیٹھتا ہے۔ مرنے کے بعد شاہ عالم کو کیا اہمیت حاصل ہوئی ہے اور سیاست کے افق کے رنگ کیسے بدلتے ہیں۔ تب تک مجھے روپوش اور خاموش رہنا تھا۔

ایک گھنٹے تک مجھ سے دائیں بائیں اور سیدھا منٹنے کے بعد جیسی ڈرائیور نے جھٹکے کہا ”آخر آپ کو جانا کہاں ہے جی مکمل کرو۔“

”جنم میں۔ راست معلوم ہے تمہیں تو بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”کوئی مارا تھی کیوں کنی گل بات ہے۔“

میں نے کہا ”تمہارے پیوں کے ساتھ میٹر چل رہا ہے بلکہ جس رفتار سے چلنا چاہیے اس سے تیزی چل رہا ہے۔ پھر تمہاری زبان کیوں چل رہی ہے؟ تم مجھے ملت میں تویر نہیں کر رہے ہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے جی۔“

میں نے کہا ”میں ڈرا شہر کے حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔“

وہ کچھ پریشان ہوا ”شہر تو ٹھیک ٹھاک ہے سرنی۔“

”ابھی تمہیں لگ رہا ہے ایسا۔ شام تک پتا چل جائے گا۔“

”شام تک۔ جناب عالی مجھے اپنے بچوں کو اسکول سے لانا ہوتا ہے۔ آپ کی بڑی سوانی ہوگی اگر دوسری جیسی پکڑ لیں۔“

مجھے اس کی عاجزی پر ترس آیا۔ میں کراہی ادا کر کے وہیں اُتر گیا۔ اس وقت میں کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ شامت اعمال مجھے بھاری ہے اور ستم حریف تقدیر کیلے ڈسے بھی ایسے ہی شر کا رخ کرنے کا فیصلہ کرائی ہے میرا خیال تھا کہ وہاں سے مجھے دوسری جیسی آسانی سے مل جائے گی مگر کیسے بعد دھڑکے دو جیسی ڈرائیور میرے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اور گردن کو دائیں بائیں ہلاتے گزر گئے۔ تیسرے نے کہا کہ وہ مخالف سمت میں جانے کے لیے تیار ہے اور میں منٹ بعد چوتھے نے جیسی خالی کرتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ جیسی خالی نہیں ہے پھر وہ ایک دروازے میں غائب ہو گیا جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے پردے ہٹا کے ایک ابھی خاصی حسین عورت نے مجھے اشارے سے بلایا تھا تو میں سمجھا تھا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے کسی اور کو بلایا ہو گا۔ جیسی ڈرائیور مجھ سے زیادہ کچھ دار تھا۔

میں نے کھینکا تھا کہ اب جو جیسی گزرے گی اس کے سامنے لیٹ جاؤں گا یا انکار کرنے پر ڈرائیور کو لٹا دوں گا جب میں نے اپنے پیچھے سے بلی کی آواز سنی اور کسی نے میری آنکھوں پر ایک خاصی زور دار ضرب لگائی۔ میں مشتعل ہو کے پلٹا اور اپنے سامنے ایوب کر آزاد کو دیکھ کر میرے ارمان فضا ہو گئے۔

وہ آہی پانچ دوپے مال والی رنگین پھول دار شرٹ اور خاکی نظر آنے والی سفید چٹن میں تھے۔ ان کی سوچیں بھی سوانہ بخاری تھیں۔ بس ان کے سر عزیز پر قرقری ٹوپی کی جگہ ٹائون کی اسپورٹس کپ تھی۔ جیسی عموماً جو کی پہنتے ہیں یا گولف کھیلنے والے۔

”کیوں میاں۔ وہ کیا دلربا نام بتایا تھا تم نے اپنا۔ وسیع عریض لا استار دہلی۔ کہ مخفف جس کا بٹا ہے والد۔ وہ پھر بلی کی طرح بیٹھے۔“

میں نے ٹانگ سلا کے کہا ”حضرت! یہ نام آپ نے بتایا تھا۔ ناچو کو کرک کئے ہیں۔ چوہدری رشید احمد چراغ کا پتہ در۔“

”ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ یہ تو گویا سلسلہ نسب ہی الٹ گیا تھا۔ والد تو ہم تھے۔ دماغ الٹ گیا ہے اس وقت کچھ ہمارا۔ پوچھو کیوں؟“

میں نے مجبوراً سوال کیا ”بتائیے کیوں؟“

انہوں نے ایک آہ بھری اور اپنی چھری اٹھا کے ایک طرف اشارہ کیا۔ چھری ایک خیرے ٹاپ برقع پوش خاتون کی پٹلیوں میں یا بٹن میں کھس گئی۔ اس نے ایک دم چلا کے کہا ”اوہ تیرا بڑا غرق۔ بڑے سنو کھوڑے۔ چھیز خانی کرنا ہے۔ حرام دے تھم۔ کا کے دا اب تیری ٹانگے توڑ کے ہاتھ میں پکڑا دے گا۔“

آزاد صاحب کی بولکھاہٹ قابل دید تھی۔ "پلیس۔
منفکات۔ یعنی ہم منحوس اور گھوڑے۔ لا حول ولا قوت۔ افس۔
بچہ اس کو کہتے ہیں اٹا چور کو تال کو ڈانٹے۔"
میں نے بڑی مشکل سے خاتون کو سمجھایا "اٹا جی۔ غلطی سے
چھڑی لگ گئی۔"

"اٹا؟ کس کو بولا ہے تو نے اٹا۔" وہ مزید برہم ہوئی "تیری
اپنی عمر کیا کم ہے اس بابے سے کھوے۔"
میں نے ہاتھ جوڑے "اچھا میری بس مجھ سے سی غلطی ہوئی"
اب جاؤ۔"

آزاد صاحب نے میرے ایک چھڑی رسید کی "آخر یہ کیا
حرکت فرما رہے ہیں آپ۔ سراسر غلامانہ ذہنیت۔ عورت ذات کے
سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ تاک کنواری مردوں کی؟"
"اور کیا کرنا۔ آپ کی معیت میرے گلے پڑتی تھی۔"

"ہمم۔ ہم خود اسے بتاتے کہ کون ہیں ہم" انہوں نے پھر
چھڑی کھائی گھر میں نے وار خالی کر دیا "کیا کچھ کے اس نے ابوبکر
آزاد کو وہ کہا۔ کیا کیا؟ منحوس۔ اور گھوڑا۔ ہم کو اس نے بھی
دیکھا کسی آنگے میں جُٹا ہوا۔ اور گھوڑا منحوس کیسے
ہو سکتا ہے۔ سرعام تو ہیں ہماری۔ ہم اس کو طلب کر لیں گے
اپنے دفتر میں۔ تم گواہ رہنا۔ اس نے دھمکی دی ہمیں کہ وہ کیا
نام تھا اس کے سر تاج میں سلامت باشد کا؟ ہاں کا کے والے۔ گویا
کاکی نہیں ہے کوئی۔ خیر ہم کہیں گے کہ عملی مظاہرہ کر کے
دکھائے ہماری یہ فاطمیں توڑ کے ہمارے ہاتھ میں پکڑا لے۔"
میں نے سر پکڑ کے کہا "آپ اشارہ کر کے کیا بتا رہے تھے۔ ذرا
دیکھ کے پھر آ رہا ہے ایک موبائل خیر۔"

وہ بلیک کی آواز میں ہنسنے لگی "بھئی خوب کہا۔ موبائل خیر۔ اندر
موبائل پاکستانی عورت جو گویا اسی طرح داخل ہوگی ایکسپریس مددی
میں۔ خیر تو ہم افسردہ اور پریشان تھے چلی کی وجہ سے۔ لیکن اچانک
ہماری پریشانی کا سبب بدل گیا ہے پوچھو کیوں؟"

"میں نہیں پوچھتا۔"
"مت پوچھو ہم خود بتاتے بغیر تمہیں جانے کہاں دیں گے۔
وہ کچھ متا تم نے آئی سی اگر خبر ہے زبانی طور کی۔ وہ اپنے شاہ
عالم کو کسی نے فوت کر دیا گویا۔" شاہید شہید وغیرہ کر دیا۔"
میں نے کہا "چلی کو کیا ہوا ہے؟ آئیے میں دیکھتا ہوں۔"
وہ میرے ساتھ چل پڑے "بہن۔ سیال۔ بلی کی کمانی
آئی۔ کچھ حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔"

"میں آپ کی نہیں چلی کی خرابی کا حال پوچھ رہا تھا۔"
انہوں نے بڑی چھڑی سے چھڑی کھمکے میری کمر باری۔ وہ
مارتے پیار سے تھے مگر چوٹ اچھی خاصی محسوس ہوتی تھی۔
"اقت۔ ہم اور کس کے بارے میں بتا رہے تھے اور والے خانے
میں کیا ہے؟ بھوسایا گویا۔" انہوں نے میرے سر کو چھڑی سے سجایا

"یہ دبا خالی لگتا ہے ہمیں تو۔ آواز دیکھ ایسی ہی آری تھی جیسے خالی
برتن۔ خیر میاں شاہ عالم ہمارا مطلب ہے کہ ایک صاحب۔ بس
اٹا محسوس ہوا ہمیں۔ پھر اس کے بعد گویا چلی کی حرکت قلب بند
ہو گئی۔"

گاڑی نے بیک فائر کیا اور کچھ گرم ہو رہی تھی۔ میں نے کہا
"میں دیکھ لیتا ہوں۔ انشاء اللہ اشارت ہو جائے گی۔"
"لیکن۔" وہ چلے چلے رک گئے "یہ کیسے ہو سکتا ہے گویا۔ ہم
نے تو ایسا نہ تھا کہ تم کچھ شہید وغیرہ ہو گئے ہو۔ ہیں کہ نہیں۔"
"میں اچھل پڑا۔" یعنی کہ میں۔ اور شہید۔ آزاد صاحب یہ کیا
فرما رہے ہیں آخر آپ؟"

انہوں نے ڈانٹ کر کہا "قسم کھا کے کہو کیا تم شہید نہیں
ہوئے؟"
میں نے کہا "برگز نہیں۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی
ہو گی۔"

انہوں نے مجھے ایک بیڈ زیادہ غصے میں رسید کی "بھوت ہم
سے؟ تم کیا کہتے ہو ہمیں۔ ہم ہوائی اور ہوائی قلعے اور جڑو ہوائی
سب جانتے ہیں۔ اور جو دشمن کو اتنا بے وقوف کیسے دیکھ دیا خود
گدھا۔ ہم نے قلعہ خود نہا ہے کہ شاہ عالم کو شہید کر دیا گیا۔ اصولاً
ہم اتفاق نہیں کرتے۔ جنم رسید ہوا زیادہ موزوں رہتا۔ مگر خیر تم
گویا ماننے کو تیار نہیں کہ تم شاہ عالم نہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس چالاک اور عیار ایکڑ کو دھوکا دینا بہت
مشکل ہو گا۔ "دیکھئے ابھی تو میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"ہوں" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا "ابھی۔۔۔ یعنی فی
الحال۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم بیک وقت میاں بھی ہو اور
وہاں بھی۔ اس عالم آب و گل میں بھی اور عالم بالا میں بھی۔ یعنی
بہت خوب۔" وہ قہقہے قہقہے کر کے ہنسنے اور قہر قہر اٹے گئے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ آپ کی کیا رائے ہے شاہ عالم
کے بارے میں؟ کیا آوی قہار؟"

انہوں نے جیب میں سے ایک ایسی ڈبیا نکالی جو کسی میوزیم
سے چوری کی ہوئی آثار قدیمہ کا نمونہ لگتی تھی۔ اس نقش و نگار
والی مراد تباری ڈبیا میں سے انہوں نے ایک پان بڑی احتیاط سے
برآمد کیا جو سرخ شعل کے کیسے کپڑے کی۔ میں دبا ہوا تھا۔ "پان
کھا گئے میاں شہزادے۔ نہیں خیر اب ہم کیا کہیں اس بنی نسل
کو۔ یعنی ایک مذہب ہے پان کی اپنی گویا۔ اس دور کی تہذیب کا
نمونہ ہے یہ۔۔۔ ملاحظہ ہو۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دیوار کے سامنے دو دیوہونچ پڑے
ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مشکل سے چند سو سال کا لاکا
تھا۔ دونوں لمبے کپڑوں اچھے بالوں اور ڈبیلوں کے ڈھانچا بدن کے
ساتھ فرش خاک پر تصویر جرت بنے بے سجدہ پڑے ہوئے تھے۔
ان کے چہروں پر کھیاں بھگ دی تھیں۔ ایک تہا ان کے بہت

قرب انہی کے انداز میں پاؤں پیارے لیٹا ہوا تھا۔
پان منہ میں رکھنے کے بعد انہوں نے چٹان کی دو سری جیب
میں سے چیلے گئے اور شعل کے استروالا وہ بڑا نکلا جس کو دو
ریشمی کان جیسے پھندے پانچندے جیسے کان کھینچ کے کھولا جاتا ہے
اور وہ ریشمی ڈبیلوں کھینچنے سے بند کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس دور کا
آئینہ تھا جب زپ نے دیوان نہیں پایا تھا۔ چھالیا تہا کو اور ایک
الاچکی منہ میں رکھنے کے بعد انہوں نے کہا "سوال تمہارا یہ تھا کہ
شاہ عالم کیسا آوی تھا؟ تو ہمیں بس آوی تھا۔ اسی قسم کا جیسے ادرہ
آدرہ چل پھر رہے ہیں یا کھڑے ہیں اور پڑے ہیں۔ دو تاک اور
ایک آٹھ والے۔"

"آپ کا مطلب ہے دو آنکھیں اور ایک ناک والے۔"
انہوں نے پھر مجھے چھڑی رسید کی "مطلب سمجھاتے ہو ہمیں
گویا۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ بے شک تم شاہ عالم نہیں ہو مگر ہم
کہتے ہیں کہ آخر تم وہ کیوں نہیں ہو جو ہو۔ اور جو وہ وہاں کیوں
نہیں کرنا چاہے گویا۔ ہمیں یہ کچھ ذہل دول والی فلم لگتی ہے۔
لیکن ہم آوی اور انسان کا فرق سمجھتے ہیں۔ شاہ عالم جو قہار وہ آوی
تھا مگر انسان نہیں تھا۔"
"جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔ آوی کو بھی میٹر نہیں انسان
ہوتا۔"

"اچھا؟ یہ کب کہا غالب نے۔ مگر بھی خوب کہا گیا۔"
انہوں نے پان کے کپڑے کو منہ میں کھونٹا شروع کیا "اور تم جو ہو تم
آوی تو پتا نہیں ہو کہ نہیں مگر انسان ہو۔"

"شکریہ کہ آپ کی رائے اچھی ہے میرے بارے میں۔"
"میاں پر خود دار ہے جو ہے نا" انہوں نے اپنی چھڑی کھمائی
"یہ ایک آلہ ہے گویا آوی میں انسانیت اور شرافت کی مقدار کا پتا
لگنے والا۔ جیسے وہ آلہ ہوتا ہے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے
والا۔ سیو میٹر۔"

میں نے کہا "جی نہیں، ٹیکو میٹر۔"
وہ ہنسنے لگا "بھئی نام میں کیا رکھا ہے تو ہم نے اس آلے کی مدد
سے دیکھ لیا تھا کہ تم ماشاء اللہ ہو سعادت مند۔ ہمیں اچھے لگے"
پوچھو کیوں؟"

میں نے کہا "کیوں؟"
"اس لیے کہ تم ہوتے گستاخ اور نافرمان تو میاں ہم سے اتنی
بار کیوں کھاتے؟ پکڑ لیتے اس آلہ متنبیہہ الفاظ قہقہے۔ دو ٹکڑے
کر کے راتے ہمارے منہ پر گویا۔ اور وہ جو تم میں ایک جذبہ ہے
خدمت خلق کا۔ چلی بھی بہت پسند کرتی ہے تمہیں اسی لیے بڑی
محبت سے پیش آتے ہو تم اس عقیفہ کے ساتھ۔ اس عمر میں
عمر رسیدہ ابوبکر آزاد اور چلی بس تمہوڑی سی عزت ہی تو مانگتے ہیں۔
اور کیا ہے اپنے پاس گویا۔ تو خیر یہ یہ سلسلہ کیا ہے آخر تم یہ ذہل
دول کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "آزاد صاحب۔ مجھے آپ کی مدد اور سرپرستی
چاہیے۔ میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔"
انہوں نے بیک سے سوتے ہوئے مجھے پرچکاہری ماری اور کتنی
بڑبڑا کے اٹھا تو وہ چٹان کی طرح خوش ہو گئے "تمہارا کہہ گا کہ
لو لسان ہو گیا۔ اس کے لا شعور میں سرخ رنگ کس جذبے کی
علامت ہو گا۔ خطرے کی یا پھر رنگ ہٹا اور لباس عوی کا۔ مگر یہ
تم کیسے جان سکتے ہو گویا۔ آوی کیسے سوچ سکتا ہے کتے کے ذہن
سے۔ خیر تو تم عرض کر رہے تھے کہ ہماری مدد چاہیے اور سرپرستی
تو پر خود دار خود ہمیں کسی نے اپنی سرپرستی میں نہیں لیا ورنہ جی ہوتی
ہماری تو ہم ضرور تمہیں سرپرستی میں لینے مدد کی درخواست پر غور
کر سکتے ہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ فرزند میں لے لیں۔ مجھے معلوم
ہے آپ نے شادی نہیں کی" میں نے کہا۔
"بھئی کیسے کر لے۔ اول تو ہم کو پسند ہی نہیں آئی کوئی بھی۔
اور بالآخر جو پسند آئی اس نے ہمیں پسند نہیں کیا۔ یہی ہوتا ما
بیٹ۔ خیر تو قدر ہم ضرور کریں گے مگر اس کا انحصار ہے مدد کی نوعیت
پر۔ اور اس پر کہ تم ہم سے کتنا پیار ہوئے ہو۔ توڑے بہت بھوتے
میں کوئی مٹا تھا نہیں۔ بہت دن سے بول رہے ہو تم لیکن پہلے ذرا
چلی سے مل لو۔ اس کی دل آزاری ہو گی۔ اتنی دیر سے کھڑے ہو اور
آٹھ اٹھا کے نہیں دیکھا اس کی طرف۔ آخر اس کے بھی جذبات
ہیں۔"

چلی جیسی نادر روزگار گاڑی کو آتے جاتے لوگ بڑی دلچسپی
سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا چاہا مگر ہر پینڈل
کوئی نہیں تھا۔ اندر سے چلتی کھول کے میں نے دروازے کو باہر
کھینچا تو آزاد صاحب نے مجھے ایک بید رسید کیا۔ "جی بے دردی
سے چھوڑو گے تو ٹوٹ جائے گا غلطو ہاتھوں۔ ناممکن۔ جو اپنی کا زور
اس ضعیف جان پر آڑنا ہے ہو؟"

میں نے کہا "میں معذرت چاہتا ہوں" اور اندر بیٹھ کے چھالی
لگانے کی جگہ تلاش کی مگر نصف صدی پرانی گاڑی پر ہر کینک
نے طبع آزمائی کی تھی اور بہت کچھ اپنی اصل حالت میں نہیں تھا۔
میں نے وہ جھن تلاش کر لیا جس کو دبانے سے گھوم گھوم کی آواز
پیدا ہوئی۔ پھر بقل آزاد صاحب کے۔ چلی کمانی پھر اس نے
ایک پانڈا چھوڑا۔ میں نے بونٹ کھول کے دیکھا تو ایک کنگ کا آ
نکلا ہوا لگا۔ میں نے اسے دبا کے ٹانٹ کیا اور پھر سیٹ مارا تو دوبار
کھانسنے کے بعد چلی کی حرکت قلب بحال ہوئی یعنی انجن اشارت
ہو گیا۔

"بھئی سبحان اللہ۔ کیا دست شفا ہے" آزاد صاحب خوش
ہوئے "دور اصل انسان اور جانور کی طرح ششیں بھی محبت سے مان
جاتی ہے۔۔۔ اب ہم تمہیں موقع دیتے ہیں۔ عین خوش قسمتی ہے
تمہاری۔ تم چلی کی لگام اپنے ہاتھ میں لو۔ ہم بیٹھے ہیں تمہارے

ساتھ۔

میں نے گہرا کے کہا "حضرت مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ کس نے فریادیں سے بے قابو ہو کے چلی کی پڑھ نہ جائے۔"

"کسی پر کیا مطلب؟" انہوں نے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کے اندر سے دواؤں کی جتنی لگائی "درخت پر یا کھجے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ باقی رہے یہ سیوان باطنی تو ان کی قدرت کرو۔ یہ خود ہماری جان بچانے کے لئے ہوا اور جو باطنی گئے تم چلو بر خودار۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے مجبوراً چلی کی اشارت کیا۔ اس کے بریک دوبار لگانے سے خود اس کا کام کرتے تھے۔ غالباً کلچر و انزویا تھا کہ گہرا بھی خاصی بد وجد کے بعد لگتا تھا تو آواز ایسے آتی تھی جیسے چلی نے ڈکاری ہو۔ آزاد صاحب نے صحیح فرمایا تھا۔ اس کی ہر چیز جتنی بھی سوائے ہارن کے چنانچہ راہ گیر خود راست چھوڑ کے الگ ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ میں بھی نقص تھا۔ پھیلا پیسہ پر چکر میں ایک بار خود اس کا اچھلتا تھا۔ آزاد صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ ایک زخم ہے جو ٹھیک سے بھرا نہیں۔ غالباً ان کی مراد ہارن کے کسی کٹ سے تھی جو دلگنا ترک کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "آزاد صاحب آپ کی وہ مسئلہ میرا مطلب ہے شہنشاہ کی جو رپورٹ ہے۔ وہ آسیب کی طرف میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"ہاں۔ بڑی باری پڑی ہے۔ بس مسئلہ یہی ہے کہ تمہاری طرح سب اس پر فوراً فریفت ہو جاتے ہیں۔"

"ابنی لغت فریفت ہونے والے پر۔" میں نے کہا اور چلی کو بڑی مشکل سے بچا کے نکلا ورنہ وہ ایک گنہ گری والے کی ریزمی سے لگے پلٹے پر آدھ تھی "اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ وہ اوصاف کھائے بھیجے تھے بے نقاب کر کے پر۔"

انہوں نے سر ہلایا "سوال یہ ہے بر خودار کہ تم زیر نقاب کیوں ہو۔ بھی جس کا چہرے نقاب ہوا اسے شناخت کا ڈر کیسا؟ بات کچھ تو ہم سمجھتے ہیں، لیکن تمہارا نقطہ نظر بھی واضح ہونا چاہیے گویا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "ہمت نیک خیال ہے۔ میں آپ سے سچ بولوں گا۔"

"کھانا چلی کی جان عزیز کی قسم۔"

میں نے قسم کھانے کہا "بلاشبہ آپ آزاد ہیں۔ نام کے ہی نہیں، فخرت اور مزاج کے بھی۔ گزارش احوال واقعی سننے کے بعد آپ جو فیصلہ کریں۔ مدد فرمائیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ بصورت دیگر یہ سمجھ لیں کہ آپ مجھ سے بھی ملے ہی نہیں۔"

"کبھی ملے ہی نہیں، خیر فرض کرنے میں کیا مضائقہ ہے گویا تم کو۔"

"اگر ہم نہیں بیٹھ کے چائے پی لیں۔۔۔ ایسے بیک وقت چلی

پر توجہ مرکوز رکھنا اور آپ سے عرض مدعا ذرا مشکل ہے۔"

"چائے ضرور پئیں گے ہم بشرطیکہ چاہے ہی ہو۔ ہمارا مطلب سمجھو تم؟ چائے خالص ہو۔ اس میں ملاوٹ نہ ہو ورنہ اور جتنی کی۔"

"آپ فرمائیں کہ خالص چائے کہاں اچھی ملتی ہے؟" میں نے کہا۔

میری پوری کوشش کے باوجود چلی نے دھنکے سے انکار کر دیا۔ بڑھاپے کے باعث اس کی رفتار کا مقابلہ نئے نازل کی شوخ اور نوجوان کاہلوں سے تو خیر ناممکن تھا۔ میں خود اسے دوڑانے سے ڈرتا تھا کیونکہ اس کے بریک نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے اسے فٹ پاتھ کے ساتھ لگانے کی کوشش کی تو وہ خود اس کا پھل کے فٹ پاتھ پر پڑھا۔ قسمت کا حال بتانے والا ایک عجیبی اپنے طوطے کا پنجہ اٹھانے جان بچانے کے لیے دوڑا اور پھر شور کرنے لگا۔ "مار ڈالو۔ پتل ڈالو غیروں کو گاڑی ڈالو۔"

آزاد صاحب کڑی کھل کے اترے "ہاں ہاں۔ کچل ڈالیں گے پھر کبھی۔ اگر تم واقعی غریب ہو۔ ابھی تو فرصت نہیں ہے گویا۔"

ہمت سے لوگوں نے ابوکر آزاد کو دلچسپی سے دیکھا مگر افسوس ناگ بات یہ تھی کہ کسی نے بھی ایک اخبار کے ایڈیٹر کو شناخت نہیں کیا اور نہ مجھے۔ ہماری جگہ کوئی تھڑکاسا دی وی سیریل کا اشار ہو تا تو وہاں لوگوں میں ہنسی پھیل جاتی۔ لوگ سیزل سے اٹھ اٹھ کے ہاتھ خانے آ جاتے۔

میں نے ہمت سوچ سمجھ کے یہ بازی کھیلی تھی۔ آزاد صاحب کے کئی پن میں کچھ قصور ان کے مزاج کا ضرور تھا۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دماغ پر ظلم کا جوہر استطاعت سے زیادہ ڈال دیا جاتے تو یہی ہوتا ہے۔ جیسے گدھے پر اس کی طاقت برداشت سے دگنا چوگنا وزن ڈال دیا جائے تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ تاہم گدھے کی جسمانی قوت اور انسان کی ذہنی صلاحیت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد صاحب پر کچھ اثر ہوا تھا۔ شاید نہ کرنے سے بھی ان کو کچھ فرق ضرور پڑا ہوگا لیکن زیادہ تر وہ خود کو بے وقوف ثابت کر کے دوسروں کو بے وقوف بناتے تھے۔ بعد میں جب میری ان سے ملاقاتیں رہیں تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس شخص کا ذہن دنیا بھر کی تاریخ ادب، فلسفے اور سیاست کا انسائیکلو پیڈیا ہے مگر یہ علم کا خزانہ ان کی معتمدہ خیر شخصیت میں دب کے رہ گیا تھا۔ اس کا اظہار وہ خاص مواقع پر یا غائب کو دیکھ کر ہی کرتے تھے۔

مجھے امید تھی کہ میری ساری دواؤں کے وہ مجھے سونپ دے گا۔ سوچا کہ ان میں سے کون سا ہے جس نے مجھے ناصر عظیم سے شام عالم بننے پر مجبور کر دیا تھا اور جب انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے ایک غلط کام کیا تھا مگر نیک نیتی سے تو شاید وہ مجھے اس حد تک ضرور معاف کریں کہ

شہنشاہ سے میری گلو غلامی کراویں۔

میں نے انہیں سونپ دیا۔ سچ بہ حال نہیں بتایا۔ اگر میں بتا دیتا کہ میں شاہ عالم کے گھر میں دو قفل بھی کر چکا ہوں تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر کے کی مٹھن ہوتے۔ اسباب کچھ بھی ہوں۔ ان کو دیکھنا اور سمجھنا عدالت کا کام ہے۔ قفل بہر حال قفل ہی سمجھا جائے گا۔ مرد راز کو میں نے نہیں مارا تھا اور نہ میرا شاہ عالم کے قفل میں کوئی ہاتھ تھا۔ میں نے اپنے بلیک میل کیے جانے کا ذکر تفصیل سے کیا مگر وہ سب مجھے سن کر کھپے جن سے مجھ پر کوئی جرم ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے حالات زندگی انہوں نے بڑے غور سے مجھے شاہ عالم کے بارے میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے تھے اور بڑی خراب رائے رکھتے تھے۔

میں نے تسلیم کیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے میں نے شاہ عالم کو خود اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار کر لیا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سیاست سے نائب ہو کے ملک سے ہی چلا جائے گا اور پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آئے گا۔ کیا تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کب آیا اور کب گیا۔ ممکن ہے وہ نام بدل کے کینیڈا کی شہریت اختیار کر لے۔ باقی زندگی پیش سے گزارنے کے لیے اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن ابھی یہ انتقال اقتدار عمل میں نہیں آیا تھا کہ اسے ایک مشتعل جھوم نے پھان کے مار دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اب میرے عوام کیم کیا ہیں۔

دور میان میں انہوں نے مسلسل چائے پی اور پان نوش فرماتے۔ اس کا مغربہ خارج کرنے کے لیے وہ کئی بار واش روم گئے۔ ان کے روتے سے میں کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ وہ کس حد تک قائل ہوئے تھے۔ کبھی وہ اٹھتے تگتے تھے، پھر کوئی بے کاسا سوال کر بیٹھتے تھے یا بالکل غیر متعلقہ بات۔ تاہم میں نے ان کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

سب سننے کے بعد انہوں نے فرمایا "تم بھی پھر کیا خیال ہے؟" تنہیر کا مسئلہ گویا سرخانے میں ہی ٹھیک ہے۔

میں نے کہا "مضمون۔ آپ بتائیے میرے مسئلے کا کیا ہے گا؟"

"تمہارا مسئلہ۔" ہاں "خوب یاد دلایا۔ وہ تم کو وزیر اعظم بننا چاہے ہو تو بھی بر خودار۔ اس میں کیا قیادت ہے۔ ضرور ہو، میں اس کی اعراض نہیں۔ یہ ہم کلمہ کے دے سکتے ہیں لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"اس کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے گویا۔ بھی جس رفتار سے روز حکومت بدل رہی ہے اس میں پوری امید ہے کہ ہر پاکستانی کو موقع ملے گا وزیر اعظم بننے کا۔ اب مصلحت تو یہی کہیں گے کہ بخشش ملی چوہا لندرا ہی بھلا۔ اپنی اپنی نوکری چھوڑی بھی نہیں چھوڑے گا اور ہاں "تم سے کیا رہے۔ ہم بھی انکار کریں گے کہ ہم آزاد ہیں اور آزاد ہی رہیں گے۔ وزیر اعظم کیا صدر بھی

نہیں بن سکتے۔ تو میاں صاحب زادے۔ فکر کیسی، آجائے گا کسی دن سرکاری ہر گاہ اور تمہارے غریب خانے کے دروازے پر دھک دے کے کے گاک چلے حلف اٹھا لیتے تو بس چل پڑتا جو تیاں بغل میں دبا کے۔"

میں نے ایک لمبی سانس لی۔ انہوں نے اٹھان ضرور دے دیا تھا کہ وہ میرے عوام کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے مگر میری مدد کرنے کا وعدہ اپنی باتوں میں گول کر گئے تھے۔ چلے چلے انہوں نے لیٹنے کے طور پر ایک مٹھو دیا۔

"میاں شاہ عالم جانی۔ تم یہیں کرو کہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرماؤ آج ہی، بلکہ ابھی۔ شروع ہو جاؤ۔"

"کیا مطلب۔ آپ کے سامنے؟"

"ہاں۔ وہ ہم دراصل بقلم خود یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم میں صلاحیت کتنی ہے گویا۔ باتوں سے عوام کو بے وقوف بنانے کی۔ لیڈر نہیں بن سکتا اس کے بغیر کوئی یا پھر ایسا کرتے ہیں "سرسرل کے بغیر ذرا کیا خیال ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں تو خیال کیا ظاہر کروں؟"

"ہم بتاتے ہیں۔ تم کو نہ کہ چار چار اخبار والوں کو۔ وہ رائی کا ہاڑ بنانے میں ماہر ہیں گویا۔ بے پر کی آواز ہے اور سنسنی خیز آواہوں پر مبنی سرخشاں لگاتے ہیں۔ رنگی کو ناری کس پٹے دودھ کو کھوٹا۔ چلی کو گاڑی کس اور دواؤں والے کو کھٹا۔ مکھڑ پھر سب ہی کھٹا ہونے لگا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ اخبار والے جن کی کوئی سادھ نہیں۔ یا بے قیامت بولتے ہیں۔ جن پر اعتبار کوئی نہیں کرتا۔"

وہ تلخ کی طرح ہنسنے "بھئی خوب سمجھو۔ ایسے لوگوں کے نام نہیں ہم بتاتے ہیں۔ ان سب کے سامنے تم یہ اعلان کر دو کہ خدا خواست تم شہید و فیو کچھ نہیں ہوئے اور نہ ایسا کوئی ارادہ رکھتے ہو گویا۔ شہید ہوں تمہارے دشمن جو تمہارے لیے ایسا چاہتے ہیں۔ اور تم سونپ دینا جیت جات ہو۔ جس کا چاہے جہاں سے چاہے چھو کر دیکھ لے۔ تم کوئی مدح و فہو نہیں ہو۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر تمہاری فہو بھی چھاپ دیں وہ۔ یقین تو کوئی بھی نہیں کرے گا ان کی بات کا۔ جو بیٹ جھوٹ بولا تو کیا ہو تو حق کو سانپ بنا کے دکھانا ہوا ہو وہ سانپ بھی دکھانے کا تو کون مانے گا؟ لیکن تمہارے پاس دیکھنا ہر ایک جھوٹ ہوگا۔ اور انہیں بعد میں موقع ملے گا خود کو مستبر ثابت کرنے کا۔ ہم جیسے بڑے بڑے نام والے جیٹادری اور سرگندہ بدھ کے جو صحابی ہیں، ابھی تک ان کی خبر کا مکھ چل رہا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو یا میاں بھی غمیدہ ہنسی کیا ہے۔ کل کچھ چھوٹے بولے بنام اور بے اعتبار قسم کے اخباروں میں تمہاری پریس کانفرنس کی دواؤں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تو بدالغ ہوگا۔ ان کی کوئی نہیں مانے گا۔ نای گرامی صحابی تو اس پریس کانفرنس کو ہی فراڈ قرار دیں گے کہ جہاں ان میں

سے کوئی شریک نہیں تھا وہ خیالی پریس کانفرنس تھی۔ کیا سمجھے۔
مجھے اس شخص کی ذہانت نے حیران کر دیا تھا۔ اس کی اسکیم
بہت شاندار تھی اور میرے حق میں انتہائی موزوں۔ میں نے کہا
”میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔ جی چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چم
لوں۔ آپ کا منہ چم لوں۔ ٹوٹی کے نیچے آپ کا تنہا سر چم لوں۔
جو ایک کوڑھ ہے گویا جس میں عقل کا سمندر ریز ہے۔“
”چونے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر تم نے کوڑھ کہا ہمارے
سر عزیز کو۔ ان گستاخی کی سزا دینے کے ہم قہیں اور تم نے عقل کو
سمندر کہا۔ جی وہ وہابیات کروا پانی میں سمجھ لو کہ چٹلی کے عقل
تم بٹھتے تھے۔“
”چٹلی کے عقل!“

”ہاں بھی۔ تم نے گویا تیسری بار علاج معالجے سے اعجاز
سمجھا کر کا مٹا ہوا کیا ہے گویا۔ ہم ہمیں چٹلی کا مستقل معالج
خصوصی مقرر کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ جیسے مریض کو عقیدت ہو
ڈاکٹر سے تو ایک نفسیاتی افغانے کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی
علاج چٹلی کا تم پر ایک نفسیاتی اعتقاد قائم ہو گیا ہے۔ کسی اور کے
علاج سے شاید وہ مطمئن نہ ہو۔“
میں نے کہا ”آپ بتائیے کہ میں پریس کانفرنس میں کس کو
مبارکبادیں اور کہاں مبارکبادیں؟“

”کہاں کی بات تو کچھ یوں ہے برخوردار کہ یہاں کیا مضائقہ
ہے۔ اتنی دیر سے بیٹھے بول رہے ہو اور ہم نے سن رہے ہیں۔ اب کوئی اور
کر سچے دیکھ لو۔ وہم ہمارا مطلب ہے“ سننے والا کوئی اور آجائے۔
نام لگھو۔ اس کے بعد ہم چلتے ہیں۔“
”مجھے صرف نام نہیں۔ فون نمبر بھی چاہئیں۔“
انہوں نے بھرت کی جیب سے ایک الیکٹرانک ڈائری برآمد کی
اور اس کے منہ دہاتے رہے۔ میں نام اور فون نمبر لکھتا گیا۔
”کوئی مشہور صحافی تو نہیں ہے؟ اس میں؟“

میں نے کہا ”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟ اس ملک کے آپ
بادشاہ ہیں۔ اپنی رعایا کو آپ پکارتے ہیں۔“
وہ قہقہے کر کے کہنے ”پکڑ لک کا کنگا بادشاہ۔ بس تم کچھ
کم یوں برخوردار۔ قصہ خود کو زندہ ثابت کرنا ہے فی الحال۔ بعد
میں تم پر الزام نہیں آئے گا کہ جب تم شہید کر دیے گئے تھے تو پھر
تم نے فوراً تردید نہیں کی تھی۔ کیا سمجھ اور جو ہم جیسے صحافت
کے پھاڑ کھینچے والے ہیں ان کو تم سب سے الزام ٹھہرا سکتے ہو کہ
انہوں نے قہقہے نہیں کی تھی اور پریس کانفرنس میں اپنا نمائندہ
نک نہیں بھیجا تھا۔ فی ایمان اللہ۔“

انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ایسی عقیدت سے بیٹھے پر
ہاتھ رکھا جیسے میں ان کا بھروسہ اور وہ مرید ہیں۔ ان کے جاتے ہی
میں نے فون ملائے شروع کیے اور ان زندہ صحافت کے طہر دار کچھے
جائے والے اخبار نویسوں کو ایک انتہائی اہم پریس کانفرنس کے

لے طلب کر لیا۔ انہیں میں نے یہ بھی سمجھا دیا کہ یہ بڑی
EXCLUSIVE قسم کی کانفرنس ہے چنانچہ وہ کسی اور سے ذکر نہ
کریں۔

ان بدنام صحافیوں کے آنے تک میں سوچتا رہا کہ مجھے ان سے
کیا کہنا ہو گا اور ان کے سوالات کیا ہوں گے اور مجھے کیا جواب
دینا چاہیے۔ پھر میں نے ریسٹورنٹ کے پیچھے سے کہا کہ وہ ایک
گوشے میں میزوں لگرا کے ہیں افراد کے لیے پانی کا انتظام
کندیں۔ مریضوں کے سامنے سب کچھ رکھ دیا جائے تاکہ انہیں کچھ
مانگنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔ اندازے کے مطابق میں نے
ادائیگی بھی کر دی تو غیرے فوراً وغیرہ کو احکامات جاری کر دیے۔

”اگر بڑا نام ہیں تو ایک سوال کروں سر؟“
”میں بڑے سوال کا بھی برا نہیں مان سکتا۔“
”آپ شاہ عالم ہیں نا۔ میں بہت دیر سے دیکھ رہا تھا۔
آپ اب بکر آزاد صاحب کے ساتھ بیٹنگ میں تھے۔“
میں نے مسکرائے کہا ”بالکل ٹھیک بچا تھا۔ آپ نے یہاں
ایک پریس کانفرنس کرنے والا ہوں۔ جب صحافی آجائیں تو آپ
انہیں مضامین اور ان کی خاطر موضوع کریں۔ میں سب کے آنے
کے بعد آؤں گا۔“

”لیکن سر۔ یہ جرات شرمیں چٹلی ہوئی ہے؟“
میں نے کہا ”وہ جھوٹ ہے۔ میرے دشمنوں نے افواہ پھیلائی
ہے۔ میں ابھی اس کی تردید کروں گا۔“
اس نے بے چینی سے مجھے دیکھا۔ ”عجب بات ہے سر۔ ضمیر
چھاپ رہا ہے بڑے جھوٹ پر۔ دیکھئے کتنے افسوس کی بات ہے؟“
”میں دیکھ چکا ہوں۔ اب آپ دیکھئے جج کا بول کیسے بالا ہوتا
ہے اور جھوٹ کا منہ کیسے کالا ہوتا ہے۔“ میں نے مجھے کو کسی غلط
فحشہ سے کی طرح ایک طرف رکھ دیا۔

تو صحافی اور نوٹور کر افراد اپنے ہم پیشہ افراد کی تعریفیں قلمی
غیر اہم تھے تو کہ وہ خبر کی خبر دیتے تھے۔ آٹھ گھنٹے میں وہاں
اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے کچھ واقعی ایماندارانہ اور اصلی صحافت
پر قہقہے رکھتے تھے مگر معاشی مجبوری نے انہیں ایسے بالکل کا نظام
بنادیا تھا جو اخبار پیچھے کے لیے صحافت کی اخلاقی تدبیروں کو جوڑنے کی
توک پر رکھتے تھے۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے
کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ پریس کانفرنس کس نے طلب کی ہے؟ کیا
اس کا تعلق شاہ عالم کی موت سے ہے؟ انہیں حیرانی یہ ہوئی کہ
بڑے بڑے اخباروں کے نمائندے اس پریس کانفرنس سے غیر
حاضر تھے۔

وہ جانے کافی پیتے رہے اور ہر چیز جو ان کے سامنے رکھی گئی
تھی صاف کرتے گئے۔ میری ہدایات کے مطابق چٹالی پر قرار
رہی۔ اس پر ہی انہیں توجہ ہونا چاہئے تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑے
ہوٹوں میں بٹائی جانے والی پریس کانفرنس میں عام طور پر خاطر

تواضع کا بندوبست لیتا ہوتا تھا مگر وہاں بھی کھانے پینے کی چیزیں
بہر حال ختم ہو جاتی تھیں۔ چھوٹی موٹی پریس کانفرنس میں جہاں
بڑے صحافی نہیں پہنچتے تھے فضل باتوں کے ساتھ فضل ہی چاہے
مل جاتی تھی یا ایک بول۔ یہاں تو ان کا پینے اور ان کی نیت سب
بھر گئے تھے مگر شاہ عالم بھی خالی نہیں ہوئی تھی۔

مزید آٹھ گھنٹے بعد جب وہ اس وی آئی ٹی ٹریسٹنٹ سے
خوش ہو چکے تھے اور سسٹمز بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا میں نے
ایک تاریک گوشے سے نمودار ہو کر ڈرامائی انداز دی ”مہمڈ
مارنگ۔ لیڈر اینڈ چٹلی۔“

میرا خیال ہے کہ یہ دنیا کی پہلی اور شاید آخری پریس کانفرنس
ہو گی جس میں اتنے غیر اہم اخباروں کے معمولی نمائندوں کو اتنی
اہم اور غیر معمولی خبر سے واسطہ پڑا۔ ایک لمحے کے لیے ان سب کو
حیرت ”مہمڈ سے یا خوف نے مفلوج کر دیا۔ ان کی نگاہیں مجھ پر جم
گئیں اور وہ ہلک جھپکا تاک بھول گئے۔ شاید ان کا دل دھڑکنا
بھول گیا ہو گا اور ان کی سانس بھی رک گئی ہو گی۔

میں نے مسکرائے کہا ”آپ لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے ہیں
جیسے میں جیتا جاگتا انسان نہیں۔ کوئی موت ہوں۔ آپ لوگ مجھ
سے پہلے بھی لے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی بڑھ چکی۔ فوٹو گرافروں نے اپنے
کیمرے چمکانے شروع کر دیے اور وہ سب ایک ساتھ چمکانے لگے۔
”آپ شاہ عالم ہیں۔ آپ تو شہید ہو گئے تھے!“
”تم شاہ عالم نہیں ہو سکتے!“
”شاہ عالم مر چکا ہے“ اسے لوگوں نے مار دیا تھا!
”اس کا جنازہ شاہ عالم پاؤں میں رکھا ہے!“

میں نے کہا ”ایک ساتھ سب سوال کریں گے تو میں جواب
کیسے دوں گا۔ حقیقت آپ سب کے سامنے ہے۔ آپ لوگ مجھے
پھوکر دیکھ لیں۔ میں زندہ ہوں اور شاہ عالم ہوں۔ قصہ حق کے لیے
آپ لوگ جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
”پھر وہ کون ہے جس کی میت شاہ عالم پاؤں میں رکھی ہے؟“
”وہ ہو گا کوئی جھلسا۔“ میں نے کہا۔

”مگر شاہ عالم کی بیوی اس کے والدین کیا وہ سب یہ بات
نہیں جانتے؟“ ایک خاتون نے سہرائی کیسے میں کہا۔
”نہیں۔ مگر بہت جلد جان لیں گے۔“ میں نے کہا ”وہ میرا
کوئی ہم شکل ہو سکتا ہے۔ آپ لوگ اس سازش سے واقف ہیں۔
ابھی کچھ دن پہلے کہا گیا تھا کہ میں نے خود عمود را کو زہر دے کر
ہلاک کر دیا۔ کل صبح میں سب کے سامنے سٹگ پور کی فلائٹ سے
کراچی پہنچا تھا۔ آج لاہور میں یہ خبر پھیلا دی گئی۔“

”کیا ساری دنیا اندھی اور بے وقوف ہے؟“ ایک شخص چٹایا۔
میں نے مسکرائے کہا ”آپ بتائیں۔ کیا آپ لوگ اندھے
اور بے وقوف ہیں؟ جو آپ دیکھ رہے ہیں خود اپنی آنکھوں

سے۔ وہ غلط ہے دھوکا ہے۔“
”ایسا کون کر رہا ہے آخر؟“ ایک بزرگوار نے سوال کیا۔
”میرے سیاسی حریف۔ وہ حسد اور حسد میں پاگل ہو گئے ہیں۔
یہ دراصل مجھے قتل کرنے کی سازش تھی۔“

”مگر آپ نے اپنے کسی ہم شکل کو مراد لیا؟“ ایک نوجوان
بوللا ”اپنے کسی ہم شکل سے آپ نے عمود را کو قتل کرایا ہو گا۔“
میں نے کہا ”آپ لوگ مفروضات پر یقین کر رہے ہیں۔“
ایک شخص نے میز پر ٹکا مارا ”آپ سچے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ
اتنا اہم اعلان آپ یہاں کر رہے ہیں ہمارے سامنے؟“
دوسرے نے کہا ”کیا آپ نے پولیس کو بتایا؟ آپ نے اعلیٰ
سرکاری حکام سے رابطہ کیا؟“

”آئی ٹی اور گورنر کو فون کیا؟ جو آپ کی حفاظت کر سکتے
تھے؟“

”یہاں بڑے اخباری نمائندے کیوں نہیں بلائے گئے؟“
میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا ”دیکھئے میں نے سب کو بلا دیا تھا۔
انہوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا اور آنے کی زحمت کو ادا نہیں کی تو
میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ آپ نے بے وقوف بنایا ہے ہمیں؟“ خاتون شور
مچانے لگی۔

میں نے کہا ”خاتون۔ خدا نے جس کو جیسا چاہا بنا دیا۔ کیا آپ
کو اپنی عقل اور حواسِ خمسہ پر بھروسہ نہیں۔ اتنا بڑا موقع ملا ہے
آپ کو ایک بہت بڑی خبر پرک کر لے گا۔ یہ آپ کے کیریئر کا سب
سے بڑا اسکوپ ہو سکتا ہے۔“

”مگر کیا ثبوت ہے کہ آپ جعلی نہیں ہیں؟ اصل ہیں تو سامنے
آئیں؟“

میں نے کہا ”میں فی الحال روپوشی کے لیے مجبور ہوں۔ لیکن
جیسے ہی یہ بنگلہ فرو ہو گا میں خطر عام پر آجاؤں گا۔ میں سب
جھوٹے سچے لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ آپ لوگ پورے وقوف کے
ساتھ یہ خبر چھاپ سکتے ہیں۔ میرا ہر لفظ آن ریکارڈ ہو گا۔ کل آپ
ہی مستر ہوں گے۔ آگے آپ کی مرضی۔ جیسے چاہیں روپورنگ
کریں۔“

”آپ کی یہ روپوشی کب تک جاری رہے گی آخر؟“

میں نے کہا ”حالات سازگار ہونے تک۔“
”مجھے کیا خیال ہے؟ آپ کو۔ اگر آپ شاہ عالم ہیں تو آپ
پولیس پارٹی کے ساتھ اپنے گھر جاکے کیوں نہیں کہتے کہ آپ زندہ
ہیں۔ کیوں نہیں ثابت کرتے کہ وہ کوئی سہو پیہا ہے یا آپ کا ہم شکل
جو مارا گیا۔ اور اب شاہ عالم شہید بنادیا گیا ہے۔ آپ اپنی بیوی
اور والدین کو بھی نہیں بتائیں گے؟“
میں نے کہا ”نہیں مطمئن ہے۔“

”یعنی وہ بھی ڈراما کر رہے ہیں؟“ کسی نے طعنے کہا۔
 ”ڈراما تو مجھے یہ لگ رہا ہے، ڈوئل بدل کی فلمی کمانی ٹاکوئی بولا۔
 ”یو پوش اور خاموش رہنے والی بات ناقابل فہم ہے۔ اس
 سے آپ کے حالات سازگار نہیں زیادہ خراب ہوں گے۔“
 صحافی چھوٹے ہوں یا بڑے۔ سنے ہوں یا پڑانے کا سیلاب
 ہوں یا ٹاکم۔ بے وقوف بہر حال نہیں ہوتے۔ میں نے کہا ”یہ بھی
 معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو وقت آنے پر۔ فی الحال میں اپنی مصلحت
 اور حکمت عملی ظاہر نہیں کر سکتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے
 حقیقی دوست کون ہیں اور درد و دشمن کون۔ سینئر نائب صدر امیر
 تیمور میرے ساتھ ہیں۔“

”محمود خود بھی غائب ہیں۔“
 ”وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں بھی قتل کر دیا جاتا۔ پابلی پر قبضہ
 کرنے والوں کا یہی پروگرام تھا۔“
 خاتون نے کہا ”مگر شاہ عالم صاحب‘ فرض کر لیں آپ ہی
 اصل شاہ عالم ہیں تو اس پر پس کاغذ نہیں میں یہ اعلان کرنے کے بعد
 آپ یو پوش کمال رہے‘ سب کچھ تو بتا دیا آپ نے۔“
 ”لیکن میں سب کے سامنے نہیں آؤں گا۔ یہ مجبوری ہے
 میری۔ کیا آپ سب لوگوں کی گواہی کافی نہیں دیکھتا ہے کہ کون
 کس پر یقین کرتا ہے۔ بلاخر کون جھوٹا اور کون سچا ثابت
 ہوتا ہے۔“

”آپ کے ساتھ اور کون ہے؟“
 ”آپ کا قیام کہاں ہے؟“

میں نے کہا ”سوری۔ سب کچھ یہاں نہیں بتایا جاسکتا۔“ میں
 نے اچانک گھڑی دیکھی ”ایک سیکنڈ ڈی! اگلی ایک منٹ میں حاضر
 ہونا ہوں۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔“

ایک گوشے میں جا کے میں نے جب سے موبائل فون نکالا اور
 تیمور کے گھر کا نمبر ملایا۔ حسب توقع نہیں نے ”یلو“ کہا۔

میں نے کہا ”یار معاف کرنا مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“
 ”کچھ دیر ہو گئی“ اے ہم تو سبھی تو بچے کی گورنٹ گون ہو گیا۔

قسم اللہ کی جان عذاب میں پھنس گئی ہے اپنہ۔“
 ”کیوں کیا ہوا؟“

”یار ہوتا کیا تھا۔ ایک تو تیار وہ گریڈ سر۔ اس سے چھڑا
 ہو گیا اپنا۔ میں نے کہہ دیا کہ آؤر نہیں ہے باہر جانے کا۔ بس یار
 اس نے تو ہاتھ مار دیا میرے کہ تمہیں آؤر دینے والے کی ایسی
 تھیں۔ بڑی غلط بات ہے یار‘ تیری ایسی تھی کہ تیرے جس نے نہیں
 آؤر دیا تھا۔ ہم لحاظ کرتے ہیں اس کی عمر کا اور تیرے رشتے کا۔
 ورنہ اس کی تولا ش باہر جاتی۔“

میں نے کہا ”وہ پریشان ہو گا میری طرف سے۔“

”اس سے زیادہ پریشان تھی تیری وہ قاتل مجبور چاندنی جس کا
 تو چاند ہے۔ مگر نام اس کا چننا ہے۔ اسی نے دادا جان سے کہا کہ

آپ جا کے دیکھیں‘ شرمیں بڑی گریڈ ہے۔“

”یہ اسے کیسے معلوم ہوا؟“

”اے ریڈیو‘ ٹی وی تو بند نہیں ہیں۔ تیمور الگ پریشان ہے۔
 اس کا بھی خیال ہے کہ تو کہیں پھنس گیا۔“

”سب کو بتادے کہ سب ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں سیدھا
 اور“ میں نے کہا۔

”تو نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں بچ رہا ہوں۔“

”بس یار۔ اچانک ہو گئی ایسی بات کہ میں نہیں پہنچ سکا۔“ میں
 نے اس گوشے کی طرف دیکھا جہاں صحافی اب آپس میں الجھ رہے
 تھے ”مگر اب آ رہا ہوں۔“

میں نے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف قدم بڑھائے جو
 میرے سامنے تھا۔ صحافی حضرات پھر تھے کہ میں بات ختم کر کے
 لوٹوں تو وہ مجھ پر مزید سوالات کی پوچھا کر رہے۔ ان میں سے کچھ مجھ
 پر یقین کرتا چاہتے تھے کہ باقی ان کو روک رہے تھے۔ ان سب کے
 لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ میری بات کو مذاق سمجھیں۔
 انسان نہ حقیقت۔ منبر خود ان کی بحث میں دلچسپی لے رہا تھا اور شاید
 انہیں مطلع کرنا چاہتا تھا کہ اگلی کچھ دیر پہلے ابوبکر آزاد بھی یہاں
 موجود تھے اور کالی دہر میرے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔ جلی کی
 طرف سے وہ مطمئن تھا کہ ابھی اسے کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔
 فون پر بات کرتے ہوئے دروازہ میرے بالکل پیچھے تھا۔ میں
 غیر محسوس طریقے پر تھوڑا تھوڑا پیچھے کھسکا گیا اور پھر ایسے باہر
 نکل گیا کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ
 سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور ڈرائیور نے سوال بھی
 نہیں کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ جب میں نے اسے پتہ سمجھا تو شاید
 اسے کاروبار کی تعلیمی کا احساس ہوا۔ وہاں سے عام طور پر واپسی کی
 سڑکی نہیں ملتی تھی۔ اس کی آخری ہوئی شکل دیکھ کے میں نے
 پریس کاغذ کے شراکی صورتوں کا تصور کیا۔ پانچ دس منٹ میں
 انہیں معلوم ہو جائے گا کہ شاہ عالم انہیں پکڑے کر نکل گیا تو وہ
 کہتے چراغ باہر ہوں گے۔ ان کا سارا غمہ انگے دن کے اخبارات کی
 شرمیوں میں ظاہر ہو گا۔ وہ پریس کاغذ کے شراکی صورتوں کا تصور
 ضرور شائع کریں گے۔ یہ بہر حال ایک زبردست سہمی خبر اور
 پراسراریت سے بھری ہوئی خبر تھی۔ لیکن میرے فرار ہو جانے کے
 بعد مرنے والے کو اصل شاہ عالم اور مجھے جلی قرار دیا جائے گا۔

فی الحال میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اصل اور نقل کا
 کنفیوژن باقی رہے۔ عوامی دہر میں میرے سامنے آ رہا تھا۔ شر

کے ان علاقوں میں جہاں شاہ عالم کے دورِ زور تھے اور کسی رکن
 اسبلی کا حلقہ اثر تھا جڑی بڑاں ٹھہرے۔ ہر جگہ لوگ جیسے چڑھ رہے
 تھے اور اپنی اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار فرما رہے تھے۔ پریس کی

گازپوں کے علاوہ ہم فوجی دستے بھی سڑکوں پر گشت کے لیے آئے
 تھے کہ امن و امان کی صورت حال خراب نہ ہو۔ اندیشہ یہ تھا کہ

شاہ عالم کے وفادار اور اس کی پارٹی کے باقی ارکان جو مرد رازی
 قیادت میں اکٹھے ہو کے پی جے ایف کی قیادت کے لیے پہنچیں
 گئے تھے ایک دوسرے سے تصادم نہ ہو جائیں۔

ابھی شاہ عالم کے ہاتھوں مرد راز کے قتل کا معاملہ پوری طرح
 رہائش تھا کہ خود شاہ عالم مارا گیا۔ ہر منطقی سوچ رکھنے والا اسے مر

دراز کے ساتھیوں کی انتہائی کارروائی قرار دیتے پر مجبور تھا حالانکہ
 شاہ عالم کے دشمن اور بھی بہت تھے۔ سیاست میں کسی تیرے

فریق کا صورت حال سے فائدہ اٹھانا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہو سکتا
 تھا کہ مشعل جہم میں سرکاری جماعت کے چھوڑے ہوئے لوگ

بھی ہوں اور انہوں نے پہلا پھر پیک کے جہم کے جذبات کا رخ
 موڑ دیا ہو۔ اکیلا آدمی کچھ کرنے سے پہلے سوچا ہے۔ جہم کی میسر

چال ہوتی ہے۔ جدھر چاہا وہاں سب کو ہانک دو۔

رہیں گیت کے اندر چار پارٹی والے لیٹا ہوا تھا اور اس کے دو
 زیر قیادت شاگرد اپنے استاد محترم کے پاس دبا رہے تھے۔ وہ اب

پہلے کے مقابلے میں بہت پھیل گیا تھا۔ اپنے فخری ماکن جسم کے
 باوجود وہ انہیں میں ہلا کی پھرتی تھی۔ وہ چپے کی طرح دوڑ سکتا تھا اور

کسی بازی کر کی طرح کودتے چاند تے‘ چلا تھیں لگے دیو اموں
 اور چھت کے راستوں سے یوں غائب ہو جاتا تھا کہ تعاقب کرنے

والے چاہتے رہ جاتے تھے۔ سختی حالات نے اس کے جسم کو فوڈا
 بنا دیا تھا اور خطرات سے کھیلنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ اس کی

زندگی کا سزا ایسے ہی ملے ہوا تھا۔ وہ پہلے فقیر تھا۔ پھر جریب کڑا بنا
 ترقی کر کے چور ہوا۔ یہ سارے کام ہوشیاری مستعدی اور مہارت

کے تھے۔ جہاں موقع ملے ہاتھ کی مٹائی دکھانے سے پہلے دیکھ لو کہ
 پکڑے جانے کی صورت میں فرار کے راستے کھلے ہیں یا نہیں۔ زاکو

بننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا کہ اپنا کردہ بنالیتا اور مسلح ہو کے
 دھناتا ہوا کسی صراف کی دکان یا بینک کو لوٹا جو عزامت کرے

اسے ٹھنڈا کرنا اور قاتل کرنا ہوا نکل جاتا۔ آٹھیں اسلحہ اس
 نے بھی استعمال بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے پاس کمانی دار خنجر اور

کچھ ایسے ہتھیار رکھتا تھا جو قانونی اصطلاح میں مسلک ہتھیار نہیں
 کہے جاسکتے تھے۔ میں نے اسے سائیکل کی چین استعمال کرتے

دیکھا تھا۔ اس کے پاس ناکون کی ڈوری سے بندھی ہوئی کرکت کی
 گیند تھی جسے وہ چادوں طرف گھماتا تھا تو قریب آنے کی کوشش

کرنے والا لیکن بولڈ ہو جاتا تھا۔ ایک بار میں نے اسے کہا تھا کہ یار
 رہیں‘ یہ سارے دھندے چھوڑ‘ میرے ساتھ آجا۔ مجھے ایک

بازی گاڑی کی ضرورت ہے جو خر کے ساتھ رہے۔ دن میں بوتھیک
 کے اندر اور جب وہاں جراتے تو آگے شو فر کے ساتھ۔“

اس نے کہا ”اے یار دیکھو یہ بڑا بڑا کام ہے۔ سارا دن
 کرسی ڈال کے بیٹھے رہنا اور انتظار کرنا کہ کوئی سلا حرامی پن کرنے

آئے تو ہم اسے پیٹ پیٹ کے لٹنٹ پیٹ کریں اور گاڑی میں
 ڈاؤن خواہو گھر تے رہیں۔ آدمی کال اور جاہل ہو جاتا ہے۔“

”جاہل۔ تو کون سا پو فیئر کا ہوا ہے؟“

”اے جاہل کا مطلب ہے جسے کچھ پتا نہ ہو۔ اب دیکھ ناک
 از کٹھنڈو دکان میں سارا دن بیٹھ کے دن گزرے گا باہر دنیا میں کیا

ہو رہا ہے اس کا کچھ پتا نہیں۔ وہاں آپس کی بھی سب باہمی جھپٹلی
 کتابیاں‘ نت نئے بیٹن کے کپڑے لینے۔ اپنی تو انہیں پتہ

جانیں کی پیارے دیسے ہی۔ پھر قمری خاطر تواضع کرے گی کہ
 بھالی کا یار ہے۔ کبھی بولن بھی چائے چرے اور مرغے اس

سے کال ہوتا تو لازمی ہے۔ ہاتھ پر چلا میں گے نہیں تو جام
 ہو جائیں گے اور بیٹ نکل آئے گا پھر بھی تو کتا ہے تو ہم انکار نہیں

کر سکتے۔“

میں نے خوش ہو کے کہا ”کل آجا مجھ کا شکوفہ چلائی آئی
 ہے نا۔ آج کل یہ باڈی گاڑ کے ہاتھ میں نہ ہو تو کوئی ڈر نہ ہی

نہیں۔“

”ہاتھ میں رہے کا شکوفہ۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں مگر
 پیارے بھی اسے چلانے کی فہم آگئی تو کیا ہو گا۔ اپنا تو چشما

فٹا ہو جاتا ہے سچے سچے روبرو کی کوئی کی آواز سے۔ تانگیں کا پتہ لگتی
 ہیں۔ قسم اللہ کی اگر کہیں سے فائرنگ کی آواز آئے۔“

ظاہر ہے اس کے بعد یہ بات وہیں ختم ہو گئی تھی مگر میرا اور
 رہیں کا ساتھ ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو اس نے

ایک چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کے دیکھا۔ ”آگے لوٹ کے
 گھر خیر سے بدھو۔“ وہ گیت کھلتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”رہیں! اعظم‘ سب ٹھیک ہے نا اندر؟“

”اے اندر کا حال اندر جا کے پوچھ۔“ قسم اللہ کی یہاں بیٹھ بیٹھ
 گئے اور لینے لینے ہاتھ پاؤں اڑا گئے۔ ”وہ انگوٹھی لے کر بولا“ میں

جاؤں اب؟“

”جلی ٹھیک ہے۔ تو تیار ہو گیا ہے تو جا۔“ میں نے کہا ”مگر
 دیکھ ایک تو اپنا فون بند مت کرنا کہ جب مجھے ضرورت ہو میں تجھ

سے بات کر لوں۔ مجھے رپورٹ چاہیے منٹ منٹ کی کہ شرمیں کیا
 ہو رہا ہے؟“

چند اے شاید میری آواز سن لی تھی۔ وہ دروازے کے پیچھے
 کھڑی میرا انتظار کرتی رہی۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس نے

میرے پیروں میں ٹانگ آزاد کی گھیر کر کے سے پہلے مجھے ایک
 ہاتھ پر سنبھالا اور آٹ کر دوڑ پھینک دیا۔ مجھے سنبھالنے کا موقع بھی

نہیں ملا اور میں سیدھا مونسے پر جا کے گرا۔

میں نے بہت کو کہتے ہوئے کہا ”تھیک یو۔ تم نے میری مدد
 کی۔ میں دیسے ہی مونسے پر آ کے لیٹا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

تھارا دادا گیری کر کے والا دادا مختلف قسم کے مسلک ہتھیار
 خریدنے نکلا ہے۔ مجھے شش فرمانے کے لیے۔“

”کیا اس عمر میں ان کو زحمت دینا ضروری تھا؟ سارا دن پچ
 نہیں کہاں جگہ مارے پھرے‘ کہیں بھی قتل ہو جاتے۔“

میں نے دیکھی لیجئے میں کما "تمہارے منہ میں خاک۔ اگر کچھ
ایسا ہو جائے تو تم کیا کر سکتے ہو؟"
"آج تک کسی مقول نے مجھ سے پہلے یہ
سوال۔" اس نے مجھے ڈانٹ کے کہا "مگر دنیا والو! تم بعد میں کیا
کرو گے؟"
میں اٹھ بیٹھا "میں چاندنی۔ جس میں شادی کا کوئی تجربہ ہے؟"
"ہاں۔ کئی شادیوں کی صفیں میں نے۔"
"جہاں۔ نام لکھو؟ سب کے اور سہتے۔" میں نے کہا "ایک
ایک کو گولی بارودوں گا۔ کس کس سے شادی کر چکی ہو تم؟"
"میں؟ ہوش میں ہوں؟ میں گمراہی کی بات کر رہی تھی۔"
"دوست صاف کرنا محبت اور ثابت کے جذبات سے مغلوب
ہو گیا تھا۔ خیر اپنے ساتھ تجربہ کر کے دیکھو کہ کاروائے ہوئے تم کو
ایک شادی کرنی ہے۔"
"کس سے؟" اس نے بڑی سرت اور اشتیاق کا اظہار کیا۔
"کس سے نہیں۔ اس کا جواب تو ایک ہی ہے پوچھو کس کی؟
تو جواب یہ ہو گا کہ ایک گمراہ ہے میری نام ہے اس کا قرضہ
اور ایک گمراہ۔"
"بڑا ہے؟" دولت بھی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ میری اپنی
خواہش یہ ہے کہ قریب المرگ کوئی کوڑی لے جائے تو اچھا ہے۔"
میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "مل جائے گا۔ ابھی تو نہیں
مگر اگلے پچاس سال تک میں پانی پانی جوڑتا رہا تو کوڑی ضرور
ہو جائیگا گا اور تو نے سال میں قریب المرگ کی شرط بھی پوری
ہو جائے گی۔ پھر تو کوئی ناچھ سے شادی۔"
"وعدہ" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا "اب یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر
کمال فاروقی کا اس معاملے میں کیا موقف ہے؟"
میں نے میز پر گھما کر کہا "اس آؤ کے پٹے کے موقف کی
ایسی تھی۔ ہو گا وہی جو ہم چاہیں گے اور ہم انہیں ایک جگہ
بٹھا کے چھوڑ آئے ہیں سوچ بچار اور خود فکر کے لیے۔ نوٹس دے
دیا ہے جن دن کا سارے انتظامات کے لیے۔"
"یہ اچانک کیا افرا تفری میں ہو رہا ہے سب کچھ؟"
میں نے دردناک لہجے میں کہا "جو ان بہنوں کا بار ہو بھائی کے
کندھوں پر تو اس کی رافوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے کہ کب بہن کے
ہاتھ پہلے ہوں تو میری بھی باری آئے۔ ویسے تم جانتی ہو کہ ایک بار
تو میں شہید کر دیا گیا ہوں۔ دوسری بار کی فوت آنے سے پہلے ہی میں
چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر کی ہو جائے پھر جیسے اللہ نے اس کی مرضی
ایسے ہی میری بھی مرنے کا آئین۔"
تیمور پردہ ہٹا کے اندر آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا "تم کب
آئے؟"
"مسامات منہ ہو گئے" میں نے کہا "تمہاری طبیعت کیسی
ہے؟"

"بہن۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک زندہ ہوں" وہ بولا "اور تم
بھی زندہ ہو۔ کچھ چلا کہ یہ کسی کی حرکت تھی؟"
"ایک قاتل کی؟" میں نے کہا۔
"وہ شکر ایا" وہ قاتل پکڑا گیا؟"
"نہیں۔ وہ محتفل ہو گیا۔ جائے واردات پر ہی اسے
کرنے والوں نے ہلاک کر دیا۔ ڈاکو کی سزا بھی مل گئی اور کامیابی
کی صورت میں بھی اس کو کوئی موت انعام میں ملتی۔ حوالے کے
لیے دیکھو شہید ملت کیس میں سید اکبر کی ہلاکت۔"
"تم اب تک کہاں تھے؟" وہ بولا۔
میں نے کہا "مگر عرض صاحب بھی آجائیں تو میں ایک بیان
جاری کروں سب کے لیے۔"
خان کی کانوں باج منٹ بعد آیا۔ میں منٹ بعد وہ خود بھی پہنچ
گئے۔ ان کی صورت سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کتنے غمر مند ہیں
اور کتنی تشویش میں چلا ہیں۔
تیمور کے پیوی پہنچے باہر کے حالات سے قطعی بے خبر تھے لیکن
شہر سے باہر اس قید خانہ کی سے کچھ پریشان تھے۔ ریس نے ان کے
باہر جانے اور کسی کے اندر آنے پر مکمل پابندی عائد کر رکھی تھی۔
ان کا باہر کی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ فون میں بند تھا۔ کی انہیں
کسی چیز کی نہیں تھی اور تیمور کے واپس آ جانے کے بعد وہ احساس
عدم تحفظ کا شکار بھی نہیں رہے تھے۔
ہماری میٹنگ رات کے کمانے کے بعد بھی نصف شب تک
جاری رہی۔ تیمور کے لیے شاہ عالم کی ہلاکت کی خبر پہلے ایسی
دھماکے کی خبر تھی کہ تم نے نہیں۔ میں نے غصے سے ملاقات اور شاہ عالم
کی میت کے آنے سے اپنے فرار ہونے تک تمام واقعات ان کے
گوش گزار کیے۔ جو ہوتا تھا ہو چکا تھا۔ کسی کے اختلاف یا تبصرو
کرنے کی نہ ضرورت تھی نہ مباحث۔
خان کی سارے مجھے خرید لائے تھے۔ ان کے معاملے سے
مجھے پتا چلا کہ شاہ عالم کی لاش دیکھنے کے بعد سے اب تک رشتہ پر
کتنے کی کیفیت طاری ہے اور ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔
ابھی تک اس نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا اور
ڈاکٹر نے اسے صدمے کی انتہا کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے سکون آور
دوائیں دی ہیں اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ وہ رات بھر سکون سے
سوئی رہی تو صبح بالکل بارل اٹھے گی۔
افسوس ناگ خبر یہ تھی کہ شاہ عالم کے مسند رباب کا اپنے بیٹے
کی لاش دیکھنے کے کچھ دن بعد ہارٹ فیل ہونے سے انتقال ہو گیا تھا
اور اب اس گھر میں ایک نہیں دو جنازے رکھے ہوئے تھے۔ شاہ
عالم کی بیٹیاں کی حالت سب سے زیادہ غراب تھی اور اسے
باہار غمی کے دورے پر رہے تھے۔ شاہ عالم کے باپ کا لڈر پریشر
بہت زیادہ تھا اور اس پر پہلے دل کے دورے کا نتیجہ قاتل کے قتل کی
صورت میں نکلا تھا جس سے وہ چلنے پھرنے کے قائل نہیں رہا تھا۔

اس کا بچلا و حزاب بھی بے جان تھا اور وہ مکمل چیز بڑھنے کے
ایک کمرے میں مکمل و حرکت تک محدود ہو گیا تھا۔ ماں جی اور میاں
جی کے لیے زندگی کا آخری دور پر آسائش ضرور تھا مگر سکون اور
پرست نہیں تھا۔ وہ کسی آسائش یا نعمت سے لطف اندوز نہیں
ہو سکتے تھے اور بڑھاپے کے جس مکھ کا خواب پرانے لوگ دیکھتے
تھے ہیں اور اس کی تعبیر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ایسا ہی ان کا
بھی نصیب تھا۔ بیٹے سے بہت ترنی کی تھی۔ بہت عزت، شہرت
اور دولت کمانی تھی۔ لیکن اس کی سعادت مندی صرف اتنی رہ گئی
تھی کہ اس نے نوکروں کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ ماں باپ کی
خدمت میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ خداس کے پاس والدین کی
خدمت گزار کی کے لیے وقت نہیں تھا۔ اور پھر دولت ہوتی کس
لیے ہے آخر؟ جو کام معاوضہ دے کے کسی اور سے کرایا جاسکتا
ہے وہ خود کیوں کرے۔
میاں جی نے وصیت کی تھی کہ انہیں اپنے والدین کے ساتھ
خاندانی قبرستان میں پہلے سے مخصوص جگہ پر ہی دفن کیا جائے۔
اپنے اور اپنی شریک حیات کے لیے وہ زمین تک کے دیے کا لائے
تھے۔ اب ان کی بیٹیاں بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ میت گاؤں
جائے گی اور جنازے میں صرف خاندان کے لوگ شریک ہوں
گے۔
خاندان میں خداس کے سوا کون تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔
ایک سو تھی تو اس کا شاہ عالم کے والدین سے کوئی جذباتی تعلق
پہنچے نہیں تھا اور اس وقت وہ اپنا گھر چھوڑ کے کہیں نہیں جاسکتی
تھی۔ شمس صاحب اور قریشی صاحب نے چند افراد کی ڈیوٹی لگا دی
تھی کہ میاں جی کی تدفین کے لیے میت کو ان کے آبائی گاؤں
پہنچانے کا انتظام کریں۔ خود شاہ عالم کا جنازہ دھوم دھام سے
نقارے کے لیے رات کو پانڈی کی ہالی کمان کا اجلاس منعقد تھا۔
پانڈی کا رکن سینئر نائب صدر امیر تیمور کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔
میں نے جناب ابوکر آزاد کے ساتھ اپنی میٹنگ اور پھر چند غیر
معروف صحافیوں کے سامنے پریس کانفرنس پیش کی تو اس کا رد عمل
خاصا ناخوشوار ہوا۔ خان جی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے مگر ان کی
خاموشی سب کچھ بتا رہی تھی۔ مجھے اس کا پہلے سے اندازہ تھا۔
سب سے پہلے تیمور نے برہمی سے کہا "میری سمجھ میں نہیں
آتا کہ تم چاہتے کیا ہو؟"
میں نے کہا "جو تم چاہتے تھے وہ بھی میری سمجھ میں فوراً نہیں
آتا تھا مشر تیمور۔ لیکن آہستہ آہستہ تم بھی سمجھ لو گے کہ میری
حکمت عملی کیا ہے؟"
چند دنوں کے "جس کا نہ سرو نہ پیرو نہ کھتے عملی ہوتی ہے؟"
"یہ سیاست ہے جس خان۔ ٹنڈے گوشت یا کلو قیر پکانے
کی ترکیب نہیں جو ہر گھر میں نسل بعد نسل دی رہے۔"
"تم صرف اپنے کنفیوژن کو چھپا رہے ہو۔ جیسے خود نہیں

معلوم کر کیا کرتا ہے۔"
میں نے کہا "میں کنفیوژن پھیلا رہا ہوں۔ ان حالات میں
میں سب سے کامیاب حکمت عملی ہو سکتی ہے۔ کل دیکھنا رائے
عامہ کیسے تقسیم ہوتی ہے اور پانڈی میں کیسے چھوٹ پڑتی ہے۔ یہ میں
جانتا ہوں کہ شاہ عالم کی تدفین دیکھنے سے ہوگی جیسے شمس صاحب اور
قریشی صاحب نے طے کیا ہے۔ وہ دہلی ہے ایف کا چیرمین تھا اور
اس کا جنازہ اسی حیثیت سے اٹھے گا۔ میں نے تردید کر دی ہے۔"
"کون تسلیم کرے گا اسے وہ اخباری ایسے ہیں۔"
"میں میں بھی جانتا ہوں کہ فی الحال کوئی بھی نہ مانے کہ وہ شاہ
عالم نہیں تھا۔ اس کی تدفین ہو جائے پھر اصل شاہ عالم سامنے
آئے گا۔ چار باج دن میں صورت حال پھر بدل جائے گی۔ بس تم
دیکھتے جاؤ۔"
میرا موز دیکھتے ہوئے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ چندا کی
خاموشی میں احتجاجی انداز تھا۔ تیمور کی خاموشی میں بے بسی کا۔
خان اعظم کے مدیو سے ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے میرے
معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اور عملاً ساری ذمے داریوں سے
دستبرداری اختیار کر لی ہے۔ لیکن اندر سے وہ خامے شکر ہوں گے۔
یہ مجھے معلوم تھا۔
اس رات میں بھی خاصا پریشان اور شکر رہا۔ شاہ عالم کی
ہلاکت سے معاملات الجھ گئے تھے۔ وہ زندہ رہتا تو بڑی آسانی سے
میں اس کی جگہ لے سکتا تھا۔ کسی کو کبھی خیال بھی نہ آتا کہ میں
نعلی شاہ عالم ہوں۔ اصلی شاہ عالم کو میں اپنے تحفظ کی مکمل مہمات
کے ساتھ کہیں نہ کہیں بھیجتا رہتا تھا۔ اس کی واپسی اس کے
اپنے اختیار کی بات نہ ہوتی۔ اسے تمام حفریہ خانے میں زندہ رکھنے
کی ذمے داری قبول کرنا عملاً ناممکن تھا۔ میں اسے موقع فراہم
کر سکتا تھا کہ وہ خدا کی پناہ ہوئی اتنی بڑی تدفین میں کہیں بھی جاسکتا
ہے اور آرام سے زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن گناہ وہ کے گزارنے
کی شرط کے ساتھ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نفسیاتی دباؤ کے
طریقوں سے اور ذہن کو بدلنے والی دواؤں کی مدد سے اس کی
ضعفیت کو بالکل بدل دوں۔ اس کی یادوں سے باطنی کا ہر نقش
مٹا دوں اور وہ جہاں بھی رہے خود کو کچھ اور سمجھتے تھیں رکھتا ہوں اور
کوئی اسے لاکھ قاتل کرنا چاہے وہ نہ مانے کہ کبھی وہ شاہ عالم تھا۔
تیمور اور آخری ناگزیر حالات میں بھی میرے لیے ناہنیدہ طریقہ
یہی ہو سکتا تھا کہ اسے لوح جہاں سے حرف مکرر کی طرح مٹا دیا
جائے۔ سیاست اور تاریخ کی یہی روایت ہے کہ کونکہ جب ایک کے
لیے ناپا بھلا کا مسئلہ ہو تو دوسرے کی زندگی یا موت سوچ بچار
اخلاقی اقدار کا مسئلہ نہیں رہتی۔ یہ حیوان اور انسان کی جبلت
ایک ہونے کی مجبوری ہے۔
میں رات بھر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ ساری دنیا کو قاتل
کرنے کے لیے کہ مرنے والا اصل شاہ عالم میں بلکہ کوئی سرہینا

تھا۔ اور اصل شاہ عالم تو میں ہوں، مجھے کیا لاکھ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اور کیا یہ ممکن ہوگا؟ اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیا ہوگا؟ سب سے زیادہ ذہنی انتشار کا سبب یہی آخری سوال تھا جس کا میرے پاس بھی جواب نہ تھا۔

صبح شائع ہونے والے چند غیر معروف اور کسی حد تک بدنام اخباروں میں شائع ہونے والی پریس کانفرنس نے پلا دھکا کیا۔ میری اور تیور کی عدم موجودگی میں پارٹی کی قیادت کا پرچم اٹھانے والوں نے سب سے پہلے اسے جھوٹ کا پتہ قرار دیا۔ لیکن یہ سنسنی خیز انکشاف کسی ایک اخبار نویس کے ذہن کی اختراع قرار نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ شام کو شائع ہونے والے (لیکن دوسرے پہلے بازار میں دستیاب ہونے والے) اخباروں نے بھی من و من ایک ہی رپورٹ دی تھی۔ سب نے تقریباً ایک ہی تصاویر شائع کی تھیں اور ان سب کو مجموعاً نہیں کہا جاسکتا تھا۔

دوسرے پہلے ہی شمس اور قریبی نے بڑی جھلت میں پارٹی سیکرٹریٹ میں ایک پریس کانفرنس بلوائی جس میں سب بڑے اخبارات کے رپورٹرز اور سیاسی تبصرہ نگاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ عموماً ان سب کو نظر انداز کر دیا گیا جو یہ شوشہ جھوٹے کے ذمے دار تھے مگر ان میں سن گل مل گئی تھی اور وہ بن بٹائے ہی وہاں پہنچ گئے۔ پارٹی سیکرٹریٹ کے دو دروازے پر مسلح محافظوں کی تنظیم "تاج عالم" کے نوجوانوں نے انہیں روکا اور ان کی اچھی خاصی گھڑپ ہوئی۔ اس کی خبر اندر پہنچی تو شمس اور قریبی مجبور ہو گئے کہ انہیں بھی اندر بلا لیں اور انہوں نے اپنا مورچہ الگ قائم کر لیا۔

شمس اور قریبی نے بھی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی سیکرٹریٹ عملی مرتب کر لی تھی۔ انہوں نے میری پریس کانفرنس کو سیاسی شہیدہ گری کا نشانہ اور سازشی عناصر کا زراعت قرار دیا تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گزشتہ روز میری بلوائی ہوئی پریس کانفرنس کے شرکاء نے اتفاق رائے سے ریاض احمد کو اپنا ترجمان بنالیا تھا۔ ریاض احمد سینئر صحافی تھا اور کچھ عرصہ قبل ایک بہت بڑے اخبار کا چیف رپورٹر تھا۔ پھر ملک کی ایک انتہائی اہم شخصیت کے اٹاٹوں پر رپورٹ کی اشاعت نے اسے صاف جہاں میں شامل کر دیا۔ انتہائی اہم شخصیت نے دھمکی دی کہ وہ رپورٹ اور اخبار کے خلاف چمک عزت کا دعویٰ دائر کرے گا اور حرجانے کا کیس کرے گا مگر سچ کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں جھوٹ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ انتہائی اہم شخصیت کے اشارے پر خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آئیں۔ ریاض احمد کو دھمکیاں ملنے لگیں۔ ایک رات اس کے گھر پر فائرنگ ہوئی۔ پھر اس کا چھوٹا بھائی قتل کر دیا گیا۔ پھر اسے قتل کرنے والے ڈاکو تھے مگر تحقیق کے بمانے ریاض کو پہلے ہی آئی اے اور پھر ایف آئی اے والے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں موجود حربے آزما کے ریاض کو قاتل کرنے کی کوشش کی گئی کہ اپنی رپورٹ دابیں لینے سے اسے کیا فائدہ حاصل ہو سکتے ہیں اور تردید

نہ کرنے کے کیا خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں مگر ریاض احمد صحافیوں کی اس نسل کا نمائندہ تھا جو اب مٹا ہوئی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا اور صرف اتنا کہا کہ تم سب کو قتل کر سکتے ہو مگر سچ کو قتل نہیں کر سکتے۔ اخبار کے مالکان نے اپنے کاروباری مفادات کو خطرے میں محسوس کیا تو ریاض احمد کو فوراً برطرف کر دیا۔ اب وہ ایک چھوٹے سے اخبار میں معمولی سے مشاہیرے پر کام کر رہا تھا۔ اور ایک وقت اخبار اور حکومت کے خلاف عدالتی جنگ لڑنے میں مصروف تھا۔

ریاض احمد نے شمس کے سامنے ایک سو بیس تصاویر کا اہم پیش کیا "شمس صاحب یہ تصاویر کل پریس کانفرنس کے دوران آتاری گئی تھیں۔ ان میں نظر آنے والے شخص کو آپ شاہ عالم تسلیم نہیں کرتے؟"

"جی نہیں۔ یہ کوئی سہوہیا ہے۔"

"یعنی اصل میں یہ کوئی اور شخص ہے جو شاہ عالم کا ایک آپ کر کے وہاں آیا تھا؟" ریاض احمد نے سوال کیا۔

"ہاں۔ شاہ عالم شہید کا جنازہ تیار ہے اور آج شام چار بجے ان کے گھر سے اٹھایا جائے گا" قریبی نے کہا۔ شمس نے سر ہلایا "شہید شاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کو اور ان کے والد نے اپنے بیٹے کو شناخت کر لیا تھا۔ یہ وہ صدے کے باعث ابھی تک بے ہوش ہے۔ شاہ عالم کے والد صدے کی تاب نہ لا کے جاں بحق ہو چکے ہیں اور ان کی میت ان کے تباہی گاہوں روانہ کر دی جائے گی۔ ایک ہیرو اپنے شوہر کو اور ایک باپ اپنے بیٹے کو شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یہ ظاہری پہچان کے ساتھ دل کی گواہی کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔"

ریاض احمد نے کہا "سوال یہ ہے کہ پھر وہ شخص کون تھا جس نے شاہ عالم بن کے پریس کانفرنس بلوائی تھی۔"

"اس سوال کا جواب تو آپ ہی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ خود جیل آدھی نہ ہوتا تو فرار کیوں ہوتا؟" قریبی نے کہا۔

ایک اور اخبار کے ایڈیٹر نے کہا "ہاں۔ وہ اپنی شناخت ثابت کرتا، اعلیٰ حکام اور پولیس سے رجوع کرتا۔"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ جان کے خوف سے روپوشی پر مجبور ہے۔"

"ریاض صاحب، حکومت اتنی ڈاٹا بھی نہیں کہ اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ وہ جموٹا آدمی تھا۔"

ریاض نے کہا "یہ جھوٹ بولی کے اسے کیا ملا؟"

"اس جھوٹ نے انتشار پیدا کیا۔ کنفیوژن پھیلایا اور شہید شاہ عالم کی شخصیت کو بعد از مرگ متنازعہ کر دیا۔"

ریاض نے کہا "وہ تمام زندگی متنازعہ رہے۔ اور ان کی موت کو شہادت قرار دینا بھی متنازعہ مسئلہ ہے۔"

قریبی کے ساتھ بیٹھے ہوئے مولانا نے اپنی داڑھی پر ہاتھ

بجھ کر فرمایا "ملک و ملت کی فلاح اور خدمت خلق کی جدوجہد میں جان دینے والا شہیدی کھائے گا۔"

خس نے کہا "میں جانتے ہیں کہ اس سازش کا مقصد پارٹی میں بھڑت ڈالنا اور پارٹی ورکرز کے دلوں میں شکوک پیدا کرنا ہے۔ لیکن وہ اپنے مذموم عزائم میں بھی کامیاب نہیں ہوں گے" قریٹی نے ہنسنے لگا۔

"کیا اس کا دسٹے دار آپ مروراز گروپ کو سمجھتے ہیں؟ پہلے جو کچھ کیا تھا کہ مروراز گروپ کسی کے گھس میں جا کے زہر دیتے والا شاہ عالم تھا۔ جب کہ شاہ عالم اس وقت بانک کالج میں بیٹھا ہوا تھا ریاض وٹاں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل اصل شاہ عالم نہیں تھا یہ اصل شاہ عالم نہیں تھا جو بانک کالج میں تھا۔ اس کے علاوہ شاہ عالم کو آپ نے اور پارٹی ارکان نے ریلوے اسٹیشن پر رہیو کیا تھا۔ اس وقت ان کے ساتھ سینئر نائب صدر مسٹر تیور بھی تھے اور ان کی بیوہ رخشہ تھیں۔ لیکن جس شاہ عالم کا جنازہ تیار رہا وہ اسی وقت وہاں سے بہت دور مشتعل جھوم کے ہاتھوں مارا گیا۔"

خس نے کہا "جی۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔" ریاض نے کہا "گویا وہ شاہ عالم جعلی تھا جس کو آپ سب نے اور پارٹی ورکرز نے ریلوے اسٹیشن پر رہیو کیا تھا؟ جس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

"وہ جعلی نہ ہوتا تو فراریوں ہوتے؟" خس نے کہا۔ "مگر اس وقت مرحوم کی بیوی دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ جعلی شاہ عالم کے ساتھ تھی" ریاض اصرار سے کہا "اب آپ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو پہچان لیا تھا اور مدد سے بے ہوش ہو گئی تھی۔"

قریٹی نے جزیروں کے کہا "آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ کوئی جہنازی یقیناً ہے جو ذاتی مفاد کے لیے ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ اصل شاہ عالم ہوتا تو سامنے آتا۔"

"خس صاحب اصل شاہ عالم اکیلا سڑکیں کر رہا تھا۔ تیور صاحب کی گاڑی میں" ایک رپورٹر بولا۔

دوسرے نے کہا "کیا اسے پہلے سے پتہ چل گیا تھا کہ اس پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر قاتلانہ حملہ ہوگا؟"

"کیا اس نے جانتے ہوئے کسی ہم شکل کو سینئر نائب صدر تیور اور اپنی بیوی کے ساتھ ٹرین سے روانہ کیا تھا۔" تیسرے نے سوال کیا۔

"خود تیور صاحب کہاں ہیں۔ اس موقع پر ان کا نظریہ آنا کیا معنی رکھتا ہے؟" پوچھتے پوچھتے

یہ چاندوں پر ورکرز کشتہ دوز میری ریس کانفرنس میں شریک تھے لیکن اس کی دودا چھاپنے پر بھولے گھرانے جا رہے تھے۔

اب قریٹی نے اپنا ٹرپ کارڈ چلایا "سینئر نائب صدر امیر تیور کا مروراز کے قتل کے بعد نائب ہو جانا اور اب شاہ عالم کی شہادت کے بعد سامنے نہ آنا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر میو تیسرے ضروری نہیں۔ آپ لوگ خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔" "کیا آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ تیور صاحب کی سازش تھی؟" "میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں" قریٹی بولا "آپ اس کا کیا مطلب نکالیں گے آخر؟"

خس نے فوراً میری کانفرنس ختم کرنے کا اعلان کر دیا "باقی باقی پھر بھی ہوں۔" شیک پروری جگ۔ اس کانفرنس کا مقصد صرف وضاحت کرنا تھا اور شکوک دور کرنا۔"

ریاض نے احتجاج کیا اور دوسرے رپورٹرز نے ایک کے بعد ایک سوال چلا چلا کر پوچھ کر خس اور قریٹی کانفرنس ہال سے رخصت ہو گئے۔ ان کا رخصت ہونا قرار کے حراف تھا۔ صحافیوں کے آنے سامنے ہونے سے معاملہ مزید الجھ گیا تھا۔ کئی دن اور بڑھ گیا تھا۔ اب بیشتر صحافی اس صورت حال کے پس منظر میں بہت کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ان کے پاس وقت کم تھا۔ شام کو شاہ عالم کا جنازہ پٹی شان و شوکت سے اٹھایا گیا۔ اس کو رونے والی حرف اس کی ماں تھی جس کی بے نور آنکھیں اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر اس کی ماتا اپنے لڑکے کو خوشبو کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ نہ کسی کو بہت ہوئی کہ اس سے کوئی سوال کر سکے۔ وہ بس خدا سے موت مانگتی رہی۔ بار بار یہی کہتی رہی "مجھے کیوں زندہ چھوڑا رہی ہے۔" جوان بیٹے اور شہر کے ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اسے بس غم ہی غم تھا کہ وہ خود کیوں زندہ ہے۔

شاہ عالم کے جنازے میں بہت سی اہم سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات نے شرکت کی مگر بیشتر اہم سیاسی رہنماؤں نے محض تعزیتی بیان پڑا دیا۔ ان میں سے کچھ بعد میں تعزیت کے لیے ذاتی طور پر بھی آئے مگر ان کا آنا بھی اخلاقی ضرورت کے تحت نہیں تھا۔ سیاسی پبلیٹی کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ ان کی تصویر لواترین کے ساتھ دعائے مغفرت کرتے ہوئے شائع ہو۔ جب وہ کسی کے مرثیہ کی تقریبات کا افتتاح فرماتے ہیں تو یہ بھی مذہبی عقیدت سے زیادہ سیاسی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خود جنازے میں شریک تھا اور جو وزیٹم میں نے بنائی وہ میں نے بعد میں تفصیل سے دیکھی تھی۔

شاہ عالم کے والد میاں جی کی میت اسی رات تدفین کے لیے ان کے آبائی گاؤں بیج دی گئی۔ شاہ عالم کی تابیاں بھی میت کے ساتھ گئی تھیں۔ گلاب اور چنبیلی کے علاوہ پارٹی کے کچھ لوگ ایک وگن میں تھے اور اگلے دن وہ سب لوٹ آئے تھے۔ شاہ عالم کی ماں اپنے پرائے گھر میں رک گئی تھی جہاں سے وہ برسوں پہلے شہر آئی تھی۔

شاہ عالم کی تدفین شہر کے مضافات کے ایک باغ میں ہوئی

تھی۔ یہ باغ اس کے ایک عقیدت مند کا مگر درحقیقت شاہ عالم کا ہی تھا۔ وہ اچانک مر گیا تو عقیدت مند اس کا مالک ہو گیا اور اس نے شہر کے کچھ لوگوں پر باغ کا ایک چوتھا حصہ اپنے محسن کو اپنی نیند سونے کے لیے دے دیا۔ اسی جگہ شاہ عالم کا مزار بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ایک رات میں مزار پر بھی گیا تھا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ "میرے" مزار کو کس طرح قبر بنی کرنے والوں اور کرانے والوں نے کسی چیز کی درگاہ بنادیا ہے۔ وہاں عرس بیٹھا ماحول تھا۔ سوئم تک وہاں پارٹی کے کارکنوں کے بھونے بھونے جلوس بھی آتے رہتے تھے۔ اندرون ملک کے دور دراز مقامات سے شاہ عالم کے حامی ارکان اسٹیبل، تحصیل اور ضلع کے عہدے دار اور دوسری سیاسی اور سماجی شخصیات نے جو جنازے میں شریک نہیں ہوئے، اب پھولوں کی چادر میں چڑھائیں اور اپنی تعادری شائع کرانے کا خصوصی اہتمام کیا۔ وہاں قوال بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گل فروش بھی۔ شاہ عالم کی تصویریں پارٹی کے بچ اور بھنڈے بیچنے والے بھی بڑس کر رہے تھے اور ٹھیکے دار بھی جو سائیکوں، موٹر سائیکوں، گاڑوں اور بسوں سے زبردستی پارکنگ فیس وصول کر رہے تھے۔

وہاں میں نے خیمہ کو بھی دیکھا تھا جو حراس پانڈ اور پریشان حال نہ جانے کس جتھوں میں تھی۔ شہر کے سونے کی بجلی کرن اسی کے دل میں پھولی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے یقینی کا اندھیرا اور ہوا کیا تھا اور یقین کی روشنی غالب آتی گئی تھی۔ اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایک اصل شاہ عالم تھا اور دوسرا اسی کا کوئی خرمی ہم شکل یا سہواریا۔ ابہام کی وہ کیفیت ابھی برقرار تھی اور بہت سی سوالات کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ مروراز کو کس نے قتل کیا تھا؟ شاہ عالم نے یا اس کے نقش ثانی نے؟ بانک کالج میں کون موجود تھا؟ شاہ عالم خود یا اس کا بھائی کیٹ۔ جو سب کے سامنے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر رخشہ کے ساتھ ٹرین سے اترتا تھا وہ شاہ عالم تھا یا وہ جو مشتعل جھوم کے ہاتھوں ایک ریلوے کراسنگ پر مارا گیا تھا؟ جس نے ریس کانفرنس میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ شاہ عالم ہے اور پھر نائب ہو گیا تھا وہ کون تھا؟

میں نے جب خیمہ کو دیکھا تھا تو مجھے اس پر ترس بھی آیا تھا اور مجھے اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی تھی۔ یہ پیشہ ورانہ جتھیں نہیں تھا جو اسے باپا شاہ عالم کے مدفن کی طرف بھیج لائے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں موجود سوالوں کا جواب تلاش کرتی پھر رہی تھی مگر یہ اور آئی تھی بھی ہوئی تھی کہ کوئی سراسر اس کے ہاتھ آتا مشکل ہی نہیں نامکن تھا۔

اس کے آزار کا ایک ذاتی سبب بھی تھا۔ وہ مجھے شاہ عالم سمجھتے ہوئے بڑے پراسٹینا جہذبات کے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گئی

تھی۔ یہ جانے ہوئے بھی کہ مروراز کے قتل کا الزام مجھ پر ہے اس نے مجھے تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ محسوس کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے اپنی قانونی اور صحافت کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بلاشبہ شاہ عالم کی چاہت میں کسی بھی انتہا تک جا سکتی تھی لیکن حادثہ یہ ہوا کہ (معمولی سی ترمیم کے ساتھ) وہ چار اچانک جبکہ لب بار ہو گیا۔ اس کا خواب آرزو ٹوٹ گیا اور شاہ عالم اس کی آتش شوق کو بھارت کر غائب ہو گیا۔ اس حسرت ناکام کی حلق کو صرف وہ محسوس کر سکتی تھی کہ شاہ عالم کو وہ صرف تحفظ ہی نہیں اپنا آپ بھی دینے کے لیے تیار تھی مگر اس نے پھر بھی خیمہ کو قاتل اعتبار نہ کیا۔ اگر وہ شاہ عالم نہیں تھا تو یقیناً اس خیال میں غرارت اور ذلت کا عنصر الگ شامل تھا کہ کسی فریب کار نے اس کے جذبات کا استحصال کیا تھا اور وہ عشق کی وارفتگی میں اتنی اندھی کیسے ہو گئی تھی کہ اتنی قربت کے باوجود شاہ عالم اور اس کے نقش ثانی کے فرق کو محسوس نہ کر سکی۔

یہ ایسی بات تھی جو خیمہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس کے شاہ عالم سے محبت کے چرچے پہلے بھی بہت تھے یہ اعتراف کر کے وہ مزید مشکل میں پڑ جاتی کہ وہ شاہ عالم کو گرفتاری سے اور انتقامی ردعمل کے طوفان سے بچا کے اپنے ساتھ لے گئی تھی کیونکہ شاہ عالم نے خود اسے فون کر کے بلایا تھا۔ وہ شاہ عالم تھا یا نہیں مروراز کا قاتل جیتا تھا۔ اگر وہ اسے پولیس کے حوالے کر دیتی تو اصل قتل کا مسئلہ ایک رات میں حل ہو جاتا۔ یہ معلوم ہو جاتا کہ عین اسی وقت بانک کالج کے ایک ہوش میں اہم کاروباری شخصیات کے ساتھ بڑس لچ کرنے والا کون تھا۔ صرف خیمہ کا ہی نہیں عام یقین ہے تھا کہ... شاہ عالم خود بانک کالج میں تھا اور اس نے یا اس کے خلاف سیاسی سازش کرنے والوں نے اس کے کسی ہم شکل کو مروراز کے قتل پر مامور کیا۔ اگر اس کی صورت میں کمی جیتی تھی تو ایک آپ سے اسے مکمل طور پر شاہ عالم بنا دیا اور اس کام کا خطرہ معاوضہ بھی ادا کیا۔ اس شاہ عالم ثانی کو بعد میں مار دیا جاتا تو کوئی خرابی نہ ہوتی مگر نہ جانے کیوں اور کیسے وہ بھی موجود رہا۔

خیمہ کی جگہ میں ہوتا تو اسی منتقلی نتیجے پر پہنچا کہ اصل شاہ عالم وہ تھا جس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ بیوی سے زیادہ اپنے شوہر کو صرف ماں پہچان سکتی ہے مگر ماں کی آنکھیں بے نور نہیں اور وہ شاہ عالم کی سیاسی معرکہ آرائی کے سفر میں اس کے ساتھ جی نہیں تھی۔ رخشہ اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ خیمہ نے آخری بار اسے شاہ عالم اڈس میں دیکھا تھا۔ یہ نامکن تھا کہ کوئی اجنبی رخشہ کے ساتھ اس کے گھر اور بیڈ روم میں بھی پہنچ جائے۔ خیمہ نے شاہ عالم سے اس کے گھر میں آخری ملاقات کے دوران یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اصل شاہ عالم ارا جاپکا ہے۔

مجھے اس نے نقلی شاہ عالم مان لیا تھا کہ میں دوسری بار اس کی آنکھوں میں دھول جو تک کے فرار ہو گیا تھا۔ پہلی بار وہ مجھے گرفتار کر سکتی تھی اور شاہ عالم پر ثابت کر سکتی تھی کہ دنیا کی نظر دھوکا کھا سکتی ہے، جہنم کے دل کی گواہی جھوٹی نہیں ہو سکتی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ دوسری بار وہ نقلی شاہ عالم کو مشتعل جہنم کے حوالے کر سکتی تھی کہ یہ ہے عمرو داز کا قاتل اور وہ جس کو مارا جانا چاہیے تھا مکروہ پھر بھاگ گیا۔

اب وہ سخت کنفیوژن کے عذاب میں مبتلا تھی۔ وہ یقین چاہتی تھی اور شک کے پر آزاد کانٹے کو دل سے نکالنا چاہتی تھی۔ شک اور بے یقینی کی اس کیفیت کا شکار سب ہی تھے مگر جہنم کا وہ مختلف تھا۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ اس کا محبوب صرف اس کی نظر سے دلوں پر ہے یا جگ جگ اس کی دسترس سے آنی دور چلا گیا ہے جہاں اس کے تصور کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

”اپنے“ مزار پر ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جہنم کا کوئی ماموں رکھن اسکی ہے جو میرے سامنے ہی میرے مزار پر پھول چڑھانے اور دعا مانگنے آیا تھا۔ یقیناً اس کے اور جہنم کے تعلقات میں بھائی اور ماموں کے رشتے والی کوئی بات نہیں تھی ورنہ وہ جہنم سے بات ضرور کرتا اور جہنم اسے یوں نظر انداز نہ کرتی جیسے وہ اس کے لیے سیکڑوں ہزاروں اچھی لوگوں کی طرح ہے۔ میں جہنم کے قریب ہی موجود رہا تھا مگر میرے بدلے ہوئے چہرے کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی۔ ایک ایسے لڑکے نے اسے بڑی بے تکلفی سے ”شبو“ کہہ کے مخاطب کیا تھا اور جواب میں جہنم نے اسے غلام حق کے بجائے گھوک کے بے عزت کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ لام حق کو کمر میں گھوما جانا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جہنم کا پورا نام جہنم انشائ ہے۔ غالباً ان کے درمیان بھی رشتے داری تھی یا کوئی پرانا تعلق تھا۔ جہنم کی داہی میں اپنے ماموں سے جھڑپ ہوئی تھی اور مجھ پر مزید انکشاف یہ ہوا تھا کہ موصوف نے چوکی شادی اپنے سیاسی حریف کی بیٹی سے کی تھی۔

میں نے مزار کشیش کے اجلاس سے پہلے ہی تیور کو پوری طرح بریف کر کے پولیس کے سامنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ عمرو داز کے قتل کے بعد حفاظت کے خیال سے اپنے خفیہ ٹھکانے پر منتقل ہو گیا تھا اور آخری بار پولیس اسٹیشن پر نظر آیا تھا جہاں سے وہ ایف آئی آر کی نقل لینے گیا تھا۔ میں اتفاق سے آزاد صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تھا اور پھر تیور کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پانی ور کر اور صحافیوں نے اسے شاہ عالم کے ساتھ زین سے اترتے دیکھا تھا۔ پھر اسے وہ گولی لگی تھی جو شاہ عالم پر چلائی گئی تھی اور وہ زخمی ہو کے ریلے اسپتال میں پہنچا تھا مگر اس کے بعد کرم خان نے فصل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے نائب کر کے رئیس کے زیر نگرانی قید کر دیا تھا۔ صحافی اور قتل کی تحقیق کرنے والے اسے

تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ان کے لیے معلومات کے حصول کا دوسرا ذریعہ رشتی ہو سکتی تھی مگر وہ دستور کے کیفیت میں تھی۔ ڈاکٹروں نے کسی کو اسپتال میں اس کے کمرے کے قریب نہیں بھیجے دیا تھا۔ ان کا سب کو ایک ہی جواب تھا ”سر شاہ عالم اس قاتل ہی نہیں کہ کسی سوال کا جواب دیں۔ وہ کونسا ہیں۔“ مجھے یہ بات ناقابل فہم لگتی تھی مگر ڈاکٹر کی رائے کو بھیج کون کر سکتا تھا۔ شاید خود رشتی یہ چاہتی تھی کہ وہ کسی سے نہ ملے بے ہوشی کا ڈراما کرنا مشکل تھا۔ ڈاکٹر فوراً پتہ چلا دیتے ہیں کہ بے ہوشی حقیقی ہے یا مصنوعی۔ اگر وہ واقعی کونسا نہیں تھی تو اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ڈاکٹروں سے مدد لی تھی۔ اس کے لیے ڈاکٹروں پر جذباتی دباؤ ڈالا تھا یا سیاسی۔ انہیں رشوت دی تھی یا مہر صحت حاجت سے قائل کیا تھا۔ اس کے منظر عام پر نہ آنے سے میری مشکلات میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا رویہ مجھے اپنے حق میں حوصلہ افزا محسوس ہوا تھا۔ شاید اس نے شاہ عالم کی موت کو قبول کر لیا تھا اور میرے وعدوں پر اعتبار کرتے ہوئے یا میری دھمکی سے ڈر کے دوسرے معاملات میں خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھا تھا۔

تیور اچانک مزار کشیش کے اجلاس میں پہنچا تو صحافی اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ قریبی اور غرض صاحب کو سخت مایوسی ہوئی تھی۔ تیور کی دہائی میں انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ شاید خوش قسمتی نے ان پر سیاسی مستقبل کی کامیابی کے سارے دروازے کھول دیے ہیں۔ ایک وقت جیڑمیں اور سینئر نائب صدر کے نہ ہونے سے یہ امکانات بہت روشن ہو گئے تھے کہ اب ان میں سے ایک جیڑمیں اور دوسرا خود بخود سینئر نائب صدر ہو جائے گا۔ تیور کے نمودار ہونے سے ان کی امیدوں پر اوس پرکھی تھی۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ جیڑمیں کی جگہ تیور لے گا اور وہ جسے چاہے گا سینئر نائب صدر کے عہدے پر لے آئے گا۔

تیور نے ان سے مختصر بات کی تھی۔ اس نے کہا ”جب عمر دراز کا قتل ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ سیاسی خالین بے وقوفی کا ایسا شاندار مظاہرہ کریں گے کہ ظلم شاہ عالم کو بنا دیں گے۔ جو شہر میں کیا ملک میں ہی نہیں تھا۔“

”تیور صاحب! اسے سیکڑوں لوگوں نے دیکھا تھا؟“ کسی نے کہا۔
”کون سیکڑوں لوگ؟“ بے عمرو داز کے ساتھی؟“
”ہیں۔ ان میں صحافی بھی تھے“ کوئی اور بولا۔
”میر میں کیا وضاحت کروں۔ بعض اوقات ہم کے سر میں نظر رہتی بھی سانپ دکھائی دیتا ہے جیسے بھوکے انسان کو چاند میں نظر آتی ہیں مدیناں۔ کیا اسی وقت کسی نے شاہ عالم کی تصویر بنائی تھی؟“

”گاڑی اچانک آئی اور سیدھی اندر چلی گئی۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس میں شاہ عالم صاحب ہو سکتے ہیں“

ایک صحافی نے کہا۔
”اس کے بعد جب وہ واپس ہوئے؟“ تیور نے کہا۔
”وہ بڑی افراتفری میں نکلے تھے بلکہ فرار ہوئے تھے۔ ان کا ذرا تیور ایسے گاڑی چلا رہا تھا کہ لوگ راستہ چھوڑ کے جان بچانے کے لیے نہ بھاگتے تو شاید وہ ان کے اوپر سے گاڑی گزرا دیتا۔“
ایک فوٹو گرافر نے غلٹی سے کہا ”خود میرا کمراس بھگدڑ میں ٹوٹ گیا تھا۔“
”اور یہی عینک مع ناک کی بڑی کے“ ایک بزرگ بولے۔
”اس کے بعد آپ نے کوئی وضاحتی بیان جاری نہیں کیا۔ کوئی پولیس کا نفرین طلب نہیں کی وضاحت کے لیے؟“ کسی نے پوچھا۔
”وضاحت کر دی گئی تھی۔ میں خود اپنی جلی کے ساتھ شفٹ کر گیا تھا۔ مجھے عمرو داز کے مشتعل مامیوں سے جان کا اندیشہ تھا۔“

”آپ کی فاتح عالم فورس کیا چوڑیاں پہنے ہوئی تھی؟“ کوئی ٹھٹھ سے بولا۔
”دیکھئے“ میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے ہم نے اپنے کارکنوں کو بھی پر سکون رہنے کی ہدایت کی تھی۔ عمرو داز کے ساتھی توڑ پھوڑ میں مصروف تھے۔ اگر ہم اپنے کارکنوں کو کنٹرول نہ کرتے تو تصادم کے نقصانات بہت زیادہ ہوتے۔ شاید کچھ لوگ مارے جاتے۔ ہمارے بہت سے آفس جلا دیے گئے اور تباہ کنبے گئے مگر ہمارے کارکن اور فاتح عالم فورس کے اراکین پانی پانی ڈھپکن کے پابند تھے۔

”کیا یہ ٹھیک ہے کہ شاہ عالم کا کوئی ڈپٹی کیٹ ہے جو اس کا ہم محل ہے یا ایک آپ سے ملایا گیا ہے؟“
”ایسا میں نے بھی سنا ہے اور یہ خارج از امکان بھی نہیں۔ لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ یہ مجھے کسی FICTION کی طرح لگتا ہے“ تیور بولا۔
”لیکن یہ ممکن نہیں ہے“ ایک سینئر جرنلسٹ منہ نے کہا۔
”بی بی ایف کے جیڑمیں کو ریلے سے کراسنگ پر ایک مشتعل جہنم نے گاڑی روک کے مار دیا تھا۔ وہ گاڑی آپ کی تھی۔“

”کیا اسے میں چلا رہا تھا؟“
آپا منہ کے بجائے جہنم نے یہی سے کہا ”یہ کس نے کہا ہے کہ آپ چلا رہے تھے مگر آپ نہیں تھے تو وہ کون تھا؟ آپ کا ذرا تیور آپ کی طرح وہ بھی نائب ہو گیا تھا وہاں سے۔ شاہ عالم لوگوں کے ہاتھ آگیا۔“
”میں آپ کی تردید کیسے کر لوں۔“ تیور نے کہا ”آپ تو خود ریلے اسٹیشن پر موجود ہوں گی۔ اس وقت جب شاہ عالم صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔“
”نہیں۔ میں وہاں نہیں تھی۔ میں وہاں تھی جہاں شاہ عالم کو شہید کیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہنچی تھی۔“ جہنم نے کہا ”اس وقت

تک لاش وہاں سے ایمرینس میں روانہ کر دی گئی تھی۔ اسپتال۔“
”کیا پھر آپ اچال گئی تھیں؟“
جہنم نے کہا ”میں ریلے اسٹیشن پر دوسرے شاہ عالم سے ملی تھی اور وہاں میں کرتے کرتے اچانک نائب ہو گیا تھا۔“
”پھر وہ اس کی مدد ہو گئی؟“ تیور نے کہا۔
”کسی اور نے کہا“ تیور صاحب ”یہ کیا ڈراما چل رہا ہے آخر؟ آپ اور سر شاہ عالم دونوں زین میں شاہ عالم شہید کے ساتھ تھے۔ آپ کو کوئی گلی اور آپ کو اسپتال لے جایا گیا۔ آپ وہاں سے نائب ہو گئے۔ شاہ عالم ریلے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے نائب ہو گیا۔ ان کی بیوی بھی نائب ہے۔“
”ایک دن سب کچھ نائب ہو جائے گا“ ایک بزرگوار بولے۔
دوسرے نے کہا ”تیور صاحب کو پکڑے رکھو۔ کہیں یہ پھر نہ نائب ہو جائیں۔“

جہنم نے کہا ”میں نہیں۔ میں شاہ عالم سے ملنے اس کے گھر پہنچی گئی تھی۔ دو ملا“ اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہی شاہ عالم ہے اور جب شاہ عالم کا جنازہ وہاں پہنچا تو وہ واقعی ایسے نائب ہو گیا جیسے وہ مدد تھا۔“
”کسی نے منڈی سانس لے کر کہا“ اس کی مدد تمہارے لیے بھگ رہی ہے۔“
دوسرے نے زنی کے درمیان کہا ”وہ زندگی میں تمہارے ہاتھ نہیں آیا تھا کہ کیسے آئے گا۔“
آپا منہ نے کہا ”تیور صاحب۔ یہاں آپ حفاظت کے خیال سے دہلیش ہو گئے تھے۔ کراچی میں آپ سر شاہ عالم کے ساتھ ایئر پورٹ پر نظر آئے۔ وہاں سے آپ نے زین میں شاہ عالم کے ساتھ ہی سفر کیا تھا۔ کیا آپ کو شک نہیں ہوا تھا کہ وہ اصل شاہ عالم نہیں ہے۔“
تیور بولا ”جب ان کی بیوی کو نہیں ہوا تو مجھے کیسے ہو سکتا ہے؟“

”دوسرا شاہ عالم آپ کی گاڑی میں کیسے سفر کر رہا تھا؟“
”در اصل۔۔۔ میری گاڑی یہاں اس گھر میں تھی جہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ میں تھا اور نہ میرے بیوی بچے تھے۔“ تیور بولا ”مجھے نہیں معلوم کہ وہ گاڑی وہاں سے کون لے گیا تھا۔“
”کیا پیچھے کوئی چوکیدار بھی نہیں چھوڑا تھا آپ نے؟“
تیور نے کہا ”نہیں۔ گاڑی کیراج میں تھی۔“
”آپ مانتے ہیں کہ اصل شاہ عالم وہی تھا جو آپ کی گاڑی میں شہید کیا گیا اور جس کی مدفن شاہ عالم کی حیثیت سے ہوئی؟“ جہنم نے کہا ”آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے!“
”میں نے انکار نہیں کیا۔“
”پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ جس کے ساتھ آپ کراچی سے

لاہور تک پائی نہیں آئے تھے وہ جعلی شاہ عالم تھا۔ جسے نہ اس کی بیوی پہچان سکی نہ آپ؟
 میں اس امکان کو مسترد نہیں کرتا۔ حقیقت بہت جلد سامنے آجائے گی۔“ تیمور نے کہا۔
 ”یہ دوسرا جعلی شاہ عالم تھا تو شاہ عالم باؤس میں کیسے پہنچ گیا اور پھر وہاں سے فرار کیسے ہوا؟“ ایک خاتون صحافی نے کہا۔
 ”یہ آپ اسی سے پوچھئے گا جب وہ مل جائے۔“ تیمور نے کہا۔
 ”آپ خود کہاں تھے؟“ ایک داڑھی والے صحافی نے سوال کیا۔

”میں ڈھمی تھا۔ اسپتال میں خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا چنانچہ میں کہیں اودھ۔۔۔ شفت ہو گیا تھا۔ ڈم خطرناک نہیں تھا اور ڈرنیک گھر بھی ہو سکتی تھی۔“
 ”آپ کے سیکرٹری اشرف نے ریلے اسٹیشن پر قاتلانہ حملے کی ایف آئی آر کھولائی ہے۔ آپ کے نائب صدر نے ریلے کراسنگ پر قتل کی دونوں میں سے کون سی صحیح ہے؟“ جنم نے کہا۔

”ظاہر ہے ایک۔“
 منیج نے کہا ”کل کی پریس کانفرنس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ اس میں خود کو شاہ عالم کہنے والا کون تھا؟“
 تیمور نے بڑی چالاکی سے کہا ”کیا آپ وہاں نہیں تھیں۔“
 ”جانتے ہو مجھے سینئر صحافیوں کو وہاں نہیں بلایا گیا تھا“ جنم نے کہا۔

”پھر آپ انہی سے پوچھیں جو آپ کے جو نیر ساتھی ہیں۔ دیے براؤن صاحب شاید آپ سے بہت بہتر ہیں۔“ تیمور نے جنم سے مخاطب ہو کر کہا ”آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ مجھے مزار کشین کے اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔“

مزار کشین کے اجلاس میں کیا ہوا تھا؟ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ جنم نے بعد میں سب سے پہلے ہنگامہ کھڑا کیا کہ شاہ عالم شہید کی شناخت کی جائے اور اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جائے۔ اس وقت تک اخبارات میں یہ مطالبہ بہت زور پکڑ چکا تھا اور وہ چھوٹے صحافی جنوں نے میری پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی ایک دم انتہائی اہم ہو گئے تھے۔ رائے عامہ بھی واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ پارٹی ورکر شہید بھٹپالٹ کا شکار تھے۔ انہیں محسوس ہوا تھا کہ اوپر والے انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ پارٹی لیڈر شپ کی سازشی ڈرامے بازی ہے کہ اصلی اور حقیقی شاہ عالم کا پتہ چلا دیا گیا ہے اور ابھی تک سولید جن کے ساتھ کوئی نہیں تباہ کیا ہے۔ ایف کے چیزیں کو شہید سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ جتناہ اس کا نہیں تھا جس میں اتنے لوگ ایک نشانِ شکر ہوئے تھے وہ سچ و دم سوگ اور ماتم سب بے مقصد تھا؟ نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

اتنے لوگوں کو بے وقوف کون بنا سکتا ہے۔ بھرا دلی کو یہ پکر چلائے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگر مزار شاہ عالم شہید کا نہیں تو پھر وہاں کون دفن ہے؟ وہ ہم شکل کون تھا جسے بچانے میں سب کی تحسین کو دھوکا ہوا۔ پارٹی کی قیادت اس کی بیوی ماں باپ دوست احباب، بیکروں لئے بننے والے کیا سب فریب کا شکار ہو گئے۔ اور اگر شاہ عالم زندہ ہے تو کہاں ہے؟ وہ دوش کیوں ہے؟ پروپیگنڈے کا مسئلہ اصول ہے کہ ثبوت کو مسلسل اتنا دھور اتنے زور شور سے بولو کہ وہ سچ مان لیا جائے یہی میں نے کیا تھا۔ مگر اپنی مرضی سے اور خوشی سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔
 وہ ایک تاریخہ قوت تھی جس نے کانپل دیا اور میری زندگی کی گاڑی لانڈیل بدل کے دوڑنے لگی تھی۔ پھر راستہ بھی بدل گیا اور جنرل بھی۔ میں تقدیر کے فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور تھا۔

○●○

تقدیر کے فیصلے سے میں مجبور ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر میری زندگی کا راستہ بھی بدل گیا تھا اور پھر جنرل بھی۔ ختم خانے کی دنیا چھوڑ کے میں نے سمجھا تھا کہ اب میں آزاد ہوں اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کر سکتا ہوں اور کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر میں مجھے سب کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اہمیت جس نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی۔ اپنائیت کا احساس۔ زندگی کی آسائش اور آزادی۔

اب میں یہ گھر بھی چھوڑ کے جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اچانک حالات نے خاموشی سے میرے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا تھا اور میں اسی میں پھنس گیا تھا۔ کیا ایسی ہے کیا رہائی ہے۔ ان حالات میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کرنا میرے اختیار کی بات نہ تھی مگر یہاں کیا تھا؟ یہاں تو میں آزاد تھا۔ پھر شاد نے مجھے کیسے ایسیر کر لیا۔ ایسا کیوں ہوا کہ شاد نے مجھے علم دیا اور میں نے کسی نظام کی طرح قبول کی۔ اس نے کہا کہ چھوڑو لےنا سبھی سنسار۔ قربان کروے زندگی کی ہر آسائش و راحت کو۔ شکر ادا ہے اپنی اہمیت کو اور بھول جا اپنی انا اور غور کرو۔ اور اٹھالے شکلوں کے انداز اختیار کر اور فقیر ہو جا۔ کیونکہ میں ایسا چاہتی ہوں اور تو مجھے چاہتا ہے۔

اور اگر یہ میرے بس کی بات نہیں ہے تو تیار کر دو۔ میرے پوجنل قدم مجھے رتہ رتہ اس گھر سے دور لے گئے جس کو میں اپنا گھر سمجھنے لگا تھا اور اس گھر میں رہنے والے مجھے اپنا سمجھتے تھے۔ پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اچھے کپڑوں پر مختلف بینے دوم ریسانہ زندگی کے چوچیلوں پر کلاس کی نظر قریب مصروفیات کا حصہ بن جانے کی گمانیت اور غور کے علاوہ بھی کچھ ہے جو کوئی کی نگاہ کو بدل دیتا ہے اور وہ سب بچ نظر آنے لگا ہے جو متعدد حیات تھا۔

جب عشق سکھاتا ہے تو آپ خود آگاہی

میرے ساتھ تقدیر نے ڈھرا مذاق کیا۔ جیسے کوئی جانے والی زمین میں دو انجن لگائے جاتے ہیں۔ ایک اسے آگے سے کھینچتا ہے اور دوسرا پیچھے سے دھکیلتا ہے۔ اس کے بغیر دھار پھاڑی راستے کی بلندی طے نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی میری عقل و خیال کی مزاحمت کو شکست دینے والی قوت صرف شاد کے عشق کی کوشش نہیں تھی۔ بنجھ صاحب کا مدیہ بھی خوف بن کے مجھے اس گھر سے دور بھاگ جانے پر مجبور کر رہا تھا۔

راکت کو زمین کی کشش سے دور جانے کے لیے بہت زیادہ طاقت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنی طاقت جو اسے پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نکالے۔ پھر جیسے جیسے زمین سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اس کی کشش کم ہوتے گئی ہے اور خلا کی آزاد فضا تک سفر آسان ہوتا جاتا ہے۔

میرے لیے بھی اس گھر کو چھوڑ دینے کے بعد تہا ز سزا کا مرحلہ زیادہ تکلیف تھا۔ اسی گھر میں گزارے ہوئے اچھے وقت کا برہنہ میرے ہاؤس کی زنجیریں کیا تھا۔ قریباً چوں کا تصور مجھے بلاتا تھا۔ اب بھی وقت ہے۔ لوٹ آؤ نامر۔ ایک شاد کیا دنیا کی کوئی لڑکی اتنی اہم نہیں ہوتی جیسے تمہارے لیے کہ تم زندگی کے مقاصد کو فراوانی کرو۔ یہ بھول جاؤ کہ تمہارے عزائم کتنے ناقابل شکست تھے۔ ایک لڑکی یا عورت کی کشش کو عشق کو یا محبت سیدھیل سانس نہیں ہے کہ یہ سن بلوفت میں فوجیوں کے جسم میں دوڑنا ہونے والی تہذیب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو مارموزڈ ڈم جو پچیس آگاہے ہیں وہی جنس مخالف کے لیے ایک جسمانی طلب کی خواہش سے مغلوب کرتے ہیں۔ جب یہ دور گزر جاتا ہے تو ہر عورت صرف ایک جسم نہ جاتی ہے۔ وہ بیوی ہو۔ محبوبہ یا رشتہ۔ اچھے کھانے کی طرح جس میں لذت ہو، شہن ہو اور خوشبو ہو جو اشتہا کو تیز اور طلب کی شدت میں اضافہ کرے۔ عورت کے پاس شہن ہو، شاپ کی لذت سے بھرپور جسم ہو اور آتشِ شوق کو ہوا دینے والی خوشبوئے زلف و پیر بن ہو تو۔

تو کیا؟ عشق کچھ نہیں۔ عورت بھی کیا چکن پلاؤ ہے یا نرگسی کوئلہ ہے۔ ایسی کی ایسی میڈیکل سائنس کی۔ سرجن کے لیے ساحت و صل کیا اسی عورت کے پوسٹ مارٹم جیسی ہو سکتی ہے؟ ایڈورڈ ہشتم نے جب عشق کے ترازو میں قولا تو ایک عام بیوہ عورت سسر سچیں کو ایسے نہیں دیکھا تھا جیسے مقابلہ حسن کے بج کسی کو مس یونیورس قرار دینے سے پہلے اس کے بدن کے قوس و خم اور خشیب و فراز کو جو میٹری کے زاویوں اور حساب کے اعداد و شمار سے ناپ تول کے دیکھتے ہیں۔ وہ تو جس عشق نے کہا کہ۔ نگاہِ قمر میں شانِ سکندر کی ہے۔ چھوڑت و تاج کو قمر شہی کو اور سوادے فرما زوالی کو اور گدائے راہ و وفا ہو جا اور ایڈورڈ ہشتم نے بھائی عقل و ہوش فیصلہ کیا کہ آغوشِ محبوب میں زیادہ راحت و سکون کا سامان ہے۔ بہ نسبت سلطنتِ برطانیہ کی بادشاہت کے اور اس کے

بعد۔ بے خطر کو در آتشِ نمرود میں عشق۔ اور شاہ کو گدا بننے پر بھی عزامت اور پشیمانی کے احساس نے پریشان بھی نہیں کیا۔ وہ اچھم عشق کا شہنشاہ بن کے زیادہ سرخرو ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے میرے اور شاد کے درمیان فاصلہ کم ہوتا گیا اس کا جسم چو۔ غر اور فتح مندی کی گمانیت سے سرشار۔ میرے تصور میں یوں ابھرا گیا جیسے قاصلے کی گرد سے عیاں ہونے والے سوز کے غدغدا خیال یا حشراتی پر نمودار ہو جانے والے دیو پیکل طیارے کا سیاہ خط جو رتہ رتہ رفتہ کی پیر سے بڑے کی طرح گئے پھر کسی چھوٹے سے جہاز کا خاکہ بن جانے میں تک کہ وہ پوری گھن گرج کے ساتھ سر کے اوپر سے گزرے اور کسی فلولادی و خوشسار کی طرح سامنے آکر اڑا ہو۔

میرا جذبیہ شوق یوں بڑھتا گیا جیسے زمین کی کشش فضا سے نکل کر چاند کی کشش کے دائرے میں داخل ہونے والے خلائی جہاز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ پلاٹر میں چاند کی سطح پر اتر گیا۔ ایک نیا سیارہ ایک نئی دنیا جس میں خود کو کسی طرح بھی نکل آدم اسزائگ سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے چاند کا نام شاد تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بسترِ سادگت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاؤس کا سارا رشم ٹیکھے پر نگرا ہوا تھا۔ جگہ زرد لباس کی چمک اس کے بدن پر یوں لگی تھی جیسے صحرا میں ریت کے نیلوں پر بکھری ہوئی چاندنی۔ سانس کے ساتھ اس کے بدن میں خفیف سا تھوین محسوس ہوتا تھا۔ اس کے لب تھوڑے سے داغے اور ایک کھلی ہوئی ناگ کا کچھ حصہ اُڑی ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ دیک رہا تھا۔ میں دروازے میں خاموش کھڑا اس کی بیکر رمتانی کا نقش اپنے خیال میں جذب کر رہا تھا۔ پھر اس نے بہت سے آنکھیں کھولیں اور مجھے دروازے کے فریم میں کسی جھمکنے کی طرح استاء دے رکھا۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک کرن جھلکائی۔ پھر یہ روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ چوکی نہیں، حیران نہیں ہوئی۔ وہ گہرا کے بدعاشی میں اٹھی نہیں اور میرے یوں چوری چوری دیکھنے پر خوش یا غامض نہیں ہوئی۔

میں آگے بڑھا اور اس کے پاس بیٹھ کے میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا ”شادوئی میں آگیا ہوں۔“ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے جنم جیسا ابدار موتی دھلک کے رخساروں پر آگیا ”اگر تو نہ آتا۔“
 ”تو کیا ہوتا؟ تو میرا کیا۔“ میں نے وہ آنسو ایک انگلی پر اٹھا لیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں خود اپنی نظریں وہ نہ رہتی۔ جو میں اب ہوں مجھے دکھ ہوا کہ اگر تو بھی بس ایک عاشق ہو آ میرا۔“
 ”تو کیا میں عاشق نہیں ہوں؟“ میں نے کہا۔
 ”عاشق تو بہت ہیں میرے لیکن وہ عشق کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے۔“

”تو بھی بے بسی اور کیا کیا ہے شادو؟“
 وہ اٹھ بیٹھی ”تو نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ وہ سب جو
 تیرا تھا۔ تو نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔“
 ”ہاں۔ میں خالی ہاتھ آیا ہوں۔ سب چھوڑ کے۔“ میں نے
 اس کو اپنے قریب کر لیا اور وہ میرے بازوؤں میں سمٹ گئی۔
 ”میں بھی سب کچھ چھوڑ دیں گی۔ اب یہ ممکن ہے۔“ اس نے
 آنکھیں بند کر کے سکون کی کمری سانس لی۔
 ”میں نے اسے چوم لیا۔ وہ ڈپ کے الگ ہو گئی۔
 ”دیکھ ناصر۔ اگر تو شادو کو صرف ایک عورت سمجھتا ہے تو
 دروازہ بند کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا فائدہ تجھے داپہیں جاتے
 ہوئے پھر دروازہ کھولنا پڑے گا۔ ایک مرد کی حیثیت سے بھی تو مجھے
 اچھا لگتا ہے۔“
 میں نے کہا ”مگر میں داپہیں جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم
 نے کہا تھا مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“
 ”ہاں۔ تو نے پہلے کسی کی مدد کی ہے؟“ اس نے بالوں کو سمیٹ
 کر منہ میں دبا لی ہوئی ہنسی سے پیچھے کر دیا۔
 ”میں نے ناصر کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔“
 ”پھر؟“
 ”پھر کیا۔ ناصر مر گیا۔ قتل ہو گیا۔“ میں نے کہا ”میں نے تم
 کماٹی تھی کہ اس کے قاتلوں کو نہیں چھوڑوں گا۔“
 ”تم نہیں کماٹی چاہیے۔ جب تک تم پوری کرنے کا حوصلہ
 نہ ہو۔“ وہ فرختمیں سے پولیس ٹکالنے لگی۔
 ”میں..... جذباتی ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔
 ”جذباتی ہو کے تو میرا ساتھ بھانے کی قسم کھالے گا۔ پھر
 وقت کے ساتھ جذبات بدل جائیں گے۔“
 ”میرے جذبات کیسے بدل سکتے ہیں تمہارے لیے؟“
 ”حالات کے ساتھ۔ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔“ اس نے ایک
 بوتل کھول کے مجھے تھمائی ”ناصر کا چچا طاقتور تھا۔ تو نے ہتھیار ڈال
 دیے۔“
 میں نے احتیاطی لیے میں کہا ”شادو جی۔ یہ غلط ہے۔ میں
 معاملات پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟ میں تمہارے پاس
 کیوں آیا تھا؟“
 ”ہاں۔ میں نے نہیں سے کہا تھا کہ اگر تیرا دوست چاہتا ہے
 کہ میں اس کی مدد کروں تو اسے ہلاک کر لائے۔“
 ”اور میں آیا تھا۔ اس امید میں کہ تم میری مدد کر لی۔“
 ”مجھے معلوم ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تو کیا قہر دھاتے اور
 میں نے اٹا تجھے مدد کے لیے کہہ دیا۔“
 ”میں نے کہا۔ تمہاری مدد سے ہی مجھے ناصر کے چچا کا فون نمبر
 معلوم ہوا تھا اور میں اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔“
 ”وہ فون پڑی۔“ صرف گھر نہیں تو تھانے پہنچ گیا تھا۔“

”مجھے چھڑانے میں بھی تم نے میری مدد کی تھی۔“ میں نے کہا
 ”تمہاری مدد کی مجھے اب بھی ضرورت ہے شادو۔ میں اپنی قسم بھولا
 نہیں۔“
 وہ میرے سامنے بیٹھ کے کوک پیئے گی ”یعنی ناصر کے چچا کو
 قتل ضرور کرنا ہے۔ چھائی ضرور چڑھنا ہے۔“
 ”میں نے سوچ کے کہا۔“ ضروری نہیں۔“
 ”کیا ضروری نہیں۔ تو سمجھتا ہے کہ پکڑا نہیں جائے گا؟“
 ”میں نے مسکرا کر کہا۔“ ہاں۔ جب میں قتل ہی نہیں کروں گا تو
 پکڑا کیوں جائے گا اور جب پکڑا نہیں جائے گا تو چھائی کیسی۔“
 ”پھر کیا کرے گا تو؟“
 ”میں اسے پکڑا دیتا ہوں۔ ایسا پکڑ چلا دیتا ہوں کہ
 پولیس اسے پکڑ لے۔ ثبوت کے ساتھ۔ اور یہ کام میں کیا نہیں
 کر سکتا۔“
 ”پہل ٹھیک ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا ”پہلے تیرا کام پھر
 میرا۔ پہلے میں تیری مدد کروں گی۔ پھر تو میری مدد کرے گا۔“
 ”میں نے اس سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ”تمہاری بات سچی ہو گئی؟“
 وہ ہنسی پڑی ”اچھا! پھر اب کیا ارادے ہیں؟“
 ”میں کسی دن لے جاؤں گا تجھے۔“
 ”اولیٰ میں بٹھا کے۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنی
 رہیں۔
 ”میں نے کہا۔ ”تو..... اپنے پرائیویٹ پلین میں اڑا کے۔“
 وہ ہنسی ”وری گڈ۔ کہاں لے جاؤ گے؟ وزیراعظم ہاؤس؟“
 ”ابھی فون لو شادو جی۔ سب کے ساتھ۔ مگر اگر پڑی کا معاملہ
 ہے کہ آخر میں بیٹنے والا کون رہتا ہے۔ یہی دیکھنا ہے۔“
 ”اچھا اب ہو۔ ٹھیک رہاں سے۔ نیچے جا کے یہ شاہزادوں
 والے کپڑے آنا اور میں جاؤں گا۔“
 ”میں نے کہا۔ ”آج رات بیگم صاحبہ کو بڑی مایوسی اور بہت دکھ
 ہو گا۔“
 ”صرف بیگم صاحبہ کو؟“ اس نے پھر سے کہا۔
 ”ہاں۔ اگر میں آج بھاگ کے نہ آتا..... تو بڑی مشکل
 ہو جاتی۔“
 ”کیا وہ کما جاتی تھے؟“
 ”ہاں۔ اس کا بھی ارادہ تھا۔“ میں نے کہا ”آج رات ڈاکٹر
 صاحبہ بھی گھر سے باہر ہوں گے۔“
 ”اس نے شوق سے کہا۔ ”پھر ایسا کر۔ کل آجنا۔ کسی کا دل
 تو زنا اچھی بات تو نہیں ہے۔“
 ”میں نے کہا۔ ”شادو جی۔ میں اتنا گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔“
 ”مجھے تو شک ہے۔ تمہارے آدمی ہونے پر۔“
 ”میں نے سہلایا ”ایک شعر سنائیں۔“ عشق نے غالب..... کہا
 کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔“

رات دس بجے شادی گاڑی سے اتر آئیں ایک پرائیویٹ گریڈ
 صاف تیس اور نیلی چٹون پہنے گھنٹوں میں سوسپہلے باہر بیٹھا ہوا
 تھا۔ میرے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے اور میں صورت سے
 معلوم نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی گھوم کے اندر آئی
 تو بیڑا نکلیں سیدھی مجھ پر پڑیں۔ میں اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔
 شادی اتر کے سیدھا میری طرف آیا ”کون ہے تو؟“
 ”میں نے کہا۔ ”شادی۔“ میں ناصر ہوں۔ آپ نے مجھے تھانے
 سے چھڑا دیا تھا۔“
 اس کی تیوری پر ہل پڑ گئے ”ہاں۔ اب کیا ہے؟ یہاں کیا کر رہا
 ہے تو اس وقت؟“
 ”آپ کا انتظار کر رہا تھا شادی۔“
 ”کیوں؟ اور تو یہاں کیا کیسے؟“
 ”میں نے کہا۔ ”میرا دوست ہے رئیس۔ اس نے کہا تھا۔ شادی
 کے پاس آج آنا اگر پریشانی ہو۔ شادی مجھے یہاں رہنے دو۔“
 ”یہاں رہنے دو؟ دن تیرے باپ کا گھر ہے۔“
 ”میں نے آنکھوں میں آنسو برکے کہا ”باپ کا گھر تو شادی تو
 دنیا میں خوار کیوں پھرنا۔ میری تو شہادت کرانے والا بھی کوئی نہیں
 تھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک۔ میں ایک بڑے
 بڑھیا کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے کام کدیا تھا۔ اس کے بدلے میں
 مدد لی جاتی تھی اور سونے کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑے
 کو بتادیا کہ میں دو دن تھانے میں بند تھا۔ جوت ہلا کر چوری کی
 تھی میں نے عورت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ بھی کہا کہ میں حوالات سے
 بھاگ آیا ہوں۔ پولیس پھر آجائے گی مجھے پکڑ لے۔ بڑے بڑھیا نے
 اسی وقت مجھے نکال دیا۔ اب میں کہاں جاؤں شادی۔“
 ”میری طرف سے جسم میں جا۔“ شادی نے یہ بھی سے کہا
 ”لاوارث لوٹے نہیں ہلا میں۔ داپہیں چلا جائیں گے۔“
 ”شادی۔ میں جہاں جاؤں گا وہ میرے پیچھے کے رہیں گے۔“
 ”اے تو حرامی! پنگا کیوں کیا تھا ان سے۔ اور وہ کون سے گھر
 والے تھے تیرے جنہوں نے دس ہزار دیے تھے۔ تجھے چھڑانے
 کے۔“
 ”میں نے کہا۔ ”شادی۔ کوئی گھر والے نہیں تھے وہ میرا تو اس
 دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“
 ”پھر کہاں سے آئی تھی اتنی بڑی رقم؟“
 ”میں نے قدرے تذبذب سے کہا۔ ”وہ..... جمع کیے تھے میں
 نے۔“
 ”تو نے جمع کیے تھے۔ کہاں؟ اور کیا کام کرنا تھا تو؟“
 ”میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”کوئی ایسے کام نہیں تھے شادی۔
 چرواہا کرنا تھا۔ کسی گاڑی سے نیپ نکال لیا۔ گاڑی چوری کر لیا۔
 آپ سے جوت نہیں بول سکا۔ چار سالگیس چوری کی تھیں
 اور سچ دیں۔ خالی مکانوں سے بجلی کے بیڑے چوری کرنا خاص کام تھا۔“

جو مکان کھل ہونے کے قریب ہوتے تھے وہاں رات کو جاتا تھا اور
 آدھ رات کے بیڑے کھل لیتا تھا۔ یہ دیکھا رہتا تھا کہ شہر میں کون سے
 گھر میں آئے پڑے رہتے ہیں۔“
 شادی کا ذرا رنج و گاضی میں سے سامان نکال کے اوپر لے
 جا چکا تھا مگر شادی کو میری باتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی ”چہ ہواں گسے
 سے پہلے کیا کرتا تھا؟“
 ”جیتیم تھانے میں قہقہہ ”چندہ جمع کرنا تھا۔“
 ”اس میں سے تو ری کرنا ہو گا؟“ شادی نے کہا۔
 ”میں نے سر جھکا لیا ”چندہ جمع کرنا مشکل کام تھا۔ بہت پھرنا پڑا
 تھا۔ گھر گھر جا کے بھی بہت کم ملتا تھا۔ بیک وقت آسان تھا۔ پیسے
 زیادہ مل جاتے تھے۔“
 شادی کا پارا چڑھ گیا ”جوت بکنا ہے۔ کہاں بیک وقت ملتا تھا
 تو۔ کسی نے دیکھا تھا بیک وقت ملتے ہوئے؟“
 ”میں نے قسم کے کہا۔ ”میں سڑک پر اور بازاروں میں بیک
 نہیں ملتا تھا شادی۔“
 ”اس اور زمین میں بیک وقت ملنے والوں کو بھی جانتا ہوں میں۔“
 ”میں نے کہا۔ ”میں دفتر میں جاتا تھا شادی۔ اور کارخانوں
 میں۔ دن میں جب کھانے کا وقت ہوتا تھا تو میں کینٹین میں پہنچ جاتا
 تھا۔ آپ جانتے ہو شہر میں کتنے کارخانے ہیں اور کتنے دفتر۔ کسی
 کھانا کھانے والے کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ اور پھرتے سے انکو تو
 بڑی آسانی سے ایک دو روپے مل جاتے ہیں۔ باغی دس بھی دے
 دیتے ہیں دینے والے۔ سید فرختمیں اور خریداری کرنے والے کم
 دیتے ہیں۔ کھانے کے چچ میں انکو تو لقمہ حلق میں ایک جاتا ہے ہی
 کھانے والے کے۔ اب تو بڑی پرکھیں ہو گئی ہے۔ روٹا کوئی مشکل
 نہیں میرے لیے اور انسواری ایک سے ایک سے میرے پاس۔ باپو
 لوگ اور مزدور ایک بچے کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے تھے تو ان کا
 ہاتھ خود جیب میں جاتا تھا۔ ان کا کھانا خراب ہوتا تھا۔ وہ کچھ دے
 کر ڈالتے تھے اور پھر آرام سے کھانا کھاتے تھے۔ جب ذرا بڑا ہو گیا
 تو لوگ دھکارتے لگے کہ کام کیوں نہیں کرتا۔ پھر شادی۔ کچھ تو
 کرتا ہی تھا۔“
 ”بڑا حرامی ہے تو۔“ شادی نے یوں کہا کہ مجھے ان کے
 لیے میں ہار نکلی سے زیادہ قریف کا پہلو نظر آیا ”کتنا عرصہ بیک
 لگی؟“
 ”بہنی سال۔ جیتیم تھانے والوں کو روز چندہ پورا کر کے دیتا ہوا
 تھا ورنہ وہ مارے تھے۔“
 ”اور تو بیک انک کے چندہ پورا کرتا تھا؟“
 ”میں نے اقرار میں سہلایا ”مجھے بھی کچھ ملتا تھا۔ وہ سب
 میں جمع کرنا تھا۔ خرچ بھی کرتا تھا۔ رئیس کو سب بتا دیا۔ شادی۔
 شادی سوچ میں پڑ گیا ”اچھا۔ یہاں رہے گا تو مفت کی مددیاں
 نہیں ملیں گی۔“

”میں کام کروں گا شادی؟“
 ”کچھ جانتے ہو؟ کیا کام ہو تا ہے میرے پاس؟“
 میں نے کہا ”جانتے ہو شادی۔ آپ آنا لیں گے ٹھیک۔“
 ”اچھا۔ ابھی بیٹھ سناں“ شاہ جی نے کہا ”کرتے ہیں تیرا بھی
 بندوبست۔“

دے دیکھ رہا تھا۔
 وہ نسبتاً بوڑھے فقیر دو نوجوانوں کی گود میں سر رکھے ہوئے تھے
 اور ان سے سرواڑے تھے۔ باقی سب خوش گریبان کر رہے تھے اور
 مگر شیش پھونک رہے تھے۔ مجھے وہاں بارہ سے چودہ سال کی عمر کے
 چار بچے نظر آئے۔ ان میں پانچ عورتیں بھی تھیں۔ میں اپنے
 مردوں کے ساتھ ایسے بیٹھی تھیں کہ گنگا کا وہاں پہری تھیں۔
 ایک درمائی عورت کے ساتھ چودہ پندرہ سال کی لڑکی بھی
 اور وہاں بیٹی سب سے الگ ہونے کے باوجود سب کی کپڑوں
 نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ کچھ فقیر اب کھانا بھی کھا رہے تھے۔
 شاہی کو دیکھتے ہی وہ سب سیدھے ہو کے بیٹھ گئے اور ایک
 ساتھ شور کرنے لگے۔ ”استاد ہی! استاد! ایک۔“ اور پھر استاد
 اوشاف آجی بسم اللہ استاد صیہ۔“
 سرواڑے والا فقیر بھی بیٹھ گیا ”استاد کوئی نواں کھور بھیجی
 ہے۔“

کی دوسری ٹانگ توڑ کے لٹا دیں گا بوشائی مسجد کے باہر۔ ایک بچنے پرارہے گا دوسرا فیکہا مرے گا؟

دو کے بارے میں رپورٹ دینے والے نے کہا "آپ نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا استاد۔ مجتہدوں کے لیے مینے میں ایک دن وہ اپنے سرال جاتا ہے۔"

متحج پر جس کے بچے پہنے گئے ہوئے تھے، اسے دھارنا تھا جیسے وہ
مطلوع اور مغرب ہے۔ ایک چتر اس رزمی کو رتی سے کھینچا گیا
تھا۔ اس کے مڑے مڑے اعضا اس وقت بالکل ٹھیک تھے۔ اس
نے باہر آنے پر شادی کے سامنے جو صدمہ پیش کیا وہ میرے
انداز کے مطابق پہلے فقیر سے گھٹنا ٹکرا کر شادی کی تیاری چھ
گئی۔

جانے والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ کیا علاقہ خالی ہوتا جا رہا ہے۔
چھاپے نے کہا ۳۳ ستادی۔ انتہاء اللہ۔
استاد گرم ہو گیا ۳۳ سوئے دوز اشاء اللہ۔ اللہ کی نہیں اپنی
مرضی کی بات کہ تین سو سے اوپر کا دوز گارڈیڈ سو پر کیسے آگیا؟
کیا کرتے ہو آخر تم دونوں۔ ادھر آکرے جوڑی وار۔

دس یا دس سال کا وہ لڑکا سا ہوا آگے آیا جو اس فقیر کی ریڑھی
کو بچھتا تھا۔ استاد نے اس کی تلاش لی۔ اسے معلوم تھا کہ جیب
میں رقم کوئی نہیں رکھتا۔ غیہ جیب کہاں کہاں۔ ہو سکتی ہے۔
شوار کے دہرے پانچوں میں اور نیچے میں۔ قییس کے کار کے نیچے
یا قییس میں اندر کی طرف جہاں بھی نوٹ چھپائے جاسکتے تھے وہاں
استاد کے ہاتھوں نے نکل کر دیکھ لیا۔ پھر اس نے کوئی اشارہ کیا اور
بغیر کسی جھجک کے چھاپے اور اس لڑکے نے اپنے سارے کپڑے
انار والے اور اب وہ سب کے درمیان الف تھکے کھڑے تھے مگر
شرم سے زیادہ خوف کا شکار تھے۔ استاد کے حکم پر ایک جوان فقیر
نے ان کے کپڑوں کو ایسے دیکھا جیسے ان میں جراثیم تلاش کر رہا
ہو۔ پھر لڑکے کے سامنے کو کپڑے والیں کو بیٹھے۔ استاد نے
لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھول صدقہ کم کیوں ہے؟

لڑکا اپنے کا ۳۳ ستادی۔ استاد۔

شاہی نے اس کے ایک جھانڈا مارا۔ اس کے ہمارے بھرم
ہاتھ کی ضرب کتنی شدید تھی۔ اس کا اندازہ کر کے مجھے یوں لگا جیسے
شاہی بھی ایک قاتلے دار ہے۔ ایک قاتلے دار عظیم خانے میں
قاتلے قاتلے دار ہر پولیس اسٹیشن میں ہلا کو خان بنا بیٹھا قاتلے قاتلے
دار ان قیدیوں کے ذریعے پر بھی موجود تھا۔ شاید ہر دھندے میں
ایک قاتلے دار تھا۔ ہر گلی مکھ میں ہر ہستی میں ایک قاتلے دار
تھا۔ بد معاش بھی قاتلے دار تھے۔ شرف اور معزز کھلانے والے
چھوٹے بڑے سارے افسر، بے شعور عوام کے دونوں کی میزبانی
کے سارے اسٹیبل تک پہنچ کے وزارت سے عداوت تک کے
سب معدوں پر فائز ہونے والے بھی قاتلے دار تھے۔ سیاسی
جماعتوں اور مذہبی فرقوں میں قاتلے دار تھے اور یہ سارے قاتلے
دار اسی طرح زور زوریت سے اپنے اپنے دھندے چلا رہے تھے اور
اپنی ہر بات طاقت کے بل پر منوارے تھے۔ اور وہ سب جو کمزور
تھے یا لام تھے یا مستحق تھے اور بے بس تھے اقتدار کے جبر اور تشدد
کے عذاب سے گزرتے تھے مگر سمجھتے کہ یہی تقدیر ہے اور رب کی
رضا ہے اور یہ ہوتا ہے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ قاتلے دار کے
سامنے ہر حلیم ظلم رکھنا اور سزا خفا کے بات نہ کرنا ہی جمہوریت
ہے۔ ایمان کی نشانی ہے اور ایسا قانون کی کتابوں میں آئینوں میں
اور مذہبی صحیفوں میں لکھا ہے۔

لڑکا بہت کمزور تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا اور میں اس کے جسم
کی ساری ہڈیوں کو اور ہڈیوں کو دیکھ سکتا تھا جس پر صرف چڑی نظر
آتی تھی۔

چھاپا اچانک آگے بڑھا ۳۳ ستادی۔ اسے مت مارو۔ یہ بتاؤ
ہو گیا ہے۔ گاڑی زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔
استاد نے زین پر پڑے ہوئے کاپچے اور چٹاکے دھتے لڑکے
کو دیکھا اچانک باری ہے اسے؟
”ہاں نہیں استاد۔ دوز بخار ہو جاتا ہے اسے۔“
استاد نے لڑکے کا ہاتھ حاتم کے اسے اٹھایا ۳۳ اس کا جسم تو
لٹھڑا ہے؟

”اسے دن میں بخار ہو جاتا ہے شام کو اتر جاتا ہے۔“
استاد نے چھاپے کو گھور کر دیکھا ”دھندے کے ٹائم پر بخار
چڑھ جاتا ہے یہ کون سا بخار ہے؟“

چھاپے نے کہا ”ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا میں اسے۔“
اس نے کہا ایکس رے کراؤ۔ خون کا ٹیسٹ کراؤ۔ اسے لی بی لگتی
ہے۔“

استاد نے اس کا ہاتھ پھونڈا۔ ایک لمبے کے لیے وہاں عجیب
سی سوگوار اور آسیب زدہ خاموشی مسلط ہو گئی۔ لڑکا اب بھی دوبا
تھا مگر پانی سب کی خاموشی کچل گیا اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ
نزع کے عالم میں ہے اور صرٹے والا ہے۔ وہ سب ایسے خوف زدہ
نظر آتے تھے جیسے انہوں نے اس بچے کے لیے تقدیر کی طرف
سے دیا جانے والا فرمان اجل سن لیا ہے۔ جیسے اسے لی بی نہیں کھنہ
ہو گیا ہے جس میں موت چھپی ہے۔

استاد نے کہا ”بھل اٹھ۔ صبح میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس
چلا۔ میں پرانے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا تجھے۔“
لڑکے نے کپڑے ہٹ لے لیے اور سسکیاں لینے لگا ”سب بولتے
ہیں استاد۔ کہ میں مر جاؤں گا۔ خون کی لٹائیاں آئیں گی مجھے۔
سب مجھ سے دور رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتا مجھ سے“ کتنے ہیں
ان کو بھی لی بی لگ جائے گی۔“

استاد نے گرج کے کہا ”کیوں کرتے ہیں سارے۔ تو ٹھیک
ہو جائے گا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے دیکھ مجھے بھی لی بی ہو گئی
تھی۔“

لڑکے نے اسے حیرانی سے دیکھا ”آپ کو استاد؟“
”ہاں مجھے مگر آپ ہی دوائیاں آگئی ہیں۔ جو لی بی سے صرٹے
والا ہوا بھی بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے
ابھی۔ اگر کچھ ہو گا پھر مجھے فکر کی بات نہیں۔ کل سے آرام کر۔
کمالی اور جاننا۔“

ایک بار پھر فقیر صرٹے دینے لگے۔ یہ شاہی کی فطرت کا
روحانہ دھوپ تھا۔ ظالمانہ دھوپ تھی زور دینے والی۔ وہ فقیر
عورت جس کے ساتھ چودہ پندرہ سال کی لڑکی تھی صرٹے کی رقم
سامنے رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”آخر میری مرضی کیا ہے؟“ شاہی نے پھر بھی سے کہا۔
عورت نے شکایتی لہجے میں کہا ۳۳ ستادی۔ اس کا داغ خراب
ہو رہا ہے۔ میرے بھجانے سے نہیں ہاتی۔“

”کیا نہیں ہاتی؟ یہ دھندلا کرنا نہیں چاہتی۔ دوسرے دھندے
میں ڈال دوں اسے۔ دوز سو کا نوٹ لے گا اسے۔ بچے بننے کے
قابل ہو گئی ہے۔ نا۔ غری پرچائے کی ہماری۔“

عورت ہاتھ جوڑنے لگی ”نہیں استاد۔ اسے خراب کرنا
ہے اس عورتی بوجھ سبیل پر ڈال دینی پاپے لانا ہے بھیکری سے۔ اس کا
دل آگیا ہے میری بیٹی پر کتا ہے مجھ سے شادی کر لے۔“
”چھا۔ دل کا معاملہ ہے۔ کیوں بھی تو بھی چاہتی ہے اس
سے شادی کرنا“ شاہی کے ہونٹوں پر ایک سنی خیر مسکراہٹ
نمودار ہوئی۔

لڑکی نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔
عورت شور کرنے لگی ”بھی کیا مرے اس کی استاد۔ اسے
کیا پتا دینا گا۔ وہ حرای چار دن رکھے گا اپنے ساتھ اور پھٹ میں پچھ
چھوڑ کے ہماگ جائے گا۔ یا حوالے کر دے گا کسی اور کے۔“
”وہ ایسا نہیں ہے“ لڑکی نے ماں کو خون آشام نظروں سے
دیکھا۔

شاہی نے سر ہلایا ۳۳ چھاپی آپس میں مت لڑو۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔ ذرا ہم بھی دیکھ لیں اس بیرو کو۔ پھر شادی بھی کرا دیں
گے۔“

شاہی کے لیے کی زری پڑی شکاک تھی۔ وہ کم مراد نادان
لڑکی اس سخاوت کے پردے میں نہاں عداوت کو کیسے دیکھ سکتی
تھی۔ اس کی ماں نے اپنی ساری عمر اسی ”دشت کی تپائی“ میں
گزار دی تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ شاہی نے اس کی بیٹی کو اپنا
دھندلا چھوڑ کے کا دبا ہر مشق میں پڑنے کی سزا نہیں دی ہے تو پھر
سزا اسے ضرور ملے گی جو ڈال دینی پاپے پیچے پیچے ایک فیصلی سے
محبت کرنے لگا تھا۔

کیا ڈال دینی اور پاپے پیچے والا محبت کر سکتا ہے؟ ایک فقیر
زادی ہے؟ یہی ایڈورڈ پیسین تو بادشاہ تھا۔ بادشاہ کسی سے پوچھ
کے محبت نہیں کرتے لیکن برابر ابراہیم ابی مرضی سے محبت کرنے
لگے ”خواہ وہ اتنی ہی بھی ہو تو اس کا لاشنس بھی کسی قاتلے دار
سے ضرور لینا پڑے گا ورنہ یہ بغیر لاشنس توپ رکھنے سے زیادہ
تکلیف جرم ہو جائے گا۔“

یہ ہو سکتا ہے کہ کل جب وہ ڈال دینی پاپے پیچے والا رات بحر
خواب میں اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھنے کے بعد جو بلاشبہ اس کے لیے دنیا
کی سب سے حسین لڑکی کا چہرہ ہو گا اس کا قصور نگاہوں میں بسائے
مسکرا اٹھا ہوا سا نکیل پر ایسے سوار ہو کے نکلے جیسے سر پر سرا جھانے
برات کے ہمراہ کوئے باہن کی طرف جا رہا ہو۔ تو پیچھے سے آنے
والا کوئی ٹک اسے ٹکرا دے اور پکٹا ہوا قاتل ہو جائے کل
دن بحر اس کی لاش مردہ خانے کے چترے پر فرش پر خون اور گوشت
کے پلو دینے والے ڈمیر کی طرح پڑی رہے اور زندگی کی محبت کا
پتلا تجربہ کرنے والی امیریت اور امیدیں آنکھوں میں بسائے سارا

دن اس راستے کو بھٹک رہے جس پر وہ بڑی پھیلی آن بان اور بانگین
کے ساتھ نمودار ہوتا تھا۔ اس کے کان کسی آواز کو ترستے رہ
جائیں پاپے کرارے پاپے۔

میں اس وقت چڑھا جب میرے کانوں نے ایک جھنجھکی شاہ
کی کے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے بید کی پتل لیٹی پک دار چھری
آگئی تھی۔ فیصلوں کا ایک جوڑا جو آپس میں مایاں ہوئی تھے صرٹے
میں بے ایمانی کے جرم کا مرکب ہوا تھا۔ مروشاہی کے پاؤں پکڑ
رہا تھا لیکن شاہ کے ہاتھ عورت کے بدن پر بید برسا رہے تھے۔
شاہیں ”شاہیں“ عورت کا بدن پرا ناؤک ہو آتا ہے شاموں نے۔
کیا کچھ نہیں کہا ہے۔ کیسی کیسی تشبیہ دی ہے اس کے لیے سب
مرمرے تراشے ہوئے شفاف بدن۔ جسم جیسے کڑی کمان کا تیرہ کیا
گہدہ کی گہدہ کی گہدہ ہے۔ مگر یہ ایک بد صورت ہے حیثیت سوال
کرنے والی عورت تھی۔ ہر ضرب کے ساتھ اس کی جج بند ہوئی
تھی اور اس کا دھڑا دیکھنے سے تڑپ اٹھتا تھا۔ میلے ہنسنے پکڑوں
کے نیچے اس کے بدن پر بید کی ہر ضرب کے ساتھ ایک گرمی خونی
کھیر بن جاتی ہوگی۔ وہ نہیں کھاری تھی۔ خدا کی رسول کی اور
قرآن کی۔ نہیں دلا رہی تھی کہ اس نے کوئی عین نہیں کیا۔ صرٹے
میں سے رقم نہیں چھٹائی ”اس کا شوہر آنکھوں میں آنسو بھر کے
بار بار شاہی کے پاؤں پکڑ لیتا تھا مگر شاہی اسے ٹھوکر مار کے دور
کر دیتے تھے۔“

”مجھے سب معلوم ہے۔ خود بتا دے ورنہ صدقہ تو میں نکال
لوں گا۔ تیری جان پہلے نکال لوں گا۔“ ہر شے میں ان کی زبان
سے عورت کے لیے وہ الفاظ نکل رہے تھے جو میں نے صرف پولیس
کو بھروسوں کے لیے استعمال کرتے سنے تھے۔

بلاخرہ شاہی نے دوسرے جوڑے کی فقیر عورت کو حکم دیا۔
وہ اس عورت کو ایک طرف لے گئی۔ باقی سب فیصلوں کی نگاہیں
بھی ہال کے آخری گوشے کی طرف جم گئیں مگر میں اور مرد دیکھنے کی
محبت نہ کر سکا۔ لیڈی سر پہ کچھ دیر بعد نوٹوں کی ایک گڈی کے
ساتھ کا تھانہ انداز میں نمودار ہوئی۔ یہ تماشا دیکھنے والوں کے لبوں
پر اب بڑی فحش مسکراہٹ آگئی تھی۔ صرف ان ماں بیٹی کی نظریں
بھگی ہوئی تھیں۔ شاید ان کے لیے یہ نا تجربہ استانی شرمناک اور
ناقابل یقین ثابت ہوا تھا۔

”میرے ایک سو پچاس ہیں استاد۔ دس دس کے“ عورت
نے نوٹ جو بوسیدہ اور ایک دول کی صورت میں لپٹے ہوئے تھے۔
شاہی کے سامنے رکھ دیے۔

شاہی نے بپ سے اس کے شوہر کو بیٹھ کے رکھ دیا ”سوار کے
بچے۔ بڑی دلالت کر رہا تھا اس کی۔ دیکھ بھلے نوٹ یا نہیں۔
میری اطلاع غلط نہیں تھی۔ سب جانتا ہوں میں کہ کون مال کہاں
چھپاتا ہے۔ میں تو نکال لیتا سب کے سامنے۔“
مرد اب خاموشی سے پٹ رہا تھا اور مال برآمد کرنے والی

مجھے ان سے سخت کجمن آ رہی تھی۔ وہ دن میں جو طبلہ بٹاکے
 جو حنڈا کر رہے تھے، اب اس طبلے میں سوئے کی تپا رہی کر رہے تھے۔
 جو تپا رہا مفلوج اور زخمی نظر آئے کے لیے جسم پر لال پیلے رنگ کے
 فلوپے تو جو پتے تھے وہ انھیں صاف کرنے کے موڑ میں نہیں تھے۔
 سبکی لیکر اور فلاح سے مجھے ہوتے رو رو کر بچنے کی کڑے کرنے

اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ انہوں نے مجھ سے میرے بارے میں سوال کرنے شروع کر دیے۔ میں کون تھا کہاں سے آیا تھا؟ کیا کرتا تھا اور ان کے گرد میں کیسے شامل ہوا۔ میرا کھانا کہاں ہوگا۔ ان میں سے دو ہمارے کمرے والے تھے کم عمر کے سب سے زیادہ فٹ بال کا کھیل کرتے تھے اور شاید اس طرح ثابت کرتے تھے کہ وہ بچے نہیں بڑے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میرے جنسی تجربات کے بارے میں ایسے شرماکنے والی سوالات بھی کیے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور پھر میرے ملاحظوں کی طرح شرما کر بے ملاحظہ ہوتے رہے۔ دلیلی ہوا اور چھپ چرائی تھا اور باتیں

میرے خیالات کی وہ بار بار پلٹ جاتی تھی۔ کبھی مجھے شک
 صاحب کا خیال آئے لگتا تھا وہ جیتا ہوا جس میں کسی مرکزی کی طرح
 اس نے مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ کیا مجھے کسی اس کا
 جال کھڑو تھا یا میں بھل اور بے وقوف تھا۔ کیا یہ مغربو نظر
 آنے والی عورتیں میرے اتنی ہی کمزور ہوتی ہیں۔ ذرا سی حالات

بھارات کے سکوت میں ایک آواز گونجی جس نے مجھے ذرا سی دیر کے لیے بھر کھنکھایا۔

شاہو نے میری اس ایک لمبے کی کزوری سے قائمہ اٹھایا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے دھکیلا اور خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی وہ بھاگی اور اس دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی جس کے اوپر تین فٹ تک چھت کا کڑا تھا۔ وہ سرے کے شاہی کا ایک سایہ نیم روشن آسمان کے پس منظر میں نمودار ہوا۔ اس نے مجھے کسی پتھر کے مجسمے کی طرح زمین میں نصب دیکھا اور اوپر سے بولا "کون ہے اوئے؟" میں نے سر اٹھانے حلق سے مردہ آواز نکالی "شاہی۔ میں ہوں۔"

"تو کون؟" "میں نے کہا۔" "میں نے کہا۔" "شاہی کے گھوڑے کیا کر رہا ہے تو یہاں اس وقت؟" میں نے کہا "نہیں نہیں آری تھی شاہی۔ اس لیے باہر آیا تھا۔"

"نیز تو چائنی کے تختے پر بھی آ جاتی ہے۔ جاسو جاسو۔ اور دیکھ" خبردار مجھے پھر شاہی کا سبب استاد ہی کہتے ہیں۔" "آئندہ خیال رکھوں گا استاد ہی! میں نے کہا "جتنی جلدی تمہارا ہاتھ تھا۔ تھوڑی دیر حلق کے سوجاؤں گا۔"

وہ اور کچھ کے بغیر لوٹ گیا تو میری جان میں جان آئی۔ خوف سے میرا سارا وجود اندر سے بھی لرز رہا تھا اور میرے جسم پر اس خیال سے ٹھنڈا جھینسا برسا تھا کہ اس نے شاہو کو میرے ساتھ نہ دیکھ لیا ہو۔ اگر اس نے فرار ہونے والی شاہی کی ایک جھلک بھی دیکھ لی ہوئی یا اسے شک ہو جائے کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتا اور اس کے سوال کے جواب میں یہ کتنا شامت اعمال کو آواز دینے کے حرافہ ہو گا کہ استاد ہی! آپ کی نظر کو دھوکا ہوا ہو گا۔ فرق صرف ایک لمبے کا تھا کہ اس نے شاہو کو نہیں دیکھا اور صرف مجھے دیکھا۔

شاہو اب حلق پر دیوار پر اپنی سانسوں اور شاہی اپنے خوف اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاہی کے غائب ہوجانے کے بعد بھی میں کچھ دیر گیٹ اور برآمدے کے درمیان ٹھٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ شاہی کیسے سے چھپ کے مجھے دیکھ رہا ہو تو مطمئن ہوجائے کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور میرے ارادے بھی غلط نہیں ہیں۔

شاہو اپنے دونوں ہاتھ کر کے دیوار سے ٹک لگائے کھڑی تھی اور مجھے گھوڑی تھی۔ اندر میرے میں ہونے کے باوجود میں اس کی دھکی ہوئی آنکھوں کو اپنے قدموں کے ساتھ ساتھ ایسے حرکت کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا جیسے ہم کے کراہوں کی نقل و حرکت کے ساتھ کمرے کا لینز بھی رخ بدلا رہتا ہے۔ اس کی ٹانگیں کانٹوں کی طرح میرے جسم میں چھو رہی تھیں۔ بالآخر میں اس کے قریب گیا۔ اب میں اپنے وحشی اور بے

لگام اندر سے جذبات کی کوئٹہ اندیشی پر شرمندہ تھا "شاہی۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ مجھے جیب سے نکلنے سے روکتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ صرف غصہ نہیں اسے حیرانی بھی ہے اور شاہی خوشی بھی کہ کوئی اس کے حلق میں دیوار کی اس اختنا تک پہنچا، میرے جذبات کی شدت میں ایسی دیوار کھلی اور بالکل کھل کر میرے والی بلاخیزی ہے۔ وہ خفا بھی تھی "اس کی آنکھوں میں آنکھوں کی بھی جلی چمک رہی تھی اور اس کے لب مسکراتا جا رہے تھے۔

ایک کمری سانس لے کر اس نے کہا "نامر۔ کیا تو بالکل بالکل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا "کیا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے شاہو؟" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے پیروں کے نیچے بھی ہو گئی

کھاس پر بیٹھ گئی "دیوار کی گت اور محبت کی دیوار کی گتوں سے ڈر لگتا ہے مجھے۔" میں نے کہا "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟" "مجھے حلق اور ہوش کے ساتھ حالات کو دیکھنا چاہیے" نامر۔ "وہ مجھے سمجھانے لگی مگر اس کا انداز اتنا تھا کہ تھا "آخر جلدی کس بات کی ہے۔ جلدی میں سوچے کیجئے بغیر قدم اٹھانے سے جو نقصان ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہے مجھے؟ ہمارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ ایک مستقبل ہے اور مستقبل محبت کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی حفاظت ضروری ہے۔ اگر احتیاط اور کفایت شعاریت سے کام لیا ہم نے تو خوشیوں کا یہ خزانہ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دے سکتا ہے اور اسل تمہیں کی طرح لڑاؤ کا پھر بھی خیال پاتھ رہ جائیں گے۔ دل کا دامن خوشیوں سے خالی ہو جائے تو پھر اس میں دکھ آجائے ہیں جیسے خالی مکان میں آہیں ابرا ذال لیتے ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا "شاہو۔ تم ایسا کیوں سوچتی ہو آخر؟ ایسا بھی نہیں ہو گا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" "وجہ نظر آتی ہے مجھے" وہ بولی "میرے وجود میں جذبات کا آتش نکلاں دیکھ رہا ہے۔ جب لاوا نکل جائے تو آتش نکلاں بھی سرد ہو جاتا ہے اور پانی نہ جاتی ہے صرف جذبات کی راگ۔" "میرے جذبات بھی رہیں گے بیش۔"

"پیار کا شعلہ کسی اللہ کی طرح کچھ دیر بجڑے اور خاموش ہو جائے" ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آگ چاہے اتنی دھم دھم ہو جتنی دے کی لو کر اسے روشن رہنا چاہیے۔ جیسے آتش پرستوں کے عبادت خانے کی آگ جو بیخوش جلتی رہتی ہے مگر معبد کو نہیں جلاتی۔"

میں نے کہا "تم بڑی حقیقت اند اور کتابی باتیں کرتی ہو۔" "تمہارے ہی حقیقت کشی آتی ہے۔ ورنہ حلق ایک ایسا آگ بن جاتی ہے جس کو استعمال کرنا نہ آتا ہو۔"

"مگر یہ معاملہ حلق کا نہیں، حلق کا ہے۔ میں دماغ سے کیسے کام لوں جب کہ دل پر میرا اختیار ہی نہیں۔" میں نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑا "یعنی تو چاہتا ہے کہ جو تو مانگے وہ آج اور ابھی مل جائے۔ ورنہ تو ذہنی طاقت سے جھین لے گا؟ مہر کے ساتھ انتظار کرنا اور قربانی دینا تجھے منظور نہیں۔ مگر مجھے اعتبار چاہیے نامر کہ میں جس کی خاطر زندگی کو داؤ پر لگا رہی ہوں" وہ کتاب سے غصہ ہے۔ کسی توقع کے بغیر کب تک اور کہاں تک میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ کیا کر سکتا ہے میرے لیے؟"

"یہ تو وقت بتائے گا شاہو۔" "کون سا وقت؟" وہ حلق سے بولی "کتنی مہر ہوگی اس محبت کی۔ شاہی کب تک شاہی کے بعد پہلی رات کی صبح ہونے تک نہ اٹھی" مون تمام ہونے تک؟ ایک دو بچے پیدا ہونے تک؟ یہ بے شری کی باتیں ہیں۔ ساری زندگی کی ضمانت بھلا کون دے سکتا ہے۔ اس کے باوجود پھر لڑکی چاہتی ہے کہ اسے ان سوالوں کا جواب مل جائے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ محبت کوئی جذبات کی کلینرٹس سیل نہیں ہے کہ جذبات کا اسٹاک فٹم ہو تو دکان سونی ہو جائے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ یقین دلا سکتی ہو مجھے؟ محبت کیا دکان داری ہے؟"

وہ مسکراتی "ہاں، کچھ مردوں کے لیے ہے۔ ایک دکان نہ چل تو دوسری کھول لی۔ یہ بھی اپنی وہ بھی اپنی۔ شمسے چار کا جو از بھی لے آتے ہیں لائے والے چار بیویاں اور چار کائیں سب اپنی لکھتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "ایسا سمجھتی ہو تم مجھے تو غصت۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ "بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں تو ایسا نہیں۔ ورنہ میں تیرے ساتھ جانے کا نہ سوچتی۔ کوئی اور ایسا ہی دار پہلے ملا ہوا تو شاہو کب کی نکل گئی ہوئی بالکل!"

میں نے اس کا ہاتھ پٹا کے چم لیا "میں واقعی پاگل ہوں۔ تم نے کروا ہے مجھے پاگل۔ دیکھ لو میری حالت۔" "اور میں جو یہاں کھڑی ہوں اس وقت تیرے پاس۔ کیا میں بہت سیاتی ہوں؟" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا "میں دیکھتا جا رہی ہوں کہ سکھ پانے کے لیے دکھ اٹھانے کی کتنی طاقت ہے تجھ میں۔ ورنہ میں کبھی تجھ سے یہاں رہنے کو نہ کہتی۔ تو ایک رات میں گھبرا گیا۔"

میں نے غصت سے کہا "میں ثابت کر دوں گا کہ میں دشت اللہ کا وہ گھوڑا ہوں جو لوہے کے پنے چبا سکتا ہے۔ حلق کے کوکھو کا تیل۔"

وہ آہستہ سے ہنسی "شیرین شیر۔" "مگر میں شیر ہوں تو پیار کے سرسک کا۔ تمہارے اشدوں پر"

دوم ہلانے اور سلام کرنے والا۔ تم واقعی بڑی بہادر ہو۔ ایسے مطمئن بھی ہو جیسے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے شاہی کا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "شاہی دیکھ لیتے تھے تو بس۔ یہیں قطع تمام ہو جاتا۔"

"کس کا؟ میرا؟ تمہارا؟" "مللی جنوں کے قصے میں کیا لیلی کی کہانی الگ ہے جنوں سے؟"

میں نے کہا "۱۳ جہاں کہانی میں جنوں کون ہے لیلی کون؟" "۱۳ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جیسے جنوں ہو وہ جنوں اور جس کا جنوں ہو وہ لیلی! ۱۳ جہاں جا کے سوجا۔"

میں نے کہا "پہلے تم جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ شاہی کو پتا چل جائے۔"

"پتا تو انہیں چل گیا ہو گا۔" وہ گھاس کا ایک پتلا چپانے ہوئے بولی "آخر وہ میرے کمرے سے گزر کے آئے ہوں گے۔" میں نے گھبرا کر کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہارا خالی بستر دیکھ کے وہ پریشان نہیں ہوتے؟"

"بستر خالی کہاں ہے؟" وہ ہنس پڑی "میں نیچے اور کبل آؤں گے کہ ان پر چار ڈال آئی تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یعنی ان کے خیال میں تم وہیں سو رہی ہو۔"

"۱۳ سہ رات کو اکڑاٹھے ہیں۔ پتا نہیں کیوں انہیں غیہ نہیں آئی۔ بس ایسے ہی بھت پر ملتے رہتے ہیں۔"

"کوئی ذہنی پریشانی لاحق ہو گئی۔"

"دراصل جب سے ان کی بیوی غائب ہوئی ہے۔"

"تمہاری ماں؟" "نہیں۔ ان کی بیوی میری ماں نہیں تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں نہیں کہ وہ ان کی بیوی تھی" شاہو نے کہا "۱۳ کی ایک تصویر ہے شاہی کے پاس۔ ان کے کپڑوں کی الماری کے اندر لگی ہوئی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ الماری کھول کے کھڑے ہو جاتے تھے اور تصویر کو دیکھتے رہتے تھے۔ دو تین مرتبہ میں نے انہیں گھنڈی سانس لے کر یہ کہتے کہیں سنا کہ بد بخت کیوں چھوڑ گئی تھی مجھے آخر۔"

"تم نے کبھی پوچھا نہیں ان سے؟" "پوچھا تھا ایک بار۔ بہت برائی بات ہے۔ میں نے کہا کہ کیا یہ میری ماں ہے تو شاہی نے انکار کر دیا کہ نہیں۔ میری ماں ایسی نہیں تھی۔ مجھے نے کہا کہ پھر یہ کون ہے؟ کیا یہ مر گئی ہے؟ تو انہوں نے بے خیالی میں کہہ دیا کہ ایسا ہی سمجھ لے۔ پھر چاک ان کا موڈ بدل گیا اور انہوں نے مجھے مجزک دیا کہ کیوں کب کب کرتی ہے بلا وجہ۔ خبردار جو آئندہ کوئی سوال کیا مجھ سے۔ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"ایسی کیا بات تھی آخر؟ اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ

عاقب ہو گئی تھی؟

اس نے سوچتے ہوئے کہا "میت سے پرانے لوگ یہ جانتے ہیں۔ میں نے گھومتے پھرتے جو سنا اس سے پتا چلا کہ شاہی پہلے کسی کو چاہتے تھے شادی کرنی پڑی میری ماں سے۔ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ وہ مجھے ایک سال کا چھوڑے مر گئی۔ اس کے بعد شاہی آزاد ہو گئے۔ اس سے شادی کرنے کے لیے جس کو وہ چاہتے تھے۔

"وہ کنواری بیٹی تھی اسی انتظار میں۔"

"نہیں۔ اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن میری ماں کی موت کے کچھ عرصے بعد اس کا شوہر مر گیا۔ تقدیر نے دونوں کا راستہ صاف کر دیا۔" شاہی کے لیے جس کی آگئی اور اس کا چھوٹا بھائی کے جذبات کا آئینہ بن گیا۔

"تمہارے خیال میں۔۔۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا یا تقدیر کا کمال تھا؟"

اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں "میرے خیال میں؟" وہ سچاٹے ہوئے تھیں۔

"شاید تمہیں اس کا یقین ہے" میں نے کہا۔

"میں نے ایسا نہیں کہا پھر تم یہ کیوں کہتے ہو؟"

"شاہی۔۔۔ ہر بات زبان سے نہیں کی جاتی۔ تمہارا لہجہ اور تمہارے جذبات اس یقین کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم اپنے باپ کو شاہی کہتی ہو۔ جیسے اور سب کہتے ہیں۔"

وہ غلامی دیکھنے لگی "سوچنے کی بات ہے یا مکر کہ جس عورت کو اس نے اپنی شکل سے حاصل کیا تھا اور جو اس سے اپنی محبت کرتی تھی وہ شاہی کو کیوں چھوڑ گئی آخر؟"

"ہاں۔ یہ مجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔"

"میں نے سنا ہے شاہی کو کسی اور سے محبت ہو گئی تھی بعد میں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

میں نے کسی غلطی کی طرح اس سوال پر غور کیا "میرا خیال ہے کہ۔۔۔ دیکھا یا نہیں کچھ بھی نہیں۔"

"یعنی دوسری بار بھی محبت ہو سکتی ہے کسی سے۔"

"ابھی مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں شاہی۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ وقت اور تقدیر کا کیا بھروسہ۔ ہر چیز بدل جاتی ہے۔"

"توئی کے جذبات بھی؟" وہ دنگی کے لیے سنبھلی۔

"توئی کی عقل پر پتہ چڑ جاتے ہیں جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بس دل آنے کی بات ہے۔"

اپنے میری بات سے سخت رنج ہوا تھا "یعنی۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کل تو کسی اور کی محبت میں اتنی پاگل ہو جائے جتنا آج میرے لیے ہے؟"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا تھا۔ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا؟ فرض کرو کوئی تمہیں مجھ سے بڑا درد ہے اچھا لگتا ہے۔"

"بڑا درد ہے کیا لاکھ درد ہے اچھا ہو گئی مجھے کیا اگر میں نے تجھے پسند کر لیا۔ محبت کوئی ٹی دی پروگرام ہے کہ جہاں اچھا نظر آیا جیتل بدل دیا۔"

اسے منانے کے لیے میں نے کہا "میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تو کہہ رہا ہے کہ محبت کسی اور سے بھی ہو سکتی ہے۔ وقت کے ساتھ جذبات بدل سکتے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا شادی اور نہ میں اپنی بات کر رہا تھا۔"

اس نے بے رخی سے اپنا ہاتھ چھڑا "مگر تو اسے ناممکن نہیں سمجھتا؟" تو جانتا ہے اپنے لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے وفا کوئی چیز نہیں۔ جو ساری زندگی کسی ایک محبت کے نام نہیں کر سکتے۔ پتا نہیں میں ایسا کیوں نہیں سوچ سکتی۔"

"شاہی۔۔۔ مجھ سے ناراض مت ہو۔"

اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی "کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔ کاش یہ ممکن ہو آ کہ میں تجھ سے محبت نہ کرتی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو فائدہ اٹھا سکتا ہے میری مجبوری سے۔"

وہ ایک دم چلی اور اندر میرے میں غائب ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے آنسو چھانے کے لیے شاہی نے ایسا کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچے کے اور بستر پر گر کے وہ نہ جانے کتنا دے گی۔ اس خیال نے میرے دل کو دکھ سے بھر دیا۔ اس کا دل انتہائی نازک تھا اس اور زخم خوردہ تھا۔

تاریک ہال میں اپنے لیے کچلے کچلے پردہ دار بستر پر لیٹ کے میرا احساس پشیمانی رزق رزق سے مجھے بدل گیا۔ آخر کیا ضرورت ہے اس حد تک خواب پرست ہو کے جینے کی؟ یہ بے وقوف جذباتی لڑکیوں زندگی کے حقائق اور امکانات میں صرف خوبصورتی کیوں دیکھتا چاہتی ہیں۔ بسلا قدم بھولوں پر ہو تو یہ کیوں سمجھ لیتی ہیں کہ راہ میں کہیں کا پتھر نہیں ہوں گے۔ یہ ضمانت کون دے سکتا ہے کہ ان کے خیالوں کی جنت زندگی کے ٹھکرات "دکھ درد" ناگامی اور ناامیدی، صدمات اور مصائب سے محفوظ اور مامون ہوگی۔ ان کے تصورات کی دنیا ویسی حسین رہے گی جیسی انہوں نے دماغی تاروں اور فطرتوں کے دل پر بند ٹھکے جو جوڑے کے بند کھچے ہیں۔

شاید مجھے اپنی حقیقت پسندانہ بے رحمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ عورت لطیفہ الم پسند اور قوت ملی ہے۔ خواتین خدا کی جنت میں بھی خوش نہ رہنے کے لیے احساس محرومی کا سبب تلاش کر لیا تو خواہ کی جی کو اس دنیا میں خوش اور مطمئن رکھنا انسان کے بس کی بات کمال۔ اگر وہ بے تعبیر خوابوں کے جھوٹ سے بھل جاتی ہے تو اسے ہاتھ دے رہو کہ چاند بھی سورج سے نہیں تمہارے چہرے سے تابانی مستعار لیتا ہے۔ مقابلہ حسن کے بھجوں کی نظر اور عقل خراب نہ ہوئی اور مس نیو برس رشوت اور سفارش سے کام نہ

لیتی تو حسن کا تاج تمہارے سر پر سجایا جاتا۔ تم ساجین نہ تھا۔ نہ ہے اور نہ ہوگا اور جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں اتنی نہ کسی نے کی نہ کر سکتا ہے۔ جتنی مجھے آج ہے، کل اس سے زیادہ ہوگی اور ہرگز نہ والے دن کے ساتھ دن دوئی رات چوٹی ہوگی۔ میں ساری عمر تمہارے حسن و خلق کی تعظیم و خزانے کے سوا کچھ کون تو اٹھ مجھے سمجھا کر۔ لہذا دوڑ دوڑا ہائی دوڑ کی کوئی کارفرما حسین کیسے ہی ہو شریاء اندام میں جلوہ گر ہو میں اس کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھوں تو اندام ہو جائیں۔ کسی اور سے دل لگاؤں تو میرا ہارت نکل ہو جائے۔ رہی آسمان سے آئے تو ذکر لانے کی بات تو یہ کیا مشکل ہے، تم ابھی غصے کوشت پکا کے فارغ بھی نہیں ہو گئی کہ میں امر کی غلطی نظر کو لپیٹا ہے ہوں کیا اور یوں آیا۔

اس رات اپنی پوری کوشش کے باوجود میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔ اپنے خیالوں سے زیادہ مجھے پھر دکھانے رہے اور نظر نہ آنے والے کھل پاپو کاٹنے رہے۔ غلط بستر پر پودش پانے والے سارے جراثیم میرے جسم پر پھیلار کرتے رہے اور سانس کے ساتھ میرے خون میں شامل ہوتے رہے۔ مجھے وہ گھبراہٹ آتا رہا جہاں مجھے ایک الگ الگ کونڈیشن ریسانہ خواب گاہ میسر تھی۔ جس کے نرم دینے قالین پر چل کے میں کمر کی تک جاتا اور ریختی پردے ہٹاتا تو باغ کا ایک دھلس دھلس مٹا ہوا آتا تھا۔ یہاں نظر کے سامنے گندے، مکرہ صورت اور بد کردار قیدیوں کے سوا کچھ نہ تھا جو سوتے میں بھی مسلسل کھجا رہے تھے خزانے لے رہے تھے اور بد معاشی کر رہے تھے۔

اب میں شاہی کے قریب تھا تو مجھے بیکم صاحبہ کا خیال آ رہا تھا۔ اس کا رنگ ضرور ساٹوا تھا مگر صورت کے نعوش اور شباب کی دلکشی میں وہ کسی سے کم نہ تھی۔ پھر اس کا لباس جو نظر کو دعوت دے رہا تھا اور عقلی برصا تھا۔ وہ خوشبو جو اس کے قریب ایک حنا طبعی کشش کا دائرہ رکھتی تھی۔ کولون، میزا پرے اور ناگہم پاؤں کی ملی خوشبو۔ اور اس کا وہ ملتنت کرنے کا انداز۔ آج کی شب گھسٹے آرزو کا سارا درد سینے وہ بھی دردناک کھلا چھوڑ کے سو گئی ہوگی۔ آج رات ڈاکٹر صاحب بھی گھر نہیں تھے اچھا ہوا ہم سب اپنی اپنی انداختوں کے عذاب سے بچ گئے۔

اس عذاب ناک رات کے بعد ایک درپے آزار صبح طلوع ہوئی۔ شاید شیم خانے میں ہر چہرہ اس سے زیادہ ہی بے وقوف ہو گئی مگر وہ وقت گزشتہ والی بات تھی۔ میں جس زندگی کا خوگر ہو گیا تھا وہ بیدلی سے شروع ہوئی تھی۔ میں مگر ناکل والے ہاتھ دم میں شاہی کے بعد ناشتے کی میز اسی شان کے ساتھ بیٹھا تھا جیسے میں بھی اس گھر اور خاندان کا حصہ ہوں اور خادم میرے سامنے سب کچھ رکھ دیتے تھے۔ ڈبل روٹی، "کھن" "اڑے" "خیر"، فروٹ جون "چائے اور کافی۔

یہاں میں قابلِ غرت فقیرانہ طے میں اکیلا اور لادارٹ بیٹھا۔

اگرچہ رہا تھا اور سب کی تعجب کی آنکھوں کا نشانہ بن رہا تھا۔ بے خوابی سے لال آنکھوں، ٹکڑے پائیں اور آج بڑا سورت کے ساتھ میں خود اپنی نظریں میں دم کے قابل ہو گیا تھا۔ میرا پیٹ خالی تھا، میری جیب خالی تھی اور میرا دماغ خالی تھا کیونکہ میری عقل گھاس چرے چلی گئی تھی۔ کچھ باقی تھا تو دل میں شاہی کا نامراد عشق جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا تھا۔

فقیر باری باری آنکھائیں لے کر اٹھ رہے تھے اور اپنے منوس طے کو زیادہ کرانیت انگیزانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہ کسی نے منہ دیا اور نہ ناشتہ کیا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے دھندے کے لیے روانہ ہوئے کی تپاری کر رہے تھے۔ باہر جا کے وہ ضرور کچھ کھا لیا لینے ہوں گے۔ مانگ کے نہ لا تو خریدے۔ جو ملا جہاں ملا کھا لیا۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ جس میں کوئی قلم و دھنیا، تصدیق یا احساس نہیں تھا۔ ناشتہ کھانا اور سونا۔ اپنی مرضی سے وہ بھی نین کام کرتے تھے۔ پولیس پکڑے تو اس کی مرضی۔ شاہی چڑی اور میٹر دیں تو ان کی مرضی۔ بیماری حملہ کرے، حادثہ ہو جائے، موت آجائے، یہ اللہ کی مرضی۔

فقیروں نے مجھ سے پہلے بھی نئے آنے والوں کو ایسے ہی پریشان حال دکھا ہوگا۔ انہیں معلوم ہو گا کہ یہ دو چار دن کی بات ہے۔ پھر میں اپنی کے رنگ میں اپنی جیسا ہو جائوں گا اور میرے لیے اس معمول میں کوئی کمی جراثی یا پریشانی کی بات نہیں رہے گی۔ وہ مجھ سے خوش کھا کی کرتے رہے اور بہت کچھ پوچھتے رہے مگر میں نے چپ سا دھلی لی تھی۔ صرف ایک بار داڑھی والے خشکے پر معاش نے تھوڑے سے چار ماہ عوام کے ساتھ پیش قدمی کی تھی اور کہا تھا "میں بے سارے کم نہیں ہیں جو بھوک رہے ہیں؟ کوٹا ہو گیا ہے۔ کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی۔" تو میں نے اسے خبردار کیا تھا کہ "بد معاشی کرے گا تو شاہی کو تباہوں گا اور ہا کے" اور وہ وہیں رک کے مجھے حیرانی سے دیکھنے لگا تھا۔ باقی سب اوپر جانے والی بات پر ایسے چنے لگے تھے جیسے میں نے کہا ہے کہ میں ابھی جا کے وزیر اقصیٰ سے ملتا ہوں یا صدر مملکت کو بتاتا ہوں۔

شاید ان میں سے کسی کو اوپر جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کے لیے (نہوذا) عرشِ معلیٰ پر خدا کے سامنے حاضر ہونے سے کم نہ تھا۔ میں انہیں کیا بتا تاکہ میں کون ہوں اسے ہم خسرو سوزنہ جہاں ہوں۔ اور ان کے درمیان اس لیے نہیں ہوں کہ معاشی ضرورت نے مجھے دست سوال دراز کرنے پر مجبور کر دیا ہے بلکہ اس بت ملاز کا خانہ خراب عشق مجھے یہاں بھیج لایا ہے جس کا نام لیتا بھی ان کے لیے جرم ہے محرومی نام میرے دل کی ہر دھڑکن میں صاف سنائی دیتا ہے۔

جب وہ رخصت ہو گئے تو میں نے ایک غسل خانہ تلاش کیا اور ایک ق کے پاس بیٹھ کے اچانک منہ دھوا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دانت برش نہیں کیے تھے۔ میرے پاس تو کیا نہیں تھا

اور بال سنوارنے کے لیے سٹمپی نہیں تھی۔ اپنے کپڑوں سے پانی خشک کرنا غلطی کو نہ پرچنے کے حرافہ تھا۔ میں ایسے ہی باہر آیا اور سوچنے لگا کہ کیا کہوں؟ بھوک سے میرا ہڑا حال تھا اور میری جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ باہر جا کے ناشتا کروں۔ شاہ جی تو مجھے بھول ہی گیا تھا۔ شاید وہ ابھی سوہا تھا یا پھر شادو اسے پرائے پکے دے رہی تھی اور وہ دی پائے کے ساتھ اپنے پیٹ کے دونوں کو بھر رہا تھا۔ پر انھوں کی خوشبو نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔

مجھے شادو پر سخت ملیش آیا۔ انوکھی چٹھی، کیا اسے معلوم نہیں کہ میں اس کی وجہ سے اس فقیر خانے میں خوار ہو رہا ہوں۔ اسے تو میری خبر بھی چاہیے۔ کیا میں سارا دن یہاں بھوکا یا ساجھا رہوں گا۔ خود تو کھالی کے فارغ یعنی ہوگی یا نکل گئی ہوگی، ہمیں بدل کے تھانے واری کرنے میں نکل گیا تو شاہ جی کہیں گے کہ میری اجازت کے بغیر کہاں دفع ہو گیا تھا۔ ان کی اجازت کے بغیر میں مشکل اٹھا کے کہیں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ گداگری کا لاشنس بھی وہ جاری کریں گے جیسے بس کا موٹ پر مٹ جاری ہوتا ہے۔ بس کی طرح فقیر کہاں جاسکتا ہے اور کہاں نہیں جاسکتا۔

اچانک مجھے ریش نظر آیا۔ وہ دو داڑے سے اندر آ کے رک گیا تھا اور مجھے بڑی کہنی ٹھکوں سے دیکھ رہا تھا۔ ختم خانے سے نکلنے کے بعد اس نے مجھے جب دیکھا تھا پہلے سے ہنر اور قابل رشک حالت میں دیکھا تھا مگر آج میں اس طرح سے بھی مت نیچے مگر کیا تھا میں نہیں تھا۔ میرا سارا خضر شرمندگی میں ڈھل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ اے ناصر۔ تو واقعی مجھوں ہو گیا ہے سالے قسم اللہ کی جگہ یقین نہیں آتا۔

میں نے کہا "یقین مجھے بھی نہیں آتا۔ مگر یاد رکھ لے، کسی زلت اٹھانا ہے توئی عشق میں۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہ ایک ٹھنڈی سانس لی "بڑے نصیب سے ملتی ہے یہ ذلت بھی بیا رہے۔"

میں نے کہا "نہیں یا۔ یہ سب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے میرے لیے۔ میں تو رات ہی بھاگ جاتا اسے ساتھ لے کے مگر وہ خود ڈر گئی۔"

"کیا؟ رات کو بھاگ جاتا؟"

"ہاں۔ وہ آئی تھی میرا حال پوچھنے یہاں بلکہ حال دیکھنے۔ بلا کے باہر لے گئی۔ میں پڑا ہوا تھا یہاں اسی طے میں۔ نیند خاک آئی۔ غصہ آتا تھا اتنا کہ میں اسے دیکھنے ہی پاگل ہو گیا۔ اٹھا کے لے جا رہا تھا اسے مگر دیکھ لیا شادی نے۔"

"بھوت ایسا بول جو مجھ میں آئے۔ شادی نے دیکھ لیا ہوتا تو اس وقت تو اپنے پیوں پر کھڑا ہوتا؟"

میں نے ہنسے میں کہا "بھوت بولنے والے پر خدا کی ہزار بار لعنت۔ شادی کی آواز پر وہ بھاگ کے چسپ گئی۔ شادی نے بس

مجھے دیکھا۔ میں نے کہہ دیا کہ نیند نہیں آ رہی ہے۔ وہ تو رات دو بجے کے بعد گئی ہو گی۔ ہم اندھیرے میں چھپ کر بیٹھے رہے۔"

اس نے مجھے حسد اور رشک کے ساتھ دیکھا "اور کیا کرتے رہے؟"

"کچھ نہیں، بس باتیں۔ کتنی ہے یہ آزانائش ہے محبت کی۔ جب یقین آجائے گا کہ تو محبت میں دکھ اور ذلت بھی اٹھا سکتا ہے میرے لیے تو میں چلوں گی تیرے ساتھ۔ کیا کہوں یا؟ عجیب معیت میں بھٹس گیا ہوں۔ نہ یہاں سے بھاگ کے کہیں جاسکتا ہوں نہ یہاں رہنا آسان ہے۔ کیسے گزری ہے یہ رات، مجھے کیا بتاؤں؟"

ریش ہنسا "ڈاکٹری کی یاد آئی کہ نہیں؟"

"یاد کیسے نہ آئی۔ بڑی ابھی زندگی گزر رہی تھی بیش کے ساتھ۔ خیر، ناصر بھی بتا دے گا کہ وہ ایسی مشکوں سے گھبرا کے بھاگنے والا نہیں ہے۔ جاؤں گا تو اسے ساتھ لے کر جاؤں گا جہاں بھی گیا۔ آنا لے دو جب تک چاہے۔ ایک مہینہ یا ایک سال بعد۔ جس دن میں مجھے موقع ملا تو اسے اپنے کال کر لے جاؤں گا کہ سالے شادی کے فرشتے جی مت دیکھنے نہ جا سکیں گے۔"

شادی دو داڑے میں نمودار ہو تو عوامی نمادے کے مطابق میری بولتی بند ہو گئی۔ ریش نے میری صورت کے تاثرات بدلنے دیکھے تو تیزی سے چلنا اور پھر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی بدحواسی بالکل جائز تھی۔ میں خاصی رنگ میں بڑی ادنی آواز میں بات کر رہا تھا۔ شادی کو دیکھنے میں ہی اپنا سارا غصہ اور ساری شچی بھول گیا۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے آیا۔

"ٹھیک نہیں اب تک؟" اس نے ریش سے سوال کیا۔

"جی۔ جا رہا ہوں استاد جی! ریش نے ڈرتے ڈرتے کہا "یہ سو رہا تھا۔"

شادی کی آواز میں بڑی گھن گرج تھی "ہاں۔ رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی یہاں شادو نے کہ۔ ریش کہتا ہے تو دوسروں کا امتحان دے گا۔"

میں نے سر ہلا دیا "ہاں شادی!"

شادی کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کا تھپڑ میرے گال پر تیز... آواز کے ساتھ لگا۔ میں لڑکھڑاکے سنبھلا۔ چوتھے اور احساس ذلت سے میرا چوکرم ہو گیا۔ میرا منہ بھی بیوقوفانہ پرکھا ہو گا۔

"کیا کرے گا دوسو پاس کر کے۔ بڑھ لکھ کے باؤنٹا تھا تو یہاں کیوں آیا تھا؟" اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

میں نے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں پڑھوں گا آگے شاہ جی۔"

اس کا دوسرا ہاتھ کلکی کی طرح میرے دائیں گال پر زیادہ قوت سے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے "میرا قصور کیا ہے شاہ

جی!"

اس نے میرے پیٹ پر ہلات اڑی۔ میں پیچھے جا کے دوا رہے لکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اتنی بار کھانے کے بعد مجھے دن میں تارے نظر آ گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی منہ کی پاگل کر دینے والی لہر مجھے مطلوب کرنے کے لیے اٹھ رہی تھی۔

اچانک ریش نے میرے کان میں کہا "سالے شاہ جی نہیں استاد جی کہ۔" اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھڑا کر دیا۔

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ شاہ جی نے رات ہی یہ بات مجھے سمجھا دی تھی مگر میں بھول گیا تھا۔

"کتنی کہاں ہیں تیری؟" شاہ جی نے لہجہ بدلے بغیر کہا۔

"وہیں رہ گئیں استاد جی۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا "جہاں میں پہلے رہتا تھا۔"

"اچھا اب جائے تو لے آنا۔" شاہ جی نے کہا "امتحان کب ہے؟"

میں نے کہا "ایک مہینہ ہے استاد جی!"

"کچھ پڑھا ہے یا نہیں؟ تیاری کی ہے یا نقل کر کے پاس ہو گا؟"

اس کی دلچسپی نے مجھ سے زیادہ ریش کو حیران کیا "پڑھے بغیر امتحان پاس کرنے کا کیا فائدہ استاد جی۔" آوی جا رہی اچھا۔"

اس نے تائید کے انداز میں سر ہلایا "جب تک تیرا امتحان نہیں ختم ہوتا تیری آدمی چمٹی۔ تو حوا دن ذرا دھندے کو دیکھ ریش کے ساتھ۔ آدھا دن پڑھائی کے لیے۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کیا کرے گا؟"

میں نے کہا "جو آپ کو ملے استاد جی!"

"ہوں!" اس نے سوچتے ہوئے کہا "اچھا ابھی تو جا۔ کچھ کھایا یا ہے کہ نہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "کا سوچا اور پھر اقرار کر لیا" ہاں استاد جی۔ تین زوردار تھپنے اور گالیاں۔"

یہ بڑی گستاخی کی بات تھی۔ ریش کا منہ پہلے ہی حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ شادی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کے وہ بھونچکا رہ گیا۔ میری طرح اسے بھی یقین ہو گا کہ اس جواب کے بعد میرا باقی ناشتا بھی شاندار ہو گا۔

"کسی نے پچھا ہی نہیں تھو سے؟ یا تو خود نواب زادہ بنا ہوا تھا۔ کھانا تو بہت ہو گا رات کا پچھا ہوا۔ سب لاتے ہیں۔ خیر تو ریش کے ساتھ جا۔ اسے جو بڑا لے چوک پر چھوڑ دے۔ لیکن تھانے میں رہے ابھی" اس نے یہ آخری بات ریش سے مخاطب ہو کے کی تھی۔ اس کے بعد وہ ہماری قدم اٹھا لٹوٹ گیا۔

ریش اسے دیکھتا رہا۔ "بی بی مجھ میں نہیں آئی یہ بات پیارے۔ استاد کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنی مروتا کیوں آخر؟"

میں نے بڑکے کہا "اسے مروتا کتنا ہے تو؟ آتے ہی مارا کرے

میرا حال کر دیا۔ ابھی تک پکڑا رہے ہیں۔"

ریش نے میرا ہاتھ پکڑا "اے بھول جا سب۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے یہاں سب کے ساتھ۔"

"نہیں ریش۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کروں گا۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"پھر کیا کرے گا؟ چھوڑ کے چلا جائے گا واپس اپنی ڈاکٹری کے پاس۔ غلطی تیری تھی۔ شاہ جی کیا یا رہے تیرا؟ سب استاد جی کہتے ہیں تو پھر مجھ پر کیا تکلیف ہے؟"

میں نے کہا "یہ بات سمجھائی بھی جاسکتی ہے۔"

وہ ہنسا "سمجھادی اس نے ابھی طرح۔ اب نہیں بھولے گا تو۔ اس عزت ذلت کے پکڑ میں مت پڑ۔ یہ سب آتی جانی چیز ہے۔ اور تو یہاں عزت کمانے آیا ہے کیا؟"

باہر آ کے دنیا مجھے بڑی عجیب لگی۔ صاف سحرے لوگ اپنی زندگی کے معمولات کا آغاز کر چکے تھے۔ نہادھو کے اور کپڑے بدل کے آٹمی یا دکان اور کارخانوں کا رخ کرنے والے مزدور، کلرک اور کارکن۔ اسکول بونیاں میں بیٹے نکالے بیٹے کھیلنے بیٹے کالج کے بائکے پیچھے لڑکے اور اعلیٰ اعلیٰ لڑکیاں۔ آغاز شباب کے اولیں تجربات کی سستی فیزی سے لطف اندوز ہوتے نوجوان۔ سب خوش تھے اور مطمئن تھے کیونکہ ان سب کا ایک گھر تھا اور انہیں پیارے بھروسے رشتوں کے سارے میرے تھے کسی نے انہیں مار کے مگر سے نہیں نکالا تھا۔ وہ سوکھی روٹی کھا کے بھی نکلے تھے تو انہیں کسی مان نے وعادے کے رخصت کیا تھا۔ چار برب را کھا۔ کسی باپ کی خاموش نگاہوں نے کہا تھا جاؤ بیٹا خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔ کسی شریک حیات نے آنچل سنبھال کے اور نظریں جھکا کے کہا تھا اچھا جی خیر سے جاؤ خیر سے آؤ مگر دیر مت کرنا۔ اور اسکول دین میں دوڑ کے سوار ہونے والے بچوں نے ہاتھ ملا دیا تھا۔ بائی کی پانی پیا۔ اور کوئی گھر منداں چلائی تھی "کو کھو تم نے پھر انڈیا چھوڑ دیا۔ دووہ کا گلاس تو ختم کر دو۔"

سب لوگ کام کرنے جا رہے تھے۔ رزق کمانے یا علم حاصل کرنے یا کچھ سیکھنے۔ ان میں کوئی فقیر نہیں تھا۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنا ان کے نزدیک شرمناک بات تھی۔ وہ بیک مانگتے پڑھو کے رہنے کو ترجیح دینے والے لوگ تھے۔ ان کے نزدیک میرے پیسے بے گتے محنت مند آدمی کا خیرات مانگنا بے غیرتی تھی۔ کل کی میں بھی انہی جیسا تھا اور انہی کی طرح سوچتا تھا مگر آج مگر اگر دلوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ کسی ضرورت کے بغیر مجھے لوگوں سے اللہ کے نام پر کچھ مانگنا تھا اور بھردن بھر عمارت، فقرت اور ترس کے ساتھ ملنے والے سکوں اور نوٹوں کو مدد نہ لکھنے کے لیے شادی کے سامنے پیش کرنا تھا۔ میرے چیک اکاؤنٹ میں ہونے دو لاکھ دو سو تھے مگر ایک لاکھ کے قسط نے مجھے سڑک پر لا کھڑا کیا تھا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ۔ ان سے چار آئے۔ آٹھ

نئی سے بالا پڑا تھا۔ ہم نے شادو تجھے دی۔ اس کی محبت بھی دی۔ ہم یار ہیں تیرے رقیب نہیں ہو سکتے تم دونوں ایک دوسرے کے لائق ہو۔ رب نے ملا ہے ہمیں۔ رب کی رضا محبوب کی رضا۔ یار کی رضا۔ ان کے سامنے اپنی رضا کیا۔ پھر کبھی چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر دیکھ یار! بڑی قیمتی چیز دی ہے میں نے تجھے اسے سنبھال کے رکھنا۔ ایسا نہ ہو تو اسے کھودے۔ ضائع کر دے یا کسی اور کو دے دے۔

”تو پاگل ہوا ہے۔“
وہ بولا رہا ”کل جب تیری گھروالی نے بی بی کا تو اپنی بھالی ہوگی۔ اپنی ہوجائیں گے جیسے تھی۔“

میں نے کہا ”رہیں۔ تو ہمارے ساتھ چل۔“
”تمہارے ساتھ“ نہیں تا صراہن اسی دنیا میں خوش ہیں۔ تم دونوں یہاں خوش نہیں ہو۔ تم جاؤ اپنی خوشی کی تلاش میں۔ اللہ کرے ہمیں اپنی دنیا میں خوشی ہی خوشی ملے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے وہ رو پڑے گا۔ یہ بڑی مسکھ خیز بات تھی! ابھی میں نے شادو کے ساتھ جانے کا اور شادو نے میرا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ شادی اور بچوں تک پہنچ گیا تھا جیسے سب ملے۔ وہ واقعی اپنے جذبات کی اور اپنی حسروں کی قربانی دے رہا تھا۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ میں اس کا ذرا بھی اڑا سکتا تھا کہ سالے رہیں غیبت۔ ذرا صورت دیکھ آئیے میں۔ شادو کی محبت میں تو پتا نہیں تیرے جیسے کتنے دیوائے ہیں۔ اس کی محبت صرف مجھے حاصل ہے۔ تو مجھے کیا دے گا کتنے فقیر۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ بچ بول رہا ہے۔ اس کا عشق بھی سچا تھا اور اس کی دوستی بھی سچی۔

موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا ”چل اب اٹھ کہیں چل کے چائے پیئیں۔“

وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ ”یہ مت بھولنا بیٹے کہ شادی کو پتا چل گیا تو تم دونوں کی لاش بھی نہیں ملے گی اور جلدی مت کرنا۔“ میں نے کہا ”تو کھرت کر۔ میں پکا بندوبست کروں گا پیلے۔“ جو بڑا دلچسپ کہنے کے پاس ہم پھر بیٹھ گئے۔ وہیں ایک شخص ریز می پر جانے بنا رہا تھا۔

رہیں نے کہا ”یہ ہے تیری جگہ پار۔“
میں نے کہا ”تیری جگہ کون سی ہے؟“

وہ بولا ”ہم انجیلز ہیں۔ گھوم پھر کے دوسرے کام کرتے ہیں جو استاد نے مجھے سونپ رکھے ہیں۔ مجھ سے کا ڈی مجھ کے میں دیکھتا ہوں کون اپنی جگہ ہے اور کون نہیں ہے۔ قتلوں میں خزانے پھانتا ہوں۔ کوئی پکڑیں آجائے تو اسے چھڑا ہوں۔ آج سالے کچھ کو دیکھنے جاتا ہے مگر استاد نے کہا ہے کہ ابھی اس کو اندر رہنے دو۔ بندہ مجھ اس کے بعد دیکھی جائے گی۔ ستا ہے صدر بازار کے کچے دار سے بات ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب۔ فیکہ کا سودا ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔ سودا ہی مجھ لے لیا اس کے علاقے میں رہتا چاہتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی کوئی لوٹنا کا پکڑ لگا ہے۔ اس نے استاد سے خود فیکہ کو مانگا۔ سالہ ہے ایک نمبر کا خزانہ مگر صورت چل کا اچھا ہے۔ ایک بار تو فیکہ کیا ہاں بال۔ ادھر مظہر سے میں کوئی ملک فقیر تھا۔ پولیس کے ساتھ مل کے چلا آتا تھا۔ وہ پکڑا گیا اور اسے ہو گئی تیل۔ یہ سالہ فیکہ اس کے گھر میں رہنے لگا اور اس کی گھروالی کو اپنی گھروالی مجھ کے پیش کر رہا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ جو بیٹے کے لیے جیل جانے والا آجائے گا تین مہینے میں۔ وہ اچانک گھر آیا تو وہاں ڈراما ہی دوسرا چل رہا تھا۔ فیکہ تو بھاگ گیا۔ اس فقیر نے اپنی گھروالی کو زنجیر کر دیا۔ دو بچے تھے۔ انہیں بھی کات کے پھینک دیا کہ یہ بھی میرے نہیں ہو سکتے اور بچے کی یاد اپنی خاتون۔ دو سال بعد اسے چھاپی ہو گئی۔“

میں نے لڑ خیر واردات عشق سن کے لرز گیا۔ ”شادی نے کچھ نہیں کہا فیکہ سے؟“

”نہیں۔ وہ آپس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ مجھے کچھ ایسا بھی پتا چلا ہے کہ فیکہ دار کی اپنی لڑکی ہے۔ وہ فیکہ سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ تیرا اور شادو والا معاملہ ہے۔ فیکہ خور فیکہ دار بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے بدلے میں فیکہ دار شادی کو گارنٹی والا بندہ دے رہا ہے۔“

”ہاں۔ ایک کے باج دینے کی گارنٹی ہے۔ فیکہ سودا تھا تو وہ باج سودے گا۔ کوئی پیدا انکی مندور ہے بنایا ہوا نہیں ہے۔“
میرا داغ پکڑا لگا ”شادی مندور بنا بھی ہے؟“

رہیں ہنسا ”ایک شاہی کیا سب مانتے ہیں۔ مگر جس کی بات ہو رہی ہے نا وہ وحاشی فٹ کا ہو گا شاید۔ مگر میں گھبرے۔ بچی پٹی نا تھیں ہیں۔ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ ہیں چھوٹے بچوں جیسے مگر چہرے پر داڑھی موچھیں ہیں۔ کتنے ہیں مگر ہالیں بچاس سال ہے۔ انکی چیز کون دتا ہے کسی کو مگر فیکہ دار دے رہا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔ شاہی کو اور کیا چاہیے۔ پندہ میں بزار مینے کے کہیں نہیں گئے۔ صدر بازار کے فیکہ دار نے بھی پشاور سے منگوایا تھا۔ پورے ایک لاکھ میں۔ مگر لاکھ تو بک کے وصول ہو گئے۔ دو سال پہلے کی بات ہے۔ بڑی سخت حفاظت کرتا تھا اس کی کہ کوئی چوری نہ کر لے۔“

میں دم بخود بیٹھا رہا ”یہ فیکہ شادی کے پاس بھی ہیں۔“
”ہاں۔ تین ہیں۔ ایک بادشاہی مسجد کے پاس رکھا ہے۔ دوسرا داماد صاحب والی گلی ہے کچھ دور۔ تیسرا بادشاہی باغیچوں کے اڑے پر۔ یہ تو چاہو گا۔ شاہی کے لاکھ دے دینے مہینہ کچھ باقی سب میرے تجربے جیسے ل کے ایک لاکھ کرتے ہوں گے۔“
میں بھر پکا ہوا گیا ”یعنی سو لاکھ کی آمدنی ہے ماہانہ شاہی

کی؟“

”آمدنی ساری اس کی نہیں ہوتی۔ اور بھی ہیں حصہ بٹانے والے۔ سب سے بڑی حصہ دار تو پولیس ہے۔ بچے سے اوپر تک سب کو دینا پڑتا ہے ورنہ دھندا کیسے چلے گا میں رہتے علاقے کے قتلوں کا پکڑ لگا ہوں۔“

میں نے کہا ”تو خبر بھی ہے پولیس کا؟“
وہ دھڑکی سے ہنسا ”یہ یار سب کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار تو ان کے جتنے چڑھ جائے گا تو مجھے بھی کرنا پڑے گا۔ نہیں کرے گا تو پھنس جائے گا کسی کیس میں۔ شاہی کی اپنی طاقت کیا ہے اصل طاقت ہے پیسے کی۔ اس نے خرید رکھا ہے پولیس کو۔ انہیں سب معلوم ہے کہ بھیک کھانے کے علاوہ یہ بھکاری کیا کرتے ہیں مگر انہیں صرف اپنے حصے سے سروکار ہے۔“

”اور کیا کرتے ہیں بھکاری؟“
”اب یہ پوچھ کیا نہیں کرتے۔ جو بسوں میں بھیک مانگتے ہیں ان کی لاش ملی ہوئی ہے جب کتروں سے اکثر بڑے اشاپ سے ایک ہانت مارا ایک بھکاری کے ساتھ سوار ہوتا ہے۔ بھکاری سب سے پہلے اسامی آتا ہے۔ لوگ اسے بھیک دینے کے لیے جیب سے پیسے نکالتے ہیں۔ اس سے پتا چل جاتا ہے کہ رقم بھلون کی کس جیب میں ہے۔ فیکہ کی اوپر والی جیب میں ہے یا ساڑھی کی پائٹ میں۔ پھر رقم کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ بھکاری کو ملتا ہے زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ۔ ایک کا نوٹ بڑے نوٹوں کے درمیان ہوتا ہے۔ سو چپاس دس اور باج کے نوٹوں کے چچ میں۔ یا پھر بھیک دینے والا پرس نکالتا ہے۔ پائٹ مار دیکھ لیتا ہے کہ بڑا کمال ہے اور اس کی محنت کیسی ہے۔ اس سے بھکاری کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی ہاتھ کی صفائی دکھانے کے بعد کسی کو خشک ہو جانے یا کوئی پکڑے تو جیب کھڑا اور ہاتھ بھکاری کے حوالے کر دیتا ہے۔“

”وہ کیسے لوگ دیکھتے نہیں؟“
”اب یہ یہ سارا کھیل ہی ہاتھ کی صفائی کا ہے۔ بعض اوقات اندازہ غلط ہو جاتا ہے تو پائٹ مار خود کو پھانتا ہے۔ وہ ہتھ بھکاری کو ایسے پاس کر دیتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلتا۔ وہ ہتھ بچے گراتا ہے اور پاؤں کی گھوڑا کر کے بھکاری کی طرف کر دیتا ہے۔ جیسے فٹ بال میں گھلاڑی پاس دیتا ہے اور بھکاری اس پر پاؤں رکھ کے کھڑا ہو جاتا ہے یا چوٹی اٹھتی گراتا ہے۔ جان بوجھ کے پھر ہتھ بھی ساتھ ہی اٹھالیتا ہے اور گڈڑی میں غائب کر دیتا ہے۔ بھکاری پر کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے۔ پائٹ مار پکڑا جاتا ہے تو اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ اٹا خشک کرنے والا یا اسے پکڑنے والا شرمندہ ہوتا ہے اور پریشان بھی کہ آخر بڑا کمال کیا۔ اس پاس کھڑے ہوئے ہر شخص کو جیب کھڑا کچھ کے تو طاشی نہیں لی جاسکتی۔ بعض اوقات کوئی جیب کھڑے کو روکے گا تو انھوں پکڑ لیتا ہے۔ جیب کتروں کو بھاگنے کی خاص تہمت دی جاتی ہے۔ وہ بھاگتے ہیں تو کچھ لوگ شور

کرتے ہیں اور پچھا کر کے انہیں پکڑ لیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہتھ ہوتا ہے بھکاری کے پاس۔“

”خود بھکاری جب نہیں کاتے؟“
”نہیں ہنسنے لگا۔ اب یہ آرت ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ مہینوں کی باروں کی ٹینگ سے آتا ہے۔ بھکاری صرف ان کی دود کرتے ہیں۔ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ بھکاری پہلے اسامی آتے ہیں۔ پھر پائٹ مار کے لیے موقع پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی بھکاری اسامی کے پاؤں پر چڑھ جاتا ہے اور اسے تکلیف ہوتی ہے تو اس کی توجہ ہوتی ہے اپنا پاؤں چھڑانے کی طرف۔ وہ شور کرتا ہے کہ چھوڑ میرا پاؤں۔ کوئی فقیر پاؤں پر لاٹھی مار دیتا ہے تب بھی کبھی ہوتا ہے۔ ایک فقیر نے کڑا ہن کرنا تھا۔ اس میں میل نکلی ہوئی تھی۔ وہ میل کر میں یا ٹانگ میں چھ جاتی تھی۔ وہ دود سے چلانے کے سوا کیا کر سکتا ہے فقیر کو گالیاں نہیں دے سکتا۔ مار نہیں سکتا۔ فقیر کے پاس عذر ہوتا ہے کہ باپس میں دھکے تو لگتے ہیں مگر ای وقت پائٹ مار اپنا کام کر جاتا ہے۔ فقیر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ کچھ فقیر کھنی مار دیتے ہیں بولی میں۔ ایک سے بھیک لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دوسرے کے کھنی لگ گئی۔ اب وہ فقیر کو کیا کہے۔ وہ بولی دیتا ہے اور جیب صاف ہو جاتی ہے۔ دراصل پائٹ مار نے والے اسی اصول پر کام کرتے ہیں کہ جب اسامی کی توجہ پائٹ سے زیادہ کسی اور طرف ہو اس وقت ہاتھ کی صفائی دکھاؤ۔ عام طور پر پائٹ مار نے والوں کے اور بھکاریوں کے علاقے ایک ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ٹیم بھی دی رہتی ہے۔ لیکن ایک مہینے بعد روٹ بدل جاتا ہے۔“

”روٹ کیسے بدل جاتا ہے؟“ میں نے کہا۔
”یار جو ٹیم روٹ نمبر نو پر چل رہی ہے اسے دور بھیج دیتے ہیں کسی دوسرے روٹ پر۔ مثلاً سڑ نمبر۔ اور سڑ نمبر والی ٹیم آجاتی ہے نو نمبر سڑ پر۔ دراصل ایک روٹ پر سفر کرنے والے بہت سے مسافر ہی ہوتے ہیں۔ جو ایک خاص وقت پر آتے جاتے ہیں۔ یہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ پکھانے نہ لگیں۔“

”ایک روٹ پر ایک ہی ٹیم ہوتی ہے۔“
”ایک روٹ پر کم سے کم تین پائٹ مار ہوتے ہیں اور تین ہی ان کے مددگار بھکاری۔ ایک ٹیم صبح اٹھ جانے والوں کے لیے۔ دوسری دس گیارہ بجے تک خریداری کے لیے ٹنگے والوں اور چیک آنے جانے والوں۔ تین بج کرانے والوں اور ہوائی جہاز یا ریل کے ٹکٹ لینے والوں سے ملتی ہے۔ تیسری شام سے رات تک چھٹی کر کے دفتر سے لوٹنے والوں یا کادھاری اور دکان دار لوگوں پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔ اب جو انارکلی بازار سے انہیں تک کا روٹ ہے اس پر چار سات اور عید بقرمید کے زمانے میں دس یا دس بیوں کا کام ہوتا ہے۔ علاقے اور قلم کی بات ہے۔“
”بھکاری تو چھرواں بھی کراتے ہیں“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ وہ گھبراتے ہیں۔ عورتیں زور پکڑنے کے علاوہ کچھ کرنے کی عادت سے محنت کچھ تادیبی ہیں۔ انہیں میں باتیں کرتے ہوئے ایک کہتی ہے کہ میرے مہاں نے دعویٰ ہے یہ بھیجا ہے اور وہ بھیجا ہے۔ دوسری اس سے بڑھ کر بولتی ہے کہ ہم نے تو ہمیں سے لیا ہے سب۔ ٹی وی ڈش کارڈ اور وی سی آر۔ گارٹی تو ہوتی ہے کم سے کم بھکاری گھر کے اندر بھی جھانک لیتے ہیں۔ زیادہ نرم دلی عورتیں انہیں گھن یا برائے میں جھانک کے مدنی کھاتی ہیں ورنہ وہ بانی مانگ لیتے ہیں اور کسی بچلے دروازے سے سب دیکھ لیتے ہیں۔ پھر وہ ساری معلومات چوروں، ڈاکوؤں کو فراہم کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”کیا مال میں سے ان کو بھی حصہ ملتا ہے؟“
 انہیں ہنسا ”اے حصہ نہ ملے تو تادمہ کیا۔ خدمت خلق کون کرتا ہے؟“

میں نے کہا ”لیکن جسے کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟“
 ”پارے۔ یہ سمجھ لے کہ بے ایمانی کے دھندے ہی ایماندار سے چلتے ہیں اور کہیں ایماندار سے نہیں ہے۔ پاکت مار جب فقیر کو بڑا پاس کرتا ہے تو فقیر ایماندار سے تادتا ہے کہ اس میں کتنی رقم تھی۔ وہ بڑا کھول کے بھی نہیں دیکھتا۔ دواں پھوڑ کے اترتا ہے تو اسے جیب کھڑے کے حوالے کرتا ہے۔ پھر جتنا مال ہو اس میں سے ایک چوٹائی بھکاری کا۔ اگر اس نے واقعی مدد کی ہو۔ آگے بھکاری اس... ایک چوٹائی میں سے تو حاشا ہی کو صدقہ دتا ہے۔ اسے ملتا ہے آٹھواں حصہ۔ یہی حساب چوری کے مال کا ہے۔ اس میں کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ چوری کے مال کی قیمت پر اختلاف ہو تو بڑے مل کے طے کر لیتے ہیں مثلاً وی سی آر کتنے میں جائے گا اور وی سی کتنے میں۔ یا زور کا لیا لے گا؟ ورنہ جب چیز بک جاتی ہے تو حساب سے چوٹائی شادی کو پہنچایا جاتا ہے۔ چوری کا مال پوری قیمت پر تو فروخت ہوتا نہیں۔ خریدنے والے بھی خاص لوگ ہوتے ہیں۔ وہ آدھی قیمت لگاتے ہیں زور دات کی۔ وی سی آریائی وی سی جی چیز بالکل ہی تو ایک تھائی پر لیتے ہیں۔ آدھی پر بیچتے ہیں۔ سب پہلے سے ملے ہے۔ نیت میں بے ایمانی نہ ہو تو جھگڑا نہیں ہوتا اور دھند اچلتا ہے۔ اعتبار پر۔ جو سودو سوارے کا ایک بار وہ اپنا ہی دھند اکھو کرے گا۔“

میں نے کہا ”پیارے میں۔ یہ تو دنیا ہی اور ہے۔ میرا خیال ہے کہ تیرے ساتھ چند دن گھوم پھر کے اچھے گزر جائیں گے۔“
 ”استاد نے بھی یہی کہا ہے۔ اے دنیا دکھاؤ۔ چل پھر تجھے اپنا یہ دنیا دکھائے ہیں پیارے! اے نہیں بولا۔“

میں بیک نہیں ہانکتا تھا۔ قابل اعتبار اور سبتر ہونے کے بعد اس کی ترقی ہو گئی تھی۔ وہ بیک وقت پولیس کا اور شادی کا خبر تھا۔ سارا دن گھوم پھر کے دیکھتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ فقیر کام چوری تو نہیں کر رہے ہیں یا کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ کوئی

غیر حاضر ہے تو کہیں اور پکڑا گیا ہے تو کہیں؟ وہ سب کا یاد دہا ہوا تھا۔ ہر شخص اسے اپنا دوست اور مہمان سمجھتا تھا اور اسے دوسروں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا۔ وہ اندازہ کر لیتا تھا کہ کون کتنی کمائی کر رہا ہے اور شاہی کو کتنا مقدمہ دے رہا ہے۔ توڑی بہت بڑا بھیری سب کرتے تھے۔ اس کا شاہی کو بھی پتا تھا اور وہ دس بیس روپے کی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ سو بچاس کا فرق بھی کسی چل جاتا تھا۔ بھی بتاری کے ہانے، بھی دھنداکم ہونے کے بند پر۔ سال کے ہر مہینے اور مہینے کے ہر دن ایک اوسط آمدنی تھی۔ رمضان میں، محرم اور ربیع الاول میں یا جب حاجی روانہ ہوتے تھے یا لوٹ کے آتے تھے تو کمائی بڑھ جاتی تھی۔ جسے کی نسبت جمعرات کو زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ پہلی تاریخ کو دو یا تین گنا رقم ہاتھ لگتی تھی۔ عید بڑھ پر دوسرے بارے ہوتے تھے۔ سردی کے مقابلے میں گرمی زیادہ متاع بخش تھی۔

شاہی کے پاس سب ملاکے دو ستر فقیر تھے۔ ان میں مرد زیادہ تھے۔ عورتوں کے مقابلے میں بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بائیس فقیروں کے اپنے خاندان تھے۔ ان کے پوتے بچے الگ الگ کھانوں پر دھند کرتے تھے مگر رات کو سونے کے لیے ایک ہی چھت تلے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ مضامات میں کوٹھیاں بنا کر رہتے تھے یا کسی دیوار کے سائے میں خالی جگہ پر شیڈ بنا لیتے تھے۔ انھیں بے جا تھے تھے تو کہیں اور ٹھکانا بنا لیتے تھے۔ ان کے لیے خانہ بدوشی کی یہ زندگی نہ باعث شرم تھی اور نہ وہ اسے کوئی مذہب سمجھتے تھے۔ وہ اس زندگی کے عادی تھے اور شرم میں دے بھی شرمی سولہوں کے خواب تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عزت اور بے عزتی کا تصور ہی نہیں تھا چنانچہ نہ وہ گاہیاں کھانے بے مزہ ہوتے تھے اور نہ پولیس یا شادی جیسے کسی طاقتور سے جوتے کھانے۔ انہیں نہ لباس کی پروا تھی اور نہ ملنے کی۔ رہائش، بچوں کی تعلیم اور صحت، سماجی تقریبات یا تقریر پر ان کے اخراجات ویسے بھی نہیں ہوتے۔ کھانا چنانچہ فری ہو جائے تو پھر فکر کیسی؟

وہ سارا دن گھومتے پھرتے گزرتا گیا۔ یہ احساس بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گیا کہ لباس فقیری میرے لیے باعث عار ہے۔ اس لیے پرانے میلے اور خلیط لباس سے نفرت اور کراہیت کے جذبات کی پہلے جیسی شدت نہ رہی۔ مجھے کوئی جاننے والا ہی نہیں ملا جس کے سامنے جا کے مجھے اپنی حالت پر شرم محسوس ہوئی اور یہ خیال آتا کہ اب وہ سوں کو پتا چلے گا تو میں کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا منہ دیکھنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ سوائے ڈاکٹر مشہور کی پہلی کے یا شاد کے۔ میرا نہ کوئی دوست تھا اور نہ خاندان۔ چشم خانے کے صاحب کس نظر آتے تو مجھے پچان نہ پاتے۔ ان کی حالت کا موازنہ میں اپنی حالت سے کرتا تھا تو مجھے ان کے لیے کسی اور مجبوری قابلِ رحم محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ حالت اپنی مرضی اور ارادے سے بنائی تھی۔ میں شادی کی

محبت میں فقیر ہوا تھا۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جب محبوب کے کہ مجھے شوق کی دیوانگی کی ابتدا دیکھنی ہے تو پھر دیوانہ دنیا کو کیا دیکھے۔

حیرت اور تجسس نے بھکاریوں کی پوشیدہ اور پراسرار دنیا کے تماشے کو بہت پر لطف بنادیا تھا۔ دوسرا کھانا ہمیری طرف سے تھا۔ انہیں مجھے شادی کھانے کی پچھلی طرف سے اس بدنام بازار میں لے گیا جو شادی محلہ کہلاتا تھا۔ دن میں وہ عام سی ہستی تھی اور مجھے وہاں زندگی اسی طرح دو دن دو دن نظر آتی تھی۔ پرانے لاہور کے کچے کوچوں میں نظر آتی ہے۔ اس علاقے میں ”بچے پائے والا“ بہت مشہور تھا اور لاہور کے فیشن ایبل علاقوں کے شرفا بھی یہاں کا دروں میں اپنی فیملی کے ساتھ پائے کھاتے آتے تھے۔ ہم شرفا نہیں تھے چنانچہ باہری بیٹھے گئے۔

انہیں نے کہا ”کیوں بیٹے“ ایک ہی دن میں دماغ درست ہو گیا۔

میں نے کہا ”مجھے تو یہ ایک دلچسپ تواشا لگ رہا ہے۔ نئے اور حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں۔“

”اب شرم نہیں آ رہی ہے اپنی حالت پر؟“

میں نے خفت سے کہا ”نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ہمیں بدل کے شرم کو دیکھنے لگا ہوں۔ پہلے زمانے میں خلیط اور بادشاہ بھی ایسا کرتے تھے۔ ہوتے وہ بادشاہی تھے اس لیے فقیروں کا لباس پہن کے بھی بے عزتی محسوس نہیں کرتے تھے۔“
 ”تو بھی فرض کرنے کے وزیر اعظم ہو گیا ہے اور کھانا بے عوام کی حالت دیکھنے“ انہیں نے پائے کی ایک پلیٹ ختم کر کے دوسری منگوائی۔

میں نے کہا ”ہاں۔ ہاں۔ تھے کمائیاں ہو گئی ہیں وہ باتیں۔ اب کون پوچھتا ہے رعایا کو خود بے چارے وزیر اعظم کی حالت پر دنیا ہنسی ہے۔ جیسے انگلستان میں نام کی ملکہ ہوتی ہے۔ بے اعتبار اور شادی محلے کے ادب آداب اور رسم و رواج کی پابند۔ ایسے ہی اپنا وزیر اعظم ہے نہ کوئی اعتبار نہ طاقت۔ نیچے والوں کو نہیں اوپر والوں کو خوش رکھنے پر مجبور ورنہ جلاتے ہیں دی لال مار کے نکال بھی دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں۔ بے چارہ ایک مود ہے۔ کبھی پینٹا ہے تو کبھی خدشہ جاتا ہے۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بڑی شان ہوتی ہے وزیر اعظم کی۔ تو خود پہلے ہی کہتا تھا۔“

میں نے کہا ”پچھ تھا تو ایسی باتوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔ اب حقیقت دیکھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شان و شوکت کتنی جھوٹی اور عارضی ہوتی ہے۔“

وہ ہنسنے لگا ”بے ساری عمو شش کر کے اور کتنی تکلیف اٹھائے لوگ پہنچے ہیں اس خیل تک۔“

”ہاں۔ کچھ لوگوں کو ہوتا ہے سیاست کا نشہ۔ خرابی کا پتا تو بعد

میں چلتا ہے جب نقد چھوٹا نہیں۔ بیرون پینے والے کو بھی پہلے بڑا مزہ آتا ہے۔ کچھ دار آدمی دور مہاں سے سیاست سے۔ یہ جو بڑے بڑے سیٹھ ہیں۔ آدمی، داؤد اور سگل جیسے۔ یہ بڑے سیٹھے ہیں۔ ان کی زندگی اور عزت دونوں محفوظ ہیں۔ حالانکہ اس ملک میں ساری سیاست پیسے کے بل پر چلتی ہے اور ان کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ یہ سارے وزراء اور سارے منتخب ممبر اپنی دولت کی ذکوہ سے خرچہ کتے ہیں۔ پھر یہ وزیر اعظم کیوں نہیں بنے؟“

میں نے انسانیت کے وہ سچ شہد نمونے بھی دیکھے تھے جو مگر اگر کی کے نظارے غفر سے نوادرات میں شمار ہوتے تھے اور بڑے مہنگے بکتے تھے۔ باکمل اور ٹیڑھے میز۔ عجیب انکشت بچے ہر جگہ پید ہوتے ہیں۔ یہ تو فیملی سائنس کے ماہرین ہی جانتے ہیں کہ کسی عورت کے وجود میں تخلیق کا حسین عمل ایسا بد صورتی کو کیسے تشکیل کرتا ہے جو انسانوں اور حیوانوں سے الگ خوف اور دہشت کا کوئی نمونہ بن جاتا ہے۔ چرے جن پر آنکھیں ہی نہیں ہوتیں۔ جڑے ہوئے مڑھ میں تین ناگیں۔ دو سرنا نوزائیدہ چرے پر لمبی داڑھی جیسے ہاتھن والے یہ بچے عموماً زندہ نہیں رہتے مگر قدرت کی قسم غرقانی کے یہ شکار بعض اوقات انسانوں کے لیے درسِ محبت بن کے جیتے نظر آتے ہیں۔ انہیں سرکس والے بھی لے جاتے ہیں اور فقیر بھی۔ انکھان کے ماں باپ کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ ماں باپ جو اپنی ایسی اولاد کا خود مارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے انہیں لاوارث چھوڑ آتے ہیں۔ ساری عمر بیک بنائی کا عذاب اور اپنی ہی اولاد کو کسی جانور کی طرح پالنے کا دکھ انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کی ولایت سے ہی منکر ہو جائیں۔

ایسے بچوں کے نمونے میں نے بار بار سڑکوں کے کنارے پرے دیکھے تھے مگر یہ انکشاف مجھ پر آج ہوا تھا کہ میں قیمت نوادرات کی طرح ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہ اپنے والدین اور خود اپنے لیے جسم بدھتی کی علامت ہوں مگر کچھ لوگوں کے لیے ان کا وجود خوش قسمتی اور خوش حالی کا وسیلہ تھا۔ ان کی کمائی کسی ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل سے زیادہ تھی۔

مغرب سے کچھ پہلے ہم ایک قہانے مجھے وہاں رئیس کو پہچاننے والے بہت تھے۔ رئیس ان سب کو ہاتھ جوڑ کے بڑی خوشامداند مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتا تھا ”خیر ہو حوالدار صاحب۔ سلام مالی باپ۔ اللہ آپ کو قہانے دار بنائے سرکار۔ یہ بھلے وہ بڑی روانی سے بولتا تھا۔ ایک دوڑے اس کے سلام کا جواب دیا۔ باقی مجھے گھورتے رہے کیونکہ میں سرگھاکے چل رہا تھا اور کسی کو سلام کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔ یہ قہانے کے آداب کی صریح خلاف ورزی تھی اور کتنا فنی تھی۔

بہتر محرر نے جو ایک خشک لکڑی جیسا حوالدار تھا، الجائی نظروں سے رئیس کو دیکھا ”اوسے رئیس دے پتہ۔ آج بھی لایا ہے کچھ؟“
 رئیس نے ہنسی کی نمائش کی ”عالی جاہ۔ آج تو فقیر کی بھولی

خالی ہے۔ اس کے تیر بدل گئے "وہ کچھ ٹیکے کا نام مت لیتا۔ اس کی تو میں نے شادی سے خودیلا ہے۔"

رئیس نے بند مٹھی میں سو کا نوٹ آگے بڑھا دیا "آپ مالک ہو جی گرا پاؤں رہے ٹیکہ خیال کرنا زرا۔"

مذکر کے چہرے کی سختی غائب ہو گئی "یہ کیا جانور پکڑ کے لایا ہے اپنے ساتھ؟"

"سہی۔ اپنے شاہی کا خاص بندہ ہے۔ میرے ساتھ بیجا ہے کہ سب سے سلام دعا ہو جائے۔"

مذکر نے مجھے محکوک نظر سے دیکھا اور سر ہلایا "چھا جا۔ ٹیکہ حالات میں موج کر رہا ہے۔"

ٹیکہ چھپ چھپیں پچیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا اور دیکھنے میں ذرا بھی فقیر نہیں لگتا تھا۔ وہ مکلی چٹون اور رنگین شرٹ پہنے دیوار سے ٹیکہ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کی خالی پیالی اس کے پاس رکھی تھی۔

رئیس کو دیکھتے ہی وہ آگے آیا "اویار۔ میں تو صبح سے راہ دیکھ رہا تھا تیری کیا مسئلہ ہے آخر؟"

"سکے تو نے پیدا کیے ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے؟" رئیس نے کہا۔

"شادی کیوں ناراض ہے مجھ سے۔ اس کا کیا بگاڑا ہے میں نے۔ رات بڑی بار پڑی ہے مجھے "وہ شرٹ اٹھا کے دکھانے لگا۔"

"اس نے کچھ نہیں کیا؟ جس نے گود لیا ہے تجھے؟"

ٹیکے کا منہ کھلا رہ گیا "تجھے کس نے بتایا؟"

"اے گود لیا کھتا ہے سب کو معلوم ہے یہ بات۔ صدر بازار کا ملا ٹیکہ دار تیرے بدلے میں ایک کے پانچ دلا مال دینے پر راضی ہے۔ آخر کیوں؟ یہ گمانے کا سودا کیوں کر رہا ہے؟" رئیس نے کہا۔

ٹیکہ سر کھپانے لگا "یار رئیس۔ اس کی ایک لڑکی ہے۔ اس کا دل گیا ہے مجھ پر۔"

"بات کر اپنے دل کی۔ تجھے بھی اچھی لگتی ہے وہ۔ سنا ہے تو شادی کر رہا ہے اس سے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ شادی کر رہا ہوں میں۔ لڑکی تو بس ایسی ہی ہے۔"

"مگر قانہ کا سودا ہے۔ ملا مرچائے گا تو ٹیکے داری خود بخود تجھے مل جائے گی۔ لڑکی اس کام کو نہیں سمجھ سکتی۔"

ٹیکہ اٹھٹالی سے ہنسنے لگا "کس نے بتائی ہے یہ بات تجھے؟"

"تو خود سوچ۔ کسی سے ضرور کہا ہو گا تو نے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔" رئیس نے کہا۔

"ملا جب مرے گا تب دیکھی جائے گی۔"

رئیس ہلکا "وہ مرنے والا ہے۔ دو چار مہینے میں۔"

ٹیکے کا رنگ اڑ گیا "یہ غلط ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ جگر کا کینسر بتایا ہے ڈاکٹروں نے اور اس لیے وہ بھی پریشان تھا۔ ایک لڑکا بھی ہے اس کا مگر وہ بہت چھوٹا ہے اور یو کی پاگل ہے۔ اس کی انگلیں کٹ گئی تھیں ایک حادثے میں۔"

ٹیکے نے کچھ دیر بعد کہا "پھر تو اچھا ہی کر رہا ہوں میں۔ اس کی ساری ذمہ داری سنبھال لوں گا۔"

"تو صرف ٹیکے داری سنبھالنا چاہتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یو کی تیرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اس کی ماں کو تو پاگل خانے میں داخل کرادے گا اور چھوٹے بھائی کو کراچی یا پشاور کے درکشاپ میں بھیج کے دام کمرے کرے گا۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں تجھے۔"

ٹیکے کی حالت اس کے اعتراف جرم کے حراف تھی "کسی نے غلط کہا ہے رئیس۔ بھوت بولا ہے میرے بارے میں۔"

"اے زیادہ چلاک مت بن۔ اپنے شاہ جی نے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے مجھے۔ وہ سن لے تیری شادی ضرور ہوگی مگر کس کے گواہ خود شاہ جی ہوں گے۔ جانا۔ اس کے علاوہ جرات تجھے معلوم نہیں وہ بھی سن لے۔ اپنے استاد نے ملا کی یو کی کو بہن بتالیا ہے۔ کیا سمجھا؟"

ٹیکے کی حالت غیر ہو گئی "بہن بتالیا ہے کیوں؟"

"یہ استاد سے پوچھتا۔" رئیس نے کہا "مٹی سی آئی ڈی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔ ملا ٹیکہ دار خود آیا تھا تیرے بارے میں معلوم کرنے۔ پھر استاد کیا قاس کے کمر۔"

"میں سسٹنٹ سمجھتا ہوں اس پر۔ نہیں کہنی مجھے یہ شادی۔" ٹیکہ ہلکانے لگا "زبردستی ہے کوئی؟"

ٹیکہ ہنسا "تیرا تو اب بھی کسے گا اس سے شادی۔ انکار کیسے کر سکتا ہے اب تو۔ حق میری ایک لاکھ ہو گا۔"

ٹیکے کا رنگ پلپلا پڑ گیا "یار رئیس۔ آخر یہ۔ معاملہ کیا ہے؟"

"معاذ کیا۔ سب تقدیر کے پکر ہیں۔ تو نے جو سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ کب سے چلا رہا تھا تو نے یہ پکر؟"

"مٹی مینے ہو گئے۔ گالے دردی ہے میرے خواہ خواہ۔"

"خواہ خواہ۔" رئیس نے سختی سے کہا "تو پیش کر کے بھاگتا چاہتا تھا۔ پرانی بیٹی کی عزت کو کھیل کچھ رکھا تھا۔ شادی تو کہنی پڑے گی تجھے اس سے جو تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے مگر تو نے سوچا تھا وہ نہیں ہو گا ٹیکے تو لڑکی کو بے وقوف بنا سکتا ہے اس کے باپ کو کیا سمجھتا ہے تو؟ اس نے استاد سے کہا کہ میرے بعد تم ان کی حفاظت کرو گے۔ استاد نے ملا کی حفاظت کرنے والا اللہ ہے تو ملا ٹیکے دار نے اپنی ٹوپی اس کے پیروں میں رکھ دی۔ بس اس کے بعد استاد نے کہا کہ ملا کو ایسے تو میں اور تو پیش دہن تجھے پر آج سے تیرا گھر میری بہن کا گھر۔ اس نے ملا کی پاگل یو کی کے سر پر دوپٹہ

ڈالا اور اسے بہن بتالیا۔"

"یہ سب یہ تو مت بڑا ہوا۔" ٹیکہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔

"پرانی ہے تیرے دل میں۔ ورنہ شادی کر اور سنبھال ملا کا سارا کا سودا۔ جب تک اس کا بیٹا اس قافلہ نہ ہو جائے کہ باپ کی جگہ لے۔ یو کی بچے کے ساتھ اپنے سالے اور ساس کو بھی سنبھال سکتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں۔ کہ دے استاد سے۔ میں نہیں کروں گا یہ شادی۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔" ٹیکہ چلانے لگا۔

حوالات کے باہر کھڑے ہوئے سترہ نے اسے گالی دے کے رائٹل اٹھا لی "شر کرنا تو ابھی شادی کرادوں گا۔"

رئیس ہلکا "ٹیکے سوچ لے آج رات۔"

"وہ دے سوچ لیا ہے میں نے۔ ایسی کی جیسی تیرے استاد کی۔ میں نہیں ڈرنا کسی سے۔ میں یہ سمجھتا ہوں نہیں لے سکتا۔ ایک پاگل عورت کا بوجھ اٹھائیں۔ اس کو بڑے کو پال پوس کر بڑا کروں تاکہ وہ بہن بن جائے میرا باپ۔"

رئیس نے کہا "اور وہ لڑکی جس کا دل گیا تھا تیرے پر۔"

ٹیکہ گالیاں بٹکنے لگا "سمت بھلتی ہیں ایسی۔ بتائیں کس کی سمیت میرے سر منہ مٹا چاہتی ہے۔"

رئیس نے کہا "تو بات تو اس لڑکی کے سامنے کہہ سکتا ہے۔ استاد کے سامنے؟"

"ہاں ہاں کہہ سکتا ہوں۔ وہ سچے راجہ مار کے بولا۔

رئیس نے سر ہلایا "سوچ لے۔ حوالات سے انگوٹوں پر مل کے باہر آنا چاہتا ہے یا چارواں پڑ؟"

تم تھانے سے باہر آگئے۔ رئیس کا یہ ادب میں نے بلی بار دیکھا تھا۔ وہ واقعی شاہ جی کے نائب کی حیثیت سے بات کر رہا تھا۔ دیکھنے میں بے وقوف نظر آئے والا رئیس سب جانتا تھا۔ اسے سارے حالات کی خبر تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی اور میری دوستی پرانے رشتوں کی بنیاد پر استوار تھی اور رئیس جیسا بھی تھا۔ کینہ پور اور کینہ نہیں تھا ورنہ اس کی رقابت مجھے معلوم پڑتی۔

میں نے کہا "یار یہ سب باتیں تجھے کیسے معلوم ہو جاتی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "مٹی سی آئی ڈی انکلیز ہیں یار۔ یہی کام ہے ہمارا۔"

میں نے کہا "رات تو آیا لگتا تھا جیسے ٹیکہ لڑائی جھگڑے کی وجہ سے بند ہے۔ شادی نے کیا کیا تھا۔"

"سب کے سامنے ایسی بات کرنے سے کیا فائدہ؟ جب شادی نے تجھے جو بڑا لاکھ چوک دیا میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اب ٹیکہ داپس اپنی جگہ نہیں آئے گا۔"

"مگر اس نے شادی نہ کی تو کیا واقعی؟"

"ہاں۔ اس کی بیٹی سزا ہوئی چاہیے۔ آجے یا ایک لڑکی ہے۔"

وہ اسے کب سے انوکھا ہے سالا۔ لڑکیاں تو ہوتی ہی پاگل ہیں۔ جس نے یار کا تعین دلا اس کے ساتھ گھر بنانے کا سوچنے لگتی ہیں۔"

"ٹیکہ کتا ہے تو شادو کو کچھ لے۔"

"تمہی نیت صاف ہے۔ ٹیکے حرامی نے تو بڑی دور کی سوچی تھی۔ بے جاہ ملا بیٹی کی وجہ سے پریشان کیسے نہ ہو۔ اس کی اپنی زندگی تو ڈی رو گئی ہے۔ پھر پاگل اور مندو بیوی ہے۔ اسے کس کے سپرد کرے۔ اس نے سوچا تھا کہ ملا تو خودی مر جائے گا۔ یہ وہ کو پاگل خانے والے نہ قبول کرتے تو یہ اسے بھی بچ دیتا۔ بھکاری تو لادھر سے لادھر ہوتے رہتے ہیں۔ پشاور سے کراچی اور کراچی سے لاہور۔ ایسی عورتوں کی کون سنتا ہے جن کا والی وارث کوئی نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو نے درکشاپ کی بات کی تھی۔ ٹیکے سے۔"

"ہاں یار۔ کل دیکھا تھی گے تجھے درکشاپ بھی۔"

میں نے کہا "آج شادو کیس نظر نہیں آئی۔"

"کیسا عاشق ہے تو۔ تجھے تو ہر طرف شادو نظر آتی چاہیے۔"

رئیس ہنسنے لگا "خوابوں خیلوں مٹو جاتے۔"

"اے بھانجے ہوں گے سب طرہ بدلنے کے باوجود۔"

رئیس نے کہا "اے کوئی نہیں بچا تھا۔ اور وہ کیس آتی جاتی بھی نہیں۔"

"مگر میں نے خود دیکھا تھا۔"

"وہ کبھی سال چھ مہینے میں ایک بار کوئی ایسا معاملہ ہو جاتا ہے۔ جیسا یہ ٹیکے کا معاملہ تھا۔ جہاں اپنی سی آئی ڈی مل ہو جائے اور کیس ہو زمانہ نو بیس کا تو شادو کے سپرد کیا جاتا ہے۔ تین چار مرتبہ میں ہی لے کر گیا ہوں اسے۔ استاد کے کہنے پر۔"

میں نے بڑا سکون اور اطمینان محسوس کیا "مٹی سی وہ سب کی طرح بھگ نہیں سکتی۔"

رئیس ہنسنے لگا "سالے گھاس کھا گیا ہے۔ کیا ضرورت ہے آخر اسے بھگ مانگنے کی۔ وہ تو شادی ہے تو نے دیکھا نہیں کیسے لغات سے رہتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ میں خود حیران تھا۔"

"حیران تو میں بھی ہوں۔ جب نیا آدمی آتا ہے تو اس کے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا جو تیرے ساتھ ہوا۔ پتا نہیں شادی کیا چاہتا ہے۔ کوئی خاص بات ہے اس کے دل میں؟" رئیس سوچتے ہوئے بولا۔

"کیسی خاص بات؟"

"وہ کچھ ناچار۔ ایک تو اس نے تجھ سے کہا کہ پڑھ اور امتحان پاس کر۔ نئے ٹرکے پہلے بھی آئے تھے۔ ان کو اسکول یا درکشاپ بھیج دیتے ہیں۔ تجھے شادی نے میرے ساتھ کر دیا کہ اس کو دنیا دکھائی ہے۔"

"تیرا مطلب ہے یہ شادی کی موانی اور سفارش ہے۔"

”اے نہیں۔ وہ کیسے بات کر سکتی ہے تیرے لیے۔ اگر تیری عمر زیادہ ہوئی تو میں سمجھتا کہ شاہی نے تجھے شادو کے لیے پسند کر لیا ہے۔“

”پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟“
”شاید ابھی وہ آزمائے گا۔ تجھے ہو سکتا ہے میری طرح ہی آئی ڈی انسپکٹر بنادے۔ تھانے دار سے کہہ رہا تھا کہ لڑکائی دار ہے۔ دوستی نبھانا جانتا ہے۔ ارادے کا پکا ہے۔ اسے ساری بات معلوم ہوگئی تھی کہ تو اپنے دوست ناصر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس سے وہ متاثر ہوا تھا۔ استاد نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ریش تو نے تھوڑا بہت پڑھا ہوتا تو اچھا رہتا۔ ہم تو جاہل تھے مگر یہ دنیا اب جاہلوں کے کام کی نہیں رہی۔ ہو سکتا ہے شاہی تجھے کوئی خاص ذمے دار کی دینے کی سوچ رہا ہو۔ ہم جیسے ان پڑھ جو کام نہ کر سکتے ہوں وہ تجھے سونپ دے۔ اسے اپنی مدد کے لیے کوئی بھروسہ کا آدمی چاہیے۔ اکیلا میں سب کچھ نہیں کر سکتا۔ چند دن میں پتا چل جائے گا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔“

”اس کے دل میں کچھ بھی ہو، میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔“

”کچھ دن رک جانا ضرور۔ تو بڑی آسانی سے استاد کو قابو کر سکتا ہے۔ تو اس کے مطلب کا آدمی ہے۔ اس کا دل جیت لیا تو پیش کرے گا۔ وہ تجھے اپنا چاشمین بنادے گا۔ اور پھر کیا پتا دیسے ی شادو کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دے۔ عمر کا فرق چل جاتا ہے۔ تو ہر طرح سے شادو کے لائق ہے۔“

میں نے ٹھہرے کہا ”ریش۔ بند کر یہ فضول بکواس۔ میرے لیے یہ چند دن بھی مجبوری کے ہیں۔ شادو کی ضد کی وجہ سے میں یہاں آگیا ہوں۔ جس دن وہ کہے گی ہم اسی دن نکل جائیں گے۔“
”بڑا خطرہ ہے اس میں ناصر۔ تو آسان سمجھ رہا ہے استاد کو دھوکا دینا۔ تم اس شہر میں کیا کہیں بھی چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ کبھی نہ کبھی استاد ضرور پتا چلا لے گا۔ فسر کی ساری پولیس اس کی ہے۔ بڑا دل فقیر اس کے ہیں۔ چور، جیب کڑے اور بد معاش اس کے ہیں۔ وہ ایک ایک کو تیرا ملہ بنا دے گا۔ سب سے کئے گا کہ تجھے تلاش کریں۔ تیری تصویر دکھا دے گا سب کو۔“

”کہاں سے دکھا دے گا میری کوئی تصویر ہی نہیں۔“
”کیوں۔ دسویں کے امتحان کا فارم بھجھا ہوا تو نے۔ استاد کو معلوم ہے کہ تو دسویں کا امتحان دے رہا ہے۔“
”وہ تصویر اسے کیسے مل سکتی ہے؟“ میں نے کہا۔

”میں جیسے غریب ہوتا ہے بیٹے۔ ہر کام ہو جاتا ہے۔ ہر چیز مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تو نے میرا بھی سوچا ہے۔ میرا کیا ہو گا؟“
”میرا کیا ہو گا۔ تجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تو دوست کس کا ہے؟ کس کے کہنے سے استاد نے تجھے پولیس سے چھڑایا تھا۔ تیری سفارش کرنے والا میں تھا۔ یہاں تو

میری وجہ سے آیا ہے۔ مجھ سے ہی پوچھا جائے گا کہ وہ کہاں گیا اور مجھے بتا دے گا۔“
”کیا؟ تو تارے گا؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”اے پاگل خانے۔ استاد مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا کہ اس سے پوچھو۔ اور تجھے پتا ہے نا وہ کیسے پوچھتے ہیں۔ آدمی کو جس بات کا پتا نہ ہو وہ بھی بتا دتا ہے۔ اپنا پتا لٹکاتا تاکہ مت جانا۔ مرتے مرتے بھی میں اتنا بتا دوں گا کہ وہ شادو کے ساتھ گیا ہے۔ اس سے محبت کرنا تھا اور ان کا ارادہ شادی کرنے کا تھا۔ پتا معلوم ہی نہیں ہو گا تو وہ کچھ بھی کر لیں، میں خاک بناؤں گا۔“

اس وقت پھر مجھے احساس ہوا کہ ریش کتنا اچھا دوست اور کتنا اچھا آدمی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بہت کم ظرف اور چھوٹے دل کا محسوس کیا۔ اس کے دل میں غرض، لالچ، ہوس جیسے جذبات کا گزری نہیں تھا جو آدمی کو خواہشات کا غلام بناتے ہیں اور اس کے لیے اپنی طلب کو اتنا اہم بنا دیتے ہیں کہ وہ حسد اور رقابت، دشمنی اور نفیس کے جذبات سے مغلوب ہو کے چاہتا ہے کہ سب کچھ صرف اپنے لیے حاصل کر لے اور جو اس کے مقابل ہو اسے راستے سے ہٹا دے۔ فٹم کر دے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے طاقت اور دولت ملی جائے، اقتدار حاصل ہو، شہرت ملے۔ میں جہنم خانے کے ایک چشم صوفی کو سزا دینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے میری عزت نفس کو بہت مجروح کیا تھا۔ میں ناصر کے قاتل کو سزا دینا چاہتا تھا اور اس سے انتقام لینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے مجھ سے میرا ایک دوست جھین لیا تھا۔ میں نے جائز و ناجائز طریقے سے دولت حاصل کر لی تھی جو میری عمر اور حیثیت کے آدمی کے لیے بہت بڑی طاقت تھی۔ میں نے رپو الور چوری کیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کو فدا کروں اور ناقابل شکست ہو جاؤں۔ میں شادو کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور ساری خواہشات میرے وجود میں اچھل پھل جاتی تھیں۔ مجھے اکساتی تھیں اور بے سکون رکھتی تھیں۔

ریش قلندر کی کے استغنا میں بادشاہ تھا۔ اسے کچھ پانے پھیننے یا جدوجہد سے حاصل کرنے کی کوئی تھنا ہے قرار نہیں کر لی تھی۔ وہ حامل مست تھا اور حرص و ہوس کی خواہشات کا نظام نہیں تھا۔ اس کے لیے شادو سے محبت کرنا ایک بے غرض پاکیزہ جذبہ تھا۔ خوشی کے ایک تجربے کا نام تھا۔ خیال کی ایک راحت کا نام تھا۔ شاید عبادت گزار کو اپنے معبود کے لیے سر جھکا کے ایسی ہی تسکین حاصل ہوتی ہے جیسی اسے شادو سے محبت کے ملتی تھی۔ لیکن اس نے کسی حسد یا رقابت کے بغیر وہ محبت مجھے بخش دی تھی۔ نہ اسے دکھ ہوا تھا نہ پشیمانی۔ وہ محبت میں جان بھی اتنی ہی آسانی سے دے سکتا تھا اور اس نے دوستی میں جان دینے کے اسکان کو بھی کسی پریشانی کے بغیر قبول کر لیا تھا۔

وہ صورت شکل میں مجھ سے بہت کمتر تھا۔ غیر نصیبانہ تھا اور

میری طرح ہوشیار اور چالاک بھی نہیں تھا۔ اسے نہ ترقی کی خواہش تھی اور نہ دنیا میں کوئی بڑا کام کرنے کی تشاہدہ ہر حال میں خوش رہ سکتا تھا اور اس کے دل میں سب کے لیے صرف غلوں تھا اور محبت تھی۔

میں نے بہت جذباتی ہو کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”رہیں۔ تو میرا دوست ہے؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”بہت دشمن تو میں کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔“

”میری بات کا جواب دے۔ تو مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے یا نہیں؟“

”کمال ہے۔ تو آج اسے مرے بعد مجھ سے پوچھ رہا ہے یہ بات؟“

میں نے کہا ”دوست کا کوئی حق ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں تم سے کچھ مانگتا چاہتا ہوں۔“

”اے جس کے ہاتھ خالی ہوں۔ اس کنگھے سے کچھ مانگ کے کیا لے گا تجھے؟“ شرمندگی کے سوا ”وہ بولا۔“

”دیکھ رہیں۔ دنیا میں نہ تمہارا کوئی ہے اور نہ میرا۔“

”دنیا میں نہیں جس کا کوئی اس کا خدا ہے۔“ وہ بولا ”پارہ کیا آواز تھی محمد ربیع کی۔ یہ گانے کے گچھے پیشہ بردار حوصلہ دیتا ہے۔“

”میں تم سے ایک وعدہ چاہتا ہوں!“

”کیا وعدہ؟ اے یہ سیاست دانوں والے وعدے ہم نہیں کرتے سالہ وعدہ کرنے والے کو بھٹا بھی پڑتا ہے۔ یہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ آدمی کے بس میں کیا ہے۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ سامان سوبرس کا بے لپی کی خیر نہیں۔“

میں نے کہا ”رہیں تو میرے ساتھ چل۔ مجھے تمہاری ضرورت پیش رہے گی۔“

وہ ہنسنے پھنسنے دہرا ہوا گیا۔ ”کیسی پاکوں جیسی باتیں کرتا ہے تو۔ اے تجھے جن چیزوں کی تشاہدہ ہے ان کے لیے کسی نام کے رہیں کی نہیں۔ حوصلے کی ضرورت ہے اور محل کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی تجھے ساتھ ہے۔ تھی تقدیر اور تقدیر کو ہم مانتے ہیں۔“

پارہ دیکھتے تو اتنی سی عمر میں کیا کہہ سکتا ہے اور ابھی تو بہت آگے جا رہے تھے۔ ہم جانتے ہیں۔ بات کے پائوں پائے میں سی نظر آ جاتے ہیں۔ رہیں جیسے غیبت تو بس کیزے کوڑے ہیں۔ سی رہے ہیں دیکھتے ہوئے لوگوں کے پائوں میں پڑے ہوئے۔“

”سیاست کہ۔ ہم جیسے ہوں کے بارے انسان اس زمین پر سکون کی طرح لڑ رہے ہیں۔ زر، زن اور زمین کے لیے ایک دوسرے کے مقابلے پر ہیں۔ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ہم اسے کوہوں ہیں کہ طاقت حاصل کرنا ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہم حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے جیسے انسانوں پر۔ بھی انسانوں پر بھی کھلیں۔ بھی دلوں پر تو بھی جنموں پر۔ تو دل کا بادشاہ ہے۔“

”اے کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیوں کہن لگا رہا ہے مجھے؟“ ”رہیں۔ میں نے کہا تھا مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ایک دوست۔ ایک مشیر کی۔ ایک بھائی کی۔ مددگار کی اور راستہ دکھانے والے کی۔“

”میں یاد رہیں تھکا ہوں کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کچھ سالہ خروکشی کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکتا ہے ہم میں اتنی بہت سی نہیں ہے پارہ کہ خواب دیکھیں۔ تو تعبیر کے پیچھے دوڑنے والا آدمی ہے اور تمہارے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ہم کیا مضمون دے سکتے ہیں تجھے اور تمہاری خاک رہنمائی کر سکتے ہیں؟ ہمارے لیے تو دوستی بھنا بھی پڑی آزمائش ہے۔ ہم اتنا تمہارے پاؤں کی زنجیریں چاہیں گے زمین پر دیکھنے والے کیزے اور اپنے علامہ اقبال صاحب کے شاہین کی کیا شکست۔ تو شاہین سے میرا کر پھاڑوں کی چٹانوں پر۔ نہیں رہنے دے اسی مانی میں ہم اسی میں خوش ہیں۔“

مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ ”رہیں۔ تو میرا دل توڑ رہا ہے۔“

”تمہارا دل توڑنے والی چیز نہیں ہے۔ میرا سب سے سخت چمر ہوتا ہے اور کبھی بھی تمہارا میرا ہے۔“

”تو انکار کر رہا ہے میری دوستی سے۔“

”دوستی سے نہیں۔“ وہ تڑپ کے بولا ”دوستی دل میں ہے جان کے ساتھ۔ تو ماننے یا نہ ماننے میں دل سے چاہتا ہوں کہ کسی دن تو وزیراعظم بن جائے۔ وہ بات سچ ہو جائے جو جیم خانے کے ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے سے کہی تھی۔ اور میں جانتا ہوں کہ تو یہ سچ کہہ سکتا ہے۔ قسم اللہ کی کہ سب سے زیادہ خوشی میں ہوگی جب ہم کسی سرک کے کنارے کھڑے ہوں گے اور تمہارا جلوس گزرے گا۔ آگے موٹر سائیکلوں والے ہوں گے پیچھے ہمتی سی جم کر کئی گاڑیاں اور ایک گاڑی میں ہمیں نظر آئے گا اپنا پارٹنر۔ اس گاڑی پر جھنڈا لڑا رہا ہوگا۔ ہم تانیں گے کسی کو کہ اپنا لنگھنا تھا۔ لیکن کا دوست تھا۔ ہنسنے والے نہیں گے ہنسنے رہیں سالے۔ دنیا والے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ان کے ہنسنے سے کچھ تو نہیں بدلے گا اور نہ ہماری خوشی کم ہوگی۔ اپنی دعائیں پیش کرے لیے ہوں گی پارہ۔ اور برائیاں ماننا۔ رہیں تو اس وقت بھی غیبتی ہی ہوگا۔ تمہارے جذبات سے نہیں ہوں گے۔ تمہارے آگے پیچھے پڑے رہیں ہوں گے۔ غارتگری رہیں۔ راتوں رات بن جائے والے رہیں۔ رہیں۔ رہیں جاگیردار تاجر اور صنعت کار۔ رہیں ڈاکو اور اسلحہ۔ تجھے یہ غیبت یاد بھی نہیں آئے گا۔“

میں نے غصے سے کہا ”تو اس مت کہ میں تجھے ساتھ ضرور لے جاؤں گا۔ تو اپنی مرضی سے نہیں جائے گا تو زبردستی لے جاؤں گا۔ تمہارا ہوں تو مجھے انکار کرتا ہے۔“

رات ہو گئی تو ہم تھک کے نمر کے کنارے چلے گئے۔ وہاں ایک ریزمی والا جگہ کھپ چکا تھا۔ اس کے تان ٹھنڈے اور

خست تھے مگر کباب مزے دار تھے۔ رہیں نے مجھے بتایا کہ یہ اس کا پارٹ نام پڑن تھا۔ وہ دن میں بیگ مانگتا تھا۔ اس کی بڑی کبابوں کا سالنا تیار کرتی تھی اور وہ شام کے وقت ریزمی لگے کے کباب بیچتا تھا۔ رات گیارہ بار بجے تک دوڑتی کمانی کر لیتا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا ”جب یہ عزت سے کما سکتا ہے تو پھر بیگ کیوں مانگتا ہے؟“

”تمہارے دماغ میں یہ سوئی ہی بات کیوں نہیں آتی۔ اے عزت کی نہیں پیسے کی ضرورت ہوتی ہے سب کو۔ عزت سے پیسہ نہیں بھرتا اور کچھ نہیں ملتا۔ ہم جیسے عزت کو کیا کریں؟ چاہیں یا سر پر سجائیں۔ سالے کو کھی کار اور تیش کے بغیر عزت کی بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے پڑ نہ ہوں مگر کوئی اڑنے کی بات کرے۔ یہ بھی دولت کمانے میں لگا ہوا ہے۔ آج ملٹی بھر کے مل رہی ہے کل بھولی بھرتے لے۔ پھر یوں بھر بھر کے آئیں گی۔ اور اسی صاحب سے عزت بڑھتی جائے گی۔ ایک بات ماننا تجھے یہ کباب کی ریزمی تو ایک ٹھکانا ہے۔ یہاں ہم جیسے صرف کباب کمانے آتے ہیں مگر یہ جو کاکا ڈکا گاڑیوں والے آ رہے ہیں۔ انہی کے لیے یہ ریزمی لگانا ہے۔ وہ کباب نہیں شباب خریدتے ہیں۔“

میں اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا ”شباب خریدتے ہیں؟“

وہ میری صورت دیکھ کے غصے پڑا ”اے نہیں کیا فاری بول رہا ہوں۔ ابھی تمہارے پاس ہوتی انکار سے مارتی کبھی سی گاڑی اور جب میں ہوتے ہرے ہرے نوٹ تو جیتے تھے دماغ میں بھی یہی آتا تو میں اس کبابی کے پاس اپنی گاڑی روک کے پوچھتا کہ ہاں بھی کیا ہے لاؤ کچھ کباب شباب۔ اور گاڑی کی نظر دیکھ کے یہ سوال کرنا کہ سربتی“ حکم کرو۔ کباب چاہیے کہ شباب۔ شریف آدمی نکل آئے غلطی سے تو کوئی بات نہیں۔ مذاق میں بات نہ کرورنہ گاڑی کا سراسر سوال کرتا ہے کہ کباب تو اچھے لگتے ہیں دیکھتے ہیں۔ شباب کیا ہے؟ بس اس کے بعد معاملہ پٹ جاتا ہے۔ یہ سو کا ایک نوٹ۔ یہ کیسیشن لپٹوانا لیتا ہے اور گاڑی کو تیار کرتا ہے کہ کباب کس کا ہے کیا ہے اور کہاں ہے؟“

”اسے کیسے معلوم ہوتا ہے؟ کون ہے وہ آخر؟“

”یاروئے تو یہ سارا دن محوم بھر کے بیگ مانگتا نظر آتا ہے۔ مراحل میں کچھ اور بھی کام کرتا ہے سالہ۔ پتا نہیں کہاں کہاں جاتا ہے۔ کچھ عورتیں واقعی منجور ہوتی ہیں۔ مردان سے یہ وعدہ کرتا ہے۔ یا مرد کاتے نہیں۔ معذرت ہوتے ہیں اور شے کے نامی۔ عورتوں کو اس لائن پر لگا دیتے ہیں۔“

”پتی بیویوں کو؟“

”نہرمان مت ہو بیٹے۔ دنیا بڑی خوب صورت لگتی ہے دیکھتے۔ لیکن اس میں کس کس کی صورت دیتی ہے کہ کہن آتی ہے۔ صرف بیویاں نہیں۔ بہنوں اور بیٹیوں کو آسان کمانی کا راستہ

دکھانے والے بھائی ہیں اور بے غیرت باپ ہیں۔ لیکن ایسے کس بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عورتیں شوق فکار ہیں۔ اپنی مرضی سے یہ کام کرتی ہیں۔ اس کو سب کے نام ہے اور ملٹی فون نمبر تک معلوم ہیں۔ اکثر شریف اور عزت دار مرد گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔“

”کمال ہے۔ تو انہیں شریف اور عزت دار سمجھتا ہے۔“

”اے الو کی دم خانہ۔ میرے کچھنے سے کیا ہو گا۔ لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔ وہ جہاں رہتی ہیں وہاں آپس پاس رہنے والے رہتے دار اور ملنے والے ایسا سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں سب ایسی ہی لگتی ہیں۔ کچھ غلوں کی ایکسٹرا ہیں۔ ان کو پھوڑ کے باقی دفتر میں کام کرتی ہیں۔ کوئی ملٹی فون آپریٹر ہے۔ کوئی نرس یا نیچر۔ بھر کالج کی لڑکیاں ہیں۔ باپ باپ غریب ہونے کے باوجود پڑھاتے ہیں۔ وہاں دولت مندوں کی لڑکیوں کے فیض اور دین سن دیکھ کے بکڑ جاتی ہیں۔ بگاڑنے والے بہت ہیں جو موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ گرو کالجوں کے آپس پاس منڈلانے والے کیزے ہوئے رہیں زادے انہیں گاڑیوں میں ٹھکاتے پھرتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں لے جاتے ہیں۔ تجھے تعارف دیتے ہیں اور شادی کے وعدے کرتے ہیں۔ پھر لڑکی کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔“

میں نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جو دفتر اور اسکولوں یا اسپتالوں میں کام کرتی ہیں۔ تنخواہ کتنی ہیں۔“

”کیا ہوتی ہے تنخواہ؟“ ”اچھا صاحب!۔“ وہ طعنے بولا ”ایک نرس یا پارٹنر کی تنخواہ تو کیا کہتا ہے آخر؟ بعض ایسی ہیں کہ ان پر زدنے داراں ہیں۔ مگر کے اخراجات کا بار ہے۔ لیکن زیادہ مسئلہ ہے ان کا جن کی خواہشات ان کی آمدنی سے بہت زیادہ ہیں۔ لاہور جیسے شہر میں وہ کے آدمی آئیں۔ بند نہیں رکھ سکتا۔ ہم بھی دیکھتے ہیں مالی شان کو لیاں اور کاریں۔ بڑی بڑی کالوں کے شو رومز میں سما ہوا مال۔ خوب صورت کیزے اور زیور ہیں تو نہیں بھگاتے مگر عورت کو رچھاتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہمیں کوئی پوچھتا نہیں۔ عورت کے پاس اس کا جسم ہے جس کے خریدار بہت عزت آہو کے پکر سے نکل جاتے تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور عزت تو ان کے پاس بہت ہے جو غریب ہیں۔ جو حرام حلال اور جائز و ناجائز کے فرق کو دیکھتے ہیں۔ دنیا کے کام چلتے ہیں ان کاغذ کے پرزدوں سے جن پر لکھا ہوتا ہے انٹرنیٹ بینک کی خدمات سے جاری ہوا۔ شرافت کی سند ہے نہیں۔“

میں نے غصے اور افسوس سے کہا ”ایسا ہی ہے تو پھر کوٹھے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔“

”مسک دہی ہے عزت کا۔ ماں باپ کی عزت۔ خاندان کی عزت۔ اتنی رنگائی ہے۔ غیر رنگائی تو رہتی ہے بیٹہ۔ بس آہستہ آہستہ آدمی کو غریبی سے عزت ہوتی جاتی ہے۔ وہ سچتا ہے کہ اپنا مکان ہو۔ آرام سے رہنے کی جگہ ہو۔ مکان ہو تو بیویوں میں دیکھ کمانے کے بجائے موٹر سائیکل یا کار لینے کا خیال آتا ہے۔“

عورتیں زیادہ خواب دیکھتی ہیں اور جب تعبیر اپنے ہاتھ میں نظر آئے تو پھر پتہ چلتی غرت کی دلدل میں زندہ رہنا مشکل لگتا ہے۔ اتنی بہت ہی نہیں ہوتی کہ خود اپنا سانس پور دھکا کے بیٹھ جائیں اس بازار میں۔ پورے خاندان کی رسوائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ چوری چھپے اپنے کا دبا ہوا چلتا ہے اور جیسے اسکی ہوا مال دکان میں سب کے سامنے نہیں ہوتا ایسے ہی یہ مال چوری چھپے بٹکا ہے۔ خریدار تو بچتی ہی جاتے ہیں حاشا کرتے ہوئے۔

میں نے ان کی معلومات کی وسعت پر اٹھ کر ہاتھ دیا۔ وہ خود کو آن پڑھ لکھا تھا اور ٹھیک ہی تھا کہ اس نے اسکول شاید چھٹی ساتویں کے بعد ہی چھوڑ دیا تھا مگر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کاغذی ڈگریوں پر حاوی تھا۔ وہ قلمیں بہت دیکھتا تھا۔ رسالے اور ناول بہت پڑھتا تھا اور بلاشبہ ذہن اور حساس تھا چنانچہ اس کی گفتگو کا انداز پڑے لکھوں جیسا تھا۔

میں اس کی باتیں سنتے ہوئے کبالی کو دیکھ رہا تھا۔ ہم نہری سڑک سے کچھ فاصلے پر غریب کی جانب ہموار زمین پر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیٹھ بننے والی نہری کے پانی کی نمی اندر ہی اندر زمین میں جذب ہوتی تھی۔ اس سے اوپر کی زمین پر خود دو گھاس کے سرسبز لان بن گئے تھے اور کچھ لوگ بیٹھے بھی بیٹھے ہوئے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ یہ دھرم پورے سے شاہیار جانے والی سڑک تھی جس پر آدھی رات تک ٹرک رول دوں رہتی تھی۔ کچھ آگے چلنے کے بعد بہت سے گول گچے فروخت کرنے والوں نے ایسی ہی جگہ پر بیڑیں ڈال رکھی تھیں۔ ان کی ریڑھیاں ایک قطار میں نظر آتی تھیں اور یہاں گاڑیوں والے بھی رگ جاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں اس کبالی کی طرح ان کا بھی بڑس کچھ اور نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ ہزاروں میں ایک غلط کام کرتا ہے تو بدنام سب ہوتے ہیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے کباب شباب کے خریدار گاڑیوں میں آئے اور چلے گئے۔ کباب کھانے والے تو گھرے اور کباب کھانے بیٹھ گئے یا ساتھ لے گئے مگر کبالی خریداروں کے پاس جا کے کبالی نے چند منٹ بات کی پھر وہ رخصت ہو گئے۔

میں نے کہا "یہ حرام زادہ تو بڑی کمائی کر رہا ہے۔"

وہ نہیں بولا "ہاں۔ بلکہ مانگنے سے سو دو سو کماتا ہوگا۔ شاید اتنی ہی کباب بچ کے گھر دوسرے دھندے میں اسے ہزار بھی مل جاتے ہوں گے۔ سینے میں تمیں چالیس ہزار بنالیتا ہے۔ دس ہزار دتا ہوگا اور والوں کو پانی اپنے۔ یہ عزت کو دیکھو یا کمائی کو۔ جب لاکھوں جمع کر لے گا اسی طرح تو پھر کوئی بڑا بڑس کرے گا۔ کباب شباب کے ساتھ شراب کی اسپورٹ ایک سپورٹ اور یہ بڑا آدمی کھلائے گا۔ جسے سب سلام کرتے ہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا میں قسمت نیچتا ہوں ایسے بڑے آدمی پر۔ ان سے وہ غریب بڑا ہے جو نفسانی خواہشات سے مغلوب نہیں ہو۔

خود داری اور قناعت کے ساتھ اپنے آپ سے شرمندہ ہوئے بغیر جیتا ہے۔"

"یہ ذرا سے بڑی مدت کر میرے سامنے۔" وہ نہیں میرے ساتھ چلنے کا "دنیا کے سامنے جو تیار کیا جا رہے کہ۔ یا دلوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ خود تو کتنا شریف ہے۔ قناعت کی بات کرتا ہے ہم سے سارے "ایسا قناعت پسند ہوتا تو زندگی گزار دیتا اسی جہنم خانے میں۔ اور اس ڈاکٹر کے گھر میں تو سب کچھ حاصل تھا مجھے۔ خود ڈاکٹر نہیں۔ کر عزت کی زندگی گزارنے پر قناعت کیوں نہیں کی۔"

میں نے اپنا کزور دفاع کیا "جتنی سب کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسے؟" شرافت اور عزت کے ساتھ؟" وہ طنز سے لہجے میں بولا "اتنے جو کچھ آج تک کیا اس پر تو شرافت کا ٹیبل لگا سکتا ہے مگر یہ جلسہ سازی ہوگی۔ جیسے کوئی رنگ پٹنی پانی میں گھول کے مدح افزا کا ٹیبل لگا دے۔ تو نے اپنی عمر اور بہت کے مطابق سارے جھنڈے دی استعمال کیے ہیں بٹا جو آج کاسالی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ پونے دو لاکھ کیسے جمع ہو گئے تھے بیک اکاؤنٹ میں۔ کیا یہ جائز اور حلال کی کمائی تھی۔ جب موقع ملا تو ان لوگوں کی شرافت سے فائدہ اٹھایا۔ انہیں بیک میل کیا۔"

احساس ذلت سے میرا چہرہ سرخ پڑ گیا "کیوں اس کرتا ہے تو۔"

"بچ کو مان کم سے کم اگر بول نہیں سکتا۔" وہ نہیں چلا کے بولا "تیری اپنی خواہشات کیا ہیں؟" مجھ سے تو خواہشات کے بے لگام اندھے ٹھوڑے پر سوار ہے۔ تو وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔ آج کتا ہے میں بہت بڑا آدمی ہوں گا۔ سینہ داؤد اور اسکی کھال مثلاً دتا ہے تو نے ڈاکٹر کے گھر میں کیسے جگہ بنائی۔ ہم جانتے ہیں تو ناصر کے بچا کو کیا سزا دینا چاہتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے تو نے ریلواریں چوری کی تھیں؟ بول۔ اس کبالی کو بڑا کرنے سے پہلے اسے کریاں میں جھانک کے دیکھ۔ تو کون سے راستے پر چل رہا ہے۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لے۔ اگر تو نے شاد کو بیک میل کیا۔"

میں نے اس کے سر پر مکا مارا "جان سے مار ڈالوں گا میں تجھے۔"

وہ نیچے گر گیا اور مجھے دیکھتا رہا "ہاں۔ اس ریلواریں کیسے گولی اپنے دوست پر چلائی تھی ابھی کچھ دیر پہلے تو ساتھ چلنے کے لئے کہ رہا تھا۔ پھر میری لاش نہیں میرے ہمارے۔ مگر کیا اس سے بچ فتم ہو جائے گا یا بدل جانے گا۔ نہیں ناصر اس سے تو دنیا میں اکیلا ہو جائے گا۔ مجھے کوئی نہیں اپنا ہے گا۔ تو رشتوں سے محروم رہے گا۔ ایک دن شاد بھی بچان جائے گی تجھے۔ وہ خود تجھے چھوڑ دے گی۔ مجھے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

میں پلٹ کے چل پڑا۔ اسے وہیں چھوڑ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھ میں بہت نہ تھی کہ میں اس کے بچ کا مقابلہ کر سکتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے بچے رحم نہ کرے مجھے نکال دے اور

میرے چاروں طرف آگے کھڑے کر دیے ہیں۔ مجھے اب اپنے آپ سے نکالنا مشکل ہو گیا تھا۔

میں اس فقیر خانے میں پہنچ کے لیٹ گیا جہاں اس وقت میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں اور کیوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک میں نے شرافت اور ایمانداری سے زندگی میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی تھی مگر اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ میں بے ایمانی اور بد معاشری کو اچھا سمجھتا تھا اور انہی جیسا بننا چاہتا تھا جس سے مجھے غرت تھی۔ مجھے دولت کی یا اقتدار کی ہوس نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ جب تک طاقت نہ ہو انسان اپنے آپ پاس نظر نہ آئے والی اور محسوس ہونے والی برائی کو بھی ختم نہیں کر سکتا۔ جہنم خانے کا ایک چشم سوئی اور نکالی۔ ناصر کا بچا اور قاتلے دار چوہدری بغیر اور شادی ہی اس کبالی جیسے لوگ۔ قانون اور اخلاق کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے غریب اور کزور لوگوں کے خلاف ایک کر لیا ہے اور وہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ دولت سے طاقت آتی ہے اور طاقت سے خرابیاں جنم لیتی ہیں تو انسان کو اپنی بچان نہیں رہتی وہ شیطان بن جاتا ہے۔

میرے جذبات اس کے برعکس تھے۔ میں دولت اور طاقت اس لیے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والی ساری بے انصافیاں کا بدلہ لے سکوں اور اپنی عرومیں کا ازالہ کر سکوں۔ بڑے لوگوں سے منٹنے کے لیے نصیحت کا کرگ نہیں رہی۔ مذہبی محیضوں کی تعلیمات بے اثر ہو گئی ہیں۔ معاشرے کی اخلاقی قدریں کھوکھلی کر دی گئی ہیں اور قانون کو ایک ایسا جال بنا دیا ہے جس میں ہفت حشرات الارض کی طرح جینے والے حقیر اور فقیر انسان ہی پکڑے جاتے ہیں۔ خون آشام بھڑے زہریلے ناگ اور اژدہ اور موار خور گدھ اس کی گرفت میں آتے ہی نہیں اور آجکے تو بڑی آسانی سے جال توڑ کے نکل جاتے ہیں۔

میں جس راستے پر چل رہا تھا وہ میری خطی نہیں تھا۔ ایک بچے کی زبان میں جب میں نے کہا تھا کہ میں وزیر اعظم بنوں گا تو درحقیقت وہ میرے لاشعور میں بسی ہوئی خواہش بول رہی تھی کہ میں با اختیار بنوں گا اور پھر ان لوگوں کے لیے کچھ کروں گا جو خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے پاس حکومت کی طاقت ہوگی تو میں ساری خرابیاں دور کروں گا۔ برائی کو مٹا دوں گا۔ غرت کو دور کروں گا۔ انصاف کا بول بالا اور شیطان کا مٹ کالا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ بے شک یہ سب ناممکن تھا مگر ایک بچے کی آرزو کے خواب میں بھی اس کی سرشت میں شامل نیکی کا جذبہ نظر آتا تھا۔ وہ بیش کرنے کے لیے وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا تھا۔ آج بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ جائز و جرم کو یکسر کر دینا ایک بچانے میں قانون کی مدد کرنے کے لیے غیر قانونی طریقے استعمال کرنا چاہا نہیں۔ یہ فلسفہ ساری دنیا میں

راج تھا کہ اس کے لیے جگ ضروری ہے۔ میں نے بد معاشر بنا چاہتا تھا۔ اسنگر اور نہ بیک میل۔ دولت جمع کر کے بیش و عشرت میں بڑنے کی مجھے کوئی آرزو نہیں تھی۔ میں طاقت اور اختیار کی ہوس کا شکار نہیں تھا مگر میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ غالی ہاتھوں والے بے اعتبار رہے یا یہ اور بے وقوف اور کزور انسانوں کا جہرم صرف فریاد کر سکتا ہے۔ دوسکا ہے۔ تقدیر کو کوس سکتا ہے۔ دعا یا بد دعا کر سکتا ہے مگر مٹی بھر عالم طاقتور اور با اختیار لوگوں سے اپنے حق اور انصاف کے لیے جگ نہیں لاسکتا۔ مانگنے سے کچھ مل جاتا تو پھر عدالت اور وکالت کی کیا ضرورت تھی۔ سلاستی کو نسل اور پو این او کی کیا ضرورت تھی۔ اصول اور انصاف سے معاملات ملے ہوئے تو قانون یا غیر قانونی جگ کی فورت کی ہوس آتی۔

جب فقیر آئے گئے تو میرے خیالات کا کشل ٹوٹ گیا۔ میں اب مطمئن تھا۔ دلائل سے میں نے خود کو ان الزامات سے بری کر دیا تھا جو میں نے بچہ پر عائد کیے تھے مگر مجھے افسوس تھا کہ مجھے میں نے نہیں کر مار کے میں نے اچھا نہیں کیا۔ اس طرح تو میں نے تسلیم کر لیا کہ میں بچ کی عملی برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ غصہ جھوٹے الزام پر بھی آسکتا ہے۔

شادی نے سب سے مدد وصول کیا لیکن مجھ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ مجھ سے پوچھتا کہ آج دن بھر میں نے کیا کیا تو میں تمیں چالیس روپے ضرور اس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ لڑکا آج موجود نہیں تھا جس کے بارے میں شک تھا کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے۔ اس کے سامنے فقیر نے بتایا کہ اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ فٹ ہاتھ پر ہی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا۔ پھر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ میرا بھی خیال تھا کہ شادی بہت ناراض ہوگا اور حکم دے گا کہ اسے تلاش کرو مگر اس نے سہلے ہوئے کہا کہ اچھا کیا خود ہی بھاگ گیا ورنہ اس کا لبا علاج تھا۔ ہم کیسے کراتے تھے اس غیر انسانی رویے پر مددہ ہوا۔ شادی کے نزدیک وہ لڑکا صرف کمائی کی ایک مشین تھا۔ ٹھیک رہتی تو اس کی اہمیت تھی "اس پر حق ملکیت پر قرار رکھنا ضروری ہوتا۔ اب مشین کا گاہک ہو گئی تھی اور لڑکا خرچہ ناجی تھی۔ جان کی کوئی اہمیت نہیں مال اہم ہے۔

میں دروازے کا خاموش بیٹھا اس ساری قابل غرت کارروائی کو دیکھتے پر مجبور تھا۔ ایک پورا دن بھکاریوں کی دنیا میں گزار کے میری غرت اور بڑھ گئی تھی لیکن کرشتہ روز کے مقابلے میں آج میں اس خیال سے ہر سکون تھا کہ میرا زور ہو گیا تھا۔ مجھے یہ اطمینان حاصل تھا کہ میں اس نظام کا حصہ نہیں ہوں۔ کوئی مجھے یہاں میری مرضی کے خلاف نہیں رکھ سکتا اور نہ میں یہاں دوسروں کی طرح راضی برضاہ سکھ ہوں۔ میں نے اس آزمائش کو شادی کی شرط سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ چند دن کا تماشائی سی۔ اس جگہ چند دن گزارے جاسکتے تھے۔ میں اتنی قوت برداشت رکھتا ہوں۔

میں اس وقت چو کا جب ایک فقیر کو گھٹ کر اندر لایا گیا۔ اس کی ایک ٹانگ پر گھٹے تک بلا ستر تھا اور وہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس کو یوں گھٹنے سے پھینکے بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ کراہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے منہ میں کچھ ٹھوس کے پنی باندھ دی گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی کر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اسے شاہ جی کے سامنے فرش پر ڈال دیا گیا۔ شاہ جی نے اسے بڑی سفاک مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "سنا ہے ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تیری۔ گاڑی سے گر ہو گئی تھی۔" اس نے اچھا آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔ "اور... بڑی تکلیف ہو گئی پھر تو؟" شاہ جی نے اس کی ٹانگ کو ایک جیر سے دبا کے کہا "۳۳ کیا تو نے کہہ اپنا جا کے لیٹ گیا۔ کمانی کی کیا ضرورت ہے تجھے دولت مند ہو گیا ہے تو بہت مال آیا ہے۔"

زخمی فقیر تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ جتنا حرکت کرتا اتنی ہی ٹانگ میں تکلیف بڑھ جاتی۔ شاہ جی نے گرج کے اسے ایک گالی دی "آرام طلب ہو گیا ہے۔۔۔ لٹائی تھا تو بادشاہی مسجد کے سامنے جگہ خالی تھی۔ چار پیسے زیادہ مل جاتے۔ مگر اپنا جا کے لیٹ گیا۔ دوائی ملتی ہے کیا کسی نرس سے یاری ہو گئی ہے؟" فقیر نے انکار میں سر ہلایا۔ شاہ جی نے انہیں اشارہ کیا جو فقیر کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ فقیر کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ باقی سب بھی خاموش اور سسے ہوئے ساکت کھڑے تھے۔ شاہ جی کو ایک اونچ سوئی لوہے کی صلاح خوش کی گئی۔ وہ اسے ہاتھ میں تھام کے کھڑا ہو گیا۔ فقیر اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا مگر شاہ جی کے دوسرے اشارے پر اسے مضبوطی سے جکڑ کے بے بس کر دیا گیا۔

جب شاہ جی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو خود میرا سانس رکے لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں آگے بڑھ کے شاہ جی کا ہاتھ پکڑ لوں اور اس سے وہ فواد دیا اچھین کے اس کا سر بھاڑ دوں مگر غصے کی یہ دوا لگی محض خیال تک محدود رہی۔ دوسرے ہی لمحے شاہ جی کا ہاتھ حرکت میں آیا اور لوہے کی صلاح فقیر کی دوسری ٹانگ پر پڑی۔ وہ بڑی طرح تڑپا اور اچھلا مگر اس کا جسم کرب سے ٹل کھائے رہ گیا۔ اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی دب گئی۔ پنڈلی کی بڑی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی مجھے پکڑ سا آیا اور حلقی محسوس ہوئی۔ بے رحمی اور شہادت کا یہ مظاہرہ میرے اعصاب کی قوت برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ دوسرے فقیریوں نے اس سزا کو بڑے خوف زدہ چہروں کے ساتھ دیکھا تھا اور اب بہت بے کھڑے تھے۔

شاہ جی نے صلاح زمین پر پھینک دی۔ اس کی نخوس آواز خاموشی میں زیادہ کمرہ لگی "لے جاؤ اسے۔ اور کل اسے بادشاہی

مسجد کے گیت پر ڈال دو۔ کوئی دوا علاج نہیں ہو گا دو دن۔ اسے چلائے دو۔ آواز میں درد ہو گا تو اثر زیادہ ہو گا۔" جو اسے لائے تھے وہی مردہ کی لاش کی طرح اسے گھٹیت کر باہر لے گئے۔ جب وہ باہر گئے تو میری نظریں نے رئیس کو اندر جمائے رکھا۔ شاہ جی نے اسے دیکھ کے سر ہلایا اور اندر بلا لیا۔ اس نے قریب جا کے آہستہ سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر وہ شاہ جی کے ساتھ چلا گیا۔ باقی فقیر اپنے اپنے بستر بچانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ چٹنے ہوئے گئے اور قہقہے لگاتے گئے۔ اس واقعے کا ان پر عارضی اثر ختم ہو گیا تھا۔

چند منٹ بعد رئیس نے پھر دروازے کی اوٹ سے سر نکالا اور مجھے اشارے سے بلا لیا۔ میں باہر گیا تو شاہ جی ہاتھ پیچھے باندھے شکر کھڑا تھا۔ "سادگی۔ آپ اس سے پوچھ لو بے شک۔" شاہ جی نے مجھے دیکھا "تجھے سے کیا بات ہوئی تھی رئیس کی؟"

میں نے اسے ساری بات بتادی۔ رئیس مطمئن کھڑا رہا۔ میں نے اس کی رپورٹ کی تصویر کھدی گئی۔ شاہ جی کچھ سوچا رہا۔ پھر اس نے رئیس سے کہا "دیکھ۔ دیکھ۔ دیکھ۔ دار سے کھان کھان کھان سے مل لے۔ اچھا رہنے دے، میں خود چلا جاؤں گا۔ سامنے بات ہو جائے گی تجھ سے۔ تو اب جا۔" رئیس نے کہا "جی استاد! اور میری طرف دیکھے بغیر باہر کل گیا۔ شاہ جی نے جاتے جاتے مجھے پلٹ کے دیکھا "لے آیا اپنی کتا میں؟"

میں نے کہا "آج تو موقع نہیں ملا استاد جی۔ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟" شاہ جی رک گیا "کیا بات ہے بھول؟"

میں نے کہا "میرے تعلیم حاصل کرنے سے آپ کو دلچسپی کیوں ہو گئی ہے۔ کیا فائدہ فقیر کے بڑھا کھانے ہونے سے۔" "یہ تو تمہیک ہے۔ مگر تو تمہیک اگتا نہیں چاہتا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا۔ کچھ اور سوچ رہا ہوں میں تم سے لے کر دالے بہت سے کام ہیں۔ تمہیک کوئی بھی مانگ سکتا ہے۔ جا اب سو جا۔" وہ بولا اور پھر بیڑیوں میں غائب ہو گیا۔

اہم ذمے داری سونی جا سکتی ہے۔ یہی اندازہ رئیس کا بھی تھا۔ میں بہت دیر تک جا گئے کی کوشش کرتا رہا۔ انتظار مجھے شاید کا تھا مگر میں ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً وہ میری پراسرار کشیدگی اور خاموشی سے پریشان ہوں گے۔ ٹیکر صاحب نے کہا ہو گا کہ وہ کچھ بتائے بغیر صرف اتنا کہہ کر گیا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں اور پھر لوٹ کے نہیں آیا۔

میرا تمام سامان ڈاکٹر صاحب کے گھر میں اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ میری ساری جمع پونجی ڈاکٹر صاحب کی تحویل میں تھی۔ ان کا پریشان ہونا جائز تھا۔ کیا وہ مجھے تلاش کریں گے؟ میرے کم ہونے کی رپورٹ تھانے میں دن کر آئیں گے؟ یا اخبار میں تلاش کشیدہ کا اشتہار دیں گے۔ کیس انہوں نے اشتہار کے ساتھ میری تصویر بھی شائع کرادی تو شاہ جی کو میرے جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔ وہ ڈاکٹر مشہور سے خود بات کریں گے اور پھر شامت رئیس کی بھی آئے گی۔ میری تصویر انہیں میزک کے رجسٹریشن فارم پر مل جائے گی۔

اس پریشانی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کوئی جھوٹ بولوں۔ ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے کہوں کہ میں کراچی سے بات کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤں کہ مجھے ایک جاننے والے کے ساتھ دینی جانے کا موقع مل گیا ہے یا یہ کہ مجھے کراچی میں ملازمت مل گئی ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ایک دو روز میں واپس آکے ساری بات بتاؤں گا۔ وہ فضا ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا کہ میں نہیں بتاؤں گا۔ جاننے سے پہلے فون کیوں نہیں کیا تھا۔ اب بتا رہے ہو تین دن بعد جاننے ہو ہم کتنے پریشان تھے؟ ان سے ڈانٹ کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں معافی بھی مانگ لوں گا کہ مجھ سے غلطی ہوئی، وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں ان کو فون کرتا رہوں گا۔ جب شاہ جی کے ساتھ جانے کا پروگرام فاصل ہو جائے گا تو میں ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کے اجازت لے لوں گا رخصت ہونے کی۔ پھر اندھ نہ رہا۔ انکھا کروں گا اور سامان اٹھائے آجاؤں گا۔ وہ سب اچھے لوگ تھے۔ وہ یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کریں گے اور سمجھائیں گے کہ میں جلد بازی میں فیصلہ نہ کروں۔ ڈاکٹر صاحب کو افسوس ہو گا کہ میں ان جیسا نامی گرامی ڈاکٹر کیوں نہ بن سکوں۔ بچم صاحب افسردہ ہوں گی۔ میری وجہ سے ان کا دل بھل گیا تھا۔ خیر! اب دل بھلا نا آ گیا ہے تو کسی اور سے بھلا لیں گی۔

شاہ جی نے آہستہ سے کہا "شش۔۔۔ تو میں چونک کے اٹھ بیٹھا۔ دروازے میں ایک سایہ سا جھلک دکھائے غائب ہو گیا۔ میں اٹھا اور دے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ ششخدا فقیر اور اس کے ساتھ رہنے والا نور علی لڑکا نہ جانے کس بات پر ہنس رہے تھے ابھی جاگ رہے تھے۔

"اپنے ہینڈ نہیں آتی تو آجا میرے پاس۔۔۔ گولی دوں گا"

الکھ۔۔۔" مجھے سے میرا بڑا حال ہو گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا "میں پیشاب کرنے جا رہا ہوں۔"

"میلز تو ادر ہے۔" وہ مجھے گالی دے کے بولا۔ "ابا میرے۔" حمزہ دیر بیٹوں کا غصہ ہوا میں "میں نے کہا۔ شاہ دیاوار سے گلی گزرتی تھی۔" آج بڑا مشکل ہو گیا تھا اتنا۔ شاہ جی مجھے میں ہے فینکے کی وجہ سے۔ میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ انہیں ہینڈ نہیں آ رہی ہے۔

میں نے کہا "اندھ بھی ایک حرامی جاگ رہا ہے۔ پوچھ رہا تھا باہر کیوں جا رہے ہو۔ اسے شک نہ ہو جائے۔" "کل میں کام سے جاؤں گی۔" وہ بولی "رئیس کو معلوم ہے کہاں ملوں گی۔ آج تھراؤن کیسا گرا؟"

"بہت خراب۔ میں تمہاری وجہ سے یہ جیل کاٹ رہا ہوں شاہ۔ مگر کوئی بات نہیں" میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں تمہارے لیے۔ تمہیں نہیں آجائے گا میری بہت پر۔"

وہ میری باتوں میں سٹپ گئی "میں مجبور ہوں یقین کرنے پر۔ دل کی بات نہ مانوں تو کیا کروں؟ فیصلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے کبھی نہ کبھی۔"

"فیصلہ تو ہو چکا۔ اب دیر کیسی۔" وہ آہستہ سے بولی "دراصل ڈر لگتا ہے مجھے۔ کیا بھی عبت کرنا تھا لکھنے دار کی بیٹی سے۔"

میں نے کہا "شاہ جی۔ مجھے گالی مت دو میں دیکھا نہیں ہوں۔"

"دیکھا تو ہمارا جانے گا کتے کی موت۔ اور اسے مرنے کی جیسے کہنے کو مگر تو نے دنا کی میرے ساتھ تو میں خود مار ڈالوں گی تجھے کل کروں گی۔"

میں نے اسے چوم کے کہا "ایک بار نہیں ہزار بار قتل کرو۔ مجھے منظور۔"

میں۔
میں نے اسے قہقہہ دیا "یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ ہوتے ہیں۔ ہم اس شہر کو اس ملک کو بلکہ دنیا کو چھوڑ دیں گے اگر تم کوئی۔"
"یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ ابھی وقت ہے۔ ابھی طرح سوچ لے۔ بعد میں پچھتاؤ نہ پڑے۔ تم سے پاس نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ آمدنی ہے کوئی۔"
"شادی۔ تم کیا سمجھتی ہو آخر؟ کیا میں صرف باتیں کر سکتا ہوں۔ اپنی ضرورت کے لیے بہت سے میرے پاس اور میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں کسی مکان کا بندوبست کرتا ہوں۔ کوئی چھوٹا موٹا کرائے کا مکان مل جائے گا ایسی جگہ جہاں کوئی غلط نہ ہو۔"
اس کے چہرے پر نظرات کے سائے گہرے ہو گئے "دیکھ ناصر۔ میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں گھر میں رہوں گی اور باہر نکلتا پڑے تو بیوقوف اور اڑھ کے جاسکتی ہوں۔ تو کیا کرے گا کام کے لیے گھر سے نکلے گا تو جان میری عذاب کی سولی پر لٹکی رہے گی۔"
میں نے کہا "میں بھی طیبہ بدل سکتا ہوں۔ رازمی سوچ لگا کر۔"
وہ زہدستی مسکرائی "مجھے میزک کا امتحان بھی دینا ہے۔"
میں نے سر ہاتھ مار کے کہا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ابھی ہم ایک مینڈ ایسے ہی گزارا کریں گے۔ ورنہ شاہی مجھے امتحانی مرکز سے اٹھوالے گا۔ میرا میزک پاس کرنا بہت ضروری ہے۔ پاس تو نہیں ہو جاؤں گا مگر امتحان دیے بغیر نہیں۔"
"ایک مینڈ مجھے بھول جائے پڑ جائی کہ۔"
"مجھے شاہی نے بھی اجازت دے دی ہے بلکہ تاکید کی ہے مگر ہمیں بھلاؤں یہ ناممکن ہے۔"
"میں نہیں ملوں گی تجھ سے۔ جب تک امتحان نہیں ہو جاتا تو۔"
"تم نہیں ملو گی تو میں امتحان بھی نہیں دوں گا۔ کتابیں پھاڑ کے پینک دوں گا۔" میں منہ پھیر کے کھڑا ہو گیا۔
"یہ کیا پاگل پن ہے؟" اس نے مجھ منانے کے لیے اپنا سر میری کمر پر رکھ دیا۔ "میں تم سے فائدے کے لیے کمر دے رہی ہوں۔ اچھے نمبر آئے جائیں تو میرے دھیان پر حاضری کی طرف نہیں ہو گا تو اچھے نمبر کیسے آئیں گے؟"
میں نے پلٹ کے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا "شادی۔ اچھے نمبر لے کر مجھے کون سا کالج میں داخلہ لینا ہے۔ آگے میں پرائیویٹ امتحان دوں گا۔ ہم دونوں مل کے ایف اے پھر بی اے اور ایم اے کریں گے۔"
اس کی مسکراہٹ میں خوشی جھلکائی "میں پڑھتی ہی رہیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ شادی بھی کریں گے۔ اور بہت جلد کریں گے۔ تم اپنے گھر اور اپنے بچوں کے لیے۔"
اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا "مت کر ایسی باتیں۔ میں خوشی سے مددوں کی۔ ڈر لگتا ہے مجھے ایسے خواب دیکھتے ہوئے۔"
"صرف ایک مینڈ کی بات ہے۔ پھر یہ خواب بچ ہو جائیں گے۔"
"مجھے بتاؤ نہ کیا سوچا ہے۔ ہم کہاں جائیں گے تو کیا کرے گا؟ شادی تو بہت دور کی بات ہے ابھی۔" وہ ایک دم بے بسی ہو کے مجھ سے الگ ہو گئی۔
"پہلے تو میں جاؤں گا ڈاکٹر صاحب کے پاس۔ ان سے کون کا کہ میں اب ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں جا رہا ہوں کراچی۔ وہاں مجھے تو فری لنگی مل گئی ہے۔"
"وہ نہیں مانیں گے میزک کیا نہیں تو فری لنگی مل گئی۔"
"خیر کچھ اور کمر دوں گا۔ جھوٹ تو بولنا پڑے گا کوئی ایسا کہ وہ ساری رقم نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ جس دن ہمیں جانا ہو گا اس دن تم بھی اپنی ساری رقم بینک سے نکالو لیتا۔"
"ساری رقم؟"
"ہاں۔ کتنا پیسہ ہے تمہارے اکاؤنٹ میں؟"
"تین ساڑھے تین لاکھ ہے۔ میں نے پیشہ پیر جمع کروایا ہے۔ نکالا بھی نہیں۔"
"پھر کیا ہو۔ جس لاپسہ ہو وہ نکالو اسکا ہے جب چاہے۔" میں نے کہا۔
وہ ہولی "مگر کیش۔ کس بینک نمبر کو ٹھک نہ ہو جائے اس کے لیے ایک ہفتے پہلے نوٹس دینا پڑتا ہے۔"
"کیا وہ شاہی کو بتا دے گا؟ انہیں جانتا ہے وہ؟"
"نہیں۔ جس نے اکاؤنٹ کھولا تھا وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد کسی فیچر بدل گئے۔ پھر بھی آج کل اتنی بڑی رقم کوئی لڑکی نکلائے تو خطرے کی بات ہے۔"
"یہ ٹھیک کہا تم نے۔ اس کے طریقے بہت ہیں۔ ابھی کوئی جلدی بھی نہیں۔" میں نے کہا "میرے نام بینک ڈرافٹ یا پی آرڈر بنوانا ورنہ ایک کراس چیک دے دیتا۔ میں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دوں گا۔ تمیں بینک نہیں جانا پڑے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک ہفتے پہلے رقم میرے حساب میں جمع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نکالو انہیں گے اور ساری رقم ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔"
"کیا انہیں شک نہیں ہو گا؟ انہیں نہیں معلوم کہ میرے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟"
"میں سوچ میں پڑ گیا۔" معلوم ہے۔"
"وہ ساڑھے چار پانچ لاکھ نقد تمہارے حوالے کر دیں گے؟ کچھ

پوچھے بغیر۔ وہ تمہارے کسی جھوٹ سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ زمانہ اتنا خراب ہے کہ بڑا توئی اتنا کیش لے کے نہیں بھرتا۔"
"کچھ میں بھی نہیں ہوں۔"
"کانوٹی طور پر ثابت ہے ابھی۔ جعلی نام سے اکاؤنٹ کھولنا بھی مشکل ہے آج کل۔" شہنشاہی کا ڈوکی ضرورت پڑتی ہے اور ایک حوالے کی۔"
"مجھے معلوم ہے۔ میں سوچ لوں گا کوئی طریقہ۔"
میری بات سن کر ہونے سے پہلے ہی کوئی سائے کی طرح حرکت کرتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ اندر اس ہال کی طرف سے آیا تھا جہاں فقیر سوئے پڑے تھے۔ شاد پلٹ کے ہما کی لیکن وہ ڈو کے اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے خوف اور دہشت سے شاد بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

○☆☆○

عظیم خوف یا دہشت سے بے ہوش ہو کر نہیں گری تھی۔ نہ وہ عام قسم کی بھلائی اور کم بہت لڑی تھی اور نہ صرف فیشن میں یا شہرت کے لیے مصافحہ کا پیشہ اختیار کر لینے والی صحافی۔ یہ سلا موقع نہیں تھا کہ جب اس نے قبرستان میں عدالت کے حکم پر دوبارہ کئے جانے والی پوسٹ مارٹم کی کارروائی دیکھی ہو۔
کئی دن پرانی لاش کو قبر سے پھر کھود کے نکالنے والے کچھ لوگ بھی کام کرتے ہیں خواہ وہ گورکن ہوں، عین چر یا لاشوں کے خریدار۔ خاک میں مل جانے والے آدمی خالی کے بچے کچھے اعضاء جسم سے دوبارہ اس کی موت کے اسباب کا تعین کرنے والے ڈاکٹر بھی یہ کام خالص پیشہ ورانہ ہے کسی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں اور ایسے پر سوچ پر کچھ جنس پسند صحافی بھی پہنچ جاتے ہیں مگر کسی بد رویتی، مکتی سڑتی اور DECOMPOSE ہونے کے عمل سے بیزیت بدلتی لاش کا نظام ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ خصوصاً ان کے لیے جو اسے زندگی میں دیکھ چکے ہوں۔ وہ پھر دنیا میں نمودار ہوتا ہے تو اسے دیکھنے والی انہیں وحی ہوتی ہیں اور دنیا میں سب کچھ دیسی ہو آ ہے جیسا تھا۔ سوائے خود اس کے۔

مدح کیا ہے اور مدح کے بغیر جسم کیا ہے؟ کیا ہوتا ہے جب ان کے الگ ہو جانے کے بعد ایک شخص کو چھوٹ لے دوڑھائی فٹ چڑے اور زمین کی گہرائی کے بستر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ کیا وہی دوسری دنیا ہوتی ہے؟ یہی ہے یہ وہ سری دنیا؟ وہاں جا کے لوٹ کر آنے والا خود تو نہیں بنا سکتا۔ اس کی حالت کیا بتائی ہے۔ مرنے کے بعد قبر میں کیا ہوتا ہے؟

اس پر خوف پر جنس اور پرمجرت سوال کے جواب بہت سے ہو سکتے ہیں۔ کچھ کی بنیاد مذہبی عقائد پر ہے۔ کچھ مصلحتی حقائق کو تجربے اور مشاہدے کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ ادھام پرتی پر مبنی ہیں یا پھر تصور کا آجیب ہے جو وقت کی آہٹ کے

ساتھ خیالوں کا چھپا کرتا ہے۔ مگر وہ جو زندگی کا ایک دن تمام ہو جانے کے بعد سوئے کے لیے انہیں بند کرتا ہے، کسی فٹ پانچ کے چھریلے چہرے۔ گھاس پھوس کے ڈھیر یا اڑکنڈہ کمرے کی راحت میں آنکھیں محبوب سے زیادہ نرم گرم ریشمی بستر پر وہ صرف آنے والے دن اور اس کی جدوجہد کے محصولات پر غور کرتا ہے۔

اس کے باوجود ایک بار دفن ہو جانے والے کو پھر بھی نکال کر دیکھتے ہیں، وہ سوچنے پر مجبور ضرور ہوتے ہیں کہ یہ زندگی جو اتنی خوب صورت اور پرمکش ہے، اتنی متحرک اور فعال قوت ہے۔ زمین سے خلا کی دست تک گہرے سمندروں میں اور پانڈوں کی اذلی برف پر اور کائنات میں ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ محسوس ہوتی ہے اور خیال سے حقیقت تک ایک سی تسلسل کا نام ہے اس کا انجام ایسا ہوتا ہے؟

جنہم نے موت کو عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ بس نرین یا ہوائی جہاز کے حادثات، دہشت گردی اور تحریکی کارروائی، سیلاب اور زلزلے، جنگ اور قحط، زلزلے اور زمین کے جھڑپے۔ یہ سب عام آدمی زندگی کے روز مو معمولات کی طرح لی دی کی خیالوں میں اور قلموں میں دیکھا تھا اور قبول کرتا تھا۔ اس کا جذباتی رد عمل زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے بھی بڑے بڑے موٹے سڑک کے کتے تھے۔ سب قریب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ لیکن پہلے کے مقابلے میں اب انسان کا الیہ ہو گیا تھا۔ ایک فرد کا یا زیادہ سے زیادہ ایک خاندان کا اور ایک دن یا سو گم کی فاقہ تک۔

جنہم خود اپنے حلقے میں شیطان کی طرح بدنام تھی۔ وہ ان محدودے چند لوگوں میں تھی جن کے خون میں ہی مصافحہ کے جراثیم شامل ہوتے ہیں اور جو کسی ڈگری کے بغیر مصلحت اپنے جنون میں مصافحہ کی راہی پر غار کی خاک جھانٹے پھرتے ہیں۔ وہ چھٹی یا کا کوئی سے ڈبٹی ہو تو اور بات ہے مگر موت کے تکمیل سے ڈرنے والی وہ نہیں تھی۔ اس کا تھوڑا بہت تجربہ مجھے بھی تھا۔ میں نے اس کا ایک فیچر دیکھا تھا جو اس نے سرکاری مردہ خانے میں پڑی ہوئی لاشوں پر بنایا تھا اور لارڈ فرار دی جانے والی لاشوں کی خرید و فروخت پر لکھا تھا۔ اس نے تو کسی اور موری لاشوں اور اسپر پارٹس کے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے۔ انسانی اعضاء کی تصاویر اتاری تھیں۔ وہ مردہ خانوں سے قبرستانوں تک رات کو چوری میچے اور اکیلی دیکھ بھلی تھی اور زور نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھی۔

یہ شاہ عالم کی لاش دیکھنے کا جذباتی صدمہ تھا جس نے اس کو ہوش و خواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ دوسرے پوسٹ مارٹم سے پہلے وہ ایک امید کے سارے پر زندہ تھی کہ اصلی اور نقلی شاہ عالم کا فرق سامنے آنے کا تو ثابت ہو جائے گا کہ مرنے والا نقلی تھا۔ اصلی شاہ عالم دائمی باقی باگ کا ٹک اور سنگ پور میں تھا۔ وہی سب کے

سانے ہوئی جواز سے اُترا تھا اور پھر زمین سے لاہور پہنچا تھا۔ جسے لوگوں نے شاہ عالم سمجھ کے مارا تھا وہ اس کا کوئی ہم شکل تھا اور شاہ عالم نے اسے استعمال کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اصل شاہ عالم روپوش ہے اور بالآخر سامنے آجائے گا۔ دوسرے پوسٹ مارٹم کا سارا چکر ہی ختم کا چلا ہوا تھا۔ اس نے اس سے پہلے شاہ عالم کے ذیل رول کو نوٹ کیا تھا۔ بعد میں بہت سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ اس شک نے رائے عامہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سیاسی حلقے تحقیقات کا مطالبہ کرنے لگے اور حکومت کے لیے بھی حقیقت کا پتہ چلانا ناگزیر ہو گیا۔ اس مرحلے پر تیمور کے اعلان نے زیادہ مستحکم پیمانی کی کہ شاہ عالم زندہ ہے اور مرنے والا شاہ عالم نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک پریس کانفرنس میں خود نمودار ہو کر بہت برا دھماکا کر دیا تھا۔ وہ دھماکہ سمجھائی تھے اور کسی حد تک غیر مستحکم بھی گمان کی روپ رٹ کو سفید جھوٹ قرار دینا ناممکن تھا۔ دوبارہ ہونے والے پوسٹ مارٹم کی خبر پر بھی اخباروں کے خصوصی صفحے شام تک شائع ہو گئے تھے۔ دیکھا کہ سمیت کم لوگوں نے تھا مگر ”صدقہ ذراغ“ سے ملنے والی اطلاع ایک جھجکی دھماکتی سرخی بن گئی تھی کہ شاہ عالم شہید کی لاش بالکل آواز اور اصل حالت میں برآمد کی گئی تھی اور اسے ”سکیورٹی“ لوگوں نے دیکھ کے شافٹ کیا تھا۔ یہ بھی صحافتی مبالغہ آرائی تھی۔ وہاں سیکورٹی لوگ ضرور تھے مگر وہ سب دور تھے اور صرف غریبے بازی کر رہے تھے۔ قریب آنے کی اجازت مشکل سے تھی افراد کو کوئی بھی جن میں ڈیوٹی مجسٹریٹ میڈیکل بورڈ کے اراکین اور صحافی سب شامل تھے۔ میڈیکل بورڈ کے چیئرمین نے چالاک صحافیوں کے سامنے کوئی حقیقی بات نہیں کی تھی مگر اس کے جوابات سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا تھا کہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے سے بھی ثابت ہو گیا کہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے کا سرکاری اعلان دو چار دن میں کر دیا جائے گا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ”آج کل لاشوں کو کیمیائی عمل سے محفوظ رکھنا کوئی مشکل نہیں۔ بہت سے سیاسی لیڈروں اور عوامی شخصیات کو تدفین سے پہلے کن دن عام دیدار کے لیے رکھا جاتا ہے اور سرکاری اعزاز کی تقریب تک ان کی لاش بالکل تروتازہ حالت میں رکھی رہتی ہے۔ لیکن اور ماؤزے تک کی لاشیں آج برسوں بعد بھی اصل حالت میں ایسے رکھی ہوتی ہیں کہ وہ مرنے سے زیادہ خوابیدہ لگتے ہیں۔ شاہ عالم کی لاش کو بھی کیمیائی عمل کے ذریعے کچھ عرصہ تک محفوظ رہنے کے قابل بنادیا گیا تھا۔ اس کا تاہوت بھی ایسے نظر آتا ہے وہ زندہ ہو۔ کوئی اچھے کی بات نہیں تھی مگر یہ بات عام ہوئی تو پائی کی غائبانہ عزائم رکھنے والی قیادت نے اس کی بھرپور تفسیر کی اور اس سے پورا فائدہ اٹھا لیا۔ کسی کے شہید ہونے کی اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی۔ علامہ گل محمد پشاور کی فٹوے کو اب گویا قدرت نے بھی سند عطا کر دی تھی۔

پائی میں ختم اور قریبی کاروبار واضح طور پر الگ ہو گیا تھا اور شاہ عالم کی موت کی تصدیق ہونے کے بعد ان کی سیاسی دوڑ دھوپ تیز ہو چکی تھی مگر ستر تائب مدد تیمور نے ان کی کامیابی کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ تیمور کے ساتھ پائی کا جنرل سیکرٹری اشرف بھی تھا چنانچہ اکثریت کو وہی کنٹرول کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ختم اور قریبی نے بہت نہیں باری تھی۔ وہ اب بھی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ فوری طور پر ختم پائی کا چیئرمین ہو سکتا تھا اور نہ قریبی۔ شاہ عالم کے بعد ستر تائب مدد کی حیثیت سے تیمور خود بخود چیئرمین بن گیا تھا لیکن ایک عبوری مدت کے لیے دو مہینے کے اندر پائی کی ایگزیکٹو کمیٹی کو نئے چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ انیس امید تھیں کہ دو مہینے میں وہ سیاست کے سارے داؤ بیچ آزما کے تیمور کا پچ صاف کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے بیشتر اراکان دور حاضر کی سیاست کے نمائندے تھے اور ایسے ہی جوڑوؤں کے حلقوں سے اتر آئے تھے۔ ہر سطح پر مدعوں کی فریاد فروخت کا یہ نظام اس طرح بنتا ہو چکا تھا جیسے سرکاری محکموں میں رشوت اور بدعنوانی کا نظام۔ بدنام صرف پولیس اور کسٹم جیسے محکمے تھے ورنہ رشوت کی جڑیں سرکاری اداروں سے معاشرے کے ہر طبقے کی جڑوں تک پھیل گئی تھیں۔ رشوت لینے اور دینے کے قواعد مضبوط طرے اور قاعدے ویلے اور ذریعے ریت اور فارمولے سب ایک غیر تحریری مگر مستند اور حلیم شدہ کوڈ کی صورت میں ہر جگہ موجود تھے۔ چھوٹے اخبارات کے غیر مستحکم جانے والے صحافی سخت مشکل میں پڑتے تھے جن کے بچ کو بچ سے برا بھوت قرار دیا جاتا تھا۔ وہ کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے اور اس ذرے روپوش ہو گئے تھے کہ ختم اور قریبی جیسے لوگ پائی کے جو شیعے اور جذباتی کارکن انیس بھی مابعد کے شہید نہ کریں۔ شام کے بعد ایک مشتعل جھوم نے اس ریسٹورنٹ کو تباہ کر دیا تھا جہاں ایک جلی شاہ عالم نے پریس کانفرنس کی تھی۔ ریسٹورنٹ کے مالک کا قصور یہ تھا کہ اس نے چشم دید گواہ ہونے کا اعتراف کر لیا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ شاہ عالم بہت دور تک ابوبکر آزاد کے ساتھ بیٹھے بائیں کرتے رہے تھے۔

یہ شوش چھوڑنے کا شورہ دینے والے میرے کرم فرما ابوبکر آزاد تردید یا تائید کے لیے کیس دستیاب نہیں تھے۔ ان کی شریک حیات جلیبی کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انیس شریک راہ کر لیا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ ایسا کر کے میں نے اپنے پاؤں پر کھانڈی ماری تھی یا اپنے بھوت کی عمارت کو سارا دینے کے لیے ایک مضبوط ستون تلاش کر لیا تھا۔

”یہ بات اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم تھی کہ ابوبکر آزاد جیسے شخص نے کیا سوچ کے میرے سر پر دست شغف رکھے ہوئے میری راہنمائی کی تھی۔ اتنی آسانی سے کہیں مجھے اجازت دے دی تھی

کہ ”میں تم ذیل رول والا ڈراما کرنا چاہتے ہو مگر۔۔۔“ یہی ضرور کہ ”میں تم تائیں کیسے چلے گا یہ ڈراما۔۔۔“ برا مزہ آئے گا اگر تم یوں کہو۔۔۔“

اس کے بعد وہ عتاب ہو گئے تھے۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اچانک گلے میں بان دبانے جلیبی کے ساتھ انٹل وڈیز ان کیس بھی نمودار ہو جائیں۔ چھری چھما کے کہیں کہیں کیا قصہ ہے یہ آخر؟ ہمارا نام بھی ہے گویا چشم دید گواہوں میں۔ ختم جلیبی کی واقعی ایک جھلسلا تھا۔ ہم نے کہا کہ بھی تم ہوشاہ عالم تو اعلان کر دیا ابھی ایک پریس کانفرنس میں۔ ہمیں کیا ایک چھوڑ دس آجائیں متاثر ہو کر خود کو شاہ عالم کہنے والے آخر میں ایک ہی رہے گا۔ خوب فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے کہ۔ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ نہ سمجھو گے تو مت جاؤ گے اے ہندوستان والو۔ ابو بھی پورا نہ سی ”ابو حوا تو ضرور انہوں نے ہی فرمایا ہے۔ شریک لگتے ہیں ہم گم گم۔“

اور یہ بیان آتا تو میرا دھڑکن تختہ ہو جاتا تھا۔ ان کے بعد سب سے زیادہ خطرناک گواہی ہو گئی تھی شہید شاہ عالم کی بیوی۔ شاہ عالم نہیں رہا تھا تو لوگ اس کے گھر کا راستہ تک بھول گئے۔ حقیقت و احترام غلوں اور وقاداری کے جذبات کے خزانے لٹانے والے جو اس کے حضور دن رات حاضری دیتے تھے اور اس کے سامنے کئے کی طرح دم لانے کا اعزاز حاصل کر کے سرخرو ہوتے تھے اپنا قلب بدل چکے تھے۔ شاہ عالم کی بیوی پہلے بھی غیر اہم تھی اور یہ وہ ہو جانے کے بعد اس کا وجود ہی مفر ہو گیا تھا۔ پہلے وہ اپنا چل میں تھی اور ڈاکٹر کتے تھے کہ وہ قریب غم سے کتنے کی حالت میں ہے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بھوت ہے۔ شاہ عالم کی زندگی میں دشمنی کی حیثیت شریک حیات سے زیادہ اس کی غیر شریعت میں آجائے والی عورت جیسی تھی۔ ایک عام عورت اپنے شوہر کی محبت پر اپنا کل تصرف رکھتی ہے اور کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور دونوں طرف سے جذباتی اور جسمانی وقاداری کے معاہدے پر ایماء ادا سے عمل کرنے کا نام ہے۔ کوئی عورت کا دوبارہ محبت میں اپنی اجاہ داری کو اپنا حق سمجھتی ہے اور یہ بدواشت نہیں کر سکتی کہ شوہر ایک پرائیویٹ لینڈ کمیٹی بن جائے جس کے شیئرز اوپن مارکیٹ میں خریدے جاسکتے ہوں اور وہ خود محض شیئرز ہولڈرز کے خوش نہیں رہ سکتی۔

دشمنی عام عورت نہیں رہی تھی۔ وہ ایک اہم سیاسی جماعت کے چیئرمین کی ملکیت بن گئی تھی۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں رہا تھا کہ وہ اس ملکیت کے حق سے انکار کر سکے۔ شاید کچھ عرصے وہ لاطینی کے باعث خود کو سولینڈ شاہ عالم چیئرمین لی ہے ایک کی شریک حیات سمجھ کے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتی رہی ہوگی پھر رند رند اس کو پتا چلا ہو گا کہ میں اس کی بد بختی ہے۔ شاہ عالم صرف اس کا نہیں ہو سکتا کہ نہ کہ اس کی پبلک لائف سے ہی اس کی

لیڈری کا جھنڈا چلتا ہے۔ وہ سب کا ہے اور ”سب“ میں فرق رکھنا اور حد قائم کرنا خود شاہ عالم کے مزاج اور افتاد طبع سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عام عورت طلاق یا طلع سے غلامی کی اس زنجیر کو توڑنے کا حق اور حوصلہ رکھتی ہے جو اس پر ازدواجی رفاقت کے نام پر مسلط کر دی جائے مگر شاہ عالم نے اسے دو ٹوک الفاظ اور لمبے میں بتا دیا تھا کہ وہ اپنے پبلک ایجنڈے کو برقرار رکھنے کے لیے کسی گھریلو تنازعے کے اسکیڈل کا تخیل نہیں ہو سکتا چنانچہ ہماری تہذیبی اور شرقی روایات کے مطابق۔ ذیلی آئی ہے تو اس گھر سے اس کا جنازہ ہی جائیگا ہے۔

شاہ عالم کی موت سے اس کو وہ آزادی حاصل ہو گئی تھی جس کی تمنا ایک حسرت تھی لیکن اس کا اعلان ایک ناقابل معافی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے بھی نہیں چھپائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ قریب غم سے کتنے کی حالت میں ہونے والی بات ایسا سفید بھوت ہے جو سب کو سیاہ نظر آ رہا ہے۔ وہ بڑے سکون اور طمانیت کے ساتھ اسپتال میں جا کے لیٹ گئی تھی تاکہ اسے سب کے سامنے روئے پیٹنے اور مدد سے بے حال ہونے کا ڈراما نہ کرنا پڑے۔ اس سے تعزیت کے لیے آئے والے بھروسے میں اس ہوتے آکر وہ زائد تقاریر نہ رول۔ اپنی بیوی کا نام اعلان نہ کرتی اور سوگ میں کم سے کم تین دن کچھ کھائے پئے بنا اپنی حالت قابل رحم حد تک خراب نہ کرتی۔

اسپتال میں وہ محفوظ تھی۔ نہ بھروسہ کرنے والے وہاں آسکتے تھے اور نہ سوالات سے پریشان کرنے والے صحافی۔ وہ اطمینان سے وہاں جب تک چاہتی رہ سکتی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتا دیا تھا کہ وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی اور انہوں نے پورے تعاون کا پورا معاوضہ وصول کرنے کے بعد اس کے گوشہ عافیت تک سب کی رسائی کو ناممکن بنادیا تھا۔ دشمنی کو معلوم ہو گا کہ عوامی جذبات کا یہ معنوی رد عمل چند دن میں ختم ہو جائے گا۔ لوگ شاہ عالم کو بھی بھول جائیں گے۔ اس کی بیوی کا پہلے بھی کوئی نہیں تھا اور اس کے والدین کی تو شاہ عالم کے نزدیک اہمیت صرف اس لیے تھی کہ ان کی خدمت سے وہ ایک سعادت مند بیٹی کی گندول بھی حاصل کرنا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہے تھے تو شاہ عالم کا مزار اس کے گھر سے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔

کسی کو بھی دشمنی کے واپس اپنے گھر لوٹ آنے کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ مگر استوار نہیں خان کی سی آئی ڈی عرف چندل چوڑی جو خدا کی فوج وار ہونے کے ناطے شہر کے حالات کی پہلی خبر دیتی تھی مجھے مطلع کیا کہ دس دن اسپتال کے صحت افزا ماحول میں مزار کے بالآخر شاہ عالم کی حسین بیوہ گزشتہ رات اپنے خانہ ویران میں ختم ہو گئی ہے۔

اس وقت تک صورت حال گھبراہٹ کی جانب مائل تھی اور باہر

کے حالات کی گرد کے بیٹے تنکے میں بھی خاموش قماشانی کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنی اسکیم کی کامیابی کے لیے آخری فیصلہ کن قدم اٹھانے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ خان اعظم مجھ سے ناخوش تھے۔ ان کے خیال میں اپنی سسکل حاکمیتوں سے میں نے معاملات کو سلجھانے کے بجائے انکا الجھایا ہے کہ مجھے مشورہ دینا بھی مشورہ ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ چند ان سے متعلق نہ ہو مگر وہ میرا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔

قدرتِ قیضا میرے فیصلوں کی تائید کر رہی تھی ورنہ ایسے بہت سے معاملات تھے جو میرے کنٹرول سے باہر تھے۔ سب سے پہلے خود رنجی میرا پل کھول سکتی تھی مگر اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ پھر ابو بکر آزاد کا میری رہنمائی فرما کے غائب ہو جانا بلا واسطہ طور پر حمایت سے کم نہ تھا اور تیور نے اپنی پریس کانفرنس میں میرے زندہ ہونے کی تصدیق کر کے اپنی غیر مشروط وقار داری ثابت کر دی تھی ورنہ اس پریس کانفرنس میں وہ میری ساری جلسہ بازی کا بھانڈا بھڑکاتا تھا۔

اب خان اعظم اپنی پوتی کے ساتھ لوٹ کے اپنے گھر جانا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہم سب کا تیور کے گھر میں دوپٹا رہنا قطعی غیر ضروری تھا۔ بالآخر ایک دن اس مسئلے پر ان سے میری بحث ہوئی۔

”خان بی۔ آخر کیوں جانا چاہتے ہیں آپ اپنے گھر؟ وہاں کون سے بچے رہ رہے ہیں آپ کے بچے؟“

”وہ مسکرانے لگے۔ ”میرے بچے ہوتے تب بھی دوتے کیوں؟“

”پھر کیا ہے۔ کوئی تکلیف ہے آپ کو یہاں؟“

”نہیں۔ تکلیف تو اپنے گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں آرام سے کوئی بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنا گھر۔“

”مگر یہاں فرماتے ہیں۔ نہ گھر تیرا نہ گھر میرا ایک مسافر خانہ ہے۔“

”تو بھی سمجھ لے گا ایک دن اپنے گھر سے آدمی کی کیا مراد ہوتی ہے؟“

میں نے کہا ”مگر آپ کی ضرورت ہے مجھے اور آپ جانتے ہیں کہ فی الحال میں وہ گیارہ ڈھوں جو شر کا رخ کرے گا تو شامت اگلاں۔“

”جب ضرورت تھی تو میں تیرے ساتھ تھا۔ پھر آسکتا ہوں اگر واقعی ضرورت ہوگی مگر اچھا ہے اپنے معاملات سے منہ ہٹنے کے لیے تجھے میری مدد کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ فیصلہ دی ٹھیک ہوتے ہیں جو آدمی خود کرتا ہے“ صرف خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے میں ویسے بھی سیاست کی ہیرا پھیری اور چال بازی کو نہیں سمجھتا۔ میری عقل ہی آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئی ہے۔“

”خان بی۔ میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔“

وہ ہنسنے لگے ”پڑ جاؤں گا کیا مطلب۔ تو مشکل میں پڑ گیا ہے اور

آسانی تجھے راس نہیں آتی۔ جب میری مرضی تو میرا بھی ایسا ہی حال تھا۔ میرے لیے اپنے وقت کی مشکلات اور آزمائشیں اور سختیاں تھیں۔ یہ اگلی نسل کے مسائل ہیں جن کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ اب تمہارا وقت ہے مشکلات سے لڑنے کا۔ تمہارے بعد والوں کی اپنی زندگی ہوگی اور نئی مشکلات۔“

”مطلب یہ کہ آپ کچھ کرنا نہیں چاہتے؟“

”آریا سمجھتا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میری عمر کے معمولات کچھ اور ہوتے ہیں۔ میں اب اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا جتنی تیز لڑا یہ دینا ہے۔ رستم زباں گھما پھلانگ کی کشتی اور بدسلی کی کشت میں دی فرق ہے جو کار تو س والی بدوق اور گلا کھٹوف کے بہت ہیں۔“

میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ مجھے اپنے جمیلوں میں مت گھمبیت۔ یہ مراد اللہ کرنے کی ہے اور آرام کی ہے۔ ساری عمر کی جدوجہد کے بعد زندگی کے آخری سالوں میں سکون ایک نعمت ہے جو ان کو حاصل تھی مگر میں نے اس کو گمشدہ نشی ترک کرنے اور عملی سیاست کے خارزار میں ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی عمر کے کسی شخص سے یہ توقع نہ کرنا زیادتی ہے کہ وہ آج کی دنیا میں آپ کے مسائل کا بار اٹھائے جتنا وہ میرے لیے کر چکے تھے وہی احسان کا ایسا پاراگراں تھا کہ میرا سر تھکا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں بھی اپنے مصائب کی دلیل میں گھمبیت لوں۔ اتنا میرا فرض بنتا تھا کہ میں ان کی زندگی کے سکون کو جتنی بناؤں اور ان میں شہرت سے تحفظ کی ضمانت فراہم کروں۔

ظاہر ہے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو میں نے خود انہیں گھر پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ قرارداد اکثر قانون کی طرح میرے سیاسی کیریئر سے الگ اور سارے خطرات سے دور رہیں۔ اگر میری وجہ سے انہیں نقصان ہو تو اس سے زیادہ کہ اور نہ امت کی بات میرے لیے کیا ہو سکتی تھی۔

تیور کی فیملی نے شر کے مضامین میں بڑی لمبی قید ختمی لائی تھی۔ استاد رئیس عمر خان نے اسی گھر کو سب جیل قرار دیتے ہوئے آنے جانے پر دسکی عی پابندی عائد کر دی تھی جیسی حکومت اپوزیشن کے کسی لیڈر کو اس کے اپنے گھر میں نظر بند کرنے کے بعد عائد کرتی ہے۔ ایسا تیور کو وقار دار رہنے پر مجبور کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تیور کے بیوی بچے بھی کچھ رہے تھے کہ انہیں خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے شر کے گھر سے اس دیرانے میں منتقل کیا گیا ہے اور سارے حاکمی انتظامات انہیں دشمنوں سے بچانے کے لیے ہیں۔ وہ دشمن کون ہیں اور ان کی دشمنی کا نشانہ وہ کیسے ہو گئے کہ ان کا سیاست سے متعلق نہ سیاسی معاملات میں دخل۔ پھر دشمن ان کو نقصان کیوں پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ اور ایسے بہت سے سوالات کا جواب تیور بھی نہیں دے سکتا تھا مگر تیور اس گھر کا سردار تھا۔ وہی اپنے شوہر سے بحث نہیں کر سکتی تھی اور

بچے اپنے باپ سے کسی فیصلے کی معلومت پہنچنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ تیور ایک سیاسی لیڈر ہے اور ان کے سارے غمازات اپنی لیڈری کے عطا کردہ ہیں۔

زورے کے پہلے ایک کا پردہ گرے والا تھا۔ مدار کی کے پہلے کھیل کود کھینچنے والے دم بخود تخت بد نماں تصویر جرت بنے بیٹھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے مہمان قدردان۔ خود سے دیکھتے ”سوچے“ غور فرما چکے۔ شاہ عالم ہنگ کانگ میں ہے۔ نہیں ”شاہ عالم تو یہاں ہے۔ اس نے لاہور میں عمر دراز کو زبردے کر ملاک کر دیا ہے۔ غلام پھر کھینچے“ وہ سگ پور میں ہے۔ ایک تو ایک وقت میں دو جگہ نظر آ رہا ہے۔ (تائیاں) وہ یہاں ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ مدار کی کا کھیل ہے۔ ایک کے دو شاہ عالم ہو گئے۔ ایک سگ پور کی فلائٹ سے اترتا ہے ”دو سرا پہلے سے اسے رسبو کرنے کے لیے موجود ہے۔ ایک نرن سے ستر کر رہا ہے“ ”دو سرا تیور کی گاڑی میں سڑک کے راستے آ رہا ہے۔ ایک کو بھوم نے مار دیا ہے۔ دوسرے پر کاٹانہ حملہ ہوا ہے۔ دو بچ گیا ہے اور غائب ہو گیا ہے۔ یہ بھی مدار کی کا جادو کا کمال ہے (تائیاں) اور یہ دیکھتے ”جو مر گیا تھا اور وقار کیا تھا وہ پھر نمودار ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہے“ یہ بھی مدار کی کا قہشا ہے۔ کیا عالم بالا سے پہلے کوئی بھی سیاست دان اس دنیا میں پریس کانفرنس منعقد کرنے آیا ہے؟ نہیں۔ ”تجھے کیسے سکتا ہے۔ پھر شاہ عالم کیسے آ گیا۔ ایک آدمی بیک وقت اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں۔ وہ زندہ ہے مگر وہ مر گیا تھا۔ تو مہمان قدردان۔ یہی ہے مدار کی کا قہشا۔ ہاتھ کی صفائی“ نظر بند کی ”جادو“ کیا ہے یہ دیکھتے ”غور فرما چکے۔ جنگ مارتے رہتے۔“

مدار کی یعنی یہ بندہ حقیر فقیر، حقیر، جو ناصر عظیم تھا۔ اصلی شاہ عالم بننے والا تھا۔ سو فیصد شاہ عالم جس کو شک ہو سانسے آئے“ نقیض کر کے ”تصدیق کرے“ ”دو آنکھوں سے دیکھے“ چار آنکھوں سے دیکھے۔ ”دو دشمن“ خود بین سے دیکھے۔ سانسٹی لیبارٹری ٹیسٹ کرانے آزما کے دیکھے۔ ٹھوک بھانکے قتل کر کے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔ سانچ کو آج نہیں۔ عقل کبھی سوتا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور شاہ عالم نہیں ہو سکتا۔ یہی شاہ عالم ہے۔ جو نہیں مانتا بھانڈ میں جائے۔ اس سے پولیس منوائے گی۔ پولیس کچھ بھی منوائے سکتی ہے۔ استاد رئیس محمد خاں اپنی چٹا دل چڑکزی کے ساتھ فی الحال رخصت ہو گئے تھے اور تیور نے بھی فیملی کو وہاں اپنے شر کے فیشن ایل علائے کی کوٹھی میں داخلے لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب نہ مجھے اس سے اندیشہ لاحق تھا ورنہ اسے مجھ سے کوئی ڈر۔ ان سب کے چلے جانے کے بعد میں اس کوٹھی میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس رات میں نے قاضی اکیشن پلان پر جن محصلوں میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

نوبتے سواکل فون کی کال پر میں نے کہا ”نہیں۔“

دوسری طرف سے رئیس نے کہا ”ڈاکٹر مندر شاہ کی فیملی جیم

قائد کلب جائے گی۔ رات کو وہاں کسی کا پوم پیدائش ہے۔“

”کوئی برتھ ڈے بائی ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہوا؟“

”اے سکر کیرے بتایا ہے نہیں سالے۔ صدر امریکا کے فون کیا تھا۔“

میں نے کہا ”یار خاکیں ہو آج ہے۔“

”اے پی سی آئی ڈی کی اطلاع کوئی ٹی وی کی خبر نہیں ہوئی۔“ وہ یوں ”راستے میں ماز قیث ہو جائیں گے۔ تقریباً ساڑھے نو اور دس کے درمیان۔ دو گار۔“

”دو ہی گار۔ اپنی بھائی کو بھی بتا دے۔“

”یار کیا پھر پڑانے کا ارادہ ہے۔ قسم اللہ کی تیری باتوں میں آکے ہم نے تو بڑے پار سے بھائی جان کر دیا تھا۔ ابھی تک چھپتے وقت دل سے اپنے غلطی ہے۔ سوئے میں خزانے لینے ہوئے کتنی سی بختی ہے۔ ایسا بچا مارا تھا ٹانگ پر۔ استاد رئیس محمد خاں ٹانگ پر بھی نہیں بیٹھے دیتے۔“

میں نے اس کے کہا ”یار اس کی محبت کا کچھ ایسا ہی انداز ہے۔“

”طقت ایسی محبت پر سوار۔ ابھی وقت ہے بیٹے چھوڑ دے اس کا خیال۔ اول تو وہ مجھ سے شادی کرے گی نہیں اور کی تو شب عوی کرے گی بیویوں کے وارڈ میں۔ جی مون ٹانگ پر بلا شرح حا کے بیساکھی پر گھومتے گزرے گا۔ ایک ٹوٹا بازو لگے میں دکھا ہوا ہو گا۔“

”انشاء اللہ“ میں نے کہا اور فون بند کر کے چندا کا نمبر لایا۔

”عقلمی بہت دیر بکھری رہی۔ پھر اس نے بتائی لے کر کہا“ ”ہے۔ لو۔“

میں نے ڈانٹ کے کہا ”تکلیف مرگئی تھی۔ اور کیوں مرگئی تھی ابھی ہے۔“

”میں میرے دشمن۔ مجھے بگاڑنے والے۔ اچھے بھلے خواب کا بیڑا غرق کر دیا“ ”وہ بولی۔“

”میں تھا خواب میں تمہارے ساتھ؟“

”میں ڈراؤنے خواب نہیں دیکھتی۔ شاہ رخ خان تھا۔ پو پوڑ بھی کر چکا تھا۔ بس میرے پس کرنے کی دیر تھی۔“

”جو معاش۔ شادی شدہ ہو کے بھی باز نہیں آیا۔ خیر اس سے میں بعد میں نٹوں گا“ ”تم آج بڑا ذرا۔“

”ڈرا کیا مطلب؟ کیا پریشانی ہے؟“

”خان صاحب کو پتا نہ چلے ایک دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں جس آدھے گھنٹے میں باہر لوں گا۔ پوری طرح تیار ہو کے آؤ“

راشتہ۔

”راشتہ“ وہ میرے لیے سے کچھ گئی کہ انکار یا بحث کی گنجائش نہیں۔

وہ نہیں جو گاڑی میرے لیے چھوڑ دیا تھا وہ اضافی مائل کی ادا

شیبہ شیراز تھی۔ ہر چہ او بعد اس کا رنگ بدل جا تھا چنانچہ وہ

اسے گرجت کے نام سے یاد کرتا تھا۔ آج کل اس کا رنگ نیا لگا
گولڈن تھا۔ اس کی ظاہری خوب صورتی سے زیادہ اس کی چال
مجھے پسند تھی جو بیک وقت مبارقار اور ہنسی رفتار کی جاسکتی تھی۔
سو گویا میرے زیادہ کی رفتار پر بھی گاڑی ہوا میں تھیں محسوس ہوتی
تھی اور سوار اچھا ہوتا تو سو گویا میری جگہ پر گاڑی ہوتی تھی۔
سو انویجے میں خان واؤس سے سو گز دور موڑ پر گاڑی سے
ٹپک لگے لگے کھڑا تھا اور اس حد تک اندھیرے میں تھا کہ کسی کی نگاہ
پڑے تو پہچان نہ سکے۔ سو سائیکل پر گزرنے والے ایک سار جینٹ
کو میرا یہ انداز کچھ مشکوک لگا۔

نیا بات ہے؟ اس نے خاصی شرافت سے پوچھا "گاڑی
خراب ہے؟"
میں نے آہ بھر کے گاڑی کو دیکھا۔ "بڑا دردناک سوال ہے
یہ۔ پوچھنے کیا خراب نہیں ہے تھانے دار صاحب۔ میری قسمت
خراب ہے ورنہ اس وقت میں نیو مارک کے فیسٹا ایو نیو پر نہ کھڑا
ہوتا۔ اور نہ خراب ہے۔ یہ جو کرل صاحب رہتے ہیں ان کی
لڑکی خراب ہے۔ بھگا کر لے جانا چاہتی ہے۔ قرب قیامت کی
نشانی ہیں۔ اس کے علاوہ موسم خراب ہے۔ میری شکل خراب
ہے اور یہ سڑک خراب ہے۔ اسٹریٹ لائٹ کالب خراب ہے۔
گاڑی البتہ خراب نہیں ہے۔"

چند اجیز میں نمودار ہوئی اور بڑی مستعدی سے چلتی ہوئی
میری طرف آئی۔
میرے جواب سے تھانے دار محظوظ نہیں ہوا تھا مگر سمجھ گیا
تھا کہ پولیس سے اس لمحے میں بات کرنے والا نشتے میں نہ ہو تو پھر
کوئی بڑی چیز ہی ہوتا ہے چنانچہ اس سے چٹکے کالین دین بے فائدہ
ہو گا۔ وہ زبردستی ہنسا "تخل کرتے ہو تم۔"
میں نے کہا "سو دیکھ لو۔ اس کی چال خراب ہے۔ چلن کتنا
خراب ہے۔"
چندانے سوالیہ نظروں سے تھانے دار کو دیکھا پھر گاڑی میں
بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "کرل خان سو رہے ہیں؟"
چندانے اقرار میں سہلایا "تم چلو جلدی۔"
میں نے پھر آہ بھر کے تھانے دار کو دیکھا۔ اپنی صورت کی
مظلومیت سے واضح کیا کہ میں کتنا بچ بول رہا تھا اور گاڑی اشارت
کر کے تھانے دار سے کہا "تم سارا سو گویا خراب ہے۔ خرابی ہی
خرابی ہے ہر طرف۔"
"یہ تھانے دار کیا پوچھ رہا تھا؟" چندانے کہا۔
"مجھے باتیں پوچھ رہا تھا۔ جو تمہیں بتاتے ہوئے شرم آتی
ہے مجھے۔" میں نے کہا۔

"یعنی آپ کو بھی شرم آتی ہے؟" وہ پھر سے بولی۔
"ہاں۔ سب کو اپنے گریڈ کی طرح کیوں سمجھتے ہو؟"

"تم انہیں بے شرم کہہ رہے ہو؟"
میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ وہ تو اتنے شریف ہیں کہ شرمیلا
نیکور نے بلاوجہ نواب پنڈی سے شادی کی۔ کرل صاحب سے
کرلے تو تم میں کچھ شرم ہوئی۔ ایسے دورے نہ ڈالیں تم میرے
جیسے بھولے بھالے نوجوانوں پر۔ میں کتنا ہوں آخر تم کیوں میرے
پیچھے پڑ گئی ہو۔ میں شادی شدہ آدمی ہوں۔"
"شادی شدہ ضرور ہو۔ آدمی کا پتا نہیں۔ تمہاری بیوی کا نام
رشدہ ہے نا؟" وہ بولی۔

"علا۔ وہ میری بیوہ ہے۔" میں نے کہا۔
میں ایک بار سیدھا کر گیا۔ جیم خانہ کلب تک مجھے کہیں کوئی
بھی گاڑی خراب نظر نہیں آئی۔ رہیں نے کہا تھا کہ وہ ہاؤس ٹیٹ
ہوں گے۔ ایسی صورت میں گاڑی کا ایک اسپرڈ ہیل لگانے سے
مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ ذرا تیر کو دو سرائز کھولنا پڑا۔ گاڑی
کو جیک پر چھوڑ کے وہ گاڑی کو نزدیک ترین پیڑوں پر پلے کے پیچھے
لگاتا اور پھر واپس آتا تو گاڑی چلتی۔ یہ قسم سے کہ آدمی مجھے کام
تھا۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ استاد کہیں خان کی
اسکیم ٹل ہو گئی ہو۔ گاڑی بچ کے نکل گئی ہو مگر استاد کچا کام نہیں
کرتے تھے۔

واپسی پر میں نے گاڑی کو دیکھ لیا۔ اس کا ڈرائیور ابھی پہلا
ٹائری بدل رہا تھا اور ایک طرف جھکی ہوئی گاڑی پر ایک نظر ڈالنے
سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا آگے والا دو سرائز بھی ٹیٹ
ہے۔ میں سیدھا گزرتا گیا اور لوٹ کے آیا تو ڈاکٹر منصور "ان کی بیوی"
ایک بیٹی فٹ ہاتھ پر کھڑے تھے اور ڈرائیور دو سرائز کھول رہا تھا۔
میں نے ایک ٹولی سر پر رکھی۔ زبردستی ٹیک لگی اور قریب
جاکے کسی شناسا کی طرح حیرت کا اظہار کیا "ارے ڈاکٹر منصور۔
خیریت ہے نا؟"

مجھے دو فٹروں کی وجہ سے اسٹریٹ لائٹس کا اٹھالا بہت کم تھا
اور ایک نظر میں ڈاکٹر منصور نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس نے کسی سمجھا
ہو گا کہ میں اس کے دست شفا پر اعتماد رکھنے والا کوئی مریض
ہوں۔ ظاہر ہے جتنے لوگ اسے پہچانتے تھے وہ ان سب کو یاد نہیں
رکھ سکتا تھا۔

اس نے قدرے بیزاری سے کہا "پتا نہیں کیسے ایک ساتھ دو
ٹائریٹ ہو گئے ہیں۔"
"پتا کیسے نہیں صاحب! ڈرائیور نے دور لگے گئے پتے کے
پولٹ کھولتے ہوئے کہا "کسی پاگل دے پڑنے یہ لکڑی رکھی ہوئی
تھی سڑک پر۔" نکلیں گئی ہوئی پتی اس میں۔ لگتا ہے کسی نے فصل
کے لیے شراوت کی ہے۔ کہیں چمپ کے دیکھ رہا ہو گا اور بس رہا
ہو گا۔ یہ بھی شراوت ہے کوئی۔ میرے ہاتھ لگ جائے تو دردانت
توڑوں اس کے اور کون ہے بھی تو مل ہے۔"
ڈاکٹر منصور کی بیوی نے کہا "باتیں تم کرو۔ جلدی سے گاڑی لے

جاؤ اور پیچھے لگاؤ کے لاؤ۔ نظر کہاں تھی تمہاری کہ تم نے یہ لکڑی
نہیں دیکھی؟"
ڈاکٹر منصور نے گھڑی دیکھی۔ "بڑی دیر ہو جائے گی۔ یہاں
قریب میں پیڑوں پر کون سا ہے؟"
میں نے کہا "جی ڈاکٹر صاحب۔ آؤ ہم چھوڑ دیں آپ کو۔
جانا کہاں ہے؟"
"میں جیم خانہ کلب جا رہا تھا۔ لیکن تکلیف ہو گئی آپ
کو۔"

"کمال ہے جی۔ ہم تو پرانے نیاز مند ہیں۔ ہمیں کچھ خدمت کا
موقع دیں جناب۔" میں نے کہا اور پیچھے والا دروازہ کھول دیا
"ڈرائیور بعد میں گاڑی لے آئے گا۔ آپ تشریف رکھیں۔"
وہ تینوں پیچھے بیٹھا چاہتے تھے مگر چندانے آگے والی سیٹ
ڈاکٹر صاحب کے لیے احرام خالی کر دی اور خود پیچھے ان کی بیوی
اور بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر منصور کو کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ
احرام در حقیقت خصوصی انتظام ہے۔

چند منٹ کے بعد دو موڑ آیا جہاں سے جیم خانہ کلب کا راستہ
دائیں طرف رہ جاتا تھا۔ مجھے بائیں طرف جانا تھا۔ میں نے
اطمینان سے گلوڈ کپار منٹ کھولا اور ریو لوڈ ٹال کے پیچھے چندا کو
ایسے پکڑا دیا جیسے کوئی چو تم کا پکٹ ہو۔ ڈاکٹر منصور بری طرح چونکا
اور پھر پیچھے اس کی بیوی نے سب سے پہلے خطرے کو محسوس کرتے
ہوئے کہا "یہ۔ یہ کیا ہے؟"

چندانے کہا "یہ سڈل مشین سمجھ لیں۔ اس سے بھی
سوراخ ہو جاتا ہے۔"

میں نے گاڑی ایک دم موڑی اور اس کے ساتھ ہی رفتار
برسادی۔ ڈاکٹر منصور نے چٹا کے کہا "یہ تم کو دھڑلے جارہے ہو
ہمیں بد معاشی گون ہو تم؟"

چندانے ریو لوڈ اس کی گدی پر رکھ دیا۔ "اب کوئی آواز نکلی
تو ایک اضافی سوراخ ہو جائے گا سر میں۔ ساری عقل اور قابلیت
نکل جائے گی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ جان بھی نکل جائے گی ڈاکٹر صاحب
کی" میں نے کہا "بڑا نقصان ہو گا مریضوں کا جو ان کے سوا کسی کے
پاس جاتے ہی نہیں۔"
ڈاکٹر منصور کی بیوی نے ہٹکا کے کہا "تمہ۔ کیا چاہتے ہو
آخر؟"

چندانے سوچ کے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم تمہیں اغوا کرنا
چاہتے ہیں۔"

"چاہتے ہیں کیا مطلب اغوا کرنا ہے؟" میں نے کہا۔
ڈاکٹر منصور کی بیٹی کے اعصاب گزور تھے یا وہ خود کو بہت
ہوشیار اور مبارک سمجھتی تھی۔ اس نے اگر بڑی میں کہا "میں تمہیں
ایسا نہیں کرے دوں گی" اور غالباً چندا پر حملہ کر کے ریو لوڈ چینیے

کی کوشش کی۔ چندا اس کے لیے تیار ہو گئی۔ میں نے ایک چیخ سی
اور ڈاکٹر منصور نے پلٹ کے توشلیں سے کہا "میں نے اسے پہلی"
ان کی بیوی نے لڑکی کو سنبھال لیا "ڈنٹ لی فوٹس۔ ہم ان
سے نہیں لڑ سکتے۔ یہ پیشہ ور بد معاش ہیں۔"

ڈاکٹر نے بھی کہا "ہاں۔ ٹیک اسٹ اپری۔ ہم انہیں مذاہنی
رقم دے سکتے ہیں۔ جان کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔"
لڑکی اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کے سسکیاں لینے لگی۔ میں
نے بیک دیو مرد میں دیکھا تو اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک پر تھا۔ ضرور
چندانے اسے کبھی مار کے پیچھے کیا ہو گا اور ضرب اس کی ناک پر
آئی ہوگی۔

"او کی۔ آئی ایم برٹ" اس نے اپنے ہاتھ پر خون دیکھ کے
دہشت زدہ لمحے میں کہا۔

ڈاکٹر منصور نے توشلیں سے کہا "یہ لو دو مال۔ دبا کے رکھو۔
ابھی خون رک جائے گا۔ گھبرائے کی ضرورت نہیں۔"

اس کی بیوی کا خوف سے بڑا حال تھا "آخر تم لوگ کہاں لے
جارہے ہو ہمیں؟"

میں نے کہا "پتہ گھر۔ آج رات ہم آپ کے میزبان ہوں
گے۔"

"لیکن کیوں۔ کیا مقصد ہے تمہارا؟" ڈاکٹر منصور نے اب
صورت حال کی عقلی کو حقیقت سمجھ کے قبول کر لیا تھا "اگر پیر
چاہے تو ہمارے پاس اس وقت زیادہ رقم نہیں ہے۔ پانچ چھ ہزار
ہوں گے میری جیب میں۔"

"میرے پاس ہیں دس ہزار" ان کی بیوی نے پیچھے سے کہا "تم
زیورے لے سکتے ہو۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا ہو گا۔ بے بی کے پاس تو
صرف تھیں بی بی کی گھڑی ہے تم سب لے لو۔"

میں نے کہا "ہم سمانوں کو کچھ دے کے رخصت کرتے ہیں۔
ان سے کچھ لینا ہماری غیرت کو راز نہیں کرتی۔ پیسہ ویسے بھی ہاتھ کا
میل ہوتا ہے اور ہم پہلے ہی اچھے خاصے پہلے ہیں۔"
ڈاکٹر منصور کسی سوچ میں گم تھا "میں نے سب دیکھا ہے
تمہیں؟"

"ممت اچھی طرح دیکھا تھا جناب۔ آکر لگا۔ اور مجھے بتایا
تھا کہ میرا پارٹ مل ہو چکا ہے یا پھر میرے سینے میں دلی ہی نہیں
ہے۔"

"پانگل ٹیک بتایا تھا۔ ایکس رے میں بھی پتھر نظر آ رہا تھا"
چندا بولی۔

ڈاکٹر نے بڑا سادہ بنایا "میں حیران ہوں کہ تم کس قسم کی
باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اغوا کتنا سنگین جرم
ہے۔"

میں نے مذمت کی "دراصل یہ پہلا تجربہ ہے۔"
اس نے پھر مجھے غور سے دیکھا "تم مجھے پیشہ ور مجرم نہیں

گلتے تھمارا مذہب اور اندازہ متھکو۔
 "دوسرا اصل۔۔۔ ابھی ہم زیر تربیت ہیں۔ تجربوں کی طرح
 منھکو کرنا ابھی نہیں سکھایا گیا" میں نے کہا۔
 اس نے ٹٹی میں سہلایا "میں کنفیوز ہو رہا ہوں۔ آخر کہاں
 دیکھا ہے میں نے تم کو پہلے۔ خبر یہ بتاؤ کہ تم جو بھی کر رہے ہو کس
 کے لیے کر رہے ہو؟ اگر پیسے کے لیے نہیں تو پھر کیا چاہیے نہیں۔
 ایکشن ایڈ THIRILL کے لیے تمہاری عمر کے نوجوان بہت کچھ
 کر رہے ہیں۔"

"آپ کیا کرتے تھے اپنی عمر میں؟" میں نے کہا۔
 "میں وقت ہی نہیں ملتا تھا اس قسم کے کاموں کے لیے۔ ہم
 فارغ نہیں ہوتے تھے۔ پڑھائی سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یہ
 سب سوچتی ہے جب بے گھر ہو۔ روزگار کی اور مالی مسائل کی
 مجبوری نہ ہو اور قائلو عام ہو۔ رہا کے پاس کچھ کرنے کو نہ ملے تو وہ
 بن جاتا ہے۔ DEVILS WORKSHOP۔"
 "تیسری صبح ہے مگر ہم پر APPLY نہیں ہوتی" چندا نے
 کہا۔

"پتا نہیں ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا" بے
 لہجہ آئی ہو پ کہ یہ تمہارا کوئی معا۔ نہیں ہے؟
 ان کی بیٹی نے دکھ سے پتہ داری "پاپا۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا
 چاہیے۔"

ان کی بیوی نے بھی احتجاج کیا "یہ کیا فضول بات کی تم نے۔"
 ڈاکٹر مندر نے کہا "میرے علم میں ہے ایک واردات۔ ایک
 لڑکی کا فیئر تھا۔ میرے ایک سینئر کولیک کی بیٹی تھی اور لڑکا ایسا ہی
 تھا۔ بے کار قسم کا۔ لڑکی نے خود ہی بات قسم کی تو وہ OFFEND
 ہو گیا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ کچھ پوائنٹ پر لڑکی سے شادی کر لی
 تھی۔ بے شک بعد میں وہ بڑا گیا اور شادی بھی ختم ہو گئی۔"
 میں نے کہا "سر۔ آپ کی بیٹی بد قسمت ہے کہ میں نے اسے
 شادی کے بعد دیکھا ورنہ مجھے داماد بنا کے آپ کا سرخروے مزید بلند
 ہوتا۔"

"نوجوان۔ زیادہ بڑا سراست بنو۔ صاف بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا
 ہے؟ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم بے وقوفی سے
 کسی اور کے آٹن کا رہتے ہو تو مجھ سے تمہیں زیادہ رقم مل سکتی ہے۔
 دگنی، تین یا چار گنا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی کو بھی
 رپورٹ نہیں کروں گا۔ مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔"
 میں نے کہا "مسئلہ بہت معمولی ہے۔ آپ کے ایک دستخط کا۔
 وہ بھی کسی چیک پر نہیں۔ نہ کسی خود کشی کے نوٹ پر یا جائداد کے
 کاغذات پر۔ وہ مسئلہ ایسے ہی حل ہو سکتا تھا۔ جو زحمت آپ کو
 اور ٹیلی کو ہوئی اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔"
 میں نے نیچے اترتے تیور کی کوٹھی کا گیت کھولا اور گاڑی کو
 اندر لے گیا۔ ڈاکٹر مندر پریشان ضرور تھا کہ اس دیرانے میں نہ

جائے اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ اس کی بیوی اور بیٹی بالکل
 خاموش اور ڈوبی ہوئی بیٹھی تھیں۔
 "پلیز اور آئیے" میں نے کہا "آپ لوگ بالکل محفوظ ہیں
 یہاں۔ ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ خواتین ڈرائنگ روم میں
 تشریف رکھیں۔ چائے کافی جو چاہیے بتادیں۔"
 "میرے نیم خانہ کلب نہ چننے سے خرابی ہوئی" ڈاکٹر مندر
 نے کہا۔

"جی نہیں۔ اور بھی کچھ لوگ شاید نہ آئیں مگر اپنی ہوگی۔
 دپے میں آپ کی طرف سے معذرت کر لیتا ہوں۔ یہ بتاتے ہوں
 کہ۔۔۔ کئی مصروفیات۔ بائزر قسم کی کئی مصروفیات کے باعث
 آپ نہیں پہنچ سکتے۔ یہاں انتظار نہ کریں۔"
 میں بیٹی ڈرائنگ روم کے ایک سی مونس پر بیٹھ گئیں۔ چندا
 نے رپو اور مجھے واپس کر دیا اور لڑکی کو دیکھنے لگی۔ وہ سترہ اعشار
 برس کی خاصی قبول صورت لڑکی تھی مگر ضرورت سے زیادہ محنت
 مند ہو گئی تھی۔ اس کی ہاں شکل سے لومڑی کی طرح چالاک لگتی
 تھی اور سخت خنیش میں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب کو ہارٹ انیک ہو چکا ہے ایک بار" اس نے
 مجھے بتایا۔

"میں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔" میں نے کہا "مجھے سے
 پرہیز کرنا چاہیے اور خوش رہنا چاہیے۔ اگر یہ ہم سے تعاون کریں
 جی خوش تو دوسرے ہارٹ انیک سے بچ سکتے ہیں۔"
 "آخر کس قسم کا تعاون چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہم باہر چل کے بات کریں گے۔ خواتین
 کے سامنے اس موضوع پر بات مناسب نہیں۔ آپ لوگ ریلیکس
 کریں پلیز۔ آپ کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ صبح ہونے سے
 پہلے ہم آپ کو واپس گھر پہنچا دیں گے کسی کو کچھ معلوم نہیں
 ہو گا۔"

نیم خانہ کلب میں فون کرنے کے بعد میں ڈاکٹر مندر کے
 ساتھ باہر آیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کے اس کو ساتھ بیٹھنے کی
 دعوت دی۔ اس کا ذہنی کنفیو زان اب اور بڑھ گیا تھا۔

"ڈاکٹر مندر۔ آپ نے حال ہی میں ایک پوسٹ مارٹم کیا تھا۔
 عدالت کے حکم پر دوسری بار پوسٹ مارٹم کرنے والے میڈیکل
 بورڈ کے آپ سربراہ تھے۔"

اس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے اسے دل کا درد سرا وہ پڑ چکا ہو
 "تم۔۔۔ تم وہ ہو۔۔۔ شاہ عالم۔ او مال کی گاڑ۔ یہ میں کیسے سوچ سکتا
 تھا۔"

"میں واقعی شاہ عالم ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہ نہیں
 سمجھ سکتا تھا" میں نے کہا۔

"پھر دوسرے کون تھا؟ جس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔"
 "جو وہ بھی تھا۔ شاہ عالم نہیں تھا۔ یہ بات آپ کو اچھی طرح

سمجھ لینی چاہیے کیونکہ یہی ہے وہ مسئلہ جو آپ حل کر سکتے ہیں۔"
 اس نے سہلایا "ایسے پبلیوں میں بات مت کرو۔ یہ کیا پھر
 ہے آخر۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"کیا آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ بتائی ہے؟"
 "جی نہیں۔"

"آپ کے دو دو گارڈ آؤٹ کرنے کوئی رپورٹ دی ہے؟"
 "دراصل۔۔۔ یہ سب کاغذی کارروائی میں کرتا ہوں۔ انہوں
 نے اپنی رائے دی اور فارم پر دستخط کھڑے۔ میری رائے بھی وہی
 ہے۔"

"کیا ہے آپ کی رائے؟"
 "وہ لاش شاہ عالم کی تھی۔ اس بارے میں دوسرے میں
 ہو سکتیں۔"

میں نے زری سے کہا "آپ کو اپنی رائے بدلنی ہوگی۔ شاہ عالم
 میں ہوں اور میں آپ کے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہوں۔"
 "یہ۔۔۔ قانونی معاملہ ہے۔ اور سیاسی ہو تو میرا اس سے کوئی
 تعلق نہیں ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ پہلی بار جو رپورٹ دی گئی تھی
 ٹھیک تھی۔"

"وہ رپورٹ غلط تھی" میں نے اصرار کیا۔
 "میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"مگر آپ ایسا کیسے؟ آپ کو کون چیلنج کر سکتا ہے۔ کیا ممکن
 ہے اور کیا ناممکن۔ اس بحث میں نہ پڑیں ورنہ زیادہ پریشانی
 ہوگی۔"

"کیسی پریشانی؟ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"
 میں نے کہا "میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ وہ رپورٹ کہاں
 ہے؟"

ڈاکٹر مندر نے کہا "میرے آفس میں۔ ابھی میں نے اس پر
 کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "تنتی دیر لگتی ہے اس کاغذی کارروائی
 میں؟"

"اس کی پانچ کاپیاں ہوتی ہیں" وہ بولا "میں اپنے پی اے کو
 بتاتا ہوں اور وہ خانہ پڑی کر کے لے آتا ہے۔ اور بجٹل گورٹ کو
 جاتی ہے۔"

"اس وقت آپ کے پی اے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت
 ہے۔ آپ بولتے جا رہے ہیں آپ کپڑوں کا۔"

"میں سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ایسا کر کے مشکل
 میں پھنس جاؤں گا۔" ڈاکٹر مندر نے کہا۔

"اس وقت آپ جس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس کا اور
 کوئی حل نہیں ہے" میں نے کہا "کیا آپ سے کسی نے رابطہ کیا تھا
 مجھ سے پہلے اس مسئلے پر کوئی بات کرنے کے لیے؟"

"ذاتی رابطہ کسی نے نہیں کیا لیکن فون پر دو افراد نے بات کی
 لاگ۔"

تھی۔"

میں نے کہا "میں صاحب نے اور قہرٹی صاحب نے؟"
 ڈاکٹر مندر کاٹ حیرت سے کل گیا "یہ تم کیسے جانتے ہو؟"
 "میرے سوا کون کچھ سکتا ہے کہ اس سازش کا کیا مقصد
 ہے۔ ایک جیسے جانگے سو فیصد زندہ شخص کا مزار بنادیا جائے۔
 پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کر لی جائے کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ سیاست
 کی گندگی ہے ڈاکٹر صاحب۔ اپنا ہاتھ اور دامن بچا کے پہلے آپ
 نے کسی سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا؟"
 "کیا وعدہ؟" وہ سر ہلکے بولا۔

"کیسے کہ رپورٹ آپ کی مرضی کے مطابق دی جائے گی۔
 میں اور قہرٹی کی جانچ ہوں گے۔"

اس نے اقرار میں سہلایا "انہوں نے کل کے کچھ نہیں کہا۔
 بس میری رائے پر بھی تھی۔ میں نے کہا ابھی میں کوئی بات کہنے کہ
 سکتا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ صاف اور واضح ہے۔"
 "میں اتنی ہی کا تھا آپ نے؟"

"ہاں وہ کہنے لگے کہ شک دہشے کی محتاج تو نہیں تھی مگر ان
 اخبار والوں سے خدا سمجھے انہوں نے شوٹ چھوڑ دیا۔ میں نے کہا
 کہ مجھے نہ اخبار والوں کی پروا ہے اور نہ کسی کے شوٹ چھوڑنے
 سے حقائق بدلنے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں
 جیسے پیش کرتے ہیں۔"

"یاد کریں۔ آپ نے کسی طرح بھی یہ تو نہیں تسلیم کیا کہ
 رپورٹ دی ہوگی جو پہلے تھی۔ کیونکہ مرنے والا شاہ عالم ہی تھا۔"
 "مجھے کچھ بھی COMMIT کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"آپ کو انہوں نے گول مول الفاظ میں دھمکی تو نہیں دی تھی
 کہ رپورٹ بدلی تو نتائج کے ذمے دار آپ ہوں گے۔ یہ یا ایسی ہی
 کوئی بات؟"

"اگر وہ ایسا کہتے تو میں ڈی جی ہیلتھ کو بتا دیتا۔ سیکرٹری یا وزیر
 صحت کو INFORM کر دیتا۔"

میں نے کہا "پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم آپ کے آفس جا کے
 رپورٹ مرتب کرتے ہیں۔ آفس میں کون ہو گا اس وقت؟"

"صرف چوکیدار شاید وہ بھی نہیں ہو گا۔"

"چالی ہے آپ کے پاس؟ نہیں تو فکر مت کریں۔ جہاں چاہ
 ہے وہاں راہ ہے۔ آپ رپورٹ پر سائن کریں۔ آج کی تاریخ

میں رپورٹ کی اصل کاپی اپنے پاس رکھ کے باقی ROUTINE
 کے مطابق بھرانے کے لیے پی اے کی نگیل پر رکھ دیں۔ ایک فوٹو
 کاپی بھی تمام اہم اخبارات کو فراہم کر دوں تو صبح سب لوگ دیکھ
 لیں گے۔ اور بجٹل آپ کو واپس کر دی جائے گی۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اپنی قیمت بتائیں ڈاکٹر صاحب۔ ایک لاکھ۔ دو لاکھ۔ پانچ
 لاکھ۔"

”تم مجھے جھوٹی رپورٹ کے پانچ لاکھ دو گے؟ آخر تم کون ہو؟“
میں نے کہا ”میں شاہ عالم ہوں۔ اور یہ رشتہ نہیں، نذرانہ ہے بہت حقیر۔ مگر سچ کو سچ کہنے اور حقیقت کہنے کے لیے مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ آپ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ آپ کی جیلی پریشان ہوگی اور خود آپ بھی جیلی کے لیے پریشان ہوں گے۔ آپ میں آپ کو باقاعدہ دھمکی دے رہا ہوں۔ آپ کو یہ رپورٹ دینی ہوگی کہ وہ لاش شاہ عالم کی نہیں تھی۔ اس کے لیے دلائل بھی آپ کے ہوں گے۔ تیسری بار پوسٹ مارٹم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”میں دوسرے ڈاکٹر کی رائے کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہوں۔“
”نہیں نے کوئی رائے نہیں دی۔ معاملہ آپ پر چھوڑا۔ ان کے اپنے دستخط فارم پر موجود ہیں تو وہ کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کی رائے کچھ اور تھی۔ پھر بھی نام دیتے بتادیں ان کے۔“
”کیا تم ان کے ساتھ بھی یہی کر گئے؟“

”مگر ضرورت پڑی۔ ویسے آج کل لوگ سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ گھانے کا سودا نہیں کرتے۔ میں انہیں بھی سمجھاؤں گا کہ اختلاف نہ کریں۔“

ڈاکٹر صفدر کچھ دیر غلامی گھورتا رہا ”دس لاکھ!“
مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے پر خوشی ہوئی۔ اگر وہ خود نہ یوں تو میں رقم دگنی کہتا ”DONE“ میں نے کہا۔
”میں چیک نہیں لوں گا۔“

میں نے کہا ”وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ پر حرف نہیں آسکتا۔“
اس نے کہا ”میری بیٹی کو بیکروپنڈ نہیں۔ وہ لینڈ کروزر کے لیے ضد کر رہی ہے۔ تے ماڈل کی۔“

”چند اچھی ہے اس کی۔“ میں نے کہا ”کل اپنی یہ پیچیدگی ایسے شہر میں پر پٹھان ہیں۔ جہاں آپ کی کسی۔ میرا مطلب ہے آپ کی صاحبزادی کی پینڈ کی لینڈ کروزر موجود ہو۔ قیمت کا فرق دیکھ لیں۔ اگر باہر چودہ لاکھ اضافی دیتے ہیں تو دو چار آپ بیٹے کے طور پر دے آئیں۔ دس ہم پٹھانوں تک پھر آپ لینڈ کروزر لے جائیں اور اپنے نام سے رجسٹر کرائیں۔ ہمارے آپ کے درمیان کوئی ڈالوفٹ نہیں رہیں گے۔“

”تم ہوشیار آدمی ہو۔ اب بات تو خیر لے ہو گئی۔ یہ تالا کھاتم واقعی۔ شاہ عالم ہو۔“

میں نے کہا ”صرف آپ کے سامنے نہیں۔ مجھے دنیا کے سامنے اس سچ کا ثبوت دینا ہو گا۔ بلا تالا کچھ کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر دنیا مجھے شاہ عالم تسلیم کرے گی تو آپ کو پتا چل جائے گا۔“

”اب کچھ عملی مشکلات ہیں۔ وہ سمجھ لو۔“ ڈاکٹر صفدر نے کہا

”یہ ٹھیک ہے کہ میری رپورٹ قائل ہے۔ اس کو نہ کوئی چیلنج کر سکتا ہے اور نہ مسترد۔ میری پوزیشن بالکل محفوظ ہے۔ لیکن یہ رپورٹ میں اخبارات کو جاری نہیں کر سکتا۔ پہلے عدالت کو رپورٹ دینا ضروری ہے۔“

میں نے کہا ”آپ کی رپورٹ ایک ہی ہوگی۔ جو عدالت کے سامنے رکھی جائے گی اور جو اخبارات میں شائع ہوگی۔“
”یہ خلاف ضابطہ ہے اور عیناً تو ہیں عدالت بھی۔“

میں نے کہا ”آپ رپورٹ کے ذمے دار ہیں کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اگر وہ رپورٹ کوئی چوری کر لے یا کوئی اخباری رپورٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو آپ کی کوئی ذمے داری نہیں۔ یہ کوئی ہاپ سیکرٹ دستاویز نہیں۔ آپ نے پی اے کی میز پر چھوڑ دی تھی۔ رات کو کسی نے قبضہ لگائی رشتہ دہی اور اندر بھیجے کے فوٹو کاپی مالدار کوئی زندہ تھی۔“

اس نے انکار کر دیا ”نہیں۔ رپورٹ تمہارے حوالے کرنے کے بعد میرے پاس کیا ہو جائے گا مگر تم کہیں دو گے مجھے دس لاکھ۔“

”اس لیے کہ میں نے وعدہ کیا ہے۔“
وہ مسکرایا ”وعدہ کوئی شرط نہ معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ تم کو کل تک انتظار کرنا ہو گا۔ میں صبح رپورٹ عدالت کو دینے سے پہلے گاڑی شہر دم پر چھوڑ آؤں گا۔ نو دس بجے تک تم شہر دم والے کو پے آرڈر کر اس چیک یا بینک ڈرافٹ کچھ بھی دے دو۔ شہر دم کے نام پر۔ میں گورنر بننے کے فخرم کروں گا۔ شہر دم کے مالک نے کہا کہ ڈیل ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں لیکن صبح تک۔ میرا مطلب ہے گورنر کو رپورٹ ملنے تک آپ کی جیلی سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ہم آپ کی تنیم کو چھوڑ دیں گے۔ آپ آپس میں مباحثہ شروع کر لیں۔“

”تمہیں میری بیٹی کو یہ خیال رکھو گے؟“
”مجبوری ہے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ بے پی کو بالکل پریشانی نہیں ہوگی مگر آپ نے ریشائی کیا بیٹیاں چاہتا ہوں۔ اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ ٹریک کے معاملے میں بیٹی پر اطمینان ہو جائی ہے۔ اگر کسی کو پتا چل جائے کہ وہ ایک رات بھی گھر سے باہر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ آپ کو بھی سمجھنا چاہیے۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

ڈاکٹر صاحب ”بے وقوف آدمی۔ ابھی ہمارا ڈرائیور گاڑی میں جیم خانہ کلب پہنچ جائے گا۔ وہ سب کو بتا دے گا کہ وہ غارتگری ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صفدر کی جیلی کو کوئی ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے جیمس بھی دیکھا تھا۔ تمہاری گولڈ جینا لک کر کی شراؤ ہے۔ کیا پتا اس نے نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو۔“

میں نے کہا ”آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ جیسے ہی کلب پہنچے گا اس سے گاڑی جیمس کی جائے گی۔ کلب کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اسے ٹاک ہٹ کر دیا جائے گا۔ گاڑی آپ کے گھر پہنچا دی جائے گی لیکن ڈرائیور کل شام کو پہنچے گا۔ اس سے کہیں کہ خاموش رہے۔ کوئی پولیس رپورٹ لکھوانے سے فائدہ کچھ نہیں۔“

ڈاکٹر صفدر نے گھٹت خود وہ لیے میں کہا ”میرا خیال ہے۔ میں اس منظم دہشت ردی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”ایک بات اور۔“ میں نے کہا ”آپ کو اور آپ کی جیلی کو اپنی زبان بالکل بند رکھنی ہے۔ آپ رپورٹ دیں کہ اس معاملے کو بھول جائیں۔ اطمینان سے لینڈ کروزر میں پھریں۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں پوچھے گا لیکن آپ نے بعد میں جانوں کا سارا لینے کی کوشش کی۔“

”میں بالکل نہیں ہوں۔ یہ لا قانونیت کا زنا ہے۔ قانون کیا کر سکتا ہے کسی کے لیے۔“ وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد رپورٹ تیار ہو چکی تھی کہ دوسری بار پوسٹ مارٹم کرنے والے میڈیکل بورڈ نے اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ لاش شاہ عالم کی نہیں تھی جس کو وہ پہنچنے والی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ موتی کے جسم پر ضربات کے نشانات نہیں تھے۔ اندرونی اور بیرونی کوئی ایسی چوٹ نہیں تھی جسے موت کا سبب قرار دیا جائے۔ مزید یہ کہ لاش زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹے پرانی تھی۔ موتی کو گھٹا گھٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور علامات بہت واضح تھیں۔ کیمیائی تجزیے سے ثابت ہوا کہ وہ کسی جسم کے نئے کاغذی تھاپا اس کو خواب آور دوا دینے کے بعد سوتے میں ہلاک کیا گیا۔ موتی کے فکر پر پٹ اور DENTURE دستیاب نہیں۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ اور وزن ایک سو اسی پانچ کلو گرام کے قریب ہو گا۔ اس کی صورت میں شاہ عالم سے کچھ مشابہت نوٹ کی گئی۔

یہ رپورٹ پہلی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے سو فیصد مختلف تھی۔ پہلی رپورٹ میں شاہ عالم کے ضربات سے ہلاک ہونے کا ذکر تھا۔ بڑی حقیقت کے ساتھ اسے شاہ عالم کیا گیا تھا۔ اس کا قد وزن سب درست لکھا گیا تھا لیکن چو فٹ ایک انچ اور ایک سو ساٹھ پانچ۔

ڈاکٹر صفدر نے ہر کاپی پر میرے سامنے دستخط کیے۔ ہم آفس کا تالا توڑ کے اندر آئے تھے۔ میں نے چار کاپیاں میز پر چھوڑیں اور باغیچوں اور بیلنگ کاپی ساتھ لے کر میں ڈاکٹر صفدر کے ساتھ واپس گیا تو ان کی سفید۔ بیکروپنڈ کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ استاد رہیں غلام کچھ فاصلے پر موجود ہوں گے مگر نظر میں آ رہے تھے۔ چاہاں گاڑی کے اندر موجود تھیں۔

”بچے۔ آپ کی گاڑی چھٹی“ میں نے کہا اور چاہاں ان کو روکے

”نہیں۔ اسے گھر جانے دو بلین۔“
میں نے کہا ”دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنی جیلی کو سمجھا دیں کہ وہ خاموشی سے گھر جائیں اور آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ آپ کی جیلی گھر کے آرام کرے اور پڑ سکیں۔ آپ ان سے قون پر رابطہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ صبح آپ آفس جائیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رات کو کسی نے تالا توڑا تھا۔ آپ چوکیدار کو ڈانٹ لیت کریں گے لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ آپ پولیس کو اطلاع نہیں دیں گے اور رپورٹ لے کر سیدھے گورنر جائیں گے۔ راستے میں بھیجی و کسی شہر دم پر

ڈاکٹر صفدر نے پریشانی سے کہا ”گاڑی یہاں کیسے چھٹی؟ تم نے تو کہا تھا کہ گھر پہنچ جائے گی۔ خیر کیا اب ہم جا سکتے ہیں؟“
”آپ کیا پسند کریں گے؟“ میں نے کہا ”ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی کے ساتھ گھر جائیں۔ آپ کی بیوی ہمارے ساتھ رہے۔“

”نہیں۔ اسے گھر جانے دو بلین۔“

ناہید سلطان اختر کے شہرہ آفاق ہم سے ایک مہلک شاہکار ناول

زندگانی میں پھول

تیرے 300 روپے

لکھنے والے: سید سبطین حسین، سید سبطین حسین اور سید سبطین حسین

ڈراماٹک ڈیولپمنٹ ایک تحقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر دولت اور حالات کی منتیں کے دم پر دم رو جانے والے چار بھائیوں کی کہانی، جن کی بد قسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بگاڑ کر دیا۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

بہترین کتابت، خصوصی صورت گروپس اور عرصہ محبت کے ساتھ

ڈاکٹر

علی میاں پبلیکیشنز

20-عزیز آباد، اردو بازار لاہور 7247414

چھوڑے ہوئے۔
 ”مگر پھر وہ گھر ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا رات
 بھر۔“
 ”مجھ گاڑی آپ اپنے گھر سے لے سکتے ہیں“ میں نے کہا
 ”ہمارے ساتھ آپ کو تکلیف کوئی نہیں ہوگی۔“
 ”مجھے تم یہاں رکھو؟ کسی کی کوٹھی ہے یہ شہرے باہر؟“
 میں نے کہا ”جی نہیں کسی کی ہے۔ لیکن ہم یہاں نہیں رہیں
 گے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔ آپ کے سونے کا بندوبست کروا جائے
 گا۔“
 ڈاکٹر مندر نے اپنی جیلی سے خودی بات کی۔ چندا کے بدلے
 کی وجہ سے ان کا خوف کچھ کم ہو گیا تھا مگر وہ ابھی گھراہیں جانے پر
 راضی نہ تھیں۔ ڈاکٹر کے سمجھانے پر وہ مان گئیں۔ ”آپ کب
 آئیں گے؟“ اس کی بیوی نے کہا۔
 ”میں صبح آؤں گا۔ کچھ کام ہے مجھے اور بے بی، کل جنس
 اپنی پسند کی وہ لینڈ کروڈز بھی مل جائے گی۔“ ڈاکٹر نے خوش دلی سے
 کہا ”جو تم نے دیکھی تھی۔“
 لڑکی نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے مگر ایڈی یہ سب کیا ہے؟“
 ”یہ بچوں کے کھٹنے کی بات نہیں“ اس نے پھر وری چاہیاں
 بنی کر دے ہیں ”تم جاؤ۔ احتیاط سے ذرا سو کر آ۔“

ان کے جانے کے بعد وہ نہیں نمودار ہوا۔ وہ بہت بدل چکا
 تھا۔ پہلے وہ ڈیڑھا پتا بے موقع خشک چرے والا معلوم صورت اور
 فاقہ زدہ لڑکا نظر آتا تھا۔ اب اس کا بدن فریب کی جانب مائل تھا۔
 اس کا چہرہ پھولے ہوئے گالوں کے ساتھ اور بڑی بڑی جنگلی
 سونچوں کے ساتھ خوف اور دہشت کا تاثر پیدا کرتا تھا۔ رنگ جو
 پہلے گھرا سا ہوا تھا اب کالا ہو گیا تھا۔ اس کے بڑے بڑے بیرو
 ٹائپ بال قلاب ہو گئے تھے اور اب ایک انچ سے بھی کم لمبے بالوں
 کے ساتھ اس کا سر چرے کے مقابلے میں چھوٹا لگتا تھا۔ اس نے
 رنگین شرٹ چٹون پہننا چھوڑا تھا مگر گلے میں لال دھال باندھا
 نہیں چھوڑا تھا۔ وہ گھیردار شلوار پر ڈھیلا ڈھالاکرتہ پن کے بالکل
 پہلوان نظر آتا تھا۔

میں نے کہا ”استاد گاڑی تو آگئی۔ ذرا سو کر کہاں ہے؟“
 رہیں نے کہا ”اے بار۔ بال بال بچ گیا سلا ورنہ گوشت
 کون ہو جاتا۔ شرافت سے قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ بڑا ظالم مگر
 مارا اور ایک بندہ لٹا رہا۔“
 ڈاکٹر مندر نے کہا ”وہ آری کا سابق باکسر ہے۔“
 ”ہو گا۔ ہم نے بڑے بڑے باکسرز کو کھیلے باکس میں۔
 قسم اللہ کی قسم آج آتا میں تو بھل جاتا کہ وہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تو
 باکس کا گھر تھا کہ ہاتھ ہلکا رکھتا۔ بندہ سالم واپس چاہیے۔ لیٹا ہوا
 ہے ابھی مگر کھڑا ہو جائے گا اپنے بیروں پر مچ نکے۔“

ڈاکٹر مندر نے استاد اور پاس کے اس انوکھے رشتے کو خاصی
 حیرت اور پند پند کی ہے دیکھا ”سٹریٹ شاہ عالم۔ کون ہے؟“
 میں نے کہا ”یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ لکھنؤ آیا۔“
 رہیں نے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ مارا ”لکھنؤ آیا رکھتے ہو۔
 جو ایک لکھنؤ کی ہو تو باری باری پس نہیں۔ باری میں ایک دوسرے کی
 لکھنؤ تک آنا نہیں مگر ضرورت پڑے تو ایک ساتھ لکھنؤ کس کے
 مقابلے پر آجائیں اور بھاگتے چور کی لکھنؤ ہی نہ چھوڑیں۔“ اپنی
 بات پر وہ خودی قہقہہ مار کے ہنسا۔
 ڈاکٹر مندر نے لکھنؤ شیار کی اس تعریف کو پسند نہیں کیا اور
 رہیں کا ہماری مجرم کا ہاتھ ہٹانے کا دھمکا ہلا ہلا ”بڑی عجب دوستی ہے
 تم دونوں کی۔“
 میں نے کہا ”دوستی عجیب ہی ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ شاید
 آپ دیکھ بھال کے اور ٹاپ تول کے دوست بناتے ہوں گے۔ اپنے
 ہم پیش اور ہم رتبہ یا ہم ذوق افراد کا انتخاب کرتے ہوں گے جن کو
 دوست کہتے ہوئے آپ کو اپنی کلاس میں شرمندگی نہ ہو لیکن ہم بس
 دوست ہیں حالانکہ ہمارے درمیان قدر مشترک کوئی بھی نہیں۔
 اس غلوں کے سوا جو ہم ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں۔“
 ”ہم آرکے۔ ہم واقعی مفادات کی دوستی رکھتے ہیں۔“ اس نے
 مسکرا کے رہیں سے ہاتھ ملایا ”میری بد قسمتی ہے کہ میرا کوئی ایسا
 دوست نہیں۔“

میں نے کہا ”استاد۔ اور کا معاملہ تو سیٹ ہو گیا۔“
 ”اور کا بھی سیٹ ہے پاس۔ چلو ختم خود کھو۔“
 میں نے کہا ”مگر اندر ہے۔ رنگ بھردل گیا ہے۔ مگر یہ جو
 تم میری بدل دیتے ہو یہ ٹھیک نہیں۔“
 رہیں گاڑی میں ذرا نیوٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا ”سب ٹھیک ہے
 پیارے۔ سو کر لیا ہے اس کا بھی۔ اپنے دل سے اتر گئی ہے یہ
 ساری۔“

”کیوں۔ ابھی گاڑی ہے۔“
 ”ابھی تو ہے لیکن بار کچھ زمانہ پن ہے اس میں۔ نزاکت
 ہے۔ ہون مائل کی لٹری والی بیپ مروانہ سوری ہے۔ خیر یہ تاؤ
 اب کہاں جاتا ہے۔“
 میں نے کہا ”خبر میں ایک خبری ہے۔ یہ کام تم ہی
 کرو گے۔ ابھی میں کسی کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔ خاص طور پر
 اخبار والوں کے سامنے۔“

”مگر نہیں پاس۔ ابھی قائم ہے۔“ رہیں نے گاڑی کو ایسے
 دوڑانا شروع کیا کہ ڈاکٹر مندر اور میں دائیں بائیں ٹھٹکتے رہے اور
 اچلتے رہے۔ ڈاکٹر مندر خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ
 بالکل ناخوش مسکراتا رہا۔
 اتنا وقت نہیں تھا کہ شہر کے سارے اخبارات کو پوسٹ مارم

رپورٹ کی نقل فراہم کی جاسکتی۔ بیشتر اخبار آخری کاپی پر نہیں ہیں
 پیچھے کی تاری کر رہے تھے۔ رہیں نے اپنے رابطے استعمال کیے
 اور تین اخباروں کو ایک مسئلہ خیز اطلاع مل گئی۔ ایک رپورٹر
 رہیں کو جانتا تھا۔ دوسری جگہ نیڈ ایڈیٹر نے خود اس سے خبر کے
 مصدقہ ہونے کی تحقیق کی۔ اس نے اور پینل کاپی دیکھی۔ یہ پوچھا
 کہ آخر نہیں کے ہاتھ یہ رپورٹ کیسے لگی۔ اس نے صاف کہا کہ
 ہم نے چوری نہیں کی مگر چوری کرانی ہے۔ چھائی ہے تو چھاپ ورنہ
 مجس جسے بدالت میں سب ہی دیکھ لیں گے۔ اخباروں کے ایڈیٹر
 اپنی خبر کا ذریعہ بنانے کے پابند نہیں ہوتے۔ لہذا خریدنے پر ان کے
 خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے اور ملکی مفاد کے خلاف کسی راز
 کو افشا کرنے پر بھی مقدمہ چلایا جاسکتا ہے مگر کسی عام خبر کو
 دوسروں سے پہلے لوگوں تک پہنچانے پر کسی قانون کے تحت ان
 سے نہیں پوچھا جاسکتا کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ ہر اخبار
 اپنے ”مصدقہ ذرائع“ اور ”بذوق ذرائع“ کے حوالے سے اپنی
 ذمہ داری پر سب سے پہلے قارئین کو خبر پہنچانے کی نیک دلی کا
 ہے۔ بڑے بڑے انکشافات ”سینکڑوں“ راز ہائے سرست اور پوشیدہ
 حقائق کو عوام تک پہنچانے میں بہل کرنے کی دوڑ میں اخبارات کا
 مقابلہ بہت سخت ہے۔

تیسری جگہ خود ایڈیٹر نے رہیں کا انٹرویو لیا اور پھر یہ
 ”رسک“ لینے کا فیصلہ کیا۔ رپورٹ غلط یا جعلی ہوتی تو بدنامی اور
 قانونی مسائل کا سامنا بھی انہیں کرنا پڑتا مگر ہر پیشے میں کام کرنے
 والے پرانے لوگوں کی ایک چھٹی جس ان کی راہنمائی کرتی ہے۔
 پرانے اخبار نویس کی نظر بھی سات پر دلوں میں چھپے ہوئے جگہ کو تاز
 کرتی ہے اور رجوت کو کچل دیتی ہے۔

استاد رہیں کو اخبار والوں کا مدتیہ پسند نہیں آیا ”سالے
 ٹک کرتے ہیں خواہ خواہ۔ قسم اللہ کی دنیا سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔“
 میں نے کہا ”استاد۔ یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔ کل کوئی پوچھے گا
 کہ جنس رپورٹ کیسے ملی تو وہ کیا جواب دیں گے؟“

”اے کون پوچھتا ہے ان سے۔ اور رجوت ہو تو الگ بات
 ہے۔ ہم نے بھی کہا کہ یار ایڈیٹر صاحب۔ تم کہہ سکتے ہو کہ پتا نہیں
 کون تھا جو کاپی باہر سے دے کے چلا گیا۔ بس نام مت لیتا ہمارا
 ورنہ قسم اللہ کی عمارت تو کچھ ہو گا نہیں“ تمہارا ہاف پینٹ آئیٹ
 ہو جائے گا۔“

”یہ ہم کہہ رہا ہے ہیں؟“ ڈاکٹر مندر نے بے چینی سے
 پوچھا۔

میں نے کہا ”آپ پہلے وہاں جا چکے ہیں، میرے مزار پر۔“
 ”مگر اس وقت؟“

”کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے وقت نہیں ہوتا۔
 وقت نکالنا پڑتا ہے۔ جب بھی ملے“ میں نے کہا۔

وہ جگہ جہاں شاہ عالم کا حجاز تھا تو صبحی رات کے بعد سونی پڑی

تھی۔ لائسنس اب بھی مل رہی تھی اور قاتلوں سے گھرا ہوا احاطہ
 پوری طرح روشن تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی میں نے ان سب
 لوگوں کو دیکھا جو لاشوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔
 کچھ لوگ بڑی خاموشی سے قبر گودے میں مصروف تھے۔

دو سے دو رجوت لگتے تھے جو قبرستان کی دیرانی میں رقص
 کر رہے ہوں۔ آس پاس بے ترتیبی سے ساکت پڑے ہوئے لوگ
 بھی مردہ نظر آتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی حورے کو دھانے
 کے لیے جنازے کے ساتھ آتے والوں میں شامل تھے مگر اس
 دہشت انگ داخل میں اچانک انہیں موت نے کسی شیطانی آسیب
 کے دھب میں آلیا۔ وہ بھی مردے ہیں جن کو خود ان کی قبروں
 نے باہر اٹھ دیا ہے۔

وہ باغ جہاں شاہ عالم کو دفن کیا گیا تھا اس رات کی تاریکی میں
 جنگل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہوا شاخوں کے درمیان سے سینیاں
 بھائی اور درختوں کو مجنونی گزرتی رہتی تھی۔ تیز ہوا سے ٹوٹ کر
 بکھرنے والے بچے اور خوش و غاشاک اڑنے کے ہر طرف پھیل رہے تھے۔
 ڈاکٹر مندر نے ان چاندلوں کو دیکھا جو بدن پر صرف نیکر جیسے
 اندھویر پتے کا دلہن چلا رہے تھے اور بچوں نے اٹھا اٹھا کے مٹی
 پھینک رہے تھے۔ ان کے بدن مٹی میں بکھر کے مٹی چپے ہو گئے تھے
 اور پیسے کے ساتھ مل کے یہ مٹی کچڑ بن گئی تھی ”یہ کیا ہو رہا ہے
 یہاں؟“ میں نے کہا ”آپ نے اخبار میں ضرور دیکھا ہو گا کہ شاہ عالم
 کے مزار کی تعمیر کا ابتدائی کام شروع کر دیا گیا ہے۔“

”لیکن۔۔۔ یہاں تو اتنی سی معاملہ نظر آتا ہے۔ یہ لوگ شاہ
 عالم کی قبر گودے میں ہیں؟“ ڈاکٹر مندر نے کہا۔

”شاہ عالم کی قبر شاہ عالم میں ہوں ڈاکٹر مندر۔“
 ”میرا مطلب تھا۔ وہی قبر جس میں سے لاش نکالی گئی تھی۔

دو یا دو پوسٹ مارم کے لیے“ ڈاکٹر مندر نے کہا۔
 ”مٹی کوئی بات نہیں۔ دور سے ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے کہا
 اور پھر رہیں سے قلاب ہو گیا ”استاد۔ صبح تک سب ٹھیک
 ہو جائے گا؟“

”نہیں گاڑی سے اتر گیا“ ٹھیک کیسے نہیں ہو گا پیارے۔ ہم
 جس نام کے استاد نہیں ہیں۔“

”پھر میں جاؤں؟“
 ”جاؤ۔ اپنی رات تو ادھر ہی گزرے گی۔ خود نہ دیکھو تو کوئی
 کام مرضی کے مطابق آغا مان بخش نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں وہی۔“

میں نے کہا ”اے بی بی۔ مجھ سے کے آوی ہیں نا۔“
 استاد رہیں محمد خان نے مجھے تسلی دی ”اے ہم کیا کام نہیں
 کرتے اپنے مرید ہیں سارے۔ حکم کے ظام ہیں۔ تو مل چکا ہے
 سب سے۔“

”اچھا؟ کون کون ہے؟“ میں نے کہا۔
 ”ایسا رک تو ہی ہے گلابا۔ شادی محلے کی رتو کا ماسخ جس
 نے طبلہ مار کے طبلے کا سر جھڑایا تھا اور کمزلی سے رتو کے ساتھ
 کود گیا تھا۔“
 ”جنگ نہ توئی تو کسی کے ہاتھ نہ آتا۔ رتو سے شادی
 کرنا چاہتا تھا کہ سال بھر جیل کا کٹنی پڑی۔ جب سے باہر آیا ہے رتو
 کو ڈھونڈنا پھر رہا ہے۔“ دوسرا بھروسہ ہے۔“

چالیس پچاس قدم دور جا کا تھا۔ کچھ فاصلے پر کدال بیجے چلائے
والے اسے اپنی طرف آنا دیکھ کر رک گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو
رکھ کر منہ لڑو لڑو ایسے دیکھ کر جانب چل رہا۔

حساب سے قاتل آگے بڑھنے کے نصب کی جانے والی تھیں اور وہاں پھر ایسے بھائی جانے تھے کہ قبر کے قاتلوں کے کنارے تک آجائیں۔ شامیانے اور قاتلوں کی رسی جن ٹکڑیوں کی بنی ہوئی تھیں سے بندھی ہوئی تھیں ان سب کو کئی جگہ گاڑنا ضروری تھا اور پرانے نشانوں کو برابر کرنا بھی۔ استاد میں محمد خان کے خیال میں چار افراد کے لیے رات کے آٹھ گھنٹوں میں یہ کام بہت آسان تھا۔

اسے نکالیا باتوں میں۔ کہنے لگا کہ بس جی کالی کرلی اچھی پہلے دس دن میں۔ اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا۔ اب بھی آتے ہیں آنے والے لیکن بہت کم۔ میں نے کہا کہ کیا چاہتے ہو بہت بچ بچتی ہے؟ اس نے کہا کہ بہت تو فیض پھر بھی ہوگی بچاس ساٹھ کپ۔ میں نے کہا کہ گرم ہے تو سب کو پادوسری طرف سے۔ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے میں نے بچاس کپ کے پیسے۔ سالا سمجھا کہ میں بھی کوئی شاہ عالم کارا سرا ہوں۔"

ضروری تھی مگر اب اسے ہر طرف سے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔
اس نے پوچھا "مسٹر شاہ عالم! تم مجھے یہاں کیوں لائے
تھے؟"

میں نے کہا "استاد کو یہاں چھوڑنا ضروری تھا۔ وہ پیدل نہیں
آسکتا تھا۔"

"آخر تمہارا یہ استاد کیا کر رہا ہے یہاں؟"

"شاہ عالم کے مزار پر کام ہو رہا ہے نا۔"

وہ چلائے لگا "مہموت بولتے ہو نہ؟ مجھ سے کہتے ہو کہ مرے
والا شاہ عالم نہیں تھا۔ تم شاہ عالم ہو پھر یہ شاہ عالم کا مزار کیوں بن
رہا ہے؟"

میں نے کہا "اس میں چلائے کی کون سی بات ہے۔ چنانچہ
والے بتا رہے ہیں تو میں کیا بناؤں۔ جب غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ
یہاں شاہ عالم دفن نہیں ہے۔"

"اور غلط فہمی دور کرنے کے لیے تمہارا یہ بد معاش استاد لاش
کو قبر سے نکلوا رہا ہے۔" وہ برہمی سے بولا۔

"یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ تم نے مجھ سے رپورٹ لے لی کہ
یہاں شاہ عالم دفن نہیں ہے۔ اب تم لاش نکال کے کیوں یہ تک
دو گے قبر خالی رہ جائے گی۔ پھر کوئی کچھ ثابت کرنا چاہے تو کیسے
کرے گا؟"

میں نے کہا "تیسری بار پوسٹ مارٹم ناممکن ہے۔"
"مگر تم نے اپنی پوزیشن کو محفوظ کرنے کے لیے لاش ہی غائب
کر دی ہے۔ ازمائی گا مجھے یہ اندازہ نہیں تھا۔" وہ سر پکڑ کے بیٹھ
گیا۔

"تمہارا اندازہ اب بھی غلط ہے۔" میں نے کہا "میں خلف
افشاں ہوں کہ اس لاش کو چھینا تک نہیں گیا جس کو انکوائری کے تم
نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ میں اتنا ہی مسلمان ہوں جتنے تم۔ مہموت
حلف اٹھاؤں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا "میرا خیال ہے میں
بہت بڑا احمق ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ
میں نے وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ دی اور تمہارے حوالے
کر دی۔"

"تم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے ڈاکٹر منصور۔"

"معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہو گا۔ اب تو رپورٹ انبار میں
چھپ چکی ہوگی، صبح سارے زمانے کو پتہ چل جائے گا۔"

"نیک انٹیری ڈاکٹر! تم بالکل محفوظ ہو۔ تم پر کوئی ایٹلی
نہیں اٹھ سکتا۔ کسی نے ایسا کیا تو وہ بچتا ہے گا۔" میں نے کہا

"ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ میرے خالصین تمہاری دی ہوئی
پوسٹ مارٹم رپورٹ پر غلط ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور طوفان
کھڑا کر دیتے ہیں۔"

"تمہارے خالصین جا میں جہنم میں۔ میرے ساتھی ڈاکٹر کیا
کیسے گئے؟"

میں نے کہا "ایک رپورٹ دیکھنے کے بعد انہوں نے اس پر
اپنے دو حلقہ کر دیے۔ کیا اب وہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے خالی فارم
پر دستخط کر دیے تھے۔ پوسٹ مارٹم انہوں نے کیا ہی نہیں تھا۔ یہ
غیر اخلاقی ہی نہیں غیر قانونی حرکت سمجھی جائے گی اور میرے دشمن
ان کے ہی دشمن ہو جائیں گے۔ دشمنی پانا ہر ایک کے بس کا رنگ
نہیں۔ ڈاکٹر حرف ڈاکٹری کر سکتے ہیں۔"

"جسے تم ناممکن سمجھ رہے ہو وہ اتنا ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہ
مسائلہ ہائی کورٹ میں بھی جاسکتا ہے کہ میڈیکل بورڈ کے ارکان
بک گئے تھے یا ان پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ مرضی کی رپورٹ حاصل
کرنے کے لیے۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ ایک نیا زیادہ بڑے ڈاکٹروں پر مشتمل
میڈیکل بورڈ بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ اس میں کراچی کے ڈاکٹر
ہو سکتے ہیں یا راولپنڈی کے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں
وقت لگے گا۔ عدالت جیسے تو یہ فیصلہ کرے گی کہ درخواست قابل
سماعت ہے یا نہیں۔ پھر فریقین کو نوٹس جاری ہوں گے۔ اس کے
بعد سماعت۔ دلائل کل پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شک کی گنجائش
کیوں ہے اور کیا ہے؟ بغرض محال یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ
رپورٹ دیانت داری سے نہیں دی گئی یا دباؤ کے تحت حاصل کی گئی
ہے تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ شاہ عالم تیسری بار یہ دیا دیکھے
گا۔ وہ کیا دیکھے گا دنیا اسے تیسری مرتبہ نمودار ہوتا دیکھے گی اور
اس وقت ڈاکٹر منصور حتمی ثبوت مل جائے گا کہ آپ کی رپورٹ
سوفیہد ٹھیک تھی۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر جائے جائیں تب بھی یہی
ثابت ہو گا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو یہ بات؟"

"اس لیے کہ شاہ عالم میں ہوں" میں نے گاڑی کو کرقل خان
کے گھر کایٹ کھول کے جب کے پیچھے کھڑا کر دیا۔

خان جی نے سوتے ہوئے محسوس کیا ہو گا کہ کسی نے گھٹ
کھولے اور کوئی گاڑی اندر آئی ہے۔ وہ سوتے وقت بھی اسنے
چرخ اور ہوشیار رہے تھے کہ میں کتنا تھا خان جی "نہیں نہیں آئی تو
آپ آنکھیں بند کر کے سونے کا زور لایا کیوں کرتے ہیں؟ لیکن ذہنی
طور پر بہت سے لوگ اتنے اثر رہتے ہیں کہ خفیف سی آہٹ پر
ان کا لا شعور فوراً شعور کو جھنجھوڑ کر بیدار کھڑا ہے۔

باہر کی ایک لاش جلی اور خان جی ٹائٹ گاڑی میں نمودار
ہوئے گاڑی ان کی دیکھی ہوئی تھی مگر ڈاکٹر منصور ان کے لیے
اجنبی تھے۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" ڈاکٹر منصور نے کہا۔

میں نے کہا "یہ کرقل خان ہیں۔ پہلے ایس ایس جی میں تھے
جن کو ہم عام طور پر کمانڈوز کہتے ہیں۔ فٹری انٹیلی جنس سروس سے

رہنما رہے اور سر۔۔۔۔۔۔ یہ ڈاکٹر منصور علی شاہ ایف آری ایس۔"
"میں جانتا ہوں" خان جی نے ان سے ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا "مگر قل خان آج بھی اتنے ہی ایکٹو اور خطرناک
ہیں جتنے ایکٹو سروس کے زمانے میں تھے۔"

"آپ کے والد ہیں؟" ڈاکٹر منصور نے پوچھا۔
"جی، بلکہ اس سے بھی بڑے گھر۔ انہی کی تعلیم و تربیت نے مجھے
اس قابل بنایا" میں نے کہا۔

خان جی نے کہا "کسی قابل ہو جاتے تو یہ بات اتنی غلط نہ
ہوتی۔ خیر آپ آئیں اندر آئیں۔"

ڈاکٹر منصور نے اپنا ریف کیس صوفے پر اپنے پاس رکھ لیا اور
مجھے بولے انداز میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا "کیا میں اپنے گھر
ایک فون کر سکتا ہوں۔"

میں نے اسے اپنا موبائل فون پیش کیا "ایک نہیں آپ دس
بک فون کریں۔ اس وقت آپ کی یہی خاطر تواضع کی جاسکتی ہے۔"

"میں چائے پانے کا لانا ہوں یا آپ کالی کو ترجیح دیں گے؟"

خان جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔
میں نے کہا "یہ ایک ڈس کوالٹی فیکیشن ہے میرے لیے کدیں
چائے بھی نہیں بنا سکتا۔"

ڈاکٹر منصور نے کہا "آپ کو زحمت ہوگی سر۔ لیکن مل جائے تو
کالی۔۔۔۔۔۔ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

خان جی کے جاتے ہی اس نے گھر کا گھبرا دیا۔ اس کے پوری
پچے شاہ پڑشانی میں جاگ رہے تھے۔ ڈاکٹر منصور نے انہیں قتل
دی اور کہا کہ وہ اطمینان سے سو جائیں۔ مجھے کچھ کام پر کیا ہے ایسا
کہ میں صبح سے پہلے گھر نہیں آسکتا۔ آف کورس صبح میں ناشتہ
لوگوں کے ساتھ ہی کروں گا۔ تم جانتی ہو یہ ایسا ہی پیش ہے۔ بعض
اوقات قانونی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات
نہیں۔ بے بل سے کہہ دیتا کہ۔۔۔ اچھا جاگ رہی ہے وہ بھی۔ فون
دو اسے۔۔۔۔۔۔ ہاں سوئی۔ میں نے کہا تاکہ کوئی پر اہم نہیں۔ فادرگٹ
ایڈوٹ دینے خوش ہو جاؤ کہ کل تمہاری فرمائش پوری ہو جائے
گی۔ ہاں بالکل دی جو تم نے پسند کی تھی۔ شام تک۔۔۔ اوکے
تھی۔۔۔۔۔۔"

اس نے فون مجھے واپس کر دیا "مجھے امید ہے کہ تم اپنے وعدہ
پر قائم رہو گے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "قائم نہ رہنے کی وجہ؟"
"دراصل پوسٹ مارٹم رپورٹ تو مل گئی تھیں۔ تم نے
اخبارات کو بھی دے دی۔ اب تم نہ جاہو تو میں زبردستی تم سے کیا
لے سکتا ہوں؟"

"تم کورٹ میں کہہ سکتے ہو کہ رپورٹ مجھ سے گمن پوائنٹ پر
لکھوائی گئی تھی۔" میں نے کہا "حقیقت اس کے برعکس ہے۔"
اس نے فنی میں سر ہلایا "یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد۔۔۔۔۔۔ مجھ میں



قیمت فی جلد
250 روپے

دو جلدوں میں مکمل

خنوہ اور سنگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک
کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک
دستی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر سنگول بھی کانپ اٹھتے تھے
پہاڑوں سے گرانے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور
طوفانوں سے الجھنے والے وحشی دیوانے کی داستان حیرت



اپنے باکرہ اپنے شہر کے ہر اچھے ہسپتال سے طلب فرمائیں
قریبی مشق آؤ دراصل کرنے پر ذرا خرچ پڑے گا۔ ادارہ ہوگا

ناشر
عالمی دیناں پبلشنگس

۲۰ عزیز داری کسٹ آرڈر بازار لاہور 7247414

نہایت روڈ،
چوک میوہ پتال،
لاہور

ہمت نہیں ہے کہ تم جیسے شخص سے اطلاع دینی ضروری ہو۔ ایک شریف، بلکہ بیرون آدمی ہوں۔ پہلے کتابی کڑا تھا، ڈاکٹر کا تو پیشے کے تقاضوں میں اچھا لگتا۔ کام کام دن رات کام۔" "کیونکہ کام کرنے سے پیسہ آتا ہے" میں نے کہا۔ "آف کورس۔ بلا معاوضہ دنیا میں کوئی بھی کچھ نہیں کرتا۔ ہارکو چھوڑ کے خدمت خلق کرنے والے بھی کمالی کر رہے ہیں۔ رات کے عبادت گزار بھی خواب کھاتے ہیں۔ میں عام آدمی ہوں۔ اسی دنیا میں وہ کے وہی کرنے پر مجبور ہوں جو دنیا کر رہی ہے۔"

"یہاں تم سکون سے سو سکتے ہو۔ اگر سونا چاہو۔ یہ جگہ ہر لحاظ محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کیاریات بھر جاتے رہو گے، پہرے وادری کو گے میری؟" "نہیں۔ مجھے صبح سے پہلے کچھ اور ضروری کام نہ ملتا ہے۔" "کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "تفصیل میں جانتے بغیر میں یہ بتا سکتا ہوں کہ ری مدو سے میں نے اپنے دشمنوں کی ایک سازش کو ناکام بنادیا۔"

"کون دشمن کیسی سازش؟"

میں نے کہا "میں ایک سیاسی جماعت کا سربراہ ہوں۔ اپنے میاں مشورہ داتی بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند برسوں عوام کی پزیرائی سے ہم اپنا سیاسی ایجنڈا بتر کرنے میں کامیاب ہوئے اور ہماری جماعت کا سیاسی مستقبل خاموش رہا۔ دشمن ام آدمی کے بھی ہوتے ہیں۔ اقتدار کی جنگ میں سیاسی حریف وہ ہوتے ہیں اور طاقتور ہوتے ہیں۔ میری مقبولیت سے حسد نے والے اور خوف کھانے والے کچھ سازشی عناصر۔"

ف ایک ایسی سازش کا منصوبہ بنایا جسے میں احمقانہ ہی کہہ رہا ہوں۔ میں غیر ملکی دورے پر تھا، لندن سے ٹوکیو، پھر ہانگ کانگ، سنگاپور۔ مجھے واپس آنے میں تقریباً پندرہ دن لگ گئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار دو میٹھے۔ مرکز پر چکا تھا اور میری غیر موجودگی میں کوئی گزیدہ نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو بار چلانے والے اپنا کام کرتے رہے۔ پائلٹ کے عہدے اور کارکن میری ہدایات کے مطابق چلتے رہے۔ میرا سب سے بڑا تھا۔ اس بار ایک عجیب بات ہوئی۔ میرے کچھ بدخواہوں نے جانے کہاں سے میرا ایک ہم شکل تلاش کر لیا۔ آپ ڈاکٹر ہیں؟

پ کے علم میں سیکڑوں واقعات ہوں گے TWINS SIAMEE کے ایک ساتھ پیدا ہونے والے دو بچے اس حد۔ مشابہ ہوتے ہیں کہ خود انہیں آپ کو ان کی شناخت کے لیے کوئی پتہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ میرا کوئی جڑواں بھائی نہیں تھا۔ بلکہ سے نہ میرا بھائی تھا کوئی اور نہ بہن تھی۔ لیکن کمال کی بات ہے کہ میرا جو ہم شکل ملا وہ بالکل میری کارن کاپی تھا۔ ایسا کہ

میرے ساتھ ہونا تو کوئی بھی نہ مانا کہ وہ میرا جڑواں بھائی نہیں ہے۔ ہانگ کانگ، قد و قامت، آواز اور انداز۔ وہ سرفیصد میرا ڈبلی کیٹ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے میرا بدل کرنے کا معاوضہ کیا دیا گیا اور وہ کون تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ساتھی میرے دوست یہاں تک کہ میرے اپنے گھر والے اور میری بیوی۔ سب اس جلسہ کو پہچانتے ہیں ناکام رہے۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے" ڈاکٹر مسند پر بٹرایا "بیوی بھی؟"

"ہاں۔ وہ میرے بڑے دم میں پہنچ گیا۔ لیکن۔۔۔ میں مسکرایا "اس نے اتنی شرافت برلی کہ عملاً میری بیوی کا شوہر نہیں بنا۔ یہ میں جانتا ہوں اس لیے بتا رہا ہوں۔ میرا ڈبلی کیٹ سامنے لانے والوں کے ذہن میں ایک بھیانک منصوبہ تھا۔ انہوں نے اسے میرے ایک پرانے ساتھی عمر دراز کے پاس بھیجا۔ عمر دراز میرا دوست اور قابل اعتماد مشیر تھا۔ کچھ غلط فہمیوں کے باعث جو پیدا کی تھی جس میں وہ مجھ سے برگشتہ ہو گیا۔ مفاد پرست اور موقع شناس قسم کے عیار لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اسے اپنی کالنگ گروپ بنانے پر مجبور کر دیا۔ سازشی لوگوں نے جلی شاہ عالم کے ذریعے عمر دراز کو قتل کر دیا۔ اسے بھیجا کہ عمر دراز معاملت چاہتا ہے اور ملاقات کے دوران میں نہ جانے کسی نے عمر دراز کی چائے میں زہر ڈال دیا۔ الزام شاہ عالم پر آیا۔ نعلی شاہ عالم بڑی مشکل سے بلکہ خوش قسمتی سے جان بچا کے نکلے میں کامیاب ہو گیا ورنہ پروگرام یہی تھا کہ عمر دراز کے مرے ہی اسے بھی مار دیا جائے۔ میں اس زمانے میں ہانگ کانگ میں تھا اور وہاں میری موجودگی کے ایک نہیں دو دن گواہ تھے۔ اس کے باوجود مجھے قائل تھا کہ وہ دیکھا گیا۔ جب مجھے ہانگ کانگ میں اس اشتعال انگیزی کا پتہ چلا تو میں نے وضاحت کی مگر کہا یہ کیا کہ شاہ عالم بیوقوف، عکاسی اور چالاک سے کام لے رہا ہے۔ وہ ہانگ کانگ سے آیا اس نے عمر دراز کو قتل کیا اور واپس ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ چونکہ نعلی شاہ عالم سرفیصد میرا ہم شکل تھا اس لیے چشم دید گواہ بھی بہت تھے۔"

"یہاں جو شخص نعلی شاہ عالم بنا تھا۔ اس سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔"

میں نے کہا "وہ جان بچا کے روپوش ہو گیا۔ یہ سب اخبارات میں آچکا ہے۔"

"تم۔۔۔ اخبار میں سیاسی خبریں نہیں پڑھتا۔"

"میں نے اور میرے ساتھیوں نے صورت حال کی وضاحت کرنے کی بہت کوشش کی مگر خالصتاً نے عمر دراز کے قتل کو بہانہ بنا کر ہنگامے شروع کر دیے۔ پھر اس کی قبر کی بے رحمی کی گئی۔ اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی اور اس کا ذمے دار میری پائلٹ کے لوگوں کو ٹھہرا دیا۔"

"آپ باہر بیٹھے رہے مرنے سے اور سب دیکھتے رہے؟" وہ طر سے بولا۔

"نہیں۔ میں فوراً واپس آیا مگر مجھے آنے میں دو چار دن لگ گئے۔ میں سگا پور کے راستے کراچی پہنچا۔ رپورٹ پر سب کے سامنے جہاز سے اتارا۔ مجھے میری بیوی نے اور پائلٹ کے عہدے والوں نے سید کیا۔ میں نے ایک پریس کانفرنس کی اور ٹرین سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔"

"ٹرین سے کیوں۔ جہاز سے کیوں نہیں؟"

"مجھے اطلاع ملی تھی کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ اس میں ہم رکھا جاسکتا ہے۔ میں نے احتیاطاً بہتر سمجھی۔ لاہور پہنچنے ہی ریلوے اسٹیشن پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک شخص نے مجھے نشانہ بنائے گا کر کیا کر گئی تھی میرے نائب صدر کو اور وہ معمولی زخمی ہوا۔ افغانیے راز سے بچنے کے لیے ناکام قاتلانہ حملہ کرنے والے کرائے کے قاتل کو وہیں مار دیا گیا۔ میرے استقبال کے لیے آنے والے ہجوم میں میرے خالصتاً اور دشمن بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک شخص نے مجھے ہجوم سے ہٹایا اور خفیہ راستے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ میں طے شدہ عام راستے سے جاتا تو قیقہ کوئی اور بات ہو جاتی۔ اس ہمدرد نے مجھے اپنی گاڑی میں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا جو شاید اس کا گھر تھا مگر وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے، میرا روپوش رہنا ہی بہتر ہے۔ اب اسے آپ میری بد قسمتی نہیں یا کچھ اور۔ ممکن ہے یہ بھی سازش کا حصہ ہو۔ اگر میں ٹرین سے لاہور پہنچا اور نعلی شاہ عالم لوگوں کو نظر آتیا۔ وہ اتنے عرصہ روپوش تھا۔ اسے عمر دراز کا قاتل سمجھنے والوں نے پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔ بعد میں پولیس آئی اور اس کی لاش اس کے گھر پہنچا دی گئی۔"

"یعنی آپ کے گھر؟"

"بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ شاہ عالم ہے میری بیوی مدد سے بے ہوش ہو گئی اور ابھی تک بے ہوش ہے۔ تقریباً گواہ جیسی کنڈیشن میں ہے۔ پائلٹ کے لوگوں نے بھی مان لیا کہ وہ شاہ عالم ہے اور اسے پوری عزت و احترام کے ساتھ وہاں دنگا دیا گیا جہاں آپ نے اسے دوبارہ نکلا کے دیکھا تھا۔"

"دو واقعی آپ کا ہم شکل تھا۔"

"لیکن وہ شاہ عالم نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔ اس تمام عرصے میں میری حیثیت ایک نظریہ جیسی رہی۔ میرا وہ اجنبی ہمدرد مجھے اپنے گھر میں بند کر کے نائب ہو گیا۔ اس گھر میں مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی مگر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ پھر ایک دن مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں اچانک سب کے سامنے جانا تو لوگ کہتے کہ یہ ہے نعلی شاہ عالم۔ اصل شاہ عالم کے مزار پر تو پائی کے لوگ بھی دن رات بھول چڑھاتے جا رہے تھے۔ میں چوری چھپے لوگوں سے ملا۔ ایک پریس کانفرنس کی مگر اس میں بڑے صحافی نہیں آئے۔ وہ سمجھے کہ یہ عملی مذاق ہے۔ شاہ عالم مر گیا۔ اب اس کی

پریس کانفرنس کیسی؟ تاہم اس سے شکوک پیدا ہوئے۔ کچھ ذہین اور تجسس پسند صحافیوں نے معاملے کی یہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس میں ایک خاتون صحافی ختم جیش جیش تھی۔ بڑی بہادر اور بے باک صحافی ہے۔ انویسٹی گیٹیو INVESTIGATIVE رپورٹر تھی۔ میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اسی نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرائے کا مسئلہ اٹھایا۔ اب آپ غور فرمائیے کہ ان سب حالات میں آپ کی رپورٹ بھی سامنے آجاتی اور اس میں یہ ہوتا کہ مرے والد اسی اصل شاہ عالم تھا تو میرا کیا بننا۔ میں کیسے ثابت کرنا کہ میں زندہ ہوں؟"

ایک غریب خاموشی کے بعد ڈاکٹر مسند نے کہا "مسٹر شاہ عالم، پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے مجھے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ لیکن میں اس وقت آپ کی زبانی آپ کا مشفق یعنی VERSION سنا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "اب آپ سب کچھ CLEAR ہو گیا۔"

"نہیں۔ میں اب بھی کنفیوژن میں ہوں" وہ بولا۔

خان جی خاموشی سے اندر آئے اور کانپ کے دو دک رکھ کے چلے گئے۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کے گفتگو میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ راز کے کی اوٹ سے انہوں نے ہماری باتیں سن کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں ہمارے پاس نہیں ٹھہرنا چاہیے۔

"جب تک یہ کافی ختم ہوتی ہے، آپ کے سوالات کا جواب دے سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"اگر آپ اصل شاہ عالم تھے۔"

"مگر سے شکوک پیدا ہوتے ہیں، میں شاہ عالم ہوں۔"

"اوکے۔ آپ نے پولیس اور عدالت سے مدد کیوں نہیں لی۔"

معاملے کو اتنا آگے کیوں نہ بڑھنے دیا؟

میں نے کہا "پہلے چند دن تو میں اس بے وقوف ہمدرد کی قید میں تھا جسے وہ حقائق کو قبول نہ کرتا تھا۔ پھر میں نے صلاح مشورے میں چند دن گزار دیے۔ میں پائلٹ کے سینئر عہدے والوں سے ملا اور صورت حال کو سمجھا۔ میں نے دوستوں اور ہمدردوں سے مل کے ایک لائحہ عمل طے کیا۔ یہ STRATEGY کامیاب رہی۔ اب سارے کارڈ میرے ہاتھ میں ہیں۔ آپ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ صبح عدالت کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی عدالت میں حاضر ہو کے اپنا بیان ریکارڈ کرادوں گا۔ اس کے بعد پائلٹ بیڈ کو مارٹر میں پریس کانفرنس ہوگی اور ساری بات کا پتہ ہو جائے گی۔ یہ ڈراما اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا۔"

"مسٹر شاہ عالم، ایک ڈاکٹر کے لیے سیاست کے الٹ پھیر کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں آپ نے اپنی شناخت کا ڈاکٹر کیٹ طرفت کیوں اختیار نہیں کیا۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو بہت کہ یہ کیا بکواس ہے۔ میں شاہ عالم ہوں میرے سامنے لاؤ اس انوکھے

بچے کو جو شاہ عالم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔
میں نے نہیں کے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ بھول رہے ہیں کہ اس الو کے بچے کو میرے سامنے آنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ آخر کیسے سامنے آتا ہو؟ اور میں بلا ہو رہا ہوں اس لئے لوگوں نے مار دیا اور شاہ عالم سمجھ کے اس کا سزا دینا دیا۔ اس وقت میں سامنے آتا تو مارا جاتا۔ ایک تو میں مجبور تھا۔ دوسرے میں مناسب تھا کہ میں جذبات کے طوفان کو گزر جائے۔ سچ دو دن بعد بھی سچ ثابت کیا جاسکتا ہے اور دس دن بعد بھی۔ اب میں محفوظ ہوں اور ان سب کی ایسی نجی کڑوں کا جنوں نے میری غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ذلیل اور اعتقاد حرکت کی۔ پانچ نہیں ان کے کون بے وقوف مشیر تھے۔ ایسے ہی مشیر تو ہر مہرے ہیں خیر اب میں کچھ دیر کے لیے اجازت چاہتا ہوں۔ میں آؤں گا صبح ہونے سے پہلے۔ آپ آرام کریں۔"

"میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا" اس نے مختصر کہا۔
"جیسی آپ کی مرضی" میں نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

ڈاکٹر صفر نے اکیلے رہ جانے کے بعد بیچہ عجیب سا محسوس کیا ہوگا۔ وہ ڈرنا تک روم میں بیٹھا کالی پینے میں مصروف تھا کہ میں اسے چھوڑ کے روانہ ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ یہاں وہ ایک حد تک آزاد ہے مثلاً وہ صوفے پر لیٹ کے سو سکتا ہے، کمرے میں ٹھن سکتا ہے گوشت میں رکھے ہوئے دی کو آن کر کے نفع شب کے بعد آنے والے سیٹلائٹ ڈش کے کچھ پروگرام دیکھ سکتا ہے۔ رسالے اور اخبارات کی ورق گردانی کر سکتا ہے مگر سناں سے اپنے گھر نہیں جاسکتا۔ ایسا ممکن ہوتا تو میں اسے یہاں لانا ہی کیوں نہ گھر کے اندر بظاہر بالکل خاموشی تھی اور ایک بوڑھے ریٹائرڈ کرکٹ کے سوا کوئی نہیں تھا مگر میں شادف کرتا ہوں وہ واضح کر چکا تھا کہ وہ ابھی تک چوکس اور ہوشیار ہے۔ اتنا ہی جتنا مسوس کے دوران میں تھا۔ ایسے شخص کے سامنے نہ ہونے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق خان اعظم میرے جاتے ہی نمودار ہو گئے تھے اور میری واپسی تک ایک اچھے میزبان کی طرح ڈاکٹر صفر سے باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتوں کا تعلق سیاست سے نہیں تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر صفر کے گھر کا نمبر لایا۔ ریسیور اٹھانے والی اس کی ہوی تھی "آپ سزا ڈاکٹر صفر ہیں؟"
"جی" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "آپ کون؟"
"جو خاتون آپ کے ساتھ آئی ہیں" فون انہیں دیتے تھے۔ "میں نے کہا۔"

اس نے قہقہہ کی اور میں نے چندا کی آواز سنی "ہیلو۔"
میں نے کہا "تم جاگ رہی ہو؟"
"نہیں" نیند میں باتیں کر رہی ہوں "وہ بولی "یہ موت پوچھتا کہ

کس سے؟"
میں نے ایک معنوی قہقہہ لگایا "اس کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اس سے جس کے تصور سے تمہارے خیالوں کی دنیا آباد ہے۔ جو تمہارے خوابوں میں رہا ہوا ہے۔ ہیلو... ہیلو... چندا۔"
میں نے دوبارہ فون لایا "کیا بات ہے فون کیوں رکھ دیا تھا؟"
"ابھی تو نہیں کسی نے کل خانے سے فون کیا تھا کوئی نشتہ میں تھا۔ عجیب، جیسی کل باتیں کر رہا تھا" وہ بولی۔

"بڑے انفسوس کی بات ہے۔"
"ہاں۔ ایسے ایسے گھٹیا اور کینے لوگوں کے ہاتھوں میں سوا کل فون نظر آنے لگے ہیں کہ انفسوس ہوتا ہے۔ بات کرنے کی تیز نہیں پڑ لایا فون۔"
میں نے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں سوا کل فون پر بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو وہ تم تھے؟ معاف کرنا میں غصے میں سچ بولی گئی۔۔۔ خیر سے اس وقت سوا کی کہاں جا رہی ہے؟"
میں نے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیسے جا رہا ہوں؟"
"تم نے ابھی ہارن بجایا تھا۔ انجی کی آواز بھی ہے یہی منظر میں۔"

میں نے کہا "میں اپنی اکلوتی بیوہ سے ملنے جا رہا ہوں۔"
"ڈرا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھنے ہی کوئی ماروے اور ایکشن ری پلے کی طرح پھر یہ ہو جائے۔ تمہارے سمان بھی ساتھ ہیں؟"

"ان کو میں اپنے سرال چھوڑ آیا ہوں۔ تم ذرا اپنے ڈاکٹر کمال فاروقی سے پوچھو کہ انہوں نے کیا ملے کیا ہے؟"
"اس وقت؟ وہ سو رہے ہوں گے۔"
"اس کو جگا کے پوچھو کہ الو کے بچے۔ تم کو اسی طرح کہنا ہے۔ تارینا کہ میں صرف پیغام دے رہی ہوں جیسا وصول ہوا ہے۔"
"میں قمرے معلوم کر چکی ہوں۔"

"کب کیسے اور کیوں؟ وضاحت فرمائیے۔"
"ملے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ سوائے آریخ کے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن... لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خان جی سارے معاملات کو سمجھائیں۔ میں نے خان جی سے کہا تو انہوں نے کہا کہ اچھا۔ کل وہ ڈاکٹر کمال کے گھر جا میں گے اور واپسی میں قمر کو ساتھ لے آئیں گے۔"

"گویا رفتنی میرے سرال سے ہوگی۔ میرا مطلب ہے تمہارے بیکے شریف سے۔۔۔ آہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ پتا نہیں تمہاری رفتنی کب ہوگی میرے ساتھ۔"
وہ ہنسی "اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ دور دور تک۔"
"آخر کیوں؟" میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔

"اس لیے کہ پہلے تو مجھے امید تھی کہ ایک دن ایک دن تم انسان کے بچے بن جاؤ گے مگر تم اب ہو گے ہو باقاعدہ مداری۔ تم مدھر نہیں سکتے۔"

میرے مزہ کچھ فرماتے سے پہلے اس نے فون دوبارہ بند کر دیا۔ میں اس وقت تک شاہ عالم باؤس کے نزدیک بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی کو کچھ فاصلے پر روک کے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جہاں شاہ عالم کی زندگی میں چل پھل رہتی تھی وہاں اب ویرانی اور خاموشی تھی۔ دواڑے کے سامنے گاڑیوں کی قطاریں نہیں تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں اور پھرے دار نہیں تھے۔

گیت لائش بل رہی تھی مگر کیت بند تھا۔ دوسرے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اندر چوکیدار موجود ہے یا نہیں۔ میں قریب جاتا تو وہ مجھے بھگانے کے چلائے لگتا ہے ہوش ہو جاتا۔ میں نے پچھلی طرف سے گھر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

جب شاہ عالم کا جنازہ لے کر ایک مشتعل جرم وہاں پہنچا تھا تو میں پیچھے دالی کوٹھی میں کھڑا تھا اور پردوں کی گاڑی لے کر فرار ہو گیا تھا۔ گاڑی انیس بعد میں مل گئی ہوگی لیکن نیک دل پردوں کی کچھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ گاڑی لے جانے والا شاہ عالم تھا اس کی نظر کو دھوکا ہوا تھا۔ اس کا جنازہ گھر میں رکھا ہوا تھا یا بعد میں اخبارات سے اس پر یک نہ شد و شد والا معاملہ واضح ہوا ہوگا۔

میں نے گیت کے اوپر سے جھانک کر دیکھا مگر مجھے نہ کوئی چوکیدار نظر آیا اور نہ الارم کے طور پر استعمال کیا جانے والا کتا۔ پوری طرح میں وہی گاڑی موجود تھی جو میں اپنی نیک دل پردوں سے بھٹکا کے لے گیا تھا۔ کوئی حرام خور کتا اس کے نیچے سوتا تھا تو میرے قدموں کی آواز سے اس کا جاگ کے آسمان سر اٹھالینا جتنی تھا۔ سب شریف انسان ہوی پولیس میں اور کتنے سے ڈرتے ہیں۔

جب کوئی کتا میرے استقبال کے لیے نہیں پکا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بائیں جانب گاڑی تھی اور اس کے بعد پانچ فٹ چڑی گئی جو عقیقی جھے کے دالان تک جا رہی تھی۔ اس پانچ فٹ والے دس پانچ فٹ چڑی سے مچھ میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ دو کرسیاں چڑی تھیں۔ بچوں کی ایک سائیکل کے علاوہ مجھے ایک خامسا پڑا مرتبان نظر آیا جس کے منہ پر کڑا باندھا تھا۔ خواتین کے آم کاٹ کے اس میں ٹنک ٹنک ٹنک ٹنک ٹنک ٹنک میں رکھتی ہیں اور یہ اچار تیار کرنے کا دوائی طریقہ ہے۔

کسی درجہ کے بغیر میں نے مرتبان اٹھا کے درمیان کی دیوار پر رکھ دیا اور پھر خود بھی دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف آ گیا۔ مرتبان کا پانچ وزن کم نہیں تھا اور اس میں شاید پانچ کلو آم کاٹ کے ڈالے گئے ہوں گے۔ میں نے پچھلی طرف سے بچن کا دروازہ

چپک کیا "وہ بند تھا۔ کل میں کھلنے والی کھڑکی کو تھوڑا سا دھکیلا تو بچن میں کوئی چیز کر کے ٹوٹ گئی۔ پت کو تھوڑا سا اور دیا تو وہ اندر مکمل کھل گیا۔ یہ کارروائی میں نے لٹائی پروف جال کے ایک سوراخ میں اٹھل ڈال کے کی تھی۔ سوراخ رنگ آلود جال... سے بنا گیا تھا۔ اٹھل کے ساتھ خود کچھ بھی اندر لے جانے کے لیے مجھے باقی جالی اس طرح پھاڑنی پڑی تھی۔ دیوار اندر اپنے کپڑے پھاڑا تھا۔

بہت سی آوازوں کے پیدا ہونے پر بھی کسی نے متوجہ ہونا ضروری نہیں سمجھا تو میں نے بہت سے نتائج اخذ کیے۔ ایک یہ کہ گھر میں کوئی قادی نہیں جو مجھ سے پوچھتا کہ بھائی صاحب! آخر آپ کیا چاہتے ہیں۔ گلاب اور چنبیلی کی جوڑی کے لیے بچن ہی ان کی خواب گاہ تھی۔ بچن خامے و صبیح کرے سے بھی بڑا چٹانچہ اس میں وہ آئندہ پانچ سات سال میں پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ بھی سو سکتے تھے مگر۔ اس گھر کو آنگ لگ گئی مگر کے چراغ سے۔ شاہ عالم کے ساتھ ہی سب کچھ چلا گیا۔ اس کے معذور باپ کی لاش لے کر اس کی لٹائیاں مل گئی اور انہی کے ساتھ گلاب اور چنبیلی چلے گئے گھر میں رشتہ کے لوٹ آنے کی فریج تھی تو شاید وہ اندر خواب گاہ کے بند دروازے کے پیچھے اپنی بیوی "خانی اور دستانہ کی کے احساس کو لگے سے لگائے کسی خواب پریشان میں کم تھی یا کسی خواب آور دوڑا کے زیر اثر بے مدھ چڑی تھی۔

میں مرتبان سمیت بچن میں ایسے آٹرا پیسے نکل آ کر سڑاٹک سانس کی آلات کے ساتھ چاند کی سطح پر اترا ہوگا۔ احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اندازے سے دروازے کی سمت کا تعین کیا "اندازہ غلط ہو گیا اور میں دیوار سے ٹکرایا۔ اندر اندر سے کی شب بھراں کی آدھ کی سے بھی کمر اندر تھا جس میں شاید الو کو بھی چشمہ لگا کے کچھ نظر نہ آتا۔ میں نے مرتبان نیچے رکھ کے دوبارہ اپنے ہنر افانی عمل وقوع پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ لائٹ کا سوچ بورت میرے دائیں جانب یعنی شمال مشرق میں ہوگا۔

اس بار میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے بورڈ تلاش کر لیا مگر لائٹ کا مٹن دبانے کے بجائے دو سوراخوں والا پلگ دبانے کی کوشش کی۔ اس سے کرنٹ لگا تو میرے حلق سے خود بخود ایک آواز نکلی جس کا مطلب کچھ بھی نہیں تھا۔ جب روشنی ہو گئی تو میں نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نیچے کریم کی شیشی ٹوٹی چڑی تھی اور نہ جانے کیا سفیدی چیز فرش پر بکھر گئی تھی۔ مرتبان اٹھا کے میں دروازے کی طرف بڑھا اور اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔

روشنی بچن کے اندر کھلنے والے دروازے سے کچھ فاصلے پر بڑے قاطانہ انداز اور سوز میں کھڑی تھی۔ انداز کا تعلق اس کے بے ترتیب لباس شب خواتین سے تھا۔ موز کا اس آتشیں اسلئے سے جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کچھ حیران اور کچھ دیران لٹھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ حیرت اسے میرے چہروں کی طرح قدم رنجا فرماتے پر نہیں ہو سکتی تھی۔ حیران وہ اس بات پر ہوئی کہ میں

اس کے بچے سے مرتان اٹھ کے کھانے جا رہا تھا اور کہیں؟ میرا اس سے ملاقات کے لیے آج رات مگر مرتان کی چوری چوری مٹی دارو! میں سمجھ رہا تھا کہ وہ تو فون کی طرح دیکھ رہا تھا اور پھر ایسے مسکرا کر ایسے لوگ فون اترتے وقت مسکراتے ہیں "ہیلو رشتی"۔

میں نے کہا۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کا پورا کچھ نہیں بدلے۔
میں نے کہا "میں نے فون لایا تھا تمہارے لیے۔ تم کا اچار۔"
اس نے ہونٹوں پر زبان بھیری۔ ایک ہاتھ سے بالوں کو عادتاً پیچھے کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مسکراہٹ کو یوں تک آنے سے پہلے روک دیا۔

میں نے مرتان کو ایک میز پر رکھ دیا "رشتی۔ یہ آؤ فون جو تمہارے ہاتھ میں ہے" یہ تو ٹیکہ ہے۔ خود چل جانا ہے۔ جیسے آؤ ٹیکہ بجلی کی اسڑی۔ اسے بھی فون بر حال کرنا پڑا ہے۔ جیسے تم نے رو اور کا سنبھلی کچھ ضرور بتا دیا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کوئی چل جائے۔ مجھے یہ رو اور اصل ہی لگ رہا ہے۔ نقل کیسے ہو سکتا ہے۔ نقل میں ہوں۔ شاہ عالم جو اصلی تھا وہ تمہارا اکلوتا شوہر تھا۔"

"بڑا کرو یہ فضل بکواس" اس نے پاٹ لیجے میں کہا۔
میں نے کہا "رشتی۔ دیکھو اب یہ ایک ہی شاہ عالم رہ گیا ہے دنیا میں۔ نقل کسی گھر پر تو اصلی جیسا۔ مجھے مارنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تمہارا بچہ سے اپنے شوہر کے قتل کا انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اپنی مرضی سے۔"

"اپنی مرضی سے؟" اس نے تلخ ذہرے لیے میں سوال کیا "یعنی تم نے مجھے بالکل مجبور نہیں کیا تھا؟"

"دیکھو۔ دنیا چاہے نہ جانے مگر تم سے تو کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ میں بھی مجبور کروا گیا تھا کہ اس ذیل بدل والے ڈراے کا ایک کردار ہوں۔ مجھے بھی بلک گیا تھا اور میں نے جو بھی کیا اپنے دفاع میں کیا۔ مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے تمہاری طرح۔ تم شاہ عالم کی بیوی تھیں۔ کسی حد تک؟ یہ تم جانتی ہو۔ مگر میں اس کی بیوی بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق اپنے مفاد میں استعمال کرے اور پھر قربان کر دے۔ اتنی آسانی سے اس کا شکار ہونے اور اس سے مشابہت کی بد قسمتی کے باعث میں مرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اسے نہ مارا تو کیا خود مرنے؟ پھر میں نے فوراً وضاحت کی "لیکن۔۔۔ اسے میں نے مارا نہیں" میں تمہارے ساتھ قلاب وہ مارا گیا تھا۔ حالات اس کے اپنے پیدا کر رہے تھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں کسی مدح سے باخبر نہ رہا ہوں یا رو اور سے مخاطب ہوں۔ وہ وہاں موجود ہونے کے باوجود میری بات نہیں

سن رہی تھی "اگر اس وقت میں تم کو کوئی امدادوں اور پھر میں سے چلی جاؤں سارے دواؤں سے منتقل کر کے۔ تو تمہاری لاش یہاں پڑی رہے گی کسی کو کیا پتہ کا؟"
"ایک ضروری شخص" میں نے کہا "میں آتے ہوئے میں نے مس خان سے بات کی تھی۔ وہ بالکل فون میری جیب میں ہے۔ اس نے پوچھا تو میں نے بتا دیا تھا کہ میں تم سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں نے کہا تھا۔ اپنی اکلوتی بیوہ سے۔"

"اس کے علاوہ مس خان کے باپ کو معلوم ہو گا۔ تیور کو پتا ہو گا۔ مجھے کیا پتہ کہ تمہاری لاش اٹھانے کے جائیں۔"
"ہمت سے لوگ جانتے ہیں کہ تم ہسپتال سے منتقل ہو کے گھر آگئی ہو۔ اس کے علاوہ تمہاری کیا دلچسپی ہے میری ذات میں؟ قتل کرنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تمہیں ایک سمجھ ضرور ادا تھا۔ وہ ضروری تھا اس کے باوجود میں نے مدد نہ کی تھی۔ میں نے تمہاری جان چھڑا دی شوہر کے ظلم و ستم اور جبر سے۔"

"لیکن اب تم میرے شوہر ہو جاؤ گے۔ تم بڑے منصوبہ ساز اور پکڑا ہو۔ تم نے بیچہ انتظام کر لیا ہو گا کہ دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شاہ عالم کو شاہ عالم قرار نہ دیا جائے۔ یہ سارا پکڑا تمہارے اشارے پر اس چھلاوہ تنظیم نے چلایا تھا۔ اس نے اور تم نے مل کے اپنی مرضی کے ڈاکٹروں کو میڈیکل بورڈ میں شامل کر دیا ہو گا۔ رپورٹ بھی وہی ہو گی جو تم چاہتے ہو۔ پھر ہمت ہے تمہارے پاس اور بد معاشی کی طاقت بھی ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اس کی معاملہ فہمی کو سراہا "تمہاری ذہانت قابل تحریف ہے۔ رپورٹ اب یہی ہو گی کہ مرے والا شاہ عالم نہیں تھا مگر ذہن کمزور میری مرضی کے تھے اور نہ اس کا خیر میں جہنم میری مددوں تھی۔"

"پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"وہ لاکھ فٹہ اور توڑی سی بد معاشی" میں نے اعتراف کیا "شرافت کا مکمل یہ شروع سے نہیں تھا۔"
"مگر قانون تمہیں شاہ عالم تسلیم کر لے گا۔ اس کے بعد شاہ عالم کی بیوی کیا کرے گی؟ جو ابھی تک بیوہ تھی وہ کل سے پھر ساکن بن جائے گی تمہاری بیوی ہو گی وہ بھی؟"

میں نے دانت کھل کے کہا "ایسا ہوتا تو میری خوش قسمتی ہوتی مگر وہ نہیں سکتا۔"
"کیوں؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی "پتا ہوا دس دن بعد تم مجھ سے نکاح کر سکتے ہو۔ سب کے سامنے ضروری نہیں۔ مگر اس طرح تمہاری خوش قسمتی پر شرع اور قانون کی مگر تصدیق لگ جائے گی میں قبول کروں گی نہیں۔"

میں نے تھوک نگل کے کہا "مگر میں اس وقت تک زندہ رہا۔ بات یہ ہے خاتون کہ میری ملکیت کی دعوے دار مس خان مجھے فوراً

قتل کر دے گی ہاں اگر تم پہلے اسے قتل کر دو۔"
"دورن سے مجھے تمہارا انتظار تھا" وہ بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے لیکن تم میرے آئے۔"
"دیر آید دوست آئے" میں نے کہا "یہ تم کا اچار۔"
"اسے رکھ دو مجھے بے وقوف مت بناؤ مجھے کیا لائے ہو آخر تم اس میں" اس نے فحش سے کہا۔

"خدا ہو گی۔ یعنی تمہارا خیال ہے کہ اس مرتان میں کوئی ہم ہو گا جو تمہارے ہاتھ لگاتے ہی پھٹ جائے گا یا زہریلی گیس ہو گی کہ تم نے کپڑا ہٹا دیا اور ہوش غائب۔ کوئی سانپ نکلے گا اس میں سے پھٹا رہا ہو گا۔ تم دیکھ سکتی ہو اس میں گھر کا بنا ہوا آم کا اچار ہے۔ دیکھو۔۔۔" میں نے کپڑا ہٹا کے مرتان کا کھانا اس کی طرف کیا۔
ایک لمبے کے لیے اس کی آنکھیں مجھ پر سے ہٹ کر مرتان پر مرکوز ہوئیں اور میں نے سوچ سے قائم اٹھاتے ہوئے مرتان اس کی طرف اچھال دیا۔ مرتان اس کے رو اور والے ہاتھ پر لگا۔ مرجع سالے کے اور تیل کے چھیننے اچھال کے اس کے کپڑوں پر اور چہرے پر لگے۔ اس کی آنکھوں میں مچھلی لگ گئیں۔
"ڈیبل۔۔۔ کیسے۔۔۔ وہ چلائی۔"

میں مرتان کے ساتھ ہی اس پر جا کر اٹھا۔ مرتان بچے کر کے فٹا پھرد کر گئی۔ اس کے اوپر میں گر کر کسی دشواری کے بغیر میں نے اس سے رو اور پھین لیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اس کے اوپر میرے کپڑے اچار کے سالے میں بھر گئے تھے۔ فرش پر تیل پھیل گیا تھا۔ آم کے ٹکڑے ٹکڑے تھے اور مرتان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ فضا آم کے اچار کی تیز مچھ سے بھر گئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس نے ہاتھوں پر سے چہرے گردن اور بالوں سے گاڑھا مسالا اور تیل جھک کے صاف کیا۔ پھر اس نے اپنے خوب صورت ریشمی لباس شب خرابی کو اور اپنی حالت کو دیکھا۔ خوب سر سے پاؤں تک آم کے اچار میں لٹھڑا ہوا کھڑا نہایت مٹھکہ خیر نگ رہا تھا۔

میں نے کہا "اکٹی ایم سو ری۔۔۔"
اس نے میری طرف دیکھا اور اس کے لیوں پر ہنسی آگئی۔ وہ بے ساختہ زور زور سے ہنسنے لگی "ذرا اپنی حالت دیکھو۔ کارڈن بن گئے ہو۔"

"اگر تم نے میرا تختہ قبول کر لیا ہوتا۔۔۔"
اسے ایک اور ہنسی کا دھو پڑا "یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھے تم آم کا اچار پسند ہے اور پھر یہ کون سا موقع تھا۔ کہاں سے لائے تھے تم یہ اچار؟"

میں نے کہا "یہ سب سوالات غیر ضروری ہیں۔ تمہیں پسند تھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا مگر آج تم کے اچار نے میری زندگی بچا لی۔"

"تم عجیب حرکتیں کرتے ہو بعض اوقات۔ جو تمہیں جانتا۔"

ہو وہ مجھے لگا کہ تم پاگل ہو۔" وہ بولی "مگر تم پاگل نہیں کوئی کرتب دکھا کے پاگل کر دینے والے داری ہو۔"
میں نے اس خرابی خیمین کو سر ہٹا کے قبول کیا اور جیمبر کھول کے رو اور سے گولیاں نکالنے کی کوشش کی۔ جیمبر خالی تھا۔ اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔
"گولیاں خود میں نے نکال دی تھیں" اس نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"یعنی تمہارا ارادہ مجھے قتل کرنے کا نہیں تھا" میں نے کہا۔
"ارادہ تھا۔ فیلڈ کرنا مشکل تھا۔ کئی بار میں نے گولیاں ڈالیں کہ جب تم آؤ تو تمہاری چھٹی کر دوں۔"

میں نے کہا "پھر کیا سوچ کے رو اور خالی کر دیا تھا؟"
"پتا نہیں۔ شاہ عالم کی موت کے بعد میں غلام میں مطلق تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ پولوں یا چپ رہوں۔ فوس یا دوک۔ میں سچا جانتی تھی مگر خلیوں کے انتشار پر قابو پانا میرے بس میں نہیں تھا۔"

میں نے کہا "پتا نہ چمکتے کی کیفیت میں ہسپتال جا کے لیٹ گئیں؟"

"مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی" وہ بولی۔
میں نے کہا "میں تم سے ہسپتال میں نہیں مل سکتا تھا ورنہ ضرور آتا۔ کل ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم لوٹ کے گھر آگئی ہو۔"
"میں نے تو کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ہسپتال کے ریکارڈ پر ابھی تک میرا نام لکھا ہوا ہے۔ میں وہی آئی لی دوم نمبر دوں ہوں۔ مٹاؤں اور دیکھوں کہ علاوہ ہمت سے دوسرے لوگوں سے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔"

"مگر میں نے معلوم کر لیا۔"
"مجھے امید تھی کہ تم معلوم کر لو گے۔ اس لیے گھر آگئی تھی میں اور تمہارا انتظار بھی کر رہی تھی۔"
"کیا یہ مناسب نہیں ہو گا کہ ہم آم کے اچار سے پیر انسان بن جائیں۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے راستہ دیا "تمہارا ہی گھر ہے۔ یہ تمہارے کپڑے کہاں ہیں ہاتھ دو کم کر مرے سب جاتے ہو تم۔"

"کیا کر میں اور کوئی نہیں ہے؟"
"نہیں۔ گلاب اور چنبیلی کا کچھ پتا نہیں لوٹ کر آئے بھی ہیں یا نہیں۔ چوکیدار کو پولیس نے گئی تھی۔ تفتیش کے لیے۔ میں نے اس کی گلوغوا صی کرا دی تھوڑی دیر پہلے کے بھاگ گیا۔ ذرا تیر کو خود میں نے چھٹی دے دی کہ ابھی تمہاری ضرورت نہیں مالی دوزخ آتا ہے۔"

"میں تم اکیلے ہو؟"
"جب شاہ عالم زندہ تھا۔ اس گھر میں دوسرے لوگ رہتے تھے۔ تب بھی میں اکیلے تھی۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ تمہارے خاندان کے لئے دوست رشتے دار۔"

"میں نے ابھی کسی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ماں باپ یا نہیں۔ ایک بھائی کینڈا میں ہے۔ ایک چاچا نہیں کہاں ہے۔ دور بے رشتے دار پہلے ہی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ سب بہت معمولی اور پتہ لوگ ہیں۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کس سے؟ جس سے ڈر لگتا ہے۔ ان سے چھپ کے ہی چٹال چلی گئی تھی اور چھپ کے یہاں رہنے لگتی تھی۔"

"تمہیں مجھ سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ جیسی شاہ عالم سے؟"

"نہیں۔ تم مجھے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ بولی۔"

"میں ڈر رہا تھا۔ خوف زدہ تھا تم سے کہ کہیں تم میرا بھانڈا نہ دو ڈو۔ تمہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ شاہ عالم بن کے میں اس کی ساری لت جائداد پر قابض ہو جاؤں گا؟ تمہیں کچھ بھی نہیں لے گا؟"

"تم ایسا کر سکتے ہو؟ مگر کرو گے نہیں۔"

"میں نہ ہوتا تو یہ سب تمہارا ہو جاتا۔ جو شاہ عالم کی پراپتی میں شامل ہے۔ میں نے کہا۔"

"تم اس میں سے کچھ نہیں لو گے۔ یہ سب مجھے دے دو گے۔"

ابولی۔

"یہ تم نے کیسے فرض کر لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس سے زیادہ ہے تمہارے پاس۔ اور تمہیں کوئی ہوس میں تھی جس کے لیے تم شاہ عالم بنے تھے۔"

"میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا اور ابھی بہت سی باتیں ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ تم کبڑے بدلنے کے بعد کچھ نہیں جاکے چائے یا کافی الو؟"

"تم اپنے گھر میں خود کو مسمان کیوں سمجھتا چاہتے ہو؟" وہ بولی۔

اُدھے گھٹنے بعد اس نے بھی غسل کر کے کپڑے بدل لئے تھے درمیں نے بھی وہ بگن میں الیکٹرک کیٹل پکاپ لگ کے پانی اٹلے انتظار کر رہی تھی اور میں چار افراد کی بریک فاسٹ ٹیبل پر بیٹھا رہا تھا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے خوشبو دار صابن اور پھر ت سا سا لکھ پاؤں اور کولون استعمال کرنے کے بعد بھی آہم کے چار کی مسک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

"تمہیں شاہ عالم کی لاش دیکھ کے کیسا لگا تھا؟"

وہ ایک دم چٹکی ٹپکایا عجیب سوال ہے تمہارا۔ وہ جیسا بھی تھا میرا شوہر تھا۔ کوئی مٹائی اور قابل پرستی نہ سہی، لیکن میں نے اس لوہے کے سامنے قبول کیا تھا اور اس کے ساتھ میں زندگی کے چھ سال گزار چکی تھی۔

"لیکن تم کو اس سے بہت شکوے تھے تم خوش نہیں

تھیں۔"

"مکمل خوشی، سلیقہ اور خالص خوشی تو مکمل ایک تصور ہے۔ جو انسان کو نہ جنت میں ملی تھی اور نہ شاید پھر لے کی۔ تصور جنت کا نہیں ہوتا۔ آدمی خوشی کی یکسانیت اور افراط سے بھی پور ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں خوش نہیں تھی بلکہ بہت دکھی تھی۔ اپنے آپ کو مجبور اور محکوم سمجھتی تھی۔ بہت دکھی تھی اپنی زندگی کے شب و روز سے۔"

"اب تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تمہارا دکھی ہونا غلط تھا؟"

"اگر میں اپنا موازنہ اس ملک کی لاکھوں کیا کروں اور عورتوں سے کروں تو شاید خود مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آئے کیا نہیں تھا میرے پاس۔ اور کیا نہیں ہے مگر پھر بھی میں دکھی تھی۔ اتنی دولت، عزت اور شان و شوکت کے باوجود۔ میں صرف ان چیزوں کو دیکھتی تھی جو مجھے حاصل نہیں تھیں۔ شفا شوہر کی ساری محبت اور توجہ۔ اس میں دوسری عورتیں پیشہ سے دار رہتی رہیں۔ میں اس کا سارا وقت مانگتی تھی۔ اس جیسے کسی بھی مرد کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ دنیا کے کام چھوڑ دے اور اپنا سارا وقت میرے لیے وقف کر دے۔ میں کون اٹھ جاؤ تو وہ اٹھ جائے میں کون سو جاؤ تو وہ سو جائے۔"

"کیا یہ بیاں ایسا ہی چاہتی ہیں؟ میں فکر مند ہو رہا ہوں؟"

"چاہتی ہیں مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے حوا اپنی خواہشات کے گھوڑے پر سوار ہو کے ساری دنیا حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ اور سب حاصل کر کے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے شاہ عالم کے ساتھ میری شادی صرف اس لیے ناکام تھی کہ تمہارے درمیان اتحاد کا رشتہ نہیں تھا۔ وہ محبت نہیں تھی جس میں نہ حسد ہو اور نہ بچھڑاؤ۔ جو انسان کے لیے سب کچھ ہو۔ اسے محسوس ہو کہ محبت نے اس کے وجود کے خلا کو پُر کیا ہے اور اس عورت کے بغیر جو اس کی شریک حیات ہے، وہ ادھر رہا ہے۔ جیسے ایک پتے والی گاڑی۔ اور یہ احساس ہو کہ دوسرا کوئی پتہ اس گاڑی میں فٹ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے کافی کے دو گدے درمیان میں رکھے اور پھر فریج میں سے سینڈویچ نکال کے مائیکرو اوون میں گرم ہونے کے لیے رکھ دیے۔

"تمہاری باتوں سے مجھے محبت کے نظریاتی، بلکہ تصوراتی اور عملی پہلو کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ میں نے کہا "میں تمہیں ایک عام عورت سمجھتا تھا جس کے پاس صرف حسن ہو تو وہ کچھ کچھ تھی کہ سب کچھ ہے۔"

"حسن بھی دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔"

"لیکن تمہاری ذہانت اور عقل تو اپنی ہے۔ یہ حسن کسی کی نظر کا بیج نہیں۔"

"میں پڑھنے کی شوقین تھی۔ سوچا تھا کہ شادی کے بعد فراغت ہوگی تو ایم اے اور پھر لی ایچ ڈی کروں گی۔ کسی کالج میں

پڑھاؤں گی یا سوشل ورک کروں گی۔ مجھے اس کے لیے مواقع حالات بھی میسر نہ تھے۔ نہ مجھے گھر سنبھالنا تھا اور نہ مجھ پر کسی خاندان کی ذمہ داری تھی۔ بچے بھی نہیں ہوئے۔ میرے پاس بہت وقت تھا۔"

"پھر تم نے ارادہ کیوں بدل دیا؟"

"شوہر کی خوشی کے لیے۔ وہ خود صرف لی اے پاس تھا۔ ہر مرد کی طرح اسے بھی کچھ پس ہو جاتا اگر میں اتنا پڑھ جاتی۔ اس کے نزدیک علم صرف کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور مقاصد بڑے محدود تھے۔ عزت، شہرت اور دولت۔ اگر کسی اُن پڑھ یا شہرک پاس کو یہ سب حاصل ہو جاتا ہے تو اسے کیا ضرورت ہے ڈگریاں جمع کرنے کی اور افلاطون پینے کی۔ ذہنی اور قلبی تسکین کیا صرف کتابوں سے ملتی ہے۔ یہ بات وہ کبھی ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بلاوجہ دماغ سوزی سے کیا حاصل ہے۔ کھاؤ پیو گھوسو پھرو! بیش کرو۔ خدا نے جو خوش نصیبی کی لازمی تمہارے نام کھول دی ہے، اس کے بعد تمہیں کچھ اور حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ علم بڑی دولت ہے مگر جاکے دیکھو بڑے بڑے علما جو تپاں چٹاٹے پھرتے ہیں اور وہ بھی اسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جو تم گزار رہی ہو۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ڈر رہا تھا۔"

"کس بات سے؟"

"وہ سمجھتا تھا کہ میں نے اتنا پڑھ لکھ کے اپنا نام خود پیدا کیا۔ میں مشہور سوشل ورکر بن گئی یا کسی کالج کی پرنسپل وغیرہ ہو گئی تو میری عزت کے ساتھ اس کی کوئی عملی عزت اور شہرت نماندہ نہ جائے گی۔ یہ حاشا کہ کتابی زبردست کیوں نہ ہو! ابھی تک پڑھے لکھے آدمی کی عزت کی بات ہے۔ بات وہی عدم اعتماد کی تھی۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ عزت، شہرت، دولت۔ سب اس کی ہو۔ میں یہ سب اس کے نام سے پاؤں۔ خود اپنی کوشش اور صلاحیت سے حاصل نہ کروں۔ یہ اس کے لیے بڑی بے عزتی کی بات ہوتی کہ وہ بولی اسے پاس ہو اور پوری ذہنی ایم اے پی ایچ ڈی۔ سیاست میں عزت معنوی ہوتی ہے اور محسوس بنیادوں پر استوار نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ عورت قربانی دینا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی عزت کا بھرم رکھا اور اپنی خواہشات کا گھار گھونٹ دیا۔"

"اب تم آزاد ہو۔"

"ہاں۔ تم نے پوچھا تھا کہ اس کی لاش دیکھ کے مجھے کیا لگا تھا۔ تو ایسا نہیں ہے کہ اس وقت مجھے آزادی حاصل کرنے کے خیال سے خوشی ہوئی تھی۔ واقعی طور پر مجھے سخت صدمہ ہوا تھا۔ کسی دشمن کے مرتبے پر بھی دکھ ہوتا ایک نظری بات ہے۔ میں ایسے انسان کا تصور نہیں کر سکتی جو دشمن کی موت پر مضائقہ نہ رکھتا اور واقعی خوشی کے شادمانے نہ جانتے۔"

"ایسے آدمی ہیں مگر وہ انسان نہیں ہیں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"شاہ عالم مجسم برائی نہیں تھا۔ اور پھر اتنا عرصہ وہ میری زندگی کا ایک حصہ رہا تھا۔ صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میرے لیے وہ روئے کج حال کر لینا اور بیوی کے سوگ کا ڈراما کرنا مشکل تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس کے ذمے دار تم ہو اور میں تم کو یہ سزا دے سکتی ہوں کہ تمہاری ساداش کو ناکام بنا دوں مگر میں خود اس میں شریک تھی۔ شریک ہونے پر مجبور کر دی گئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں مزاحمت کر سکتی تھی جان دے سکتی تھی یا لے سکتی تھی۔ مجھے کئی ایسے مواقع ملے جب میں تمہارا بھانڈا چا رہا ہے پھوڑ سکتی تھی۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟"

"میں مجھے تمہاری مجبوری کے خیال نے روک لیا۔ تم کو بھی اس دہل میں تمہاری مرضی کے خلاف سمجھایا گیا تھا۔ تم اپنی اور دوسرے لوگوں کی مجبوری کے جال میں پھنس گئے تھے۔ تم کو شاہ عالم نے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا اور تمہارا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ بعد میں تم نے اسے ایک چیلنج سمجھ کے قبول کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے تم سے دشمنی نہیں کی کہ تم شاہ عالم کے دشمن نہیں تھے۔ اس نے دشمنی کی تھی تم سے اور تمہیں زبردستی اپنا دشمن بنایا تھا۔ میں ایک طرح سے غیر جانبدار قماشانی بنی رہی۔ میں نے شاہ عالم کے خلاف خود کچھ نہیں کیا اور تمہارے خلاف بھی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ویری مچ کہ تمہیں مجھ سے بھروسہ دہی تھی۔"

وہ مسکرائی "ایک اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ صرف بھروسہ دہی نہیں تھی جس نے مجھے غیر جانبدار رہ کر لکھا کچھ تمہاری بھروسہ دہی میں جذباتی کر دیا۔ میں تمہیں پسند کرتی تھی۔"

"اس کا بھی شکریہ۔"

"میں نے کئی بار سوچا کہ تم میں اور شاہ عالم میں ویسے کوئی فرق نہیں، ایک کی جگہ دوسرا لے سکتا ہے کسی کو احساس نہیں ہو سکتا کسی تبدیلی کا۔ لیکن کاش ایسا ہوتا کہ مجھے بھی فرق نہ پڑتا۔ میں اپنے شوہر کی جگہ تمہیں قبول کر سکتی، رکھ سکتی، اخلاقی، شرعی اور قانونی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ لیکن تمہارے لیے میرے دل میں ستائش کے جذبات ایک حقیقت تھے جن پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ یہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے سے روکا۔"

ہم ایک ہی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا صبح کے تین بجے تھے۔ وہ میرے اتنے قریب تھی کہ میں ہاتھ دھوا کے اسے چھو سکتا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق جوں جوں اس اور خوشبو استعمال کی تھی وہ بڑی پیمانہ خیر تھی مگر یہ سب اس نے مجھے رجمانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پیشہ اس کی دھڑلے سے باہر رہوں گا۔ ابھی وہ ایک بڑی تھی اور اسے مدت کے چار ماہ وہ دن اپنی

ہما جاکے بیٹھ گئے۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ شطرنج کھیل رہے ہیں آپ لوگ اس وقت؟"

ڈاکٹر صفدر نے سر اٹھایا دیکھا اس وقت یہاں ہم پولو کھیل سکتے تھے؟

میں نے سر کھپکا کر کہا "مکانگ نہیں۔ گھوڑا لٹکا کر دیتا۔"

"وہ بڑی اور اعصابی یاد رکھنے کے لیے میں شطرنج سے بہتر کوئی کھیل نہیں سمجھتا" وہ بولا۔

"پریشان کن خیالات سے بچنے کے لیے ذہن کا رخ تفریح کی طرف موڑنا اچھی بات ہے۔ ذہنی تفریح کی طرف۔"

خان کی اپنے اصول پر عمل پیرا تھے۔ خیال کو کنٹرول کرو۔ میں نے اندر جا کے جوئے سوزے اٹارے اور بیڈ پر لیٹ کر

فون پر ڈاکٹر کمال فاروقی کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا۔

"مگر جاگ رہا تھا الٹو کے پیٹھے؟" میں نے کہا۔

"جگانے کے بعد اس سوال کا مقصد 'سور کے پیچے' وہ غلطی سے بولا۔

"مجھے دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے" میں نے کہا "اسی وقت۔"

"میری جیب میں دس روپے ہیں اس وقت۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ آپ ایک چمک باتیں دس لاکھ کا۔"

"مگر اس وقت کیوں؟"

"اس لیے کہ صبح آپ چلے جائیں گے خدمت خلق کینک۔ وہاں آپ کو نہ فرصت ہوگی اور نہ یاد رہے گا۔ انکی بات سمجھ میں۔"

"نہیں۔ ایسی اشد ضرورت ہے تو آپ ہی تشریف لاسکتے ہیں۔ غریب خانے پر یا کینک میں۔ میں صبح آٹھ بجے جانا ہوں۔"

"ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ تو مجھے چمک دے کر واپس چلا جاؤ اور پھر سو جا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ناقابل بیان مجبوریوں

ہیں جن کی وجہ سے میں نہیں آسکتا۔ صبح سات بجے میں چلا جاؤں گا کہیں۔ ڈاکٹر صفدر کے ساتھ اور ناشتا دیں کہوں گا۔ چند اوپاں پہلے سے موجود ہے۔"

"یہ کیا پھر اسرار محکم ہے۔ کون ڈاکٹر صفدر؟"

"وہ اس وقت خان اعظم کے ساتھ شطرنج کی بازی ہارنے کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ دونوں برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ تجھے

یقین نہیں تو آ کے دیکھ لے۔ ویسے بھی مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں جن کا تعلق تیری ازدواجی زندگی سے ہے۔ ایک سالے کی بہنوں کو وصیت۔"

"میں وہ باتیں سننا نہیں چاہتا۔"

"مگر میں سننا بھی چاہتا ہوں اور سننا بھی۔ تو آ آ ہے شرافت سے یا میں باپوش مبارک بدست بقلم خود تیرے سر عزیز کی گوشالی

فرمائے تشریف لاؤں؟" میں نے دھماڑے کے کما اور فون بند کر دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں